

نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء)



وی ایس نیپال (۲۰۰۱ء)



اِمرے کیرٹیس (۲۰۰۲ء)



جے۔ ایم کوئٹزی (۲۰۰۳ء)



اَورحان پامُوک (۲۰۰۶ء)



ڈورِس لیسِنگ (۲۰۰۷ء)



جے ایم جی لی کلیز یو (۲۰۰۸ء)



ہیرٹا مُلّر (۲۰۰۹ء)



ماریوؤرگاس یوسا (۲۰۱۰ء)



مَو یان (۲۰۱۲ء)



ایلس مُنر و (۲۰۱۳ء)



سویتلا نا الیگزائی وِچ (۲۰۱۵ء)

انتخاب و ترجمہ: نجم الدّین احمد

اکادمی ادبیات پاکستان

نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء)

انتخاب و ترجمہ

نجم الدّین احمد



اکادمی ادبیات پاکستان

اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
انتخاب و ترجمہ	:	نجم الدین احمد
تدوین	:	اختر رضا سلیمی
طباعت	:	علی یاسر
ٹائٹل	:	سجاد احمد
اشاعت	:	2016
تعداد	:	1000
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	NUST پریس، اسلام آباد۔
قیمت	:	400/- روپے

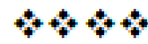
ISBN NO: 969-472-298-6

Selected Short Stories of Nobel Laureates
(2001-2015)

Selected & Translated By
Najam ud Din Ahmed

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad,Pakistan

فہرست



حرف آغاز

اگر ہم دنیا کی بڑی زبانوں کی فہرست پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی زیادہ بڑی زبانیں وہی ہیں، جن میں دوسری زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے کے زیادہ سے زیادہ تراجم ہوئے ہیں۔ آج انگریزی زبان ادبی لحاظ سے محض اس لیے پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جب بھی کوئی قابل ذکر ادبی کتاب چھپ کر منظر عام پر آتی ہے تو اس کا انگریزی میں فوراً ترجمہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر میں نے فرانسیسی کی کوئی کتاب پڑھنی ہے تو ظاہر ہے مجھے انگریزی کے ذریعے ہی اس سے استفادہ کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان ممالک میں بھی جہاں انگریزی زبان نصاب کے طور پر نہیں پڑھائی جاتی، انگریزی سیکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دوسری طرف ہماری زبان اردو، جو بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے، اسے سیکھنے کی طرف مائل ہونے والے بہت کم ہیں کیوں کہ اس میں علمی و ادبی سرمائے کا وہ ذخیرہ موجود نہیں جو دنیا کی تمام بڑی زبانوں کا خاصہ ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے قیام کا مقصد جہاں ایک طرف پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج و اشاعت ہے وہیں یہ بات بھی اس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ بین الاقوامی ادب کو پاکستانی زبانوں خاص طور پر اردو میں ترجمہ کرائے تاکہ ہماری زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادبی قارئین دنیا بھر میں تخلیق ہونے والے ادب سے استفادہ کر سکیں۔

انھی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پاکستانی زبانوں سے بین الاقوامی زبانوں اور بین الاقوامی زبانوں سے پاکستانی زبانوں میں تراجم کا ایک وقیع منصوبہ تیار کیا ہے جس کے پہلے مرحلے میں بین الاقوامی ادب سے دس کتابیں اردو میں جب کہ اردو سے دس کتابیں انگریزی

میں ترجمہ کی جارہی ہیں۔اس سلسلے کی پہلی کتاب اکیسویں صدی کے نوبیل انعام یافتگان کی منتخب کہانیاں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ تراجم ممتاز فکشن نگار اور مترجم نجم الدین احمد نے ہماری درخواست پر کیے ہیں۔نجم الدین احمد نہ صرف تخلیقی طور پر متحرک ہیں بل کہ بطور مترجم بھی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اس سے قبل وہ منتخب امریکی کہانیاں بھی ترجمہ کر چکے ہیں۔علاوہ ازیں ان کی ترجمہ کردہ کہانیاں اکادمی ادبیات پاکستان کے سہ ماہی مجلّے ''ادبیات''میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اس کتاب میں کہانیوں کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کا تفصیلی تعارف دیا گیا ہے تا کہ قارئین کہانیوں کے پس منظر سے آگاہ ہوسکیں۔

امید ہے کہ آپ کو ہماری یہ کاوش پسند آئے گی۔ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

نوبیل انعام

نوبیل انعام اب ایسا غیر معروف نہیں رہا کہ اس کی تاریخ بیان کی جائے لیکن جہاں نوبیل انعام دُنیا کا سب سے بڑا انعام یا اعزاز تصوّر کیا جاتا ہے وہیں یہ سب سے زیادہ متنازعہ بھی ہے۔ ہر برس اِس کے لیے ہونے والی نامزدگیوں کے ساتھ ساتھ نوبیل انعام پانے والے پر بھی اعتراضات اُٹھائے جاتے ہیں۔ ادب سمیت یہ اعزاز نو (۹) مختلف میدانوں میں دیا جاتا ہے، جن میں سب سے زیادہ تشہیر امن اور ادب کو دیے جانے والے انعامات کی ہوتی ہے کیوں کہ سب سے زیادہ اعتراضات اِن دونوں میدانوں میں اعزازات پانے والوں پر اُٹھائے جاتے ہیں۔

ادب کے لیے نوبیل انعام کی نامزدگیاں ہر سال اپریل سے شروع ہو جاتی ہیں۔ شارٹ لسٹنگ کے بعد اکتوبر کی نوتا بارہ تاریخ کو نوبیل کمیٹی کی طرف سے انعام جیتنے والے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ سویڈن کے شہر سٹاک ہوم میں دسمبر کی سات کو تقریب ہوتی ہے جس میں عام طور پر انعام پانے والا تقریر کرتا ہے جسے نوبیل لیکچر یا نوبیل خطبہ کہا جاتا ہے۔ اب تک زیادہ نوبیل انعامات افسانہ/ناول نویسوں کو ملے ہیں اور بہت کم شاعر یہ اعزاز پانے میں کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ تراجم کے اِس مجموعے میں سال ۲۰۰۴ء، ۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۱ء کے نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی کوئی کہانی شامل نہیں ہے کیوں کہ یہ ان برسوں کے اعزازات جن کے حصے میں آئے وہ اوّل الذکر مختصر کہانی نویس نہیں تھے۔ سال ۲۰۰۴ء کا نوبیل انعام آسٹریا کی خاتون ڈراما و ناول نویس الفریڈی جیلی نیک، سال ۲۰۰۵ء کا برطانیہ کے ڈراما نگار، سکرین پلے رائٹر، ہدایت کار اور اداکار ہیرالڈ پنٹر اور ۲۰۱۱ء کا سویڈش شاعر ٹومس ٹرانس ٹرومر کے حصے میں آیا۔ وہیں پر سال ۲۰۱۴ء کا نوبیل انعام فرانس کے ناول نویس پیٹرک موڈیانو کو ملا اِس لیے اُس کی بھی کوئی کہانی اِس مجموعے میں شامل نہیں ہے کیوں کہ اکثر ادیبوں کے برعکس اُس کا شمار اُن معدودے چند

ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مختصر کہانیوں کی بجائے صرف ناول لکھے۔ یہاں یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ بعض ادیبوں نے بوجوہ نوبیل انعام وصول کرنے سے انکار بھی کیا۔

اپنے نوبیل خطبے میں عام طور پر نوبیل انعام یافتہ ادیبوں نے اپنے ادب، ادب کے فوائد، زندگی اور دُنیا کے لیے ادب کی اہمیت، اپنے حالاتِ زندگی، اپنے وطن کے ساتھ عالمی سیاسی، معاشی کساد بازاری، جنگوں وغیرہم کا بھی ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے علم، فن، فکر، افسانوی تیکنیکوں اور اپنے اُن قابلِ قدر پیش رووں کا تذکرہ بھی کیا جن سے اُنھوں نے استفادہ کیا۔

بیسویں صدی کے بیشتر نوبیل اعزاز یافتہ ادیبوں کی کہانیاں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اس لیے اس مجموعے میں صرف اکیسویں صدی میں اب تک یعنی سال ۲۰۱۵ء تک نوبیل انعام پانے والوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ اِس کا خیال اُس وقت اچانک آیا جب گجرات سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے ''تناظر'' کے نومبر/دسمبر میں شائع ہونے والے شمارے کے لیے، جریدے کے مدیر ایم خالد فیاض نے مجھ سے ہر سال نوبیل انعام پانے والے ادیب کی ایک کہانی کے ترجمے کا تقاضا کیا۔ کہانیوں کے تراجم کے ساتھ ساتھ دو امور کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اوّلاً ہر ادیب کا مکمل تعارف، جو ادیب پر لکھے گئے معتد بہ مضامین کے مطالعے کے بعد ضبطِ تحریر میں لائے گئے، اور ثانیاً نوبیل خطبے میں اُس نے اپنی تخلیقات، فن، اسلوب، بنت کاری، کردار نگاری، پلاٹ وغیرہ کے بارے میں جو کچھ کہا انھیں اقتباسات کی صورت میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے ہاں کے نوجوان ادیب استفادہ کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھ سکیں۔

اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، اَن تھک محنت اور بہتر سے بہتر کہانی کا انتخاب کرتے ہوئے اِس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اصل متن سے انحراف اور نثر کی روانی بھی متاثر نہ ہو۔ وہیں پر یہ بات بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ کوئی ایسی کہانی ترجمہ نہ ہو جو پہلے سے اُردو قالب میں کسی اَور نے پیش کی ہو۔ اُمید ہے کہ اِس کاوش کو پذیرائی ملے گی۔

نجم الدین احمد
بہاول نگر
۱۵/اپریل، ۲۰۱۶ء

وی ایس نیپال
(VS NAIPAUL)

۸۰ سالہ ہندوستانی نژاد برطانوی ادیب وی ایس نیپال کو نوبیل انعام ۲۰۰۱ء سے نوازنے کا اعلان کرتے ہوئے سویڈش اکادمی نے اُس کے کام کی تحسین میں یہ کلمات ادا کیے: ''اُن کی تخلیقات میں مُدرک بیانیے اور کامل دیانت دارانہ پرکھ کا ادغام ہمیں پوشیدہ تاریخوں کی موجودگی کو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ نیپال وہ جدید دانش ور ہیں جو ابتدائی طور پر Letters presanes and Candide سے شروع ہونے والی روایت کے امین ہیں۔ وہ محتاط اسلوب میں، جس کی بجا طور تحسین کی جاتی ہے، زور آفرینی کو بے کم و کاست میں ڈھالتے ہوئے واقعات کو اپنا آپ خود اپنی فطری ستم ظریفی سے بیان کرنے دیتے ہیں۔'' سویڈش کمیٹی نے نیپال کو جوزف کانرڈ سے مماثل قرار دیا ہے۔ نیپال ریاستوں کی اخلاقی اموت کی وقائع نگاری میں کانرڈ کے وارث ہیں: ریاستیں انسانوں کے لیے کیا کرتی ہیں؟ نیپال اپنا بیانیہ اُس یاد کی سرزمین پر لکھتے ہیں جسے دُوسرے بُھلا چکے ہیں یعنی مغلوب کی تاریخ۔

وی ایس نیپال کا پُورا نام سر ودیا دھر سُورج پرساد نیپال ہے۔ وہ ۱۷۔ اگست، ۱۹۳۲ء کو وینزویلا کے وسیع دریا اوری نوکو (Orinoco) کے جزیرے ترینی داد (Trinidad) کے قصبے توبوگو (Tobogo) کے ایک چھوٹے سے گاؤں چاگوآناس (Chaguanas) میں پیدا ہوئے جو خلیج پاریا (Gulf of Paria) سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اُس علاقے میں ۱۸۸۰ء کے بعد ہجرت کر کے آنے والے گورے، پرتگالی، چینی، ہندوستانی، ہندو، مسلمان اور دیگر قوموں کے لوگ بستے تھے اور وہ نہایت خستہ حالی کے عالم میں ہونے کے باعث دارالخلافہ پورٹ آف سپین کی سڑکوں پر شب باشی کیا کرتے تھے۔

بحری جہاز کے ذریعے وی ایس نیپال کے اجداد نے بھی پورٹ آف سپین ہجرت کی جہاں سے وہ ترینی داد چلے گئے۔ وی ایس نیپال کا بچپن ہر لحاظ سے عسرت زدگی میں گُزرا۔ نیپال نے ابتدائی تعلیم چاگوآناس گورنمنٹ سکول اور بعد ازاں ترینی داد کے سکول سے ہونہار طالب علم کی حیثیت میں حاصل کی۔ مابعد آکسفورڈ یُونیورسٹی کی جانب سے وظیفہ ملنے پر برطانیہ چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وی ایس نیپال کا تعلق ادیبوں کے خاندان سے ہے۔ نیپال کا والد سی پرساد نیپال، بڑا بھائی شیوا نیپال، ماموں نیل بسون داس اور عم زاد واہنی کپل دیو وہ ادیب ہیں جن کی تخلیقی نگارشات منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔

وی ایس نیپال نے پہلی شادی پیٹریشیا ہیل نامی ایک انگریز عورت سے کی۔ اُن کا ساتھ ۴۱ برس تک ۱۹۹۶ء میں سرطان کے ہاتھوں پیٹریشیا کی موت تک رہا۔ پیٹرک فرنچ کی خودنوشت کے مطابق پیٹریشیا اور نیپال میں نیپال کے ادبی کام کے علاوہ کوئی تعلق مشترک نہیں تھا بلکہ دیگر معاملات میں اُن کی زندگی حقیقتاً ناخوش گوار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نیپال کے لندن کی طوائفوں سے روابط تھے اور بالآخر مارگریٹ گُڈنگ نامی ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلقات استوار ہو گئے جن سے پیٹریشیا بھی آگاہ تھی۔

پیٹریشیا کی موت کے بعد نیپال نے سابقہ پاکستانی صحافی خاتون نادرہ خانم علوی سے عقد ثانی کیا۔ نیپال سے ملاقات سے قبل نادرہ پاکستانی انگریزی اخبار *The Nation* کے لیے دس برس سے کام کر رہی تھی۔ وہ پاکستانی فوج کے سپیشل سروس گروپ کے سابقہ سربراہ میجر جنرل عامر فیصل علوی کی بہن ہیں، جو شمال مغربی پاکستان میں جنگ کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ نیپال نے پیٹریشیا کی وفات سے قبل ہی نادرہ کو شادی کی پیشکش کر دی تھی لیکن اُن کی شادی پیٹریشیا کی موت کے دو ماہ بعد ہوئی۔ نیپال سے قبل بھی نادرہ نے دوبار شادی کی تھی اور ایک شوہر سے اُس کے دو بچے ملیحہ اور نادر ہیں۔ نادرہ سے شادی کے ساتھ ہی نیپال کے مارگریٹ گُڈنگ سے تعلقات ہمیشہ کے لیے انجام کو پہنچ گئے۔

وی ایس نیپال نے بہ یک وقت کئی اصناف میں لکھا جن میں افسانہ، ناول، مضامین اور سفرنامہ شامل ہیں۔ اُس کی افسانوی نثر کی حامل کتب میں *The Suffrage of* ،*The Mystic Masseur* *Mr. Stone and the Knights* ،*A House of Mr. Biswas* ،*Miguel Street* ،*Elvira* ،*In a Free State* ،*A Flag on the Island* ،*The Mimic Men* ،*Companion The* ،*Finding the Centre* ،*A Bend in the River* ،*Booker Prize Guerrillas The* ،*Half a Life* ،*A Way in the World* ،*Enigma of Arrival Magic* ،*Nighwatchman's Occurance Book: Comic Inventions (Stories)* *Seeds* شامل ہیں۔

اپنی تحریروں کے بارے میں نیپال کا اصرار ہے کہ اُن کی تحریریں خاص نظریے سے ماورا ہیں۔ نیپال کا کہنا ہے: ''کسی سیاسی نظریے کا حامل ہونا متعصب کر دیتا ہے۔ میں کوئی سیاسی نظریہ نہیں رکھتا۔'' نیپال کے حامی اُنھیں بائیں بازو کا نقاد قرار دیتے ہیں اور مخالف مثلاً شاعر ڈیرک والکوٹ نے اُن کے نیوکالونیل معذرت خواہانہ روّیے پر شدید تنقید کی ہے۔

دُوسری طرف مسلمانوں کے خلاف نیپال کا شدید ترین متعصبانہ روّیہ اُن کی غیر عرب مسلمانوں پر اسلام کے اثرات سے متعلق کتاب *Beyond Belief* میں کھل کر سامنے آیا جس میں اُنھوں نے اسلام کو ظالم اور بنیاد پرست مذہب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ محض عربوں ہی کو، جو نبی کریم ﷺ کی اولاد اور وارث ہونے کے ناطے، غیر عربوں اور دیگر مذاہب سے مسلمان ہونے والوں پر فوقیت حاصل ہے۔ (یقیناً نیپال نبی کریم ﷺ

کے خطبہ حجتہ الوداع سے قطعی طور پر لاعلم لگتے ہیں یا دانستہ چشم اغماض برتتے ہوئے عرب اور غیر عرب مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ خطبہ حجتہ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے مسلم امہ کو واضح طور پر مساوات کا درس دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔' اور فوقیت کا واحد معیار صرف اور صرف تقویٰ قرار دیا تھا۔ مترجم) اس کتاب سے نیپال کے درج بالا بیان کا تضاد سامنے آ گیا کہ سیاسی نظریے کا حامل ہونا متعصب کر دیتا ہے اور اُن کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے۔ نیز اس کتاب کی وجہ سے ۲۰۰۲ء میں نیپال شدید تنقید کا نشانہ بنے اور اُنھیں ہندوستانی متشدد تنظیموں RSS، VHP اور BJP کا حامی قرار دیا گیا جنھوں نے مارچ ۲۰۰۲ء میں حکومتی سرپرستی میں ہندوستان کے شہر گجرات میں مسلم کش فسادات کروائے تھے۔ نیپال کی اس کتاب کو فاشزم قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ اُنھوں نے نوبیل انعام کی توہین کی ہے۔ اس کے علاوہ نیپال کے ناولوں، کہانیوں اور سفرناموں کو بھی ''تیسری دنیا'' کی بے جا ہمدردی کی بنا پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور کہا گیا کہ نیپال کے بچپن کی حسرتیں اُن کی تحریروں میں در آئی ہیں۔

مئی ۲۰۱۱ء میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی میں اپنے ایک انٹرویو میں نیپال نے خواتین مصنفین کو مرد مصنفوں سے کم تر قرار دیا اور کہا۔ ''کم از کم کوئی خاتون لکھاری میری ہم سر تو ہرگز نہیں ہے۔'' جس پر ذرائع ابلاغ میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔

نوبیل انعام کے علاوہ بھی نیپال کو معتد انعامات ملے ہیں جن میں *Booker Prize 1971*، *Elected Foreign Honorary Member of the American Academy of Arts and Sciences 1990*، *British David Cohen Prize for Literature 1993* اہم ہیں۔

نوبیل انعام وصول کرتے ہوئے وی ایس نیپال کے نوبیل خطبے ''دو الفاظ'' سے نیپال کی ادبی اور ذاتی زندگی کے بارے میں چیدہ چیدہ باتیں یہ ہیں۔

''یہ میرے لیے غیر معمولی ہے۔ میں تحریریں دیتا ہوں خطبے نہیں۔ جب لوگ مجھے خطبہ دینے کے لیے کہتے ہیں تو میں اُنھیں بتاتا ہوں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے ...... اپنے بارے میں ہر اہم شے میں نے اپنی تصانیف میں بیان کر دی ہیں۔ ...... میں اپنی تصانیف کا مجموعہ ہوں۔ ...... میں کیسے لکھتا ہوں! میں اپنے وجدان پر بھروسا کرتا ہوں۔ شروع سے آج تک میں نے اپنے وجدان ہی پر اعتماد کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ واقعات کو کیسے موڑ دیا جا سکتا ہے، آگے کیا لکھوں گا۔ میں نے موضوعات کے لیے بھی اپنے وجدان پر اعتبار کیا ہے اور جو لکھا ہے وجدانی ہی لکھا ہے۔ جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو میرے پاس ایک خیال ہوتا ہے، ایک تصور رہتا ہے ...... مجھے اپنے والد کی لکھی ہوئی مختصر کہانیوں سے ہندوستانی معاشرت کو جاننے کا موقع ملا۔ اُن کہانیوں نے مجھے بہت سا علم اور مضبوطی عطا کی، مجھے دُنیا میں کھڑا ہونے کے قابل کیا۔ مجھے نہیں معلوم اُن کہانیوں کے بغیر میری ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ ...... میں ترینی داد میں اندھیروں میں گھرا ہوا ایک ہونہار لڑکا

تھا...... جب میں لکھاری بنا تو میرے بچپن میں میرے آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے میرے موضوع بن گئے ......اور میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ بحیثیت مصنف کے، خاص طور پر آغاز میں، میرے لیے لکھنا کتنا مشکل کام تھا...... میں بتا چکا ہوں کہ میں وجدانی لکھاری ہوں، شروع سے اب تک، اب بھی جب میں اپنے تصنیفی انجام کے قریب ہوں۔ میں کبھی منصوبہ بندی نہیں کرتا، کسی نظام کی تقلید نہیں کرتا۔ بس وجدانی طور پر کام کرتا ہوں۔ میرا ہر تخلیق کے وقت بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ تحریر دلچسپ اور عام فہم ہو۔......جس طرح میرے کام میں ترویج ہے، بیانیے کی مہارت، علم اور حساسیت میں ترویج ہے اسی طرح میرے کام میں ایک قسم کی ہم آہنگی اور منزل بھی ایک ہے گو میں مختلف اطراف میں بیان کر رہا ہوتا ہوں...... جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو میرے پاس کوئی خیال نہیں ہوتا بس میری خواہش ہوتی ہے کہ ایک کتاب تخلیق کرنا ہے۔ جب میں نے انگلستان میں لکھنے کا آغاز کیا تو مجھے کسی مصنف کی میرے جیسے حالات اور پس منظر کو بیان کرنے والی کوئی تصنیف نہیں ملی۔ میرے والد کی کہانیاں ہندوستان کے ماضی کے معاشرے کو بیان کرتی تھیں......میرے گھر، میری زندگی اور اردگرد کی دُنیا کے بارے میں لکھنے کے لیے میرے پاس بہت مواد تھا...... بالآخر ایک روز میرے ذہن میں پورٹ آف سپین سٹریٹ کے بارے میں لکھنے کا خیال آیا جس سے گُزر کر ہم چاگوآماس گئے تھے...... میں اُس سڑک کی زندگی کے بارے میں جلد از جلد لکھنا چاہتا تھا......بلا استفسارات اور نہایت سادگی سے۔ میں نے لوگوں کو ویسے ہی بیان کیا جیسے وہ اُس سڑک پر نظر آتے تھے۔ میں روزانہ ایک کہانی لکھتا۔ ابتدائی کہانیاں نہایت مختصر تھیں۔ لیکن مواد خاصا تھا۔ پس آہستہ آہستہ کہانیاں طویل ہونے لگیں اور اُنھیں ایک دن میں مکمل کرنا ممکن نہیں رہا۔ یُوں میں مصنف بن گیا۔ تخیل وسعت پکڑتا گیا اور وجدان میری رہنمائی کرنے لگا۔......میرے اوقیانوسی علاقے اور ہندوستان کے سفروں نے مجھے سفرنامہ نگار بنا دیا...... ان دونوں سفروں کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھ پر نئی دُنیائیں منکشف ہوئیں اور میری افسانہ نگاری کا میدان مزید وسیع ہو گیا...... میں نے کبھی اپنی تحریروں میں تجریدی الفاظ استعمال نہیں کیے......اب میں اپنے کام کے انجام کے قرب میں ہوں اور مجھے خُوشی ہے کہ میں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں سے تخلیقی کام کیا......پراؤسٹ کہتا ہے کہ کامیابی کے لیے صلاحیت ہونا ضروری ہے لیکن میں کہوں گا کہ خُوش قسمتی اور بہت سی محنت۔"

VVVV

امبر بیل
(Suckers)

میرے والد بیمار تھے لیکن اِتنے بھی نہیں کہ قریب المرگ ہوں۔ میں ہفتہ وار تعطیلات پر اُنھیں ملنے لندن سے قصبے جایا کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ مکان کتنا خستہ حال ہو گیا ہے، گھر سے زیادہ جھونپڑ دِکھائی دیتا ہے، کتنا گرد آلود اور دھوئیں سے سیاہ پڑا ہوا۔ اِسے سفیدی کے ایک کوٹ کی ضرورت ہے اور یہی بات میرے والد بھی سوچتے تھے۔ اُن کا خیال تھا وہ مکان زندگی بھر کی کمائی اور پریشانیوں کا بہت کم حاصل ہے۔

فرض تو فرض ہے اور میری بڑی پریشانیوں میں سے ایک کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو میرے والد کے لیے مکان کی دیکھ ریکھ کر سکے۔ ایک زمانہ تھا جب آبادی کا ایک بڑا حصہ گھریلو خدمات سرانجام دیتا تھا۔ تب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ایک خاص رقم آتی اور جاتی لیکن کوئی مسئلہ دوامی نہیں تھا۔ آپ جنگ سے قبل کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اگر آپ کو اِس خاص پریشانی کا سامنا ہوتا تو لوگ بہ سہولت اپنا گھر بار چھوڑ کر دِنوں اور ہفتوں کے لیے دُور دراز کے مقامات پر چلے جاتے۔ اُنھیں یہ آزادی خُدام عطا کرتے تھے۔

اب نوکروں کا طبقہ عنقا ہوا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ نوکروں نے کون سا رُوپ دھار لیا ہے۔ البتہ ایک چیز کا ہمیں یقین ہے کہ ہم نے اُنھیں کھویا نہیں ہے۔ وہ اب بھی مختلف حیثیت میں ہمارے ساتھ ہیں: ثقافت اور انحصار پذیری کے رؤیوں میں۔ قصبوں اور بڑے دیہاتوں کے نواح میں بلدیہ کی سرکاری آبادیاں اور حکومتی سرپرستی میں بننے والی بستیوں کے جھنڈ کے جھنڈ درحقیقت اُن ہی غریب غربا کے لیے ہیں۔ وہ آبادیاں ٹرین سے بھی بہ آسانی پہچانی جاتی ہیں۔ اُن میں سوچا سمجھا سماجی گھناؤنا پن اور ذوقِ سلیم سے نکلنے والے جمال کے تصورات اور انسانیت کا دانستہ استحصال نظر آتا ہے۔ ایک زمانہ دُوسرے کے بالکل ہمسر نہیں ہوتا لیکن اگر کسی زمانے میں گھریلو خدمات سرانجام دینے والے لوگوں کی فیصدی تعداد اب بلدیہ کی اُن بے شمار آبادیوں سے موافق نہ بھی ہو تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔

بلا شبہ یہی وہ مقامات ہیں جن کی طرف ہم اپنے گھروں میں مدد کے لیے دیکھتے ہیں۔ ہم مقامی اخبار نویس کے ہاں اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات پیش کرتے ہیں۔ بہ وقتِ ضرورت صفائی کرنے

والے آجاتے ہیں اور وقت نکلنے پر چلے جاتے ہیں۔ چوں کہ کوئی بھی اپنے گھر میں موجود تمام اشیا کی مکمل تفصیل اپنے ذہن میں نہیں رکھتا لہٰذا اُن کے چلے جانے کے بعد ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ چیز غائب ہے اور وہ چیز جا چکی ہے۔ ڈِکنز نے لندن کے سیون ڈائلز ایریا میں، جو آج کل کتب خانوں والا ٹائن ہام کورٹ روڈ ہے، فاجن کے چوروں کا باورچی خانہ دِکھایا تھا۔ وہاں سے فاجن اپنے کم تر لوگوں کو عامیانہ قسم کے چھوٹے بٹوے یا خوب صورت دستی رومال اُٹھانے بھیجا کرتا تھا۔ اُن دُور دُور تک آوارہ پھرنے والوں سے ڈِکنز ہراساں تھا لیکن ہمارے نزدیک وہ بہت معصوم اور نہایت بہادر تھے۔ آج کل کے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم ڈاج کروانے کا ماہر اور اُس کے عملے کو اپنے گھر بلائیں۔ انشورنس کمپنیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اِس طرح گُم ہونے والی چیزوں کا کبھی ازالہ نہیں ہوتا۔ جدید ڈاجروں کی عجیب و غریب اور متنوع ضروریات ہیں: شاید گھر کی تمام چینی، گھر میں موجود تمام کافی، لفافے، آدھے زیر جامے، ہر فحش تصویر۔

اِن حالات میں زندگی ایک محدود حد تک ایک مستقل جوا اور سر دردی بن جاتی ہے۔ ہم سب اُس کے ساتھ جینا سیکھ لیتے ہیں۔ درحقیقت بہت کچھ کھونے اور پانے کے بعد ہم نے بالآخر میرے والد کے گھر کے لیے ایک مناسب شخصیت ڈھونڈ ہی لی۔ جو ایک دیہاتی لڑکی تھی لیکن اُس وقت دو بچّوں کے ہمراہ بالکل تنہا، جن کے دو باپ تھے، اگر ایسا ہونا قواعد کی رُو سے ممکن تھا تو، جو اُسے ہر ہفتے معقول رقم فراہم کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو بتاتی کہ وہ ''خوش قسمت'' ہے اور اپنی ابتدائی غلطیوں کے بعد اب وہ اعلیٰ چیزوں کے لیے تگ و دَو کر رہی ہے۔

اِس بات نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ میں نے اِس چیز کو مجرمانہ علامت کے طور پر لیا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ہمیشہ مجرموں سے ملتا رہا ہوں اور یہ بات میرے تجربے میں تھی کہ مجرم اپنے آپ کو اِسی طرح پیش کرتے ہیں۔ لیکن اُس عورت کے معاملے میں ہمیں غلط تھا۔ وہ وہاں ڈٹ کر رہی اور اچھی اور قابلِ اعتبار ثابت ہوئی۔ وہ تیس کی دہائی میں تھی: تعلیم یافتہ، معقول انداز میں اچھے خط میں لکھنے والی، نہایت خُوش لباس (بذریعہ ڈاک مال بھیجنے والی فرموں سے طرح دار چیزیں سستے داموں خریدنے والی) اور اچھے اخلاق کی مالک۔ وہ چھے، سات، آٹھ برس تک ٹکی رہی اور گھر کا ہی ایک حصہ بن گئی۔ میں اُسے.....تقریباً.....عطیۂ خداوندی سمجھنے لگا۔

اِس تمام عرصے کے دوران میں، مَیں نے خاصی احتیاط سے کام لیا کہ اُس کی نجی زندگی میں اپنی دلچسپی ظاہر نہ کروں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نہایت مشکل کام تھا۔ اُسے دیکھتا لیکن میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ڈر تھا کہ میں تفصیلات میں پھنس جاؤں گا۔ میں قطعاً نہیں جاننا چاہتا تھا کہ معمار سائمن ایسا تھا یا مائیکل ٹیکسی ڈرائیور ویسا تھا۔

میں جمعے کی جمعے شام کو کالج جایا کرتا تھا۔ ہفتے والے روز کی ایک صبح اُس نے مجھے سرسری انداز میں بتایا کہ اُس نے گزشتہ ہفتہ بہت سخت گزارا۔ اتنا سخت کہ ایک شب اُسے کالج آنا پڑا۔ اُس نے اپنی کار چھوٹی سی روش پر کھڑی کی اور روتی رہی۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ رونے کے لیے کالج ہی کیوں آئی۔

وہ بولی۔ ''میرے پاس جانے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ کے والد ناراض نہیں ہوں گے۔ پھر یہ کہ میں نے اِن تمام برسوں میں کالج کو اپنا گھر ہی سمجھا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ اُس کا کیا مطلب ہے۔ اِس بات نے میرے دِل کو چیر ڈالا لیکن پھر بھی میں تفصیل نہیں جاننا چاہتا تھا۔ بلا شبہ وہ اُس بحران سے نکل گئی اور ہمیشہ کی طرح دوبارہ پُرسکون، صاحبِ طرز اور با اخلاق ہو گئی۔

کچھ عرصہ گزرا تو مجھے دوبارہ محسوس ہونے لگا کہ بَو کی زندگی میں کوئی نیا آ گیا ہے۔ مرد نہیں بلکہ عورت۔ سرکاری آبادی میں کوئی نووارد یا کوئی تازہ تازہ مطلقہ۔ اُس دُوسری عورت کا نام میری اَین تھا۔ وہ دست کار تھی، پردے بنانے اور مٹّی کی رکابیوں کو رنگنے والی۔ اُس نے بَو میں بھی ایسے ہی کام کرنے کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ اب مجھے ہفتہ وار تعطیل پر سننے کو ملنے لگا کہ بھٹّے کتنے مہنگے ہیں، چھے یا آٹھ صد پاؤنڈ۔ مجھے خیال گزرا جیسے مجھ سے کہا گیا ہو کہ میں فن اور بَو کی عمومی سماجی دوڑ دھوپ کی خاطر برقی بھٹّے پر کچھ رقم خرچ کر دوں۔ ایک کاروباری خرچہ جس کی وصولی جلد ہو جاتی۔ کیوں کہ بَو کو اُس کی دست کاری اور فن کاری کا کوئی صلہ نہیں مل رہا تھا۔ اِس دوران میں اُس نے اپنی پھولوں یا گُتوں کی نقش نگاری سے مزیّن مٹّی کی سادہ تشتریوں پر یا مُٹھے منے بلو ٹکڑوں کی تصویر کشی والے چائے کے پیالوں پر اور پھر سرکاری بستی کے بھٹّہ مالک سے اپنی منقّش رکابیوں کی پکائی، قصبی میلے میں ایک سٹال کرائے پر لینے، میلے میں شرکت کے لیے سفر کرنے پر خرچ کیا...... اُس نے یہ سب کیا لیکن کوئی منافع نہیں ہوا۔ میں نے بچشمِ تصوّر اُسے ازمنۂ قدیم کے لمبے فرغل والے ایک ایسے باسی کے مانند دیکھا جو سادہ زمانے میں گاؤں کے بازار میں اپنے انڈوں کے قریب بیٹھا ہوا اور تھکا ڈالنے والے دِن کے اختتام پر اپنے مٹھی بھر طلسمی بیجوں کے بدلے کچھ بھی لینے کے لیے تیار ہو۔

بعض اوقات لندن میں فن پاروں کا کوئی اُبھرتا ہوا تاجر، جس سے آپ کی حال ہی میں شناسائی ہوئی ہو، آپ کو رات کے کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ آغاز میں آپ کو لگتا ہے کہ سادگی سے سجائے گئے اُس گھر یا فلیٹ کی ہر چیز غیر معمولی طور پر اعلیٰ ذوق کی حامل اور ایک دِیدہ زیبنا کا حسنِ انتخاب ہے۔ جب آخر میں آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ سے توقع کی جا رہی ہے کہ آپ بلوط کی جس میز پر کھانا کھا رہے ہیں، اُس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے ہر وہ چیز جو آپ نے

دیکھی ہے برائے فروخت ہے تو آپ کو ادراک ہوتا ہے کہ آپ محض رات کے کھانے پر نہیں بل کہ ایک نمائش میں بلائے گئے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ایک معمار آپ کو ایک گھر دِکھانے کا کہے جس کی غرض و غایت آپ کی معیّت کے علاوہ کچھ اَور بھی ہو۔

تو یہی کچھ جُو کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ ہفتے کی صبح کو اپنے کام کے بڑے بڑے اور بھاری بھاری بنڈل کھولنا شروع ہوتی ...... رنگی ہوئی قابیں، ناپختہ رنگ اور تاروں کا کام، بے حد دھاری دار قدرتی مناظر والی تصاویر اور مومی خاکے، جانوروں کی راکھ سے بنی تصاویر، آبی رنگوں والی دریاؤں اور بید مجنوں کی تصاویر۔ ہر وہ شے جو چوکھٹے میں آ سکتی تھی نہایت برے انداز میں جڑی گئی تھی جس سے بنڈل بہت وزنی ہو گئے تھے۔

ہفتے والے دِنوں کی نُمائشیں مجھے جائے وقوعہ پر کھینچ لے جاتیں۔ مجھے حقیقتاً دِلچسپی تھی۔ جذبے کے اُن محرکات کو دیکھنا میرے لیے باعثِ کشش تھا جہاں سے کسی شے کی توقع نہیں تھی لیکن دِلچسپی کا اظہار اگلے ہفتہ کے روز ایک اَور بنڈل کشائی کی حوصلہ افزائی کرتا۔ پھر یہ کہنا کہ اُس میں حقیقی صلاحیت موجود ہے اور اُس کے لیے بہتر ہے کہ وہ مصوری کی تربیت لے لے، اُس پر بے اثر ثابت ہوتا۔ وہ یہ بات سننا گوارہ نہیں کرتی تھی۔

کسی طرح اُس کے دِل میں یہ خیال گھر کر گیا تھا کہ صلاحیت فطری ہوتی ہے اور اُسے لگام ڈالی جا سکتی ہے نہ تربیت دی جا سکتی ہے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ ایک تصویر میں نہایت بہتری نظر آئی ہے تو وہ بولی: میرا خیال ہے کہ یہ سب میں موجود ہے۔ وہ شیخی نہیں مار رہی تھی بل کہ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں خُوش گُمانی کا شکار تھی۔ وہ بیرونی عناصر کے بارے میں بھی بات کر سکتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ فنی صلاحیتوں کے فطری ہونے کے وہ نیم سیاسی خیالات۔ اور اُن کی بے گروہی: اُن میں بہت کچھ تھا۔ اُسے کسی اَور نے دیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اُس کی نئی دوست میریّن کی عطا ہوں۔

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا وقت لگا کہ جُو مجھے اپنا کام میری تنقیدی رائے جاننے کے لیے نہیں بل کہ اِس خواہش کے تحت دِکھا رہی تھی کہ میں اُسے خرید لوں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے اپنے لندن والے دوستوں سے متعارف کرواؤں۔ میں اپنی ذات میں دست کاری کا پُورا میلہ تھا اور میرے والد کا بھی یہی عالم تھا۔ جو تخلیقات جُو ہفتے کی صبحوں کو لاتی تھی وہ صرف اُسی کی نہیں ہوتی تھیں، اُن میں سے بہت سی چیزیں میریّن کی ہوتی تھیں، جن کے لیے وہ بہت فیاض تھی۔ وہاں کسی قسم کا کوئی حسد نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے دونوں عورتیں، ایک دُوسرے کی حوصلہ افزائی کرنے والی، اپنے آپ سے خوف زدہ تھیں۔ وہ عام تھیں لیکن اُن کی صلاحیتوں نے اُنھیں خاص بنا دیا تھا، عام خواتین سے بلند۔ وہ اپنی ہر فنی تخلیق کو پسند کرتی تھیں۔ ہر تخلیق اُن کے لیے ایک چھوٹا سا معجزہ تھا۔ میں اُن عورتوں سے بدحواس ہو کر

اپنے خول میں بہت زیادہ سمٹ گیا تھا۔

بعض اوقات وہ اپنا کام گھر چھوڑ جاتیں، جو مجھ سے زیادہ میرے والد کے لیے ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ غیر لوگوں کو برداشت نہیں کرتے تھے لیکن جو پر مہربان تھے۔ وہ اس قسم کا تأثر دیتے جیسے وہ اُس کے ہاتھ میں ہوں جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ یہ ذرا سی اداکاری اُنھیں مسرت بخشتی: طاقت کا ایک چھوٹا سا کھیل۔ دست کاری کا مال فراہم کرنے والی دونوں خواتین کو یہ باور کروانا کہ وہ جتنے دکھائی دیتے ہیں اُس سے زیادہ کمزور ہیں۔ جو اور میرین کا خیال تھا کہ ہفتہ دس دن میں کسی شے کی خوب صورتی سے متأثر ہو کر وہ اُسے خرید لیں گے۔ اِس پر اُنھیں الزام نہیں دیا جا سکتا کہ لندن کے کچھ کاروباری بھی یہی کرتے تھے۔

دست کاری کا ایک اہم میلہ ہونے جا رہا تھا۔ میں نے اُس کے بارے میں جو سے ہفتوں پہلے سنا تھا۔ اُسے اتوار کے روز ہونا تھا اور اُس اتوار کو صبح سویرے ایک والوو سٹیشن ویگن گھر کی رَوش میں داخل ہوئی۔ اُسے ایک اجنبی عورت چلا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرین ہے۔ جو اُس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پہلے جو اُتری۔ وہ اپنا راستہ بخوبی جانتی تھی اور سیدھی گھر میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے والد کے ہمراہ نکلی، جو اپنی ناتوانی کے باوجود سخت محنت سے، کڈھب انداز میں مختلف کڈھب چیزیں (بڑے بڑے چوکھٹے، بڑی بڑی چیزیں) باہر پورچ میں لانے میں اُس کی مدد کر رہے تھے۔

میرا کمرہ گھر کے دُوسرے سرے پر داخلی دروازے کے قریب اور چھوٹی سی نیم دائرہ رَوش کے شروع میں تھا۔ اِس لیے جب میرین میرے والد کو سلام کرنے کے لیے کار سے باہر آئی تو میں نے اُسے پشت سے دیکھا۔ اُس کے سیاہ رنگ لباس کا نہایت ڈھیلے الاسٹک والا پاجامہ کافی نیچے ڈھلکا ہوا تھا اور اُس تن آور نے والوو سے نکلنے کے لیے سٹیئرنگ وہیل کو پکڑ کر اپنے آپ کو نیچے دھکیلا تو پاجامہ کھنچ کر اَور نیچے اُتر گیا۔

وہ میرے والد سے بولی۔ ''مجھے آپ کا گھر بہت پسند آیا۔ میں نے جو سے اِس کے بارے میں بہت سنا ہے۔''

ایسے سیدھے پن، ایسے اخلاقی وقار کی مجھے قطعاً توقع نہیں تھی اور نہ ہی اتنے بڑے والوو کو اتنی بلندی پر بیٹھ کر بہ آسانی چلانے اور ہماری رَوش کے اچانک اور کڈھب موڑ مڑنے کی۔ برس ہا برس گزرنے کے باوجود بھی وہ لمحہ مجھے آج تک یاد ہے۔ وہ طویل القامت تھی اور حیران کن امر یہ کہ وہ گھٹیا سماجی طبقے کی لگتی تھی نہ سرکاری بستی کی عورتوں کی سی جسامت کی بل کہ اُس کا بدن کسرتی اور چھریرا تھا۔ موٹے کھردرے سیاہ لباس کے تضاد میں اُس کی حسین جلد والے بدن کے نچلے حصے کی ایک جھلک ہمیشہ کے لیے میری یادداشت میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ دائیں ہاتھ کی سریع حرکت سے اُس نے اپنے

پاجامے کا عقبی حصہ یُوں سیدھا کیا کہ پہلے اُسے باہر کی طرف کھینچا، پھر کچھ اُور نیچے کرتے ہوئے اُوپر چڑھایا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس نے کیا کیا ہے۔ لیکن وہ لمحہ ہمیشہ سے میرے ساتھ ہے۔ بعد میں جب ہم اکٹھے ہوتے تو وہی تصور اُس کی فوری طلب کا باعث بن جاتا یا پھر میری ڈھیلی کارکردگی میں برق دوڑا دیتا۔

میں اُنھیں اپنی چیزیں سٹیشن ویگن میں لادتے دیکھتا رہا اور پھر وہ چلی گئیں۔ میں اتنا بدحواس ہوگیا تھا کہ میں نے پُکار کر جو کو بھی بلایا تک نہیں۔ وہ ایسا واقعہ تھا کہ میں ہفتہ بھر تک اُس عورت کے تصور کا اسیر رہا جس کا میں نے چہرہ تک نہیں دیکھا تھا۔

ہفتے کے روز میں نے جو سے پُوچھا کہ میلہ کیسا گُزرا۔ اُس نے بتایا کہ بس گُزر گیا۔ وہ اور میرئین تمام دِن اپنے خوانچے پر (جس کا کرایہ پچیس پاؤنڈ تھا) بیٹھی مکھیاں مارتی رہیں۔ سہ پہر کے اختتام پر کچھ مردوں نے دِلچسپی کا اظہار کیا لیکن وہ بھی صرف اُنھیں ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

میں بولا۔ ''پچھلے اتوار کی صبح جب میرئین یہاں آئی تو میں نے اُسے دیکھا تھا۔''

میں نے کوشش کی کہ میرا لہجہ بے تاثر رہے لیکن جو کے چہرے کے تاثرات نے مجھ پر آشکار کیا کہ میری سعی ناکام رہی تھی۔ اگر عورتیں خُود اُس میں ملوث نہ ہوں تب بھی جنس کے معاملے اُن کی حِس تیز ہوتی ہے۔ اُن کی تمام حِسوں کی اِس طور پر تربیت ہوتی ہے کہ وہ دِلچسپی اور رجحان، مرد کی عدم دِلچسپی کے خاتمے کو آغاز ہی میں بھانپ لیتی ہیں۔

جو کی روشن آنکھوں میں غصّے اور مجرمانہ کیفیت کے سائے لہرائے۔ وہ خُود بھی ایک نئے رُوپ میں ظاہر ہو رہی تھی جو اُس سے ہم آہنگ تھا، جسے اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا تھا۔

میں نے پُوچھا۔ ''میرئین کیا کرتی ہے؟''

''وہ بیرا ک ہے۔ وہ حماموں پر کام کرتی ہے۔ ہمارے قصبے کی مارکیٹ کے بلدیاتی حمام میں۔''

اِس کا مطلب تھا کسرتی بدن۔ میں کبھی بلدیاتی حمام نہیں گیا تھا اور میں نے چشمِ تصور سے ایک بہت بڑے تالاب پر اپنے گرد بیرا کی کا لباس لپیٹے میرئین کو عریاں پیروں اپنے سر سے ایک دوفٹ کی بلندی پر چلتے دیکھا۔ (اگر چہ میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ کسی قسم کا مصنوعی لباس زیبِ تن کیے دھوپ سے دُھندلے پڑے رنگ اور پانی کے چھینٹوں سے خراب اَستر والے کسی کاؤنٹر کے پاس بیٹھی گھٹیا چائے یا کافی پیتے ہوئے رسالہ پڑھ رہی ہوگی)۔

جو جیسے میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولی۔ ''وہ پیاری ہے، ہے نا؟'' اپنی دوست کے لیے ہمیشہ کے مانند فراخ دِل لیکن اب بھی اپنی اُنھی مجرمانہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی جیسے وہ

میرے ساتھ اپنی دوست کی شمولیت والی ہر طرح کی مہم جوئی کے لیے تیار ہو۔ مجھے اُس کے اپنے بستر پر آرام دہ حالت میں اُس کے پھیلے ہوئے کسرتی بدن کا خیال آیا۔ صاف چادر پر کلورین ملے پانی کی مہک دیتا ہوا شفاف بدن اور میں اندر تک جوش سے بھر گیا۔

جو بولی۔ ''اُس نے بھی ہم سب کی طرح بہت سی خطائیں کی ہیں۔''

جو کی زبان ایسی تھی جس میں پرانے زمانے کے عجیب وغریب الفاظ بھرے ہوئے تھے بلا شبہ خطائیں نامناسب لوگوں کی اولاد ہیں۔

وہ بولی۔ ''وہ کسی کے ہمراہ عرصے سے رہ رہی ہے۔''

اُس نے مجھے بتانا شروع کیا کہ اُس شخص نے یہ کیا وہ کیا۔ لیکن میں نے اُسے منع کر دیا۔ مجھے مزید جاننے کی تمنا نہیں تھی۔ میں اُس کی تصویر کشی نہیں چاہتا تھا۔ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

میرا میریَن کا تعاقب، اہانت آمیز ترین واقعہ تھا، جس سے میں نے اپنا کبھی واسطہ پڑنے نہیں دیا اور انجام کار میری یہ دریافت میری توہین میں اضافے کا باعث بنی کہ سرکاری بستی کی میریَن کی ہم عمر عورتیں جنسیت کو بے حد حقیقی فعل خیال کرتی ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت غیر لطیفانہ انداز میں لیتی ہیں یا نہایت سادہ، فطری انداز میں اس طرح لیتی ہیں کہ جیسے آپ خریداری کرنے نکلیں۔۔۔اور اُسی کھیل کود کے جذبے کے ساتھ، جس سے وہ سستے داموں کریانے کی اشیا خریدنے جاتی ہیں (مخصوص شاموں کو جب سپر مارکیٹیں گلنے سڑنے والی چیزوں پر قیمتیں کم کر دیتی ہیں)۔

میریَن نے مجھے، بعد میں بتایا کہ اُس کے علاقے کی جوان عورتیں جمعرات یا جمعہ یا ہفتے کو ایک جتھے کی شکل میں پہلی نظر میں بھا جانے والے مردوں سے مباشرت کے لیے شراب خانوں اور کلبوں کا رُخ کرتی ہیں۔ بھا جانے والا: یہ لفظ تھا۔ ''میں اُسے بھا گئی ہوں۔'' کوئی عورت ایسا مرد نہیں چاہتی تھی جسے وہ بھا جاتی۔ ایسے مواقع طوفاں خیز واقع ہو سکتے تھے۔ بھا جانے والے مرد جنسیت کے بارے میں حقیقت پسند ہوتے اور عورت بہ آسانی چاروں شانے چت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اپنی اُونچی آواز میں معترض ہوتی یا بہت فحش ہوتی تو اُسے 'بیئر شیمپو' دیا جاتا: بیئر کی ایک بوتل اُس کے سر پر خالی کر دی جاتی۔ یہ سب جنسیت کے کھیل کا حصہ تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کی اس نوع کی کلب بازی کرنے والی تقریباً ہر عورت کو کبھی نہ کبھی بیئر شیمپو لینا پڑتا تھا۔ آخرش وہاں سب کے لیے مباشرت موجود تھی، خواہ وہ بھاری پڑتی یا بے لطف ہوتی۔

ایک روز میریَن مجھے اپنی گلی کی ایک عورت کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ آلو کی تلی ہوئی خستہ قاشوں، چاکلیٹ کی تختیوں کا پڑا اور برگر کھایا کرتی تھی اور اچانک ہی موٹی ہو گئی تھی۔ اُس عورت

کے تین مختلف مردوں سے تین بچے تھے اور وہ بھی موٹے ہی تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ پیراک میری‌ئن کی بُری خوراک اور فربہی پر تنقیدی کہانی ہے لیکن میرا خیال غلط تھا۔ میری‌ئن کے علاقے کی اکثر عورتیں فربہ تھیں۔ فربہی بذاتِ خود کوئی کہانی نہیں تھی۔ وہ ایک عورت کی جنسی اشتہا اور جنسی کامیابی کی داستان تھی۔ میں نے دیکھا کہ میں جس اخلاقی لہجے کے بارے میں سوچا کرتا تھا وہ مفقود ہے۔ میری‌ئن چٹخارے دار خورانہ انداز میں محض موٹی عورت کے غلط اندازِ زندگی اور بے ڈھنگے پن کی بات کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''اُس گھر میں جیسے مردوں کا چینی دھوبی گھاٹ کھلا ہے۔ فوراً اندر فوراً باہر۔''

یہ تھا میری‌ئن کا بات کرنے کا انداز، تیز تیز۔ میرے نزدیک اُن سب سے گِل بنتا تھا۔

اگر مجھے میری‌ئن کے پس منظر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوتا تو بھی میں نہیں سمجھتا کہ وہ اُس کے ساتھ، میرے جنسی تعلّقات کی راہ میں مددگار ثابت ہوتا، میں وہ غیر مناسب لفظ نہ برتتا۔ میں شراب خانوں کے روحِ رواں مردوں کا سا رویّہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک عورت کے ساتھ کیسے مذاق کیا یا اُسے 'بیئر شیمپو' دیا جا سکتا ہے۔ میں تو بس اپنی صلاحیتوں ہی کو بروئے کار لاتے ہوئے اُسے مجامعت کے لیے راغب کر سکتا تھا۔ یہ صلاحیتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میری بیوی پر دیتا، اور پر دیتا ہی جیسی دیگر عورتوں کا قول تھا کہ وہ خود ہی مجھ پر سوار ہوتی ہیں۔ اُن کا کھل کر کھیلنے کا جنسی مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے محض اسی بنا پر شادی نہیں کی تھی۔ اُن میں شاید جنسیت ہی داخل ہوئی تھی۔ میں بطور ساتھی یا شوہر کے ٹھیک تھا اور بس۔ اِسی لیے میں نہ تو عورتوں کا متلاشی رہتا تھا اور نہ اُنھیں جیتنے کی سعی کرتا تھا۔ وہ مجھے حاصل تھیں لیکن اب مجھے ادراک ہو رہا تھا کہ میری‌ئن کو مباشرت کے لیے ورغلانے کے لیے میرے پاس صلاحیتوں کا فقدان ہے۔

مرد اُس مرحلے سے زیادہ احمق یا مضحک کبھی نہیں ہوتے جب وہ کسی عورت کو ''پھانس'' رہے ہوتے ہیں۔ عورتیں اِس امر کا خاص طور پر تمسخر اُڑاتی ہیں گو اُنھیں نہ پھانسا جائے تو یہی عورتیں اشتعال انگیزی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ میں نے مضحک پن کو گہرائی تک محسوس کیا اور اگر بُو میری مدد نہ کرتی تو میں اُس سے کبھی نہ نبٹ پاتا۔ اُس نے زمین ہموار کی، بہ الفاظِ دیگر جب، بالآخر میری‌ئن سے میری ملاقات ہوئی تو وہ جانتی تھی کہ مجھے اُس میں دِلچسپی ہے۔ ہم قصبے کے علاحدہ کمروں والے پرانے شراب خانے میں ملے۔ یہ منصوبہ بُو کا تھا کہ وہ اور میری‌ئن ہفتے کی سہ پہر وہاں چائے یا کافی پینے جائیں گی اور میں گھر سے قصبے میں، اُن کے پاس اتفاقاً پہنچوں گا۔ بُو کے بہ قول اُس منصوبے میں سادگی تھی اور میرے بجائے عورتوں کو اُس میں سہولت تھی۔ میں بے حد پریشان ہو رہا تھا، میں نے شاید ہی میری‌ئن کی طرف دیکھا ہو۔

بُو رخصت ہوئی۔ میری‌ئن اندھیرے، نیچے اور تقریباً خالی شراب خانے میں، نیم گرم مشروب

پینے کے لیے ٹھہری رہی ۔ میں نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ درحقیقت جائز مماثلت نے اِس معاملے میں میری مدد کی ۔ اُس کی ہر شے نے مجھے سحر زدہ کر دیا: بالشت بھر کمر، آواز، لہجہ، زبان اور اُس کی تنہائی ۔ جب بھی مجھے حوصلہ گرتا محسوس ہوا میں نے والوو سٹیشن سے اُترتے ہوئے اُس کے موٹے کھردرے پاجامے کا نیچے سرکنا یاد کیا۔ میں نے سوچا کہ اب اس کام کو مزید ایک ہفتے کے لیے ملتوی کرنا مناسب نہیں ۔ میں تحرک ہی نہیں بلکہ حوصلہ بھی کھو بیٹھوں گا اور شاید وہ بھی اپنا ارادہ بدل لے ۔ وہ رات کے کھانے کے لیے ٹھہرنے پر راضی ہو گئی تھی بلکہ درحقیقت یہ لگتا تھا کہ پہلے ہی سے رضامند تھی ۔ جو نے اپنا کام بخوبی سرانجام دیا تھا۔ اِس لیے بہتر تھا کہ میں بھی اپنا کام کروں ۔ میں نے کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اُسے گھر لے جاؤں لیکن مجھے معلوم تھا کہ اُسے وہاں لے جانا خطرے سے خالی نہیں ۔ میرے والد اگرچہ ضعیف ہو چکے تھے لیکن اب بھی اُن کی ہوشیاری عجب تھی ۔ لہٰذا رات کھانا بھی بس کھانا ہی رہا۔ اُس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوا ۔ یوں کہہ لیجیے کہ میرے اور میریَن کے مابین ایک نوع کا عشق تھا۔ ہم نے مقامی بنی ہوئی شراب پی، جو اُسے بہت پسند آئی ۔ ہم نے اگلے روز دوپہر کے کھانے پر ملنا طے کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جو نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے، اُس کے لیے ۔ اُس پر خزانے نچھاور کر دوں ۔

اگلے دِن میں نے سرائے میں کمرہ کرائے پر لیا۔ میری رات مشتاق تھی تو صبح مایوس ۔ میں نے خود کو گر یدا کہ کیا کبھی میں نے اتنا مضطرب وقت گزارا ہے، اِس قدر اشتیاق، بے اعتمادی سے بھرا، لیکن مجھے یاد نہیں آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہر شے کا انحصار محض اُس عورت کو راغب کرنے اور بستر پر لے جانے میں ہے ۔ دیگر تشویش ناک مراحل میں آدمی جانتا ہے کہ وہ کس قابل ہے، کیا کر سکتا ہے اور معاملات کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں لیکن اُس رضا اور رغبت کے لیے تیار کرنے کے کاروبار کا، مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ایک مکمل جوا تھا۔ ہر شے دُوسرے فریق پر منحصر ہوتی ہے۔ بعد میں جب مجھے میریَن کے مزید اطوار اور اُس کے دوستوں کے بارے میں پتا چلا تو مجھے اپنی یہ بے قراری نہایت فضول اور قابلِ رحم لگی لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ اگر میں وہ اطوار جانتا ہوتا، تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا ۔

طویل شب کا اختتام ہوا، دوپہر کا کھانا آیا، جس کے بعد ہم مخصوص کرائے گئے عجیب و غریب اندھیرے اور دیمک زدہ فرنیچر والے کمرے میں چلے گئے ۔ ایسے ماحول میں ایک اجنبی سے لپٹنا کتنا خوف ناک ہے ۔ میریَن مجھے دُور رکھنے میں لچک دار دِکھائی دیتی تھی اور میں مطمئن ہو گیا۔ ہم بے لباس ہو گئے ۔ میں نے اپنا لباس یُوں اُتارا، جیسے میں ڈاکٹر کے پاس اپنی خارش کا معائنہ کروانے آیا ہوں ۔ پہلے جیکٹ، پھر پاجامہ، زیریں جامے اور قمیص سب کچھ صاف ستھرے انداز میں کرسی پر رکھا۔

میریَن کی بغلیں ریشمی بالوں سے سیاہ پڑی ہوئی تھیں ۔

میں نے کہا۔"تو تم اِنھیں صاف نہیں کرتیں؟"

"کچھ عرصہ پہلے کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نہ کروں۔ کچھ لوگ اِنھیں گھناؤنا سمجھتے ہیں۔ وہ اِنھیں دیکھ کر عجیب عجیب مُنھ بناتے ہیں۔"

"مجھے ان سے پیار ہے۔"

اُس نے مجھے، اُنھیں چھیڑنے اور اُن کا ریشم پن محسوس کرنے دیا۔ میں نہایت پُر جوش ہوگیا اور اُس کی قربت کے اپنے قائم کیے ہوئے دیگر تصورات کو عملی صُورت دینے لگا۔ میں اپنے عام دوران میں ہے کی نسبت جلد فارغ ہوگیا۔ وہ سرد تھی۔ کافی دیر تک وہ بائیں کروٹ پڑی رہی۔ اُس کے گو۔ لبے اُٹھے ہوئے، کمر دھنسی ہوئی، دایاں پہلو ہموار، کسرتی اور مضبوط تھا۔ اُس کے بائیں بازو نے، اُس کے چھوٹے چھوٹے پستانوں کو قدرے ڈھانپ رکھا تھا۔ پستانوں کو ڈھانپنے والے ہاتھ کی دویا تین اُنگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں: سابقہ عاشقوں کے دیے ہوئے تحفے، میں نے سوچا لیکن پھر میں نے اُن کی طرف سے اپنا ذہن ہٹا لیا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے، سرد لہجے میں کہنے لگی۔"کیا تم میرے ساتھ لواطت نہیں کرو گے؟"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

وہ بولی۔"میرا خیال تھا کہ تم یہ کرو گے۔"

مجھے اب بھی نہیں معلوم تھا کہ کیا کہوں۔

اُس نے پُوچھا۔"کیا تم آکسفورڈ یا کیمبرج گئے تھے؟" وہ جھنجھلاہٹ کے تاَثرات لیے بہ آسانی اپنے بیگ تک گئی جیسے وہ جانتی ہو کہ وہ کہاں پڑا ہے اور اُس نے ہونٹوں کو تر کرنے والی ٹیوب نکالی۔

میں ہچکچایا۔ اُس نے تر کرنے والی ٹیوب مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔"یہ میں تمھارے لیے نہیں کر رہی ہوں۔ لو کرو۔"

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک عریاں اور بے لباس عورت کے لیے اِتنا تحکمانہ ہونا ممکن ہے۔

اُس نے حکم صادر کیا۔ میں نے تعمیل کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کتنا اچھا کیا، نہ ہی اُس نے مجھے بتایا۔

جب ہم نے دوبارہ لباس پہن لیا، اُس نے کم و بیش مکمل اور میں نے جزوی، تو دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ مجھے یہ بات بہت دیر سے اب یاد آئی کہ اپنے اضطراب کے باعث مَیں "خالی نہیں ہے"

والی بتّی روشن کرنا بھول گیا تھا۔

وہ بوکھلاہٹ کا شکار لگ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''تم غسل خانے میں جاؤ۔'' اُس نے پکار کر باہر والے شخص کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور پھر میرے تمام کپڑے غسل خانے میں پھینکنے لگی۔ جیکٹ، جُوتے، اُسے جو چیز بھی نظر آئی۔ جیسے وہ چاہتی ہو کہ اُس کمرے میں میری کوئی نشانی باقی نہ رہے۔

وہ کوئی کمروں کی ملازمہ تھی، جو محض کسی قسم کا جائزہ لینے آئی تھی۔

میں تنگ غسل خانے میں یُوں کھڑا تھا جیسے کوئی مسخروں والا نقاب چڑھائے کھڑا ہو۔

تاہم مَیں بعد میں میر-یَن کے روّیے کی کھوج لگانے پر زیادہ متردّد تھا۔ شاید وہ ذرّہ برابر حیایا اخلاق تھا، جو اُس کے اختیار سے باہر تھا۔ شاید اِس کا سبب یہ تھا کہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں تھا، جو اُس آبادی کی عورتوں کو بیئر کا شیمپو دیتے ہیں۔ اِس لیے نئے قواعد وضوابط، نئی اخلاقیات کا اطلاق ہوتا تھا اور شاید نئے احساسات بھی درکار تھے۔

اُس نے کبھی وضاحت نہیں کی اور جب میں نے کہا کہ ہفتہ وار تعطیل کو لندن سے واپسی پر ہم مل سکتے ہیں تو اُس نے کہا: ہاں، اور پھر اُمید وبیم بھرے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''دیکھیں گے۔''

میں نے اُس کے لیے ایک زیور خریدا، جس پر اوپل جڑا تھا۔ اُس کی قیمت چند سو پاؤنڈ تھی۔ میں اُس کے لیے کوئی اچھی چیز خریدنا چاہتا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ وہ اُسے اپنی دوستوں کو دکھائے گی اور اُن میں سے شاید ایک جو بھی ہو، جو اُسے کہہ سکتی ہے کہ ہم اُسے مقامی جوہری ٹریتھووانس کے پاس اُس کی قیمت معلوم کرنے لے جائیں۔ میں دیانت داری سے تمام وقت یہی سوچتا رہا: اوپل زیادہ قیمتی پتھر نہیں ہے۔

اُس جمعے کی شام، جب میں نے اُسے وہ دیا تو وہ مسرور ہوگئی۔ وہ اُسے ہاتھ میں تھام کر اُس کی نیلی روشنی، چمک دمک اور پتھر میں غیر مختتم نُھا سا طوفان دیکھتی رہی۔ گو اُس کی اپنی آنکھیں دمک رہی تھیں لیکن وہ بولی۔ ''کہا جاتا ہے کہ اوپل بدقسمتی کی علامت ہوتا ہے۔''

میں نے ہفتہ وار تعطیل کے دِنوں کے لیے ہوٹل میں کمرہ محفوظ کروا لیا۔ جہاں کا عملہ ہسپانوی، پرتگالیوں اور کولمبویوں پر مشتمل تھا۔ کولمبوی اگر چہ کم تعداد میں تھے لیکن وہ ہمارے شہروں کے بازاروں میں گھس بیٹھے تھے اور محض محنت مزدوری سے ہٹ کر ہماری کچھ مقامی ضروریات بھی پُوری کرنے لگے تھے۔ وہ جذباتی طور پر زمینی اور بے حد تحمّل والے لوگ تھے۔ اُنھوں نے اور دُوسرے عملے نے میرے اور میر-یَن کے ساتھ پُرانے دوستوں کا سا سلوک کیا۔ اِس سے ہمارے اپنے نئے انتظام سے متعلّق خدشات رفع ہو گئے۔

درحقیقت ہوٹل میں سب کچھ یُوں حیرت انگیز تھا جیسے ہم غیر ملک میں تعطیلات گزارنے

آئے ہوں کیوں کہ وہاں کی ہر شے اپنے ہی شہر میں ہوتے ہوئے بھی اجنبی اور دلچسپ تھی۔ میرے والد کے گھر سے محض چند میل کے فاصلے پر شراب خانے، کھانے کے کمرے اور خواب گاہ کی زندگی اور بدیسی زبانیں، اور پھلا پھولا چمنستان، جو میرے لیے بہت عرصے تک اُداس مقام رہا تھا، بدنُما چھتیں اور میلے شیشوں کے عقب میں دھندلاتی تصویریں، ایک ایسی جگہ، جہاں زندگی بلا تردد بتائی جا سکتی تھی۔

میں میریَن کے ساتھ دوبارہ ملاقات کے لیے ہفتہ بھر مشتاق رہا تھا، تقریباً اُتنا ہی، جتنا میں پہلی ملاقات کے لیے مشتاق تھا۔ ہوٹل کے بروشر کے دعوے کے مطابق "کھلے شہتیروں کا خزینہ" میں، مَیں وقت سے پہلے پہنچ کر ایک نیچی چھت والی نشست گاہ میں بیٹھ گیا اور سامنے مارکیٹ کے چوک کی طرف دیکھنے لگا، جہاں ایک کونے کے پیچھے چھپے ہوئے ٹیکسی اور بس دونوں کے اڈّے تھے۔ جب وہ آئی تو شان دار لگ رہی تھی۔ پاجامے کا کھلا آسن اُسے نہایت متاثر کن بنا رہا تھا۔ اُس کی چال سبک اور چست تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ شاید میں اُس عالی شان عورت سے نپٹ نہ پاؤں۔ لیکن جب میں اُسے ہوٹل کی سمت آتے دیکھتا رہا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ پاجاما خاص طور پر اُسی موقع کے لیے خریدا گیا ہے۔ وسطی حصے میں استری یا پرخَت کا نشان پڑا ہوا تھا جو دکان ہی پر پڑا ہوگا کہ اُسے تہہ کر کے پتلے کاغذ میں لپیٹ کر ڈبّے یا تھیلے میں رکھا گیا تھا۔ مجھے اُس کی کوشش اور تیاری نے متاثر کیا۔ اِس سے مجھے قدرے سکون بھی ملا۔ بااِیں ہمہ اِس سے مجھ میں خجالت اور دَرپیش مقابلے کے احساسات بھی اُبھرے۔ تو گویا یوں اب میں آغاز کی نسبت زیادہ ہیجان کا شکار ہو گیا تھا۔

خواب گاہ کے المیے جیسا کوئی المیہ نہیں ہے۔ مجھے ٹالسٹائی کی اُس بات پر یقین ہے، جو اُس نے اپنے ایک دوست سے کہی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُس کا منشا کیا تھا۔ بار بار پیش آنے والی شرم ناک ضرورت؟ ناکامی؟ کم زور کارکردگی؟ ردّیت؟ خاموش مذمت؟ اُس روز رات گئے میرے ساتھ بھی تقریباً یہی کچھ ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنے احساسات کا اثر میریَن پر مارکیٹ کے چوک والے ہوٹل کی تعیّشات سے ڈالا ہے کہ وہ اپنے بدیسی عملے اور کہیں بدیس میں واقع ہونے کے احساس سے عجیب وغریب احساس پیدا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کھانے پر شراب نے اِس احساس کو تقویت دی۔ لیکن اِس احساس کا گہرا اَور دُور رَس کار رُجحانِ طبیعت بستر پر جانے کے لمحے لوٹا۔ اب وہ کوئی اَور ہی شخصیت تھی، جس نے اوّلیں قبول اور مسرت کا اظہار کیا تھا۔

اُس نے پیرہن اُتارا اَور خود سپردگی دے دی اور بعد میں، اُس نے پہلے ہی کے مانند اپنی نمائش کی: پتلی کمر، اُٹھے ہوئے کولہوں کے دِلکش اُبھار، سیاہی مائل دہانہ، بغلوں سے جھانکتے بال۔ اب کی بار، میں وہ کچھ بہتر طور پر کرنے کے لیے تیار تھا جو وہ مجھ سے کروانے کی واضح تمنائی تھی۔

لیکن میں نہیں جانتا تھا آیا وہ مجھ سے تلذّذ حاصل کر پا رہی ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ

مجھے تو لذت حاصل ہو رہی تھی لیکن اُس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شاید وہ اداکاری کر رہی تھی یا شاید اُس کا انداز ہی ایسا تھا۔ شاید اُس نے اپنے دونوں میں سے ایک شیخی خورے دوست سے یہی سیکھا تھا یا اُس کا سبب یہ تھا کہ سرکاری آبادی میں اُس کے ناہموار بچپن کے دوران میں اُسے اِس کام پر مجبور کیا گیا تھا،فطری حیا کی ہلکی سی جھلک ،زندگی بسر کرنے کا ایک طور۔

اور— چوں کہ دماغ بہ یک وقت بہت سی چیزوں سے نپٹ سکتا ہے — جب میں خواہش کے ہاتھوں مکمل طور پر بے دست وپا ہو چکا تو بہ مشکل یہ یقین کرتے ہوئے کہ مجھے کیا پیش کیا جا رہا ہے اور اُسی لمحے یہ خواہش کرتے ہوئے کہ وقت کو وہیں تھام دوں، میں نے اپنے آپ کو یہی تو جیہہ پیش کی۔

بعد میں جب اِس خوف ناک احساس کے بوجھ تلے بہت دب گیا تو مجھے لگنے لگا کہ ابتدائی ایام میں میری کارکردگی بہتر نہیں تھی۔ اگر مجھے اُسی وقت معلوم ہو جاتا ،تو یہ چیز مجھے تباہ کر ڈالتی لیکن اُس وقت ہوٹل کے غسل خانے میں مجھے اس کا ادراک نہیں تھا۔

آدھی رات گزرنے پر وہ بولی۔ ''تم اپنے بیلٹ سمیت آئے ہو۔ کیا مجھے پیٹنا چاہتے ہو؟''

میں کسی حد تک اُس کا منشا بھانپ گیا تھا لیکن پھر بھی اُس کی بات میری فہم سے بہت دُور تھی۔ میں کچھ نہیں بولا۔

اُس نے کہا۔''بیلٹ استعمال کرو۔کسی اَور شے کو استعمال مت کرنا۔''

جب ہم یہ کر چکے تو وہ بولی۔''کیا میرا نچلا حصّہ سیاہ اور نیلا ہے؟''

وہ ایسا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کئی ہفتوں بعد اُس کی رنگت ایسی پڑ گئی ہو لیکن اُس وقت نہیں تھی۔

وہ بولی۔''تمھیں اِس میں زیادہ لطف نہیں آیا؟''

مجھے نہیں آیا تھا لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔

اُس نے کہا۔''میرے پاس تمھارا نمبر تھا۔''اور اپنی مضبوط ٹانگیں بستر سے لٹکا کر ہلانے لگی۔

تو بالآخر جب ہم یہ سب کر چکے تو وہ پرے ہٹ گئی۔ میں نے سوچا کہ خواب گاہ کے اِلیے کے دوران میں یہ اُس کے رویے کا اجمالی نقطہ ہے اور اُس کا یہ رویہ مجھے پسند آیا۔ میں نے اُسے بہ خوشی یہ فاصلہ قائم رکھنے دیا۔ اگر میں یہ نہ کرنے دیتا تو اِس سے ایک اَور رشتہ قائم ہو جاتا اور سادہ سی بات ہے کہ یہ ممکن نہیں تھا۔ خواب گاہ اور اُس کی گہری ہوتی کیفیت سے ہٹ کر ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے بہت کم باتیں تھیں۔

اُس نے کچھ پڑھا ہوا تھا۔ کوئی جنت والی کتاب یا کتابچہ، یا پھر اُس کی اپنی کسی دوست عورت سے بات چیت ہوئی تھی، جس سے اُس نے اپنے طور پر، میری خاص ضرورت کا خیال اخذ کیا تھا، جسے اُس نے میرا ''نمبر'' کہا تھا۔ وہ صرف ایک چوتھائی درست تھی۔ میرا اپنے بارے میں ہمیشہ گمان رہا

تھا کہ میں جنسی طور پر ایک کمزور شخص ہوں۔ یہ گمان میرے کردار کا حصہ بن گیا تھا۔ اِس نے میرے لیے چیزیں آسان کر دی تھیں۔ ایک ایسی عورت کے ساتھ صحبت، جس کے سامنے میں اس حد تک عریاں ہو جاؤں، میرے لیے ناپسندیدہ تھا۔ کچھ لوگ اصرار کریں گے کہ اگر میں ایسا نہیں ہوں تو ویسا ہوں۔ اُنھیں یقین ہوگا کہ میں مردوں میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ حقیقت اس کے بھی برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ہمہ قسم کی جنسی قربت ناپسند ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی جنسی کمزوری کو ایک نوع کی آزادی تصور کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ جیسے بہت سے لوگ ہوں گے — رسکن، ہنری جیمز۔ اُن کی مثالیں عجیب ہیں لیکن فوری طور پر وہی ذہن میں آتے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری آزادی کی نعمت رہنے دی جائے۔

اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں، پہلی بار، میں نے شہوانی تصویروں والا رسالہ دیکھا۔ مجھے جھٹکا سا لگا اور میں ہراساں ہوگیا۔ وہ رسائل اخبار فروش کی دُکانوں پر سال ہا سال سے موجود تھے، تمام کے تمام کم وبیش ایسے ہی سرورق والے، لیکن میں نے کبھی اُن پر نظر تک ڈالنے کا نہیں سوچا تھا۔ یہ واقعی سچ ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد میں نے بے شمار زیادہ فحش رسائل دیکھے۔ اُنھوں نے مجھے احساس دِلایا کہ ہم سب جنسی محسوسات کی اُن قابلِ نفرین وسعتوں میں ماہر ہو سکتے ہیں۔ محض چند ایک جنسی افعال بے ساختہ ہوتے ہیں۔ دیگر ہر فعل سیکھنا پڑتا ہے۔ ہم سب تربیت لے سکتے ہیں۔ بنا تربیت کے ہمیں مخصوص افعال کے بارے میں قطعاً علم نہیں ہو سکتا۔ میں نے تربیت نہ لینے کو ترجیح دی۔

مجھے یقین ہے کہ میریَن نے میرے اندر یہ تمام لاعلمی دیکھ لی تھی۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ مجھے خول سے نکالے، اپنے محدود علم کی حد تک، جس حد تک اُسے تربیت دی گئی تھی اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔

میں بتا چکا ہوں کہ خواب گاہ سے باہر میرے میریَن کے درمیان کچھ نہیں تھا لیکن میں اِس پر متحیر تھا۔ میریَن کو جان لینے کے بعد میرے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ اُسی خاص طریقے سے میں دیگر عورتوں کو بھی جانوں اور میں متحیر تھا کہ کیا اُسے محبت کی ایک قسم نہیں کہا جا سکتا: باقی سب پر صرف ایک فرد کو جنسی ترجیح۔

میں زندگی کے نئے ڈھب میں ڈھل گیا۔ ہفتے کے کام کے ایام لندن اور ہفتہ وار تعطیل کے دِن گاؤں میں میریَن کے ہمراہ۔ اگرچہ اُس کے خواب گاہی مزاج میں ہمیشہ سرد مہری اور فاصلہ رہتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میری یہ پریشانی بھی ختم ہوگئی۔ جتنا میں اُس سے آگاہ ہوتا گیا اُتنا ہی میں جنسی طور پر اُس کے ساتھ دھنستا چلا گیا۔ میں نے اُن ہفتہ وار تعطیلات کے دوران میں اُسے کبھی ضائع نہیں کرنا چاہا، یُوں کہہ لیجیے: میں اُس کے ساتھ کبھی کاہل نہیں رہا۔ اتوار کی صبح میں ہمیشہ تقریباً نڈھال ہو جاتا۔ تب میں اُس سے آزادی اور، واپس لندن کے راستے پر ہونے کی تمنا کرتا۔ اتوار کی شام میں میرے

لیے ہفتے بھر کا بہترین وقت ہوتیں، پُرلطف آرام اور تنہائی اور یادوں کا وقت جب شہوانی نڈھالی اور سکون دھیرے دھیرے خُوش گمانی کے عام احساس میں تبدیل ہوتا اور میں اگلے ہفتے کے لیے تیار ہو جاتا۔ جمعرات تک میں پھر ہمت ہار بیٹھتا، میرا دماغ ایک بار پھر میریَن کی شبیہوں سے بھر جاتا اور جمعہ کی سہ پہر میں اُس کے پاس لوٹنے کا شدید تمنائی ہو جاتا۔ اس طرح یہ خواہش کو زندہ رکھنے کے لیے بھرپور علاحدگی والا ایک مکمل تعلق تھا۔

ایک مخصوص علاقے تک محدود رہتے ہوئے ہم نے چند ایک بار ہوٹل تبدیل کیے۔ میری ہمیشہ خواہش رہی کہ جب تک میرے والد زندہ ہیں، میں گھر کی رسائی میں رہوں۔ شروع میں ہوٹلوں کی یہ تبدیلی میریَن کو، اُس کی دوستوں یا عزیز و اقارب کے پہچاننے سے بچانے کے لیے تھی۔ بعد میں اُس کی بڑی وجہ تنوع بن گئی: نئے کمرے، نیا عملہ، نیا لاؤنج اور شراب خانہ، کھانے کا نیا کمرہ۔ ایک بار ہم نے کسی چھوٹے اور دُور دراز قصبے میں کوئی فلیٹ یا گھر خریدنے کے بارے میں بھی سوچا اور اس خیال نے ہمیں مہینوں تک پُرجوش رکھا لیکن جوں جوں ہم نے گھر رکھنے کے خیال کی تفصیلات پر غور کیا تو یہ ہم دونوں کے لیے پریشانی ہی پریشانی بنتا چلا گیا۔

گھر والی تعطیلات میں قطعاً نہیں چاہتا تھا۔ اِس سے میریَن کے خاندان کی سمت سامنے آتی جس کی طرف سے، میں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ خاندان کی سمت ہمیشہ پس منظر میں رہی تھی: بعض اوقات میں محسوس کرتا کہ خاندانی مسائل میریَن پر دباؤ ڈال رہے ہیں لیکن میں کبھی اُنھیں جاننے کی کوشش نہ کرتا۔ زیادہ آگاہی اور ہر روز میریَن کو سرکاری آبادی والی ایک بیوی کے رُوپ میں دیکھنے کا تصوراُس سحر کے ختم ہونے کی بنا پر دم توڑ دیتا جو مجھے اُس کے لاپروایانہ اور ٹوٹے پھوٹے تلفظ سے حاصل تھا، ہر کام اُس کے پیراکانہ بدن کی شفاف بُو سے بہت عجب طور پر وقوع پذیر ہوتا تھا۔ لیکن گھر کے خیال نے اُسے ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا اور بالآخر ہر جانے کے طور پر مجھے اُسے سرکاری آبادی والا مکان خرید کر دینا ہی پڑا۔ حال ہی میں قانون تبدیل ہوا تھا کہ سرکاری آبادی والے اپنے گھر خرید سکتے ہیں۔ مجھے میریَن پر ہفتہ وار کچھ نہیں خرچنا پڑتا تھا لیکن بلدیہ نے اُس کے گھر کی قیمت معقول سے بھی زیادہ وصول کر لی تھی۔

جس طرح لوگ — مثلاً میرے والد جیسے لوگ — جنگ یا حملے جیسی پیش کی گئی ایسی صورتِ حال کے بتدریج عادی ہو سکتے ہیں جو اُن کی زندگی کا دھارا بدل دے، جس میں ہر معلوم روزمرہ شے زیرِ تلیں ہو یا کچھ چیزیں تباہ و برباد ہو جائیں، تو میں اپنی نئی سماجی صُورتِ حال میں آگے بڑھتا چلا گیا: ایک ایسی عورت کے ساتھ ہفتہ وار تعطیل گزارنے کی شدید تمنا، جس سے میں کوئی حقیقی گفتگو نہیں کر سکتا تھا، جس کو مجھے ''پیک کروا کے لایا ہوا کھانا'' سمجھنے کی کوئی خواہش تھی نہ کسی اور کو پیش کرنے کی۔

اور پھر میں نے ایک ادبی دریافت کی۔ میں نے عہدِ وکٹوریا کے رسائل سے، اے۔ جے مُن بائی کا ایک انتخاب پڑھا اور مجھے ایک دوست مل گیا۔

مُن بائی ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔ اِس وہ تالسٹائی کا ٹھیک ہم عصر تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، سہل وکٹوریائی طرز کا عمدہ اور قوی لکھاری اور اپنے زمانے کی دانش ورانہ اور فن کارانہ زندگی میں اندر تک اُترا ہوا شخص تھا۔ وہ بہت سے بڑے ناموں کا شناسا تھا۔ کچھ کو تو اُس نے، جیسے کہ رُسکن اور ولیم موریس، اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب وہ نوجوان تھا تو ڈکنز کو سرِ راہ سلام کر سکتا تھا اور پھر وہ اپنے مضمون میں چند الفاظ میں پچاس سالہ مصنف کی جسمانی دِکھاوٹ لکھ سکتا تھا: اپنے لباس اور ظاہری حالت کی خُوب دیکھ بھال کرنے والا تھوڑا سا اداکار، اپنے چھریرے بدن پر نازاں، پیشانی پر ذرا سا جھکا ہوا ہیٹ۔

لیکن مُن بائی بھی۔ رُسکن اور ڈکنز کے مانند۔ ایک جنسی اُسرار تھا۔ وہ کارکن عورتوں کا خُوب دِلدادہ تھا۔ وہ اُن عورتوں کو پسند کرتا تھا، جن کے ہاتھ واقعی غلیظ ہوتے تھے۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے ملازم عورتوں کو دیکھنا پسند ہے جب اُن کے ہاتھوں اور چہرے پر کلونس اور زرا کھجی ہو۔ اور آج یہ بات ہمارے لیے کس قدر باعثِ حیرت ہے کہ اُس زمانے کے کتنے غلیظ کام، آتش دانوں کی صفائی وغیرہم، عورتیں آلات کے بغیر محض اپنے ننگے اور بےڈھپے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ جب اُن ہاتھوں کو دھولیا جاتا تو بھی وہ کھردرے، موٹے اور سُرخ دِکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کے ہاتھ سپید اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ مُن بائی کی ترجیح، نشست گاہوں سے ہٹ کر، وہی سُرخ ہاتھ تھے جو اگر اُس زمانے کے رواج کے مطابق کہنیوں تک لمبے دستانوں سے ڈھانپے نہ ہوتے تو اُس کے نوکرانی ہونے کو ظاہر کر دیتے۔

مُن بائی نے ایسی بہت سی عورتوں سے سڑکوں پر بات چیت کی۔ اُس نے اُن کے خاکے بنائے۔ اُس کے پاس اُن کے کھنچے ہوئے فوٹو تھے۔ فوٹوگرافی اُس کا پہلا شوق تھا۔ وہ کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والی خواتین کی اُن کے موٹے، بھدّے اور خُوب داغ دھبے لگے پاجاموں میں تصویریں بناتا جن میں بعض اوقات اُن کی ٹانگیں ضرب کے نشان کی طرح ایک دُوسرے کو کاٹ رہی ہوتیں، وہ اپنے بیلچوں پر جھکیں سخت اور پریشان نگاہوں سے فوٹوگرافر کو دیکھ رہی ہوتیں۔ اِکا دُکا ہی اپنی غلیظ حالت کے باوجود مُسکرانے کا حوصلہ کر پاتیں۔ گو مُن بائی کے لیے اُن میں کوئی نہ کوئی جنسی جذبات اُبھارنے والی شے ہوتی تاہم اُن تصاویر اور خاکوں میں کوئی چیز فحش نہ ہوتی۔

زندگی کے بیشتر حصّے میں اُس کا اپنی گھریلو ملازمہ سے خفیہ تعلّق رہا۔ وہ طویل القامت، ہٹّی کٹّی اور گلی کے بہت سے لوگوں سے دو ہاتھ اُونچی تھی۔ مُن بائی لمبی چوڑی اور طاقت وَر عورتیں پسند کرتا تھا۔ اپنی اِس مستقل دوست عورت کا دُوسرے گھروں میں کام کرنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ اگر چہ بعض اوقات

اُس نے اپنے آجروں کے بے رحمانہ روّیے کی شکایت بھی کی تھی لیکن وہ اُسے نجات دِلانے کی قطعاً خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اُس کی جنسی جبلّت کو سمجھ چکی تھی اور اُس پر ناراض نہیں ہوتی تھی۔ مُن بائی سے ملاقات سے قبل اُس نے ایک شریف آدمی کے محبوب یا شوہر ہونے کا خواب دیکھا تھا۔ کبھی کبھار، آغازِ تعلّق میں شاذ و نادر، وہ ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے بھی رہے تھے۔ پھر جب ملاقاتی آتے تو عورت کو بیٹھک کی کُرسی سے اُٹھنا اور اپنا ملازمہ ہونے کا تاثر دینا پڑتا۔ جریدے میں اُن کے جنسی تعلّقات کا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ شاید یہ وکٹوریائی عہد کی عیب چھپانے کی روایت کی پاسداری ہو۔

مُن بائی جیسے ذوق کے حامل شخص کے لیے وکٹوریائی عہد کا لندن انگیخت سے بھرا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر بلومز بری چوک پر شام چھے بجے ارضی منزل کی ہر روشن کھڑکی کو دیکھنے پر کتنی مسرت حاصل ہوتی تھی جہاں ہر کھڑکی سے ایک خاص خزانے کی نمائش ہو رہی ہوتی تھی: ہر ایک میں ایک ملازمہ بیٹھی بلاوے کی منتظر ہوتی تھی اور بالکل اِسی طرح مُن بائی کے جریدے میں لندن کی ملازم پیشہ زندگی کا احاطہ کرتا ہوا ایک احساس ہے جو مُن بائی کے لیے بہ یک وقت تکلیف دہ اور باعثِ مسرت تھا اور ایسا ہی میرے لیے بھی میریّن کا معاملہ تھا۔ اگر چہ میں نے اِس طرف سے اپنے ذہن کے دروازے بند کر لیے ہیں کہ جب وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی تو کیا کرتی ہے لیکن سرکاری بستی کی زندگی کے، جنھیں حقیقتاً میں کبھی نہیں جان پایا، ایسے دہشت ناک اور بہیمانہ ٹکڑے خیال میں آتے ہیں جو کچھ وقت کے بعد مکمل تصویر کی صُورت اختیار کر جاتے ہیں۔

ہفتہ بھر میریّن اپنے سرکاری گھر میں اپنی ''خطاؤں'' کے ساتھ رہتی ہے جن کے بارے میں جو نے مجھے آغاز ہی میں بتا دیا تھا۔ خطائیں دو تھیں: دو مختلف مردوں کے دو بچے۔ مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ پہلا بچہ اُن مردوں میں سے ایک 'معلون'' کا تھا۔ یہ میریّن کا ایک لفظ تھا: وہ اِسے تقریباً ایک تکنیک، تقریباً ایک پیشے کی طرح ادا کرتی تھی جیسے سوشل سیکورٹی یا حکومت کے دیگر فارموں میں درج کیا جاتا ہے۔ پیشہ: معلون۔ معلون سیاہ بالوں والا تھا۔ بال اہم تھے: میریّن نے اُن کا تذکرہ ایک سے زائد بار کیا تھا گویا وہ ہر شے کی صراحت کر رہے ہوں۔

میریّن بذاتِ خود اُن چار خطاؤں میں سے ایک تھی جو اُس کی ماں نے تین مختلف مردوں کے ہمراہ سرانجام دی تھیں۔ اُن چار خطاؤں کے بعد میریّن کی ماں، جو ابھی بیس کے پیٹے میں تھی، ایک ایسے مرد سے ملی، جس کی چاہت میں وہ گرفتار ہو گئی۔ وہ زندگی بھر سے اُسی کی منتظر تھی۔ محبت: یہی اُس کی منزل تھی۔ وہ ذرا بھی نہیں ہچکچائی۔ اُس نے چاروں خطاؤں کو چھوڑا اور اُس مرد کے ہمراہ سرکاری آبادی ہی کے ایک دُوسرے گھر میں چلی گئی۔ حکام کے لیے کچھ مسئلہ پیدا ہو گیا کیوں کہ میریّن کی ماں اُن چاروں خطاؤں سے ملنے والے فوائد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کسی نہ کسی طور معاملہ سیدھا کیا گیا اور میریّن

کی ماں اُس وقت تک اُس مرد کے ساتھ رہی جب تک وہ اُس سے اُکتا کر کسی اَور کے ساتھ بھاگ نہیں گیا۔ وہاں زندگی کے یہی طور تھے۔

اِس قسم کے واقعات کہیں بھی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں لیکن میرے لیے باعثِ دلچسپی امر یہ تھا کہ کسی بھی مرحلے پر حکام میں سے کسی نے بھی میر یٔن کی ماں سے تقاضا نہیں کیا کہ وہ اپنے فیصلوں کے مادی یا مالی نتائج خُود بھگتے۔ اُسے ہمیشہ ایک سرکاری گھر اور کسی نہ کسی نوع کا فائدہ میسر رہا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر یٔن کی ماں کا ہر عمل اُس کے لیے ایک سرکاری انعام لے کر آیا۔ جنھیں بھگتنا پڑا وہ تو بچے تھے؛ خطائیں۔ اور میرے خیال میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھیں بھی کسی خاص طریقے سے سزا نہیں دی جا رہی تھی بل کہ اُنھیں تو صرف سرکاری بستی کی زندگی کے لیے تربیت مہیا کی جا رہی تھی۔ جس طرح کی میر یٔن کی بے چاری ماں نے زندگی بسر کرنے کی تربیت اپنے بچپن میں دُوسرے لوگوں سے حاصل کی تھی۔

میر یٔن اور دُوسری خطاؤں کو ''دیکھ بھال'' میں لے لیا گیا۔ ایک خطرناک تکنیکی لفظ، اور یہ میر یٔن کے بچپن کا نہایت خطرناک حصہ تھا۔ وہ مار پیٹ، جنسی طور پر ہراساں کرنے اور بار بار نا امیدانہ فرار کی داستان تھی۔ کسی نہ کسی طور بچے نے برداشت کیا اور حکومتی کارخانے میں بسر کی۔ وہ مختلف اصلاحی سکولوں میں گئی۔ اُنھی میں سے ایک میں نے اُس نے پیراکی سیکھی، جو اُس کی زندگی کی سب سے بڑی چیز بن گئی اور اِسی دوران میں ایسے دِن بھی آئے، جب میر یٔن، اپنی ماں کو گاڑی میں جاتے اور اپنی ایک اَور ہی زندگی گزارتے دیکھا۔

جب وہ زندگی انجام کو پہنچی تو اُس کی ماں ایک بار پھر نمودار ہوئی اور ایک اَور سرکاری گھر میں ایک خاندان کی سی زندگی قائم ہوئی۔ زندگی کے اُس حصے میں اُن کی ماں میر یٔن و دیگران کو سپر مارکیٹوں اور مقامی سٹوروں سے چیزیں اُٹھانے کے لیے لے جاتی۔ وہ نہایت کمال سے کام دِکھاتے۔ کبھی کبھار پکڑے بھی جاتے لیکن تب میر یٔن اور دُوسری خطائیں وہی کرتے جو اُنھیں ایسے موقعوں پر کرنے کے لیے بتایا گیا تھا: وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے اور اُنھیں ہمیشہ چھوڑ دیا جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مہم جوئیاں بند ہوتی چلی گئیں۔

ہر ایک کی، جن سے سرکاری بستی میں میر یٔن شناسا تھی، اپنی زندگی تھی جس پر اُس کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا۔

اُس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں آگاہی پانے کے بعد، میں اُس کے خواب گاہ میں روّیے کو سمجھنے لگا تھا: مردہ نگاہیں، غائب دماغی۔ اور تب مجھے خواہش ہوئی کہ کاش مجھے جو معلوم ہوا ہے وہ نہ معلوم ہوتا۔ میں نے اُس کا تعلّق مُن بائی کے بارے میں پڑھے ہوئے ایک خوف ناک واقعے سے

جوڑا۔ ایک چھوٹا سا پیراگراف، جسے کاش میں نے نہ پڑھا ہوتا۔ ایک روز مَن بائی کسی نجی گھر یا کسی ہوٹل کے، جہاں اُسے داخلے کی اجازت مل گئی تھی، کمرے میں داخل ہوا اور خواب گاہیں صاف کرنے والی ایک ملازمہ کو، جس کی پشت اُس کی سمت تھی، دیکھا۔ اُس نے اُسے پکارا تو وہ مُڑی۔ وہ نوجوان تھی، اُس کا چہرہ پیارا تھا اور اُس کی وضع قطع اُس کی حالت سے میل کھاتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں طہارت والا ایک برتن پکڑا ہوا تھا اور وہ اپنے دُوسرے غیر ڈھپے ہاتھ سے اُس کے گاؤن کو ہلا رہی تھی: لگتا تھا جیسے طہارت والے برتن میں تُنی تھی۔

جب میں میریَن کے ماضی کے بارے میں سوچتا تو مجھ پر افسردگی اور کچھ کراہت طاری ہو جاتی۔ یہ کیفیت مجھ پر ہمارے نہایت قربت کے لمحات میں طاری ہوتی۔

میں سرکاری بستی کے بارے میں جانتا تھا جہاں اُس کے بچپن کا وہ بدترین کھیل کھیلا گیا تھا۔ بعض اوقات تو اُسے لگتا جیسے وہ ڈراما کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میں متعدد بار اُس نہایت عام سے مقام سے گزرا تھا جہاں وہ دیکھ بھال کے لیے لے جائی گئی اور جہاں سے اُس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ تقریباً یُوں تھا جیسے اب بھی اُس کے لیے ڈِکنز کی متوازی اخلاقی دنیا قائم ہو، میرے لیے نہیں جو گاڑی میں قریب سے بلا دیکھے، بلا جانے، بلا سوچے سمجھے ایک اور ہی عہد میں گزرتا تھا۔ وہ متوازی دنیا سرکاری گھروں کی روشن تصویر کشی، کھڑی ہوئی موٹر گاڑیوں اور ہمارے سماجی تبدیلی کے نہایت سہل خیالات کی بنا پر ہم باقی لوگوں سے پوشیدہ تھی۔

ایک دو سال کے عرصے میں ایک بار نہایت سست رفتاری سے سرکاری گھروں کی مرمت اور قلعی چُونا کیا جاتا۔ میں نے معماروں اور سینٹ جان وُڈ میں واقع اپنے گھر کے کام کے بارے میں سوچتے ہوئے اِس پر اپنے چوتھائی دماغ سے توجہ دی تھی۔

ایک جمعے کی شام جب ہم ٹرین سٹیشن سے نکلے تو ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے کہا۔ ''ہم گھر بدل سکتے ہیں لیکن مکینوں کو نہیں بدل سکتے۔''

اُس کی یہ بات دانش مندانہ تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس نے یہ بات کسی اَور شخص سے مستعار لی تھی۔ وہ سرکاری آبادی کا رہنے والا تھا۔ اُس نے مجھ سے ایسی ہی باتیں کیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے نیم مجرمانہ انداز میں مجھ سے ویسے ہی گفتگو کر رہا ہے جیسا ایک باہر کے شخص سے کی جاتی ہے اور مجھے وہی کچھ بتا رہا ہے جو اُس کے خیال میں مَیں سننا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے معاملات کا خاتمہ ہونا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ختم ہوتے ہوئے احمقانہ سماجی رواج کے ذریعے میں نے میریَن کے ساتھ اپنے تعلقات کو انجام تک پہنچانے میں جلد بازی سے کام لیا۔ یہ اِس طرح ہوا۔

جَو نے فیصلہ کیا کہ وہ جس باورچی کے ساتھ کچھ برسوں سے رہ رہی ہے اور جس سے اُس کی ایک یا دو منافع بخش خطائیں بھی ہیں، اب اُس کے ساتھ با قاعدہ شادی کر لے۔ وہ یہ کچھ چاہتی تھی: گرجا گھر، سجی ہوئی بڑی سی کار، چھت سے فرش تک سفید ربن کی لٹکی ہوئی پٹیاں، سر پر ہَیٹ اور رَسم کا کوٹ، چمکتا دمکتا سفید لباس، گُل دستہ، فوٹو گرافر، مقامی کلب میں استقبالیہ جہاں سرکاری بستی کے لوگ ایسے استقبالیے دیتے تھے۔ اور وہ چاہتی تھی کہ میں آؤں۔ اُس نے میرے والد اور اُن کے گھر کی دیکھ بھال کی تھی اور میر یَن سے دوستی کے بجائے یہی تعلق تھا جس کی وجہ سے وہ ہمارے بیچ مضبوط رشتے کی دعوے دار تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہایت معمولی طور وہ خاندان سینت کر رکھنے والی تھی۔ اُسے اِس بات اور نہایت احمقانہ قسم کے رواج اور ہر طرح کی غلط فہمیوں سے مسرت ہوتی تھی۔ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا کہ بے شمار طبقاتی رسوم و رواج اب متروک ہو چکے ہیں۔ میں گیا۔

میں اپنے آپ تک محدود رہا۔ میں نے میر یَن کو نہ دیکھنے اور خاص طور پر اُس کے ہمراہی کو نہ دیکھنے کا بہانہ کیا۔ یہ میر یَن اور جَو کے ساتھ معاہدے کا حصہ تھا۔ میں جتنی جلد ممکن ہو سکا، خطابات اور استقبالیے کی مکمل ہا وہو سے قبل ہی، نکل آیا۔

جب میں اپنی کار کے پاس پہنچا تو میں نے کچھ فاصلے سے ہی دیکھ لیا کہ اُس پر بُری طرح خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ اگلی نشستوں پر سفید رنگ یا کسی موٹے مارکر کے چمکیلے سفید سے محتاط بچگانہ لکھائی میں تحریر تھا: دفع ہو جاؤ اور میری ماں کو ورغلانا بند کرو اور دفع ہو جاؤ یا کچھ اَور کرو۔

وہ ایک بُرا لمحہ تھا۔ وہ بچگانہ لکھائی: میں نے مُن بائی کی طہارت والے برتن تھامے اُس خادمہ کے بارے میں سوچا۔

مجھے بعد میں میر یَن سے پتا چلا کہ بچے کا والد میری تلاش میں تھا۔ جَو نے نتائج کا خیال کیے بغیر کچھ لوگوں کو بتا دیا تھا میں شادی میں شریک ہو رہا ہوں۔

اُس سفید رنگ میں، جو بچے نے استعمال کیا تھا، چپکنے کی ایک خاص صلاحیت تھی۔ اُسے صاف کرنا قریب قریب ناممکن تھا، شاید وہ گرافتی (gar affiti) فن کاروں کے لیے خاص طور پر تیار کیا جانے والا رنگ تھا جو اپنے کام کو دھویں، موسم اور مٹ جانے سے محفوظ رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ کار کی نشستوں کے مصنوعی چمڑے کی تمام تہوں میں بھر گیا، ہموار سطح پر کھرچ ڈالنے کے بعد بھی گھونگے چلنے کے نشانوں کی طرح اُس کے نشان ایک خاص زاویے سے روشنی پڑنے پر واضح دکھائی دیتے تھے۔

ہفتے کے اُس روز شروع ہونے والی اذیت ہر ہفتے بڑھتی چلی گئی۔ میں جانا پہچانا ہو گیا تھا، میری کار پہچانی جانے لگی تھی۔ میرا تعاقب کیا جاتا۔ مجھے ٹیلی فون کیا جاتا اور جب میں جواب دینے کے لیے فون اُٹھاتا تو کوئی بچہ گالیاں بکنے لگتا۔ پس منظر میں مرد کی موہوم موجودگی، بچے کی اوٹ میں اُس کا

والد میرے نزدیک زیادہ شیطان بنتا چلا گیا۔

انجام کار میں نے مضافات میں ہماری ہفتہ وار ملاقاتوں کا سلسلہ بند کرنے اور میریَن کے لیے لندن میں ایک فلیٹ خریدنے کا فیصلہ کیا۔ میرے اِس ارادے سے وہ خُوش ہوئی، اتنی خُوش کہ وہ مجھے اُس اذیّت ناک منصوبے کی شریک معلوم ہونے لگی: اُس نے ہمیشہ لندن میں رہنے کی تمنا کی تھی، دُکانوں کے قریب کہ سفر کر کے اُن تک نہ آنا پڑے۔

لیکن لندن ایک بہت بڑا شہر ہے۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ایک مہذب اور مناسب فلیٹ خریدوں۔ جب میں نے یہ معاملہ اپنی فرم کے ایک نوجوان شریک کار کے سامنے رکھا تو حل ہوا۔ میں نے اُسے اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا بلکہ اُسے جتنا بتانا چاہیے تھا، اُس سے کچھ زیادہ ہی بتا دیا۔ وہ غربی لندن میں ٹرن ہام گرین کے قریب نارمن شایا آرٹس اینڈ کرافٹس کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ٹرن ہام گرین قابلِ دید جگہ ہے۔ اُس علاقے کے اکثر وکٹوریائی یا ایڈورڈ عہد کے گھر فلیٹوں میں تبدیل کیے جا رہے تھے جن کی قیمتیں شہر کے مرکز کے قریب کے فلیٹوں کی نسبت ایک چوتھائی یا ایک تہائی تھیں۔

اور ٹرن ہام گرین — سینٹ جان وُڈ سے جنوب مغرب میں اچھا خاصا سفر — وہ جگہ تھی جہاں میں نے فلیٹ خرید لیا۔ میریَن کو علاقے کا نام بہت پسند آیا۔ وہ اِسے بار بار یُوں دھراتی جیسے وہ الف لیلوی داستان کا کوئی طلسمی نام ہو اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہاں زیرِ زمین ریلوے لائن بھی ہے جو اُسے ٹرن ہام گرین سے بیس پچیس منٹ میں سیدھی پکاڈلی پہنچا دے گی تو یہ اُس کی برداشت سے قریب قریب باہر تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ دیہی علاقے کے سرکاری گھر کو بھول جائیں گے اور اُسے میریَن کی خطاؤں اور اُس کے دُوسرے بچّے کے باپ کے لیے چھوڑ دیں گے کیوں کہ اب میریَن اپنی ماں ہی کی طرح، لندن کا تصوّر سامنے رکھ کر، اپنی خطاؤں سے جان چھڑانے کی خواہش کرنے لگی تھی۔

اِس کا قیاس کوئی بھی کر سکتا تھا کہ اُس کی لندن آمد میرے اور اُس کے، دونوں کے لیے، خطرناک ثابت ہوگی۔ بہ الفاظِ دیگر، اب وہ وہاں ہر وقت موجود تھی اور ہفتہ وار تعطیل کی شدّت دم توڑ گئی تھی اور اُس شدّت کی عدم موجودگی میں وہ ایک عام سی ہمہ وقت دستیاب شے بن گئی تھی، حتّی کہ جنسی طور پر بھی، جس کے بارے میں، مَیں نے کبھی ممکن ہونے کا گمان تک نہیں کیا تھا۔ میری زندگی کا تمام نقشہ بگڑ گیا۔

یہ میرے تخیّل کی شکست تھی۔ بے شمار چھوٹے بڑے مصائب ایک عرصے تک اپنے اعمال کے روزمرّہ نتائج کو نہ سمجھنے کی ناکامی یا نااہلیت کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔ چند برس قبل مجھے ایک لکھاری کے بارے میں پتا چلا۔ وہ ہفتہ بھر برٹش میوزیم کے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا اور اپنا لکھنے کا

کام ہفتے کے آخری دِن کرتا۔ ہفتہ بھر مطالعے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ساری دُنیا اُس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی اور وہ اپنے تخیل کی آبیاری کرتا رہتا۔ اُس کی ہفتہ وار افسانوی تخلیقات نے اعلیٰ کامیابی کے قدم چُومے۔ لوگ مطالعے کے کمرے میں اُس معروف شخص کی محض ایک جھلک دیکھنے جاتے جو وہاں اپنا پُونچ جیسا مُنھ لیے ہفتے کے ایام کے عام سے کام کرتا ہوا چھوٹی چھوٹی، سریع اور ہیجان زدہ حرکات کر رہا ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح دو صدیاں قبل چیتھڑوں میں ملبوس مفلوک الحال فرانسیسی شاہی محل جا کر بادشاہ کو کھانے کھاتے یا سونے کی تیاری کرتے دیکھتے تھے۔ اور بلا شبہ، رَتی برابر سہی لیکن بادشاہ ہی کے مانند لکھاری کو بھی وہی حیثیت ودیعت ہوئی تھی۔ شہرت اور صلاحیت۔ اُسے برٹش میوزیم میں اپنے کام سے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اُس نے اُسے ترک کیا اور دیہی علاقے میں جا بسا اور ہمہ وقت لکھاری بن گیا۔ اُس کی تحریریں بدل گئیں۔ بہت عرصے سے دُنیا اُس کی نگاہوں میں نہیں رہی اور اُس کا تخیل قحط کا شکار ہو گیا۔ اُس کی تصانیف پہلے سے کوتاہ ہو گئیں۔ عظیم کتب جو پچھلی کتب کو بخوبی زندہ رکھتی ہیں، کبھی ظہور پذیر نہ ہوئیں۔ وہ بے اثاثہ دُنیا سے گیا۔ اُس کی کتابیں ناپید ہو چکی ہیں۔ میں اُس مصنف کا سانحہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن اپنا نہیں۔

اور بعینہٖ یہی بات میریَن کے بارے میں کہی جا سکتی تھی۔ اُس نے لندن میں تنہائی کے امکان کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ادراک نہیں کیا تھا کہ صرف ایک دِن میں اِتنا زیادہ وقت ہوتا ہے کہ اُسے دُکانوں کو دیکھنے میں صَرف نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خُوب صُورت اور سرسبز و شاداب نام کا حامل ٹرن ہام گرین قید خانہ بھی بن سکتا ہے۔ اُسے پیچھے چھوڑ کر آئی ہوئی چیزوں کی ہوک اُٹھنے لگی۔ وہ بات بات پر طیش میں آنے لگی۔ مجھے اب بھی ہمیشہ اُس سے دُور جا کر خُوشی محسوس ہوتی لیکن اب اُس دُوری میں شدّت تھی نہ صحبت کی تکان۔ ہمارا اکٹھے وقت بتانا بے مقصد ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم ایک دُوسرے کو نہایت واضح دیکھ سکتے تھے اور ہم اپنے دیکھے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اِس لیے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ میں نے وہ کیا جو وہ مجھ سے لگاتار کہتی رہی یعنی اُس کے ہم راہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا حالاں کہ حقیقتاً وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھر واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ دوبارہ اپنے پُرانے دوست چاہتی تھی۔ وہ اُن لوگوں کے مانند تھی، جو ایسی جگہ چلے جاتے ہیں، جہاں راوی چین ہی چین لکھتا ہے لیکن سکون کے اُس مقام پر وہ بیزاریت اور تنہائی کے ہاتھوں مجنوں بن جاتے ہیں۔

بہتر یہی ہوتا اگر میں بھی بے رُخی سے تعلّق توڑ لیتا جیسا کہ میریَن کی ماں یا اُس کی دیگر بے شمار دوستوں کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن مجھ میں حوصلہ یا سفاکی نہیں تھی۔ یہ میری فطرت یا پرورش میں شامل نہیں تھا۔ میں صلح جوئی کی کوششوں میں جتا رہا جو رائیگاں ثابت ہوئیں اور اُس عمل میں تجدید شدہ جذبے کے ہر آخری امکان تک کا قتل ہوتا رہا کہ جنسی جنون، جس نے میری خاطر بہت سے لوگوں کو بھینٹ

چڑھایا تھا، اب وجود باقی نہیں رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ دُوسرے فرد کا رویّہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

یہی وہ کیفیت تھی جس کے دوران میں، مَیں نے میریَن کا تعارف اپنے ایک دوست اور قانونی شریکِ کار سے کروایا جوڑن ہام گرین میں ہی رہتا تھا۔ مجھے اُمید ہو چلی تھی کہ اب اُس سے میری جان چھوٹ جائے گی اور واقعی ہوا بھی یہی۔ اُس نے متاثر کرنے کے لیے اُس کے سامنے نئے نام اور پُرانے رومانوی خیال پیش کیے: پیرس، فرانس کا جنوب — اور — سماجی حرص کی بنا، جس سے میری آگاہی اور چاہت عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھی — وہ اُس کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں اُس سے آزاد ہو گیا لیکن ساتھ ہی مجھ پر رقابت کی شدید کسک بھی منکشف ہوئی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا لیکن میرے دماغ میں میری شہوانی تمنّا کے آغاز سے اب تک، وہ شہوانی تمنّا جو اَب مجھ سے دُور تھی، شہوت انگیز تصاویر بھری پڑی تھیں۔ میں نے اُس کی باتوں کو یاد کیا۔ میں نے کبھی اِس قدر اذیّت سہنے کے امکان پر غور نہیں کیا تھا۔

vvvv

بیکری والے کی کہانی
(The Baker's Story)

میری طرف دیکھو۔ میں حکم کے اِکے کی طرح کالا اور مجھ جیسا کوئی بدصورت نہیں۔ مجھے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرے گا کہ وہ پورٹ آف سپین شہر کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک کو دیکھ رہا ہے۔ تمھیں پتا ہے کہ کبھی کبھار تو مجھے خود بھی اِس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے، خاص طور پر جب میں کسی چھٹی والے روز باہر نکلتا ہوں کیوں کہ آج کل میں نے بیوی بچوں کو باہر لے جانا شروع کر رکھا ہے۔ جب میری نگاہ مہنگے ترین ہوٹلوں میں چار چوفیرے لگے آئینوں میں سے کسی میں اپنے گھناؤنے کالے چہرے پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے انھیں مجھ جیسے لوگوں سے کینہ جُوئی کی بنا پر لگایا گیا ہے۔

اب سب ہی — خاص طور پر کالے — ہمیشہ مجھ سے پُوچھتے ہیں کہ یہ کیسے شروع ہوا تو میں اُنھیں یہی بتاتا ہوں کہ میں روٹی سے اپنی روٹی کماتا ہوں۔ ہا! تمھیں یہ بات اچھی لگی؟ لیکن اِس کا آغاز کیسے ہوا؟ یہ اچھی بات ہے کہ تم میری باتیں سُن رہے ہو اور میں تمھیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ غرناطہ میں، جہاں سے میرا تعلق ہے — اور یہ بھی ایک بات ہے کہ یہ کالے ترینی دادی کے اِس چیز کو کبھی معاف نہیں کرتے: ایک کالے غرناطوی کو۔ میں غرناطہ میں دس بچّوں میں سے ایک تھا۔ میرا یقین ہے وہاں ہر چیز گڈمڈ ہو جاتی ہے — البتہ مجھے یہ نہیں پتا کہ کس عاشق نے میری ماں کو ٹھونکا تھا۔ لیکن اِتنا مجھے یقین ہے کہ اُس نے اُس جزیرے کے دُوسرے تمام علاقوں کی عورتوں کو بھی ٹھونکا ہوگا کیوں کہ جب کبھی میں اُن چھٹیوں پر، جن کے بارے میں مَیں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں، واپس غرناطہ جاتا ہوں تو لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ مجھے دیکھ کر اُنھیں فلاں کی یا فلاں کی یاد آجاتی ہے اور جب میں کسی دُکان پر جاتا ہوں تو اکثر مجھے دُکان دار کا مددگار سمجھ لیا جاتا ہے۔ (اگر یہ سلسلہ یُوں ہی جاری رہا تو ایک روز میں اشتعال میں آ کر کسی کو کوئی نہ کوئی چیز بیچ ڈالوں گا۔) حد یہ کہ جب ترینی داد میں بھی کسی غرناطوی سے سامنا ہوتا ہے تو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آتا ہے۔

خیر، مجھے نہیں معلوم غرناطہ میں کیا ہوا تھا لیکن ماں، جو ابھی جوان جہان تھی، مجھ اکیلے ہی کو ترینی داد لائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے باقی بچّوں کا کیا کیا لیکن شاید وہ اُن میں سے کوئی بھی اُس کے پاس ہوگا نہیں۔ بہر حال، اُسے سینٹ اینی میں سفید لوگوں کے ہاں کام مل گیا۔ وہ اُسے وردی، تین

وقت کے کھانے کے علاوہ ہر مہینے چند ڈالر دے دیتے تھے۔ اُسے کہیں سے ایک اَور مردل گیا، ایک اصل ترینی داد بھڑوا، اور کہیں سے، مجھے نہیں پتا کہاں سے، اُسے میری دیکھ بھال کے لیے بھی کوئی مل گئی اور وہ خُود اُس آدمی کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ جو خوراک حاصل کرتی اور جو رقم کماتی اُس پست ذہن ترینی داد بھڑوے کے لیے، جسے اُس نے چُنا تھا، نا کافی تھی۔

میں ایک چینی دُکان پر جایا کرتا تھا جو اُس نئی خالہ کے گھر سے، جس کے ساتھ میں رہ رہا تھا، زیادہ دُور نہیں تھی اور ایک روز جب اُس بُڑھیا کے پاس روٹی کے لیے پیسے نہیں تھے ــ اب یہ خیال آتا ہے کہ اِس شہر میں اُن لوگوں کے لیے یہ کتنی لعنتی شے ہے جن کے ہاتھ میں اِسے خریدنے کے کچھ نہیں ہوتا ــ تو جب اُس کے روٹی خریدنے کے لیے دام نہیں تھے تو اُس نے مجھے اُس چینی دُکان پر اُدھار روٹی لینے بھیج دیا۔ وہ چینی عورت ــ آہ، یہ چینی بھی کتنے بچے پیدا کرتے ہیں! ــ کیم شحیم عورت تھی اور مجھے یقین ہے کہ میں اُس کے پاس صحیح موقع پر پہنچا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کسی سے کچھ لیتی ہے نہ دیتی ہے لیکن اگر میں کچھ کام کرنا چاہوں تو وہ الگ بات ہے کیوں کہ اُسے ہندوستانیوں کے لیے اپنی بنائی ہوئی ڈبل روٹیاں بھیجنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ڈبل روٹیوں کے معاملے میں مجھ پر کیسے بھروسا کر سکتی تھی؟ یہ سوال تھا۔ تو پھر میں نے اپنے میلے کچیلے مَرینا لے کے، جس میں چھیدوں نے اُسے کپڑے سے زیادہ چھلنی بنایا ہوا تھا، نیچے سے اپنا مسیح کا مصلوب حالت میں گلے میں پہننے والا چھوٹا مجسمہ نکالا اور اُسے کہا کہ جب تک میں اُس کی ڈبل روٹیاں دے کر واپس نہ آ جاؤں وہ اُسے ضمانتاً رکھ لے۔ مجھے نہیں پتا چینیوں کا کیا دین مذہب ہوتا ہے لیکن وہ عورت مجھے میری بات سے متاثر دِکھائی دی لیکن وہ ہوشیار بھی تھی۔ اُس نے میرا مسیح مصلوب کا چھوٹا مجسمہ اپنے پاس رکھا اور مجھے *chale-au-pain* کے چھپے ہوئے الفاظ والے پُرانے لفافے میں لپٹی ہوئیں، صرف تین چار روٹیاں دے کر بھیجا۔ میں رقم وصول کر کے لوٹا تو اُس نے مجھے میرا مجسمہ واپس کیا اور ساتھ ہی چند سکّے اور ایک ڈبل روٹی بھی دی۔

تو دراصل اِس طرح یہ کام شروع ہوا۔ میں ہمیشہ کالے لوگوں کو بتاتا ہوں کہ مجھے زندگی میں خُدا نے یہ کام شروع کروایا تھا اور اِن ترینی داد لوگوں کی باتوں کو دِل پر نہ لیا کرو جو ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ غرناطوی ہمیشہ نمازیں ہی پڑھتے رہتے ہیں۔ اِس کے باوجود یہ سچ ہے کہ اب بھی جب مجھ پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو میں سجدے میں گر جاتا ہوں! لڑکے، میں گھٹنوں کے بَل بیٹھ کر خشوع وخضوع سے دُعائیں مانگتا ہوں۔

ٹھیک، تو یُوں یہ معاملہ اُس وقت تک جاری رہا جب ایک سہ پہر کو میں حسبِ معمول لوگوں کو ڈبل روٹیاں دینے جا رہا تھا۔ بیکری پر عام ڈبل روٹیاں بھی بنتی تھیں ــ خُودکار طریقے سے پکانے اور اُچھال کر پلٹنے والی مشین پر ــ جنھیں وہ غریب لوگوں کو فروخت کیا کرتے تھے۔ وہ چینی بھی کیا کام کرتے

ہیں! وہ بڑی سی تو ندوالی چینی عورت گندے کپڑے پہنے، بھٹّی کے سامنے پسینم پسین بیٹھی ڈبل روٹیاں بناتی اور پیسے کماتی رہتی تھی لیکن مجھے نہیں پتا کہ آخر وہ اِس رقم کا کیا کرتے تھے کیوں کہ وہ عقبی کمرے میں نہایت عسرت میں رہتے تھے، جس میں صرف ایک پلنگ، چھوٹے بچّوں کے لیے کچھ کھلونے اور چند صندقچیاں تھیں۔ میں اُس کے خاوند سے تو بالکل بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انگریزی کا ایک لفظ تک نہیں جانتا تھا اور جو کچھ بھی لکھتا تھا چینی میں لکھتا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا غلیظ شخص تھا جو بالعموم اکثر چینیوں کا مخصوص پہناوا پھڑ پھڑ کرتی مضحکہ خیز خاکی کچھا اور سفید مڑ ینا پہنے رکھتا تھا۔ وہ ایک کتیا کے مانند بھی کام کرتا تھا۔ ہم غرباطوی سخت محنت کرنا جانتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اِسی بنا پر میں اُن چینیوں کے ساتھ احسن طور پر کام کرتا رہا، اور یہی وجہ ہے کہ یہ کاہل کالے ترینی دادی ہم سے نہایت حسد کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ غلیظ رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے بچّے، مرد اُس خستہ حال پُرانے کمرے کو تازہ ڈبل روٹی کی طرح صاف ستھرا کر کے باہر نکلتے اور ہمیشہ صفائی برقرار رکھتے۔ اُن کے پاس ہمیشہ پنسلیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے ڈبّے، مُجھے مُجھے ربڑ، پیالے اور سیاہی چُوس ہوتے تھے اور وہ کسی بھی شے کو گُم نہیں کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت ایک چھوٹی سی عمدہ قطار میں کمرہ چھوڑتے اور اُسی قطار میں سہ پہر کو لوٹتے، بالکل پُرسکون اور صاف ستھرے گویا دِن بھر کسی بھی شے نے اُنھیں چُھوا تک نہ ہو۔ اُن سے یہ چیز کالے لوگوں کے بچّے بھی سیکھ سکتے تھے۔

لیکن جیسا کہ میں بتا رہا تھا کہ وہ بیکری غریب طبقے کے عام لوگوں کے لیے بھی ڈبل روٹیاں بناتی تھی لیکن وہ ہیں امیروں کے لیے بھی روٹیاں بناتے تھے۔ البتہ اُن کے لیے یہ کرتے تھے کہ اُن کے گھروں سے آٹا جمع کرتے، اُسے پکاتے اور گرما گرم اور تازہ تازہ ڈبل روٹیاں بنا کر بھیجتے تھے۔ میں گاہکوں کے اِس طبقے کے ہاں سے آٹا لاتا اور ڈبل روٹیاں دے کر آتا تھا۔ اُنھوں نے مجھے کبھی دُکان پر کام نہیں کرنے دیا۔ اِس سے لگتا جیسے اُنھیں مجھ پر بھروسا نہیں تھا کہ وہ مجھے کاؤنٹر پر کھڑا کرتے اور لوگوں کے ہجوم سے رقم وصول کرنے دیتے۔ وہاں ہمیشہ ہجوم لگا رہتا تھا۔ تمھیں پتا ہے کہ کالے لوگ: اگر محض ایک کالا شخص دُکان پر کام کر رہا ہو تو لوگوں کو یُوں لگتا ہے جیسے وہاں کالوں کی جہنمی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔

اچھا تو ایک روز میں اُس علاقے میں *chale-au-pain* والے لفافے میں ایک گھر ڈبل روٹی دینے گیا۔ وہاں ایک اَور عورت بھی تھی، کوئی پڑوسن۔ وہ کہنے لگی کہ کیا ہی اچھا ہوا گر تمھارے ہاتھوں سے گُندھے آٹے کی روٹی ملے کیوں کہ اُس میں طرح طرح کے لوگوں کا پسینہ تو شامل نہیں ہوگا۔ اور اُس کی اِس بات سے میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا۔ بھٹّی تو بھٹّی ہی ہوتی ہے۔ مجھے یہ کرنا تھا چاہے میں صرف ایک دو ڈبل روٹیاں ہی بناتا۔ میں نے اُس عورت سے، جو پُرتگالی تھی، کہا کہ میں اُس

کا آٹا لے کر جاؤں گا اور اُسے ڈبل روٹی بنا کر لا دوں گا اور اُس سے فالتو پیسے بھی نہیں لوں گا۔ میں نے یہ بات اُس سے اِس انداز میں کہی کہ اُسے پتا نہ چلے کہ میں وہ پیسے چینیوں کو دوں گا یا نہیں اور پھر اُسے کوئی فالتو رقم بھی ادا نہیں کرنا پڑ رہی تھی کیوں کہ وہ پیسے تو میں خُود رکھنے والا تھا۔ لیکن اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ چاہتی ہو کہ وہ پیسے میں رکھوں۔ تو معاملہ طے پا گیا۔ میں اگلے چند روز chale-au-pain واپس جاتے ہوئے بیکری کے بائیسیکل کے کیریئر پر آٹا لٹکا کر لے جاتا رہا۔ میں اُسے بیکری کے اندر لے جاتا اور اُسے chale-au-pain کے کاغذ میں لپیٹنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ اگلا کام میں یہ کرتا کہ اُس آٹے کو بھی دُوسرے آٹے میں ملا دیتا، اُسے یُوں گوندھتا اور پکاتا گویا وہ سارا ایک ہی گھر کا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ جب بھی ایسا کام کرو تو بہت زیادہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو ایسا چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے بہت گڑبڑا جاتے ہیں جس سے پکڑے جاتے ہیں۔ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میں نہایت بِھجک تھا۔ میں اُس سارے آٹے کو بھٹی میں دھکیل دیتا اور وہ چینی ہمیشہ اپنا افسردہ اور ملول چینی مُنھ لیے، ایک لمبے دستے والے بیلچے سے اُسے بھٹی سے نکالتا، دیکھتا اور واپس بھٹی میں دھکیل دیتا۔

اور جب میں دُوسری ڈبل روٹیوں کے ساتھ وہ ڈبل روٹیاں بھی لے کر جاتا تو اطمینان سے پیسے وصول کر لیتا۔ ایسے معاملے کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ ایک بار شروع ہو جائے تو اِسے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آدمی زیادہ زیادہ اکٹھا کرنے کے چکّر میں پڑ جاتا ہے۔ میرا دماغ تو ویسے بھی حسابی ہے۔ میں تو ہمیشہ بیٹھ کر حساب کتاب کرتا رہتا ہوں۔ مثلاً اگر ایک روز پچاس پیسے تو ہفتے کے کتنے ہوئے اور سال کے دوران میں آنے والے ہفتوں میں کتنے بنیں گے۔ اور یہ چیز میرے لیے تو بہت اہم ہے لیکن میں ہر ایسے شخص کو، جو کاروبار کرنا چاہتا ہے، اِس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ لیکن جب میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ میں روٹی سے اپنی روٹی کماتا ہوں تو میرا مطلب یہی ہوتا ہے۔

اب چینی عورت کی صحت ٹھیک نہیں رہی تھی اور بڈھا بھی اپنے چینی اطوار کے برعکس کم ہی خُوش باش رہنے لگا تھا۔ تمھیں پتا ہے یہ چینی لوگ کس طرح جوا کھیلتے ہیں۔ اگر تم دِن کے پہلے دو تین گھنٹوں کے دوران میں میں سپاتھ لے کے میرین سکوائر سے گزرو اور باقی دِنوں میں دو ایک گھنٹے تو تمھیں وہاں سرکاری خزانے کے باہر کچھ چینی النسل یُوں بیٹھے دِکھائی دیں گے گویا وہ دولت کا قرب حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں اور سب کچھ داؤ پر لگا کر جوا کھیل رہے ہوتے ہیں۔ خیر، بڈھا جوا کھیل رہا تھا اور بڑھیا بیمار پڑی تھی۔ اور بیکری کی دیکھ بھال کے لیے میں اکیلا ہی بچا تھا۔ میں تمھیں بتاؤں کہ میں اُن کی خاطر سخت محنت کرتا۔ میں چینی زبان کے بمشکل دو تین لفظ ہی سمجھ پاتا تھا لیکن کچھ بدتمیز کالے لوگ مجھے کالا چینی کہہ کر پکارنے لگے کیوں کہ اُن دِنوں میں بھی چینیوں ہی کی طرح خاکی کچھا اور مَرَینا پہنتے

اور چائے پینے لگا تھا جو چینی سارا سارا دِن پیتے رہتے تھے اور تو اور میں بھی کسی چینی ہی کی طرح سر جھکا کر خاموشی سے چلا کرتا تھا۔ اے، چینیوں کے بارے میں لوگوں کی باتوں اور اُن کے حسد پر یقین مت کرنا۔ وہ کالوں کے بالکل خلاف نہیں بشرطے کہ وہ محنتی اور ممنونِ احسان ہوں۔

لیکن زندگی بھی بڑی مضحکہ خیز چیز ہے۔ اب جب یہ نظر آتا ہے کہ میں ہر لحاظ سے اپنے قدم جما چکا ہوں، ہر کام بہترین اور خُوب ہو رہا ہے تو واقعات کا ایک پُوراجتھا سامنے آکر، مجھ پر چیخنے چلّانے لگتا ہے۔ سب سے پہلے تو چینی عورت کو ذات الجّنب کا ہونا اور اُس کا چل بسنا۔ وہ نہایت گھمبیر واقعہ تھا لیکن آگ کے سامنے جھک کر کام کرنے اور پسینے سے شرابور بدن کے ساتھ نہانا، بارش میں باہر نکل جانا اور ایسی ہی دُوسری اُلٹی سیدھی حرکات کے بعد اَور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ اور پھر ہر وقت بچّوں کی دیکھ بھال اِس کے علاوہ تھی۔ مجھے اِس پر بہت دُکھ ہوا تھا اور کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب میں اُس بڈّھے کے ساتھ اکیلا کیسے کام کر سکوں گا۔ میں نے جتنے عرصے بھی اُس کے ساتھ کام کیا تھا اُس نے کبھی مجھ سے براہِ راست بات نہیں کی تھی بل کہ مجھ سے جو کہنا ہوتا اپنی بیوی کے ذریعے کہتا تھا۔

اور اب میرے نصیب کے چکّر دیکھو۔ جیسے ہی عورت مری، چینی آدمی تو جیسے پاگل ہو گیا۔ وہ رویا نہ پیٹا بس بے تحاشا جوا کھیلنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز، شاید بُوڑھیا کے مرنے کے ایک ماہ بعد، اُس نے بچّوں کو سامان باندھنے اور وہاں سے روانہ ہونے کے لیے کہا کیوں کہ وہ جوئے میں اپنی دُکان ایک اَور چینی نژاد ہی کو ہار بیٹھا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اب میں کہاں کھڑا ہوں اور کوئی مجھے بتا بھی نہیں رہا تھا۔ بس وہ سامان باندھ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے مجھے بھی دُکان ہی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا اور بڈّھا مجھے یہ بھی نہیں کہہ رہا تھا کہ مجھے کھونے پر اُسے دُکھ ہے۔ اور تمھیں پتا ہے جیسے ہی میں اپنے گھٹنوں کے بَل جھکا تو واقعی یہ خُدا ہی تھا جس نے شروع ہی سے میرے دِل میں آٹے والی بات ڈالی ورنہ میں کہیں کا نہ رہتا۔ کیوں کہ بیکری حاصل کرنے والے نئے آدمی نے مجھے کہا کہ اُسے میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ بیکری بند کر کے اُس کی جگہ باقاعدہ کریانے کی دُکان کھولنے والا تھا اور وہ نہیں چاہتا کہ میں وہاں کام کروں کیوں کہ کریانے کے گاہک کبھی نہیں چاہیں گے کہ کوئی کالا اُنھیں سامان دے۔ تو میری حالت دیکھو، عمر تیئیس برس اور بے کار۔ کوئی کام کاج نہیں۔ میرے پاس وہ چینی حلیہ تھا، میں ڈبل روٹی بنانا جانتا تھا اور پچھلے برسوں کے دوران میں میں جوڑی ہوئی تھوڑی سی فالتو رقم۔

میں نے پُرانے خاکی کپڑے اور مرَینا اُتار پھینکی اور کام کی تلاش میں قصبے کا چکّر لگایا۔ لیکن کسی کو بھی بیکری کا کام جاننے والے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پاس سات سو ڈالر تھے اور مجھے پتا چل گیا کہ یہ منزگشت ہی ہوتی رہے گی لیکن اِسے مجھے حاصل کچھ نہیں ہوگا کیوں کہ میری رقم تیزی سے ختم ہوتی

جا رہی تھی۔ اب یہ دیکھو۔ اُن دِنوں میرے دماغ میں اپنی دُکان کھولنے کا خیال تک نہیں آیا۔ کالے لوگوں کا یہی مسئلہ ہے۔ وہ دُوسروں کے لیے کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں کیوں کہ اُنھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ کالے ہیں اور وہ دُوسروں کا کام کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اور میں تمھیں یہ ضرور بتا دوں کہ جب میں نے خُدا سے دُعائیں مانگنا شروع کیں تو خُدا نے مجھ سے کہا کہ میں وہاں سے نکلوں اور اپنی دُکان کھولوں۔ مجھے لگا جیسے شاید خُدا کو غلطی لگی ہے یا میں نے خُدا کی بات اچھی طرح نہیں سنی۔ لیکن خُدا مجھ سے ایک بات کہتا رہا۔ ''نوجوان، اپنی رقم سے بیکری کھول لو۔ تم اچھی ڈبل روٹیاں بنا سکتے ہو۔'' اُس نے مجھے کھانے پینے کی دُکان کھولنے کے لیے نہیں کہا، جو چند کالوں نے کھول کر رکھی ہیں، کیک، مَوبائی (mauby) اور دُوسرے مفرح مشروب بیچ رہے تھے۔ نہیں، وہ تو کہتا تھا کہ بیکری کھولو۔ میری قسمت کے پھیر دیکھو۔

مجھے چند سو اضافی ڈالر حاصل کرنے کے لیے نہایت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بالآخر ایک ہندوستانی نژاد نے مجھے قرض دے ہی دیا۔ اور میں ہمیشہ نوجوان ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ اگر تمھیں ٹھیک ٹھیک معلوم ہو کہ تم نے کیا کرنا ہے تو قرض لینے میں کوئی عار نہیں۔ میں لوگوں کو یہ نہیں کہتا پھرا کہ مجھے قرض دے دو کیوں کہ مجھے گھر تعمیر کرنا ہے یا لاری خریدنا ہے۔ میں تو صرف اور صرف ڈبل روٹیاں بنانا چاہتا تھا۔ خُوب، طویل قصے کو مختصر کرتے ہیں۔ میں نے آروکا کے مضافات میں ایک ٹُوٹی پھُوٹی پُرانی جگہ خریدی اور اُس جگہ کو ٹھیک کرنے میں اپنی رقم کا خاصا حصہ صرف کر ڈالا۔ کوئی فضول خرچی نہیں کی۔ تم سمجھتے تو ہو کہ آروکا، آروکا ہے اور تمھیں کسی تیز معاملے میں بھی زمین جائیداد کے سودے کروانے والوں سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے پاس رقم نہیں بچی۔ میں نے وہاں چند استعمال شدہ شیشے کے کاؤنٹر اور ایسی ہی چیزیں رکھ لیں۔ میں نے بورڈ پر اپنا نام لکھا اور، دیکھو، میں کاروبار میں داخل ہو گیا۔

اب مضحکہ خیز واقعات ہونے لگے۔ لیو بِھلے میں لوگوں کے پاس میری بنائی ہوئی ڈبل روٹیاں خریدنے کے لیے رقم نہیں تھی -- اور آخری چند مہینوں میں، مَیں ڈبل روٹیاں ہی بنا رہا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں ایسی بہتر ڈبل روٹیاں بنا رہا تھا جو آروکا کے لوگوں نے کبھی دیکھی تک نہیں تھیں لیکن مجھے اپنے سامنے والے ٹُوٹ کر گرنے کے قریب دروازے سے ایک بھی شخص ایک پیسے والی چھوٹی ڈبل روٹی بھی خریدنے کے لیے آتا دِکھائی نہ دیتا۔ تم اشتہارات میں معیار کے بارے میں تو سُنتے ہی رہتے ہو نا؟ لڑکے، اِس پر یقین مت کرنا۔ معیار کے ساتھ کوئی اَور چیز بھی چاہیے ہوتی ہے اور وہ چیز میرے پاس بالکل نہیں تھی۔ میں بھَونچک تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بات میں اِس لیے کر رہا ہوں کہ میں آروکا میں نیا تھا اور میرے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن نہیں، میں نیا تھا اور میری روٹیاں بُس جاتیں۔

لوگ پُرانی دُکانوں پر بھی ہجوم در ہجوم سینکڑوں کی بکری نہیں کروا رہے تھے۔ میں روزانہ پاؤ والی دو تین اچھی ڈبل روٹیاں بناتا، وہ تمام پڑی رہ جاتیں اور خشک ہو کر سڑ جاتیں۔ میں صرف حکومتی فارم کے ایک شخص کو روٹیاں بیچ رہا تھا جو گلے سڑے کیک اور ڈبل روٹیاں گائیوں یا سؤروں کے لیے، یا وہاں جو بھی جانور رہتے، خریدتا تھا اور میری ڈبل روٹیاں تو اچھی والی تھیں۔ پس میں دوبارہ اُنھی گھٹنوں کے بَل جھک جاتا اور یُوں خُوب دعا کرتا گویا میں گھٹنوں کو توڑ ہی ڈالنا چاہتا ہوں۔ مجھے اب بھی وہی جواب ملتا: ''نوجوان۔''۔ مجھے اپنی دعاؤں کے دوران میں میں اِسی طرح پُکارا جاتا تھا۔ ''نوجوان، تم بس ڈبل روٹیاں بناتے رہو۔''

میرے باپ! مسئلہ یہ ہے کہ ہر ماہ قرض پر سود بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ مہینوں تک میں نے محض سود کی ادائیگی کے لیے خالہ اور ہر اُس مہربان شخص سے اُدھار لیا جو میری بات پر توجہ دے سکے۔ حالات اِتنے خراب ہو گئے ہیں کہ میں نے باہر جانا اور لوگوں سے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے کہ میں کسی اَور کی بیکری پر کام کر رہا ہوں اور نہایت ہی کم مزدوری پر وہاں ڈبل روٹیاں بنا رہا ہوں۔ اور آروکا میں کم مزدوری کا مطلب کم مزدوری ہی ہوتا ہے۔ میں بتاتا کہ اِس طرح گِر گِر کر میں بمشکل اِتنا کما پا سکتا ہوں کہ جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھ سکوں۔

میری پریشانی سمجھو۔ حیران، راستے سے ہٹ کر آروکا کی ایک پُرانی جگہ — جسے میں نے اِس خیال کے تحت خریدا کہ وہاں کوئی بیکری نہیں ہے اور وہاں کے لوگ اچھی غرناطوی ڈبل روٹیاں پا کر خُوش ہوں گے — راستے سے اتنی ہٹ کر چکہ کہ کوئی اُسے خریدنے پر تیار نہ ہوتا۔ اُس کی انشورنس تھی نہ کچھ اَور، کیوں کہ وہاں آگ لگنے یا کسی اَور حادثے کا اندیشہ بھی نہیں تھا — نہ ہی مجھے بھی ایسے کسی حادثے کا خطرہ تھا۔ اور ہر بار جب میں اپنے گھٹنوں کے بَل ہوتا تو مجھے راست ایک ہی جواب ملتا۔ ''نوجوان تم صرف ڈبل روٹیاں بناؤ۔''

ٹھیک، آقا کی خُوشنودی کی خاطر میں ہر روز معمول کی ایک پاؤ والی ایک یا دو ڈبل روٹیاں بناتا رہا گو مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ آقا مجھے شکستہ حال کرنا چاہتا ہے اور مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے چینیوں کی بیکری میں جو کیا ہے یہ خُدا کی طرف سے اُس کی سزا ہے۔ میں بُرا اَور حقیقتاً بے دست و پا بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں آقا کی خاطر وہ پاؤ والی ڈبل روٹیاں تیار کرنے کے بعد بیکری سے — کسی شے کو تالا لگائے بغیر اور چوری کے کھٹکے کے بغیر — دُور رہنے لگا۔ اور جب لیو پھیلے کے لڑکے مانزانیلا، بلانڈرا اَور ساتھ کے دُوسرے ساحلی علاقوں کو جانے والے وہاں آ نکلتے تو میں اُنھیں مذاقاً بتاتا کہ میں ''روٹیاں بنانا سیکھنے میں وقت گزار رہا ہوں۔'' تو وہ بُری طرح قہقہے لگاتے۔ اِس دُنیا میں اپنے چُوتڑوں پر بیکار بیٹھ کر بھی خُوب اچھی قسمت پانے والے شخص کو دیکھنے سے زیادہ بڑی ستم ظریفی کوئی نہیں۔

ہندوستانی آدمی اپنی رقم کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ اُسے بھی الزام نہیں دیا جا سکتا تھا کیوں کہ کچھ مہینوں سے اُسے سُود تک نہیں ملا تھا۔ اِس صُورتِ حال سے میرا حوصلہ بھی جواب دینے لگا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اُس کے پاس رقم مانگنے گیا تھا تو اُس نے مجھے کیا پُوچھا تھا: ''تمھیں یقین ہے کہ تم ڈبل روٹیاں ہی بنانا چاہتے ہو؟ تمھارا خیال ہے کہ تم ڈبل روٹیاں بنانے کے ماہر ہو؟'' ''ہاں، ہاں۔'' جیسے میں نے اُسے بتایا اُس مالک نے اُسی انداز میں رقم نکال کر دے دی۔ اور اب وہ پریشان ہو رہا تھا۔ پس ایک روز آقا کے لیے روٹیاں بنانے کے بعد میں نے اُس شخص سے ملنے کے لیے پورٹ آف سپین جانے والی اَریما بس سروس پکڑی۔ میں راستے بھر خُود کو نہایت بہادر تصور کر رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی میری نظر قدیمی سمندر اور جنوبی گھاٹ کی ہَوا کا جھونکا مجھ سے ٹکرایا اور بس ریلوے سٹیشن کے آخری اڈّے میں داخل ہوئی تو میرے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے۔ میں نے کچھ دیر شہر میں آوارہ گردی کا فیصلہ کیا۔

وہ ایک گرم صبح اور حبس آلود موسم تھا۔ اُس زمانے میں ایک اناس کی قیمت صرف اعشاریہ صفر چار تھی۔ خُوب، تو وہاں پُرانے چوک میں اناس کا ایک ٹھیلا تھا۔ میں اُس کے پاس ٹھہر گیا۔ وہ دیکھنے کے لائق نہایت دِلچسپ چیز تھی۔ اناس والا ایک سیاہ فام تھا۔ تم تب تک اِس بات کی دِلچسپی نہیں سمجھ سکتے جب تک تمھیں یہ نہ پتا ہو کہ اُس جزیرے میں ہر اناس فروش ہندوستانی ہوتا تھا۔ وہ کالوں کی نسبت بہتر طور پر قرولی چلانا جانتے ہیں۔ بائیں ہاتھ میں اناس، دائیں ہاتھ سے کٹا کٹ کٹا کٹ کٹا کٹ چلتی ہوئی قرولی اور اناس کٹ کر پینے کے لیے تیار۔ میں نے کبھی کسی اناس بیچنے والے کو اپنا ہاتھ کاٹتے نہیں دیکھا۔ اور وہاں وہ کالا آدمی قرولی سے اناس کا کٹا کٹ کٹا کٹ کام کر رہا تھا۔ وہ اتنا ہی پُرلطف نظارہ تھا جتنا کسی کالے کو دھوتی اور پگڑی پہنے دیکھنا۔ اُس تمام کاروبار کا سب سے خُوب صُورت پہلو یہ تھا وہ کالا شخص ایک ہندوستانی ہی کی طرح نظریں بھی اِدھر اُدھر گھما رہا تھا۔ وہ بہت سے ہندوستانیوں سے ہندی میں بات چیت کر رہا تھا جو اُس سے بے ہودہ مذاق کر رہے تھے لیکن وہ اُن کا بُرا نہیں مان رہا تھا۔ اِس طرح تب ہوتا ہے جب کالے آدمی کسی علاقے میں بہت سے ہندوستانیوں کے بیچ رہ رہے ہوں۔ وہ سالن استعمال کرتے ہیں، ہندی بولتے ہیں اور ہندوستانیوں ہی کی معاشرت رکھتے ہیں۔ خیر، میں نے ایک اناس لیا اور پھر رقم کے سلسلے میں اُس شخص سے ملنے چل دیا۔

جب میں نے اُسے بتایا تو وہ تشویش زدہ ہونے سے زیادہ غمگین ہو گیا۔ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اُسی کی طرح غم زدہ ہو جاتا۔ یہ کتنی بڑی مصیبت ہوتی ہے جب رقم ڈوبتی دِکھائی دیتی ہے اور اُس پر طرّہ کہ ہر ماہ ملنے والے خُوش کُن سود کی آس بھی نہیں رہتی۔ بہر حال، اُس نے مجھے کہا وہ مجھے مزید تین ماہ کی مہلت دے گا لیکن اگر میں نے معاہدے کے مطابق رقم دینا شروع نہیں کی تو وہ اس سے قبل بھی معاملہ ختم کر سکتا ہے۔ ''تم نے مجھے اچھی خاصی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''میری طرف دیکھو۔ کیا تمھارے خیال میں مجھے آروکا میں دُکان چاہیے؟''

جب میں اُس کے پاس سے رخصت ہوا تو خُود کو قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا اور اُس سے رخصت ہونے کے بعد میری جس شخص سے ملاقات ہوئی وہ پَرسی تھا۔ پَرسی میرا لنگوٹیا تھا جو میرے ساتھ لیونخِلے ایلیمینٹری سکول جایا کرتا تھا۔ میں نے پَرسی جیسے مختلف کسی شخص کو نہیں جانتا۔ وہ انتہائی بُرے حالات میں پلا بڑھا تھا لیکن اُن سے لاپروا تھا اور وہ مختلف کاروباری پیش کشوں کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ تاہم مجھے پتا تھا کہ وہ انشورنس پالیسیاں بیچتا ہے — یہ وہ کام ہے جو ترینی داد میں ہر سست اور کاہل شخص کرتا ہے اور میری بات یاد رکھنا کہ وہ دِن دُور نہیں جب ایسے لوگوں کو ایک دُوسرے ہی کو انشورنس بیچتے دیکھو گے۔ بہرحال، مجھ سے مل کر پَرسی حقیقتاً خُوشی سے کِھل اُٹھا اور بولا کہ وہ پُرانے وقت کی یاد میں دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا چاہتا ہے۔ اُس نے غرناطیوں کے بارے میں چند عام سے جاہلانہ مذاق دہرائے اور ہم ایگوپچو رابار چلے گئے۔ میں اِس سے قبل وہاں نہیں گیا تھا اور نہ ہی وہ ایسی جگہ تھی جہاں توقع کی جا سکتی کہ پَرسی جیسے آدمی کو خُوش آمدید کہا جائے گا۔ لیکن ہم وہاں چلے گئے اور پَرسی نے وہاں کے بیروں پر اپنا رعب جمانا شروع کیا۔ یاد رکھو کہ وہ پَرسی کے مقابلے میں چوتھائی بھی کالے نہیں تھے۔ کتنی اچنبھے والی بات ہے کہ اُنھوں نے پَرسی کو بالکل بھی بُرا بھلا نہیں کہا، خاص طور پر اِس صُورتِ حال میں کہ وہاں ہر سمت گورے موجود تھے۔ پینے پلانے کے بعد پَرسی بولا۔ ''دوپہر کا کھانا کہاں کھانا پسند کرو گے؟''

میں، مجھے تو اِس شہر کے ایک ریستوران کے بارے میں بھی علم نہیں تھا اور جب پَرسی کھانے کے بارے میں بات کر رہا تھا تو میری توقع محض چاول اور مٹر یا کسی ہندوستانی ڈھابے کی روٹی یا کھانے پینے کی کسی دُکان سے موبائی اور رزاک کیک کی تھی۔ اور سب سے بُری بات لوگوں کا ملنا ہے، حتیٰ کہ پَرسی جیسے لاپروا لوگوں کا، خاص طور پر جب تم اپنی دو اُنگلیاں جیب میں ڈالے سکّے کھنکنا رہے ہو۔ پس میں نے پَرسی سے کہا کہ ہم کسی کھانے کی دُکان یا بار میں جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ بولا۔ ''نہیں، نہیں۔ جب میں اپنے دوستوں کو دعوت دیتا ہوں تو اپنے کھانے کو کالے لوگوں کا ہاتھ تک لگنا پسند نہیں کرتا۔''

ٹھیک وہی لمحہ تھا جب میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میرا خیال ہے کہ ترینی دادی غرناطویوں کے جس احمق پن کی بات کرتے ہیں اُس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے کیوں کہ کسی جگہ طویل عرصے تک قیام پذیر ہونے کے بعد ہی حقیقتاً اُسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ اے مردِ خُدا، میرے دماغ کو ایک خیال نے جکڑ لیا۔

جب کالے بھی ترینی داد کے کسی ریستوران میں جاتے ہیں تو وہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی کالا اُن کے کھانے کو چُھوئے۔ اور پھر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ترینی داد میں ہر نسل اور ہر رنگ کے لوگ

موجود ہیں اور ہر نسل اپنے خاص کاروبار کرتی ہے۔ لیکن اے شخص دیکھو، اگر تم برف کا گولا خریدنا چاہتے ہو تو کس سے خریدو گے؟ تم کبھی کسی ہندوستانی، چینی یا پُرتگالی سے نہیں خریدو گے۔ سیاہ فام سے خریدو گے۔ جب میں خود بھی آروکا میں اپنی جگہ ٹھیک کروا رہا تھا تو میں نے بھی ہندوستانی بڑھئی یا راج مستری کو کام پر نہیں لگایا تھا۔ اگر ترینی داد میں کوئی ہندوستانی بڑھئی کا کام کرنا چاہے تو وہ فاقوں ہی مرے گا۔ کیا کبھی کسی نے ہندوستانی بڑھئی دیکھا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی بڑھئیوں اور راج مستریوں کے لیے دُنیا میں واحد جگہ ہندوستان ہے۔ یہ نہایت مضحکہ خیز امر ہے۔ مجھے یہ چیز دیکھنے کے لیے ایک دن کے لیے اُس ملک جانا چاہیے۔ اور چلتے ہوئے میں نے بیکریوں کے نام پڑھے: کوئیلھو پینٹن، سٹوبل، پوٹو جی یا سوس یا کچھ ایسے ہی نام اور پھر تمام دُوسری چینی جگہیں دیکھیں۔ اور پھر میں نے دھوبیوں کی دُکانیں دیکھیں۔ اگر کوئی کالا آدمی دھوبی کی دُکان کھول لے تو کیا تم اپنے کپڑے وہاں لے کر جاؤ گے؟ میں تو اپنے کپڑے کبھی نہیں لے جاؤں گا۔ ٹھیک، جا تو میں اُس ریستوران کی طرف رہا تھا لیکن مسرت سے اچھل بھی رہا تھا۔ اور پھر میرے تمام معاملات اپنے اپنے مقام پر ٹک گئے۔ تمھیں یاد ہے وہ چینی لوگ مجھے کاؤنٹر پر کام کرنے نہیں دیتے تھے؟ میں سمجھتا تھا کہ وہ بھیڑ کے باعث مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔ لیکن بات یہ نہیں تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اگر وہ مجھے ایسا کرنے دیتے تو حقیقتاً وہاں بھیڑ ہی نہ لگتی۔ کیا تم نے کبھی کسی کو کالے سے ڈبل روٹی خریدتے دیکھا ہے؟

میں نے ہَرِی سے دریافت کیا کہ وہ عوامی مقامات پر اپنے کھانے کو کالے لوگوں کے ہاتھ لگنا پسند کیوں نہیں کرتا۔ اِس سوال نے اُسے تھوڑا سا تذبذب میں ڈال دیا۔ وہ ٹھیر کر سوچنے کے بعد بولا۔

''یہ اچھا نہیں لگتا۔''

خُوب، باقی کہانی اب تم خود قیاس کر سکتے ہو۔ اُس روز آروکا لوٹنے سے قبل میں نے میکناب نامی ایک زردرُو لڑکے سے رابطہ کیا۔ وہ لڑکا آدھا کالا اور آدھا چینی تھا۔ اگرچہ اُس کی رنگت ذرا سی گندمی اور بال تھوڑے سے گھنگھریالے تھے لیکن وہ اس خامی پر قابو پا سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ چینیوں سے ذرا گہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ میکناب مجھے ایک شخص کے صحن میں فولادی طبلہ بجاتے ملا — وہ کسی کارنیوال کے لیے تیاری کر رہے تھے — اور میرا خیال ہے کہ میکناب کے آروکا آنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ اُس کے پاس کارنیوال کے طائفے کے لیے لباس خریدنے کی رقم نہیں تھی۔

لیکن وہ میرے ساتھ چلا گیا۔ میں نے اُسے مرَینا اور خاکی کچھا پہنا کر دُکان میں سامنے کھڑا کر دیا اور اُسے ہدایت کی کہ اگر وہ کارنیوال میں شمولیت کے لیے رقم چاہتا ہے تو جس قدر چینی زبان بول سکتا ہے بولے۔ میں نے پچھلے کمرے میں رہتے ہوئے ڈبل روٹیاں بنانا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ میں نے میکناب کو ایک پُرانا چینی اخبار، پڑھنے کے لیے نہیں صرف اُس پر جھوٹ موٹ

نظریں دوڑانے کے لیے، دے دیا کیوں کہ وہ تو انگریزی بھی کم ہی پڑھ سکتا تھا۔ میں نے ایک بڑا سا چینی کیلنڈر بھی لے کر دیوار پر ٹانگ دیا، جس پر ایک چینی عورت پھول اور آبشار بنی ہوئی تھی۔ اور جب یہ سب تیار ہوگیا تو میں اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر خُدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ اب بھی مجھے وہ پُرانا پیغام مل رہا تھا لیکن اِس بار دوستانہ اور پُرمسرت انداز میں: ''نوجوان، تم صرف ڈبل روٹیاں بناؤ۔''

اور تمھیں پتا ہے کہ اِس سے ایک اَور مسئلہ حل ہوگیا۔ میں پریشان تھا کہ اب میں بیکری کو کیا نام دوں: نیوشنگھائی، کیفون، ہانگ کانگ، نان کنگ، یا نگ زے کیانگ۔ لیکن جب دوبارہ وہ پُرانا پیغام آیا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ کیا نام ہوگا۔ میں نے پُرانا نام کھرچ دیا ــ یہ بات تمھیں بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی ــ اور میں نے چینی اخبار سے چند الفاظ نقل کرنے کے لیے ایک مناسب سا پینٹر بلایا۔ اُس سے میں نے وہاں جلی حروف میں لکھوایا:

یَنگ مین بیکرز YUNG MAN BAKERS

میں نے دوبارہ کبھی دُکان کے سامنے والے حصے میں اپنا چہرہ نہیں دِکھایا۔ اور تمھیں شیخی بگھارے بغیر بتادوں کہ میں بہت اچھی ڈبل روٹیاں بناتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ آروکا کے لوگ احمق نہیں ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ جلد ہی میں نے خُوب کما لیا کہ میں نے پہلے ایک شاخ اَریما اور پھر دُوسری شاخ پورٹ آف سپین میں کھول لی۔ شروع میں اصل چینیوں کا ملنا مشکل ہوا جو ایک کالے کی ماتحتی میں کام کرسکیں لیکن دولت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ آج تم جب بھی ینگ مین کی کسی دُکان کے پاس سے گُزرتے ہو تو تمھیں کاؤنٹر کے عقب میں چینی کھڑا نظر آتا ہے۔ اُن میں سے کچھ کو تو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ ایک کالے کی نوکری کر رہے ہیں۔ کاروبار کا یہ رُخ میری بیوی سنبھالتی ہے، اور میری بیوی چینی ہے۔ وہ سامنے والے راستے سے آتی ہے۔ پس اب میری طرف دیکھو۔ سنوبل، پینٹن اور کوبلہو کے کاروبار میرے مرہونِ منّت ہیں۔ میں دُکانوں میں عقبی سمت سے جاتا ہوں۔ لیکن ہر سوموار کی صبح میں نہایت اکڑتے ہوئے میرین سکوائر سے ہوتا ہوا بینک میں سامنے کے راستے سے جاتا ہوں۔

vvvv

۱۔ merino: ایک قسم کی بھیڑ اور اُس کی اُون سے بنا ہوا کپڑا یا لبادہ۔

۲۔ Sabbath: اردو میں سبت مراد ہفتے کا دِن۔ عبادت کے لیے ہفتہ وار تعطیل کے دِن؛ یہودیوں کا ہفتے کا دِن اور عیسائیوں کا اتوار لیکن یہاں یہ ایک ساحلی قصبے یا شہر کا نام ہے۔

اِمرے کیرٹیس
(IMRE KERTESZ)

۲۰۰۲ء کے نوبیل انعام کے لیے ہنگری کے ناول نویس اِمرے کیرٹیس کے نام کا اعلان کرتے ہوئے نوبیل کمیٹی نے اُنھیں اس اعزاز کا حق دار قرار دینے کی وجہ یُوں بیان کی: ''تاریخ کے ظالمانہ اور وحشیانہ فیصلوں کے خلاف فرد کے ناتواں تجربے کی تاکیدی لکھتیں ضبطِ تحریر میں لانے پر۔''

اِمرے کیرٹیس نے ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک یہودی نژاد خاندان میں ہنگری کے دارالخلافہ بُڈاپیسٹ میں جنم لیا اور آج کل اپنی بیوی اور دو بچّوں کے ہم راہ برلن، جرمنی میں مقیم ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران جب وہ محض ۱۴ برس کے تھے تو اُنھیں دیگر ہنگروی یہودیوں کے ہم راہ ہنگری سے نکال کر آش وِتز (Aushwitz) کے قیدی کیمپ اور بعد میں وہاں سے بُخن والڈ (Buchenwald) بھیج دیا گیا۔ جہاں سے اِمرے کو ۱۹۴۵ء میں محصوری سے آزادی نصیب ہوئی۔

ہنگری لوٹ کر اِمرے کیرٹیس نے بُڈاپیسٹ کے اخبار ''Vialogosseg'' میں کام کرنا شروع کر دیا لیکن ۱۹۵۱ء میں اُنھیں کمیونسٹ پارٹی کے منشور کی حمایت پر اخبار کی نوکری سے نکال دیا گیا۔ دو برس کی فوجی خدمات کے بعد اُنھوں نے آزاد لکھاری کی حیثیت سے لکھنا شروع کیا۔ چُوں کہ ابتداء میں اِمرے کی تخلیقات کو ہنگری میں زیادہ پذیرائی نہیں ملی لہٰذا وہ جرمنی منتقل ہو گئے۔ اُنھوں نے نطشے، ہوف مینستھل، شنِٹظلر، فرائڈ، روتھ، وِٹ جینٹا ئین اور کینیٹی جیسے اہم مصنفوں کی تحریروں کو جرمن سے ہنگروی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان تمام کا اُن کی اپنی لکھتوں پر بھی گہرا اثر ہے۔

ہنگری میں پذیرائی نہ ملنے کے باوجود بھی اِمرے کیرٹیس نے ہنگروی زبان میں لکھنا اور چھپوانا جاری رکھا۔ اِمرے کیرٹیس کا پہلا ناول ''Sorstalansag''، جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ''Fatelessness'' کے نام سے ہوا، ۱۹۷۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اُن کا یہ معروف ناول ایک پندرہ سالہ لڑکے جارجی (جارج) کے آش وِتز، بُخن والڈ اور زیت (Zeitz) کے قیدی کیمپوں کے تجربات کو بیان کرتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس ناول کو نیم آپ بیتی قرار دیا ہے لیکن اِمرے کیرٹیس اسے خُود نوشت تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں:

''میں جب بھی کسی نئے ناول پر سوچ و بچار کرتا ہوں تو ہمیشہ آش وِتز کے بارے میں سوچتا ہوں۔''

تاہم اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ ''Fatelessness'' نہایت سادہ نوع کی خُود نوشت ہے۔ اِمرے کیرٹیس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اُنھوں نے اس ناول کے لیے خُود نوشتی اُسلوب ضرور اختیار کیا ہے لیکن یہ آپ بیتی ہرگز نہیں ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب یہ ناول منصۂ شہود پر آیا تو اسے پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اِمرے کیرٹیس نے عدم پذیرائی کے اس تجربے کو اپنے ناول ''Fiasco'' میں شامل کیا ہے۔ اس نوع کے ناولوں کی ایک تثلیث ہے جس کا تیسرا ناول ''Kaddish for a Child Not Born'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ جس میں Fatelessness ناول کا ہیرو جارجی کووس دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں اِمرے کا ناول ''Galley Dairy'' اشاعت پذیر ہوا۔ یہ روزنامچہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۹۱ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے اور اسے افسانوی نثر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اسی روزنامچے کی توسیع ''Chronicle of a Metamorphosis'' ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آئی جو ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء کے واقعات پر مبنی ہے۔ یہ بھی خُود کلامی کے انداز میں ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہے۔

اِمرے کیرٹیس کی بنیادی حیثیت ایک ناول نویس کی ہے جنھوں نے سترہ سے زائد ناول تحریر کیے جن میں سے صرف آٹھ کا انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ مندرجہ بالا پانچ ناولوں کے علاوہ اُن کے تحریر کردہ ناولوں میں The Pathseeker، A Detective Story، The Failure، The Union Jack، A Language in Exile، The Liquidation وغیرہم شامل ہیں۔

۱۹۸۹ء کی سیاسی ہلچل کے بعد اِمرے کیرٹیس عوام کے سامنے زیادہ آنا شروع ہوئے۔ اُنھوں نے بے شمار خطاب کیے۔ اُن کے خطابات کو مختلف مجموعوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اُن کے ناول Fatelessness پر اسی نام سے فلم بھی بنی جو خُود نوشتانہ عنصر زیادہ لیے ہوئے ہے۔ یہ فلم ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء میں عالمی سطح پر سینما گھروں کی زینت بنی۔

حیرت انگیز بات ہے کہ اِمرے کی صرف ایک مختصر کہانی ''The Sworn Statement'' کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے جس کا اُردو ترجمہ اس مجموعے میں شامل ہے۔ البتہ دُوسرا ترجمہ ''ٹائیں ٹائیں فش'' اُن کے ناول ''Fiasco'' کے پہلے باب کا ترجمہ ہے لیکن یہ باب ہر لحاظ سے ایک افسانے کے تمام محاسن لیے ہوئے ہے اور اگر نہ بتایا جائے تو قاری اسے بطور مختصر کہانی ہی لے گا۔

نوبیل انعام کے علاوہ اِمرے ۱۹۹۵ء میں Bandenburger Literaturpries، ۱۹۹۷ء میں Leipziger Buchpries zur Europaischen Verstandiging، ۲۰۰۰ء میں Harder Pries اور WELT-Literaturpries، ۲۰۰۱ء میں Ehenpries der

اور ۲۰۰۲ء ہی میں Robert-Bosch-Stiftung اور Hans Shal-Pries جیسے اہم ادبی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔

اپنے نوبیل خطبے ''میں نے پا لیا'' (Eureka) میں اِمرے کیرتیس نے اپنے تخلیقی فن، اُسلوب، تخیل اور موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''میں جس شے پر سب سے زیادہ غور وخوض کرتا ہوں وہ ہے ''موضوع''۔ میرا دماغ ہمہ وقت اس پر سوچ و بچار میں غرق رہتا ہے۔ اسی لیے میں لکھت کو سب سے نجی چیز گردانتا ہوں۔ لکھت۔ ...... ہم کس کے لیے لکھتے ہیں؟ جان پال سارتر نے اس سوال پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ ...... اگر کوئی لکھاری کسی خاص سماجی طبقے یا گروہ کا منتخب کرتا ہے، جسے وہ نہ صرف مسرت فراہم کرنا چاہتا ہے بلکہ اُس پر اثر انداز بھی ہونا چاہتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنے اُسلوب کو دیکھنا ہوگا اور اُن مناسب ذرائع کا تجزیہ کرنا ہوگا جن کے ذریعے وہ اُس طبقے یا گروہ پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ وہ کس طرح یقین کی اس حد کو پہنچ سکتا ہے کہ اُس کے قارئین درحقیقت کیا چاہتے ہیں؟ وہ ہر ایک سے تو دریافت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ یہ کرتا ہے تو اچھا نہیں کرتا۔ پس اُسے اپنے تخیل پر بھروسا کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ یہ کرتا ہے تو اچھا کام کرتا ہے ...... لکھاری کس کے لیے لکھتا ہے؟ جواب واضح ہے کہ وہ اپنے آپ کے لیے لکھتا ہے۔ میں اس جواب تک اس طرح پہنچا کہ میرا کوئی قاری ہے نہ مجھے کسی پر اثر انداز ہونا ہے۔ ...... البتہ میرا ایک مقصد ضرور رہا ہے ...... یوں کہ مجھے کسی کے لیے نہیں لکھنا تھا اس لیے میرا مقصد محض زبان، اُسلوب اور موضوع کے سوا کچھ نہیں رہا ...... سب سے زیادہ مشتبہ سوال یہ ہے: ہم کیوں لکھتے ہیں؟ ...... اسے میں نے اپنے ناول ''شکست'' (Failure) میں بیان کیا ہے کہ میں ایک دفتر کے خالی برآمدے میں کھڑا تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ کی گونج سنائی دی۔ ایک عجب ہیجان نے مجھ پر تسلط جما لیا ...... چاپ بلند ہوئی، اَور بلند، اَور بلند ...... دکھائی نہ دینے والے فردِ واحد کے قدموں کی نمایاں چاپ ...... اور پھر یکا یک مجھے لگا گویا میری سماعت میں ہزار ہا قدموں کی چاپیں گونجنے لگی ہیں ...... ہر فن کار ایسے لمحات سے آشنا ہے۔ کسی نہ کسی لمحے اُنھیں یکا یک محرکات مخاطب کرتے ہیں ...... میں فن کارانہ الہام کی اقسام بندی نہیں کر رہا ہوں بلکہ دریافت کا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں ...... یہ لمحات طویل تاریخ رکھتے ہیں ...... سگمنڈ فرائیڈ نے اسے کچلے ہوئے دماغ کے دوروں میں دریافت کیا ہے۔ وہ درست ہوسکتا ہے۔ میں بھی درست ہوں۔ لیکن میرا رجحانِ طبع منطقی استدلال اور طلسماتی ادراک کی جانب ہے اور ہمہ نوع غیر منطقی آمد میرے لیے غیر ارضی ہیں۔ پس میں وژن کی بات کرتا ہوں ...... کیا آمریت کے تسلسل کی محدود اور بے زار آزادی میں کوئی لکھک سے زیادہ آزادی کا تصور کرسکتا ہے؟ ...... اب یقیناً میری منزل مختلف تھی۔ میں سیدھے راستے سے تاریخ تک نہیں پہنچا بلکہ میں نے ایک مختلف راستہ اپنایا ...... میرے طریقے نے میری لازم بصیرتوں تک رہنمائی کی ......''

vvvv

ٹائیں ٹائیں فش
(Sworn Statement)

کاژونا ری نجیشی کی فنی کاوش۔

ہماری فرم کے مطالعہ بینوں نے آپ کے مسودے کا جائزہ لیا ہے۔اُن کی متفقہ رائے کی بنیاد پر ہم آپ کا ناول شائع نہیں کر سکتے۔

ہمارا خیال ہے کہ آپ نے اپنے تجرباتی مواد کو جس نوعیت کا پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے وہ نامناسب ہے، اس پر طرّہ یہ کہ بذاتِ خود موضوع بھی خوف ناک اور ژولیدہ بیاں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ خستہ حال تجربہ، بااین ہمہ، قاری کو مرکزی کردار سے جوڑنے میں ناکام رہتا ہے اور وہ اِسے عام انداز میں لیتے ہوئے عجیب ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ جب کہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مرکزی کردار باشعور ہونے کے باوجود، اپنے اِردگرد کے حالات وواقعات کی ظہور پذیری کا فوری ادراک کرنے کا اہل نہیں ہے (جبری مشقت کے لیے طلبی، زرد ستارے کا لازمی لگانا وغیرہ)۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار ہے کہ ارتکازی کیمپ میں آمد پر وہ ایک گنجے کو ''مشکوک'' کیوں سمجھتا ہے۔عبارت کے زیادہ تر ٹکڑے بدذوقی کے حامل ہیں جیسے: ''اُن کے چہروں سے بالکل بھی اعتماد ظاہر نہیں ہوتا تھا، جگ جیسے کان، بڑی بڑی ناکیں، عیّارانہ چمک والی دھنسی ہوئی بٹنوں جیسی آنکھیں۔گویا ہر لحاظ سے یہودی۔''

یہ واقعہ بھی حیرت انگیز ہے کہ نعش سوزی کا منظر اُس میں ''ایک خاص مذاق کے فہم اور ایک نوع کے طالب علمانہ مسخرا پن'' کو اُبھارتا ہے۔ جب کہ وہ جانتا ہے کہ وہ مقتل خانے میں ہے اور اُس کا یہودی ہونا ہی اُس کے قتل کر دیے جانے کی معقول وجہ ہے۔اُس کا روّیہ، لوگوں پر بے ہودہ تبصرے بھی قاری کو بھڑکانے اور مشتعل کرنے والے ہیں، جو ناول کا انجام پڑھنے کے بعد غم و غصّے کا شکار ہو سکتے ہیں کیوں کہ مرکزی کردار کا سلوک، اُس میں رحم دِلی کے عنصر کی کم یابی کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے اخلاقی فیصلوں کو کوئی جواز فراہم نہیں کرتا اور وہ دُوسروں ہی کو موردِ الزام ٹھیراتا ہے (مثلاً اُس عمارت میں بسنے والے یہودی خاندان کو اُس کا بار بار سرزنش کرنا)۔ہم اُسلوب کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہیں گے۔آپ کے اکثر جملے بے ڈھنگے، پیچ در پیچ نوع کے حامل ہیں اور افسوس ناک طور پر ایسے

جملوں کی جگہ جگہ بھر مار ہے: ''.....بحیثیت مجموعی .....'' ''فطری طور پر کافی'' اور ''اِس کے علاوہ.....''
پس ہم آپ کو مسودہ واپس بھیج رہے ہیں۔ آداب۔

''میں نے ایک ناول لکھا ہے۔'' میں نے انکساری سے اعلان کیا۔

''آہا!'' وان ڈی گرواِن نے جوش کا مظاہرہ کیا۔

''اور تم نے مجھے اِس کے بارے میں پہلے اشارتاً بھی نہیں بتایا۔'' سَیس نے مجھے طیش بھری نظروں سے گھورا۔

''وہ کب شائع ہوگا؟'' جیریینیڈ اس نے دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھا۔

''اصل بات یہ ہے کہ وہ کبھی شائع نہیں ہوگا۔'' میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟''

''ناشر نے اُسے مسترد کر دیا ہے۔''

''اوہ، سمجھ گیا۔'' جَن ہیر گرواِن نے ہلکے سے انجانے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔ لیکن اُس کا چہرہ بے تأثر ہی رہا۔

اُس کے برعکس سَیس میں دلچسپی کی رَو دوڑ گئی تھی: کس ناشر نے مسترد کیا ہے اور کیوں؟ وہ جاننے کا متمنی ہو رہا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ وجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اُن کی طرف سے مجھے ایک برہم کرنے والا نامعقول خط ملا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یا تو اُنھوں نے ناول کو سمجھا ہی نہیں یا پھر سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ میں نے بتایا کہ لگتا ہے کہ جیسے اُن کے خیال میں ناول انتہائی خالص قسمت کو پست کرتا ہے، اُس میں بے ڈھنگی گستاخی ہے اور اُس کا انجام انحراف ہے۔

''ناول کس بارے میں ہے؟'' سَیس نے پُوچھا۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ میری پریشانی سے منکر نہیں تھے۔

''کوئی بھی ناول کس بارے میں ہوتا ہے۔'' میں نے محتاط ہو کر کہا۔ ''وہ زندگی کے بارے میں ہے۔''

سَیس اُن میں سے نہیں تھا، جن سے بہ آسانی جان چھڑوائی جا سکتی۔ ''ہم کچھ دیر کے لیے تمھارے حکیمانہ خیالات، جن سے تم ہمیں اکثر نوازتے رہتے ہو، ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔'' اُس نے انتباہ کیا۔ ''میں بالخصوص صرف اور صرف تمھارے ناول کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس بارے میں ہے۔ کیا اُس کا منظر نامہ موجودہ زمانے کا ہے؟''

''نہیں۔'' میں بولا۔

''پھر کس زمانے کا ہے؟''

''اوہ، زمانۂ جنگ کا۔''

''کہاں کی جنگ؟''

''آش وِٹز کی جنگ۔'' میں نے سرگوشیانہ کہا۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''بے شک۔'' وان ڈی گر واِن نے بے دِلانہ غم گساری سے کہا، گویا نیم تندرست ہو جانے والے جُذامی سے بات کر رہا ہو۔ ''تم اَوش وِٹز میں رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''کیا تمھارے ہوش وحواس رخصت ہو گئے ہیں؟'' سَیِس اپنے ابتدائی تحیّر سے نکل آیا تھا۔ ''اَوش وِٹز پر ناول! آج کل کے زمانے میں! کون پڑھے گا اُسے؟''

''کوئی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ وہ شائع ہی نہیں ہو رہا۔''

''یقیناً نہیں ہو گا کیوں کہ۔'' اُس نے پُوچھا۔ ''اُنھوں نے تمھاری گردن کے گرد شکنجہ کس دیا ہو گا؟''

''کیوں نہیں ہو گا؟ وہ ایک اچھا ناول ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا؟ اچھے سے تمھاری کیا مراد ہے؟''

''اَور کیا کہوں؟'' میں ہکلایا۔ ''اچھا سے مراد اچھا ہے۔ وہ کیا ہے کہ خُود وضاحتی ...... وہ کیا کہتے ہیں ...... اگر میں کہوں کہ ادب کے ایک رسیا کے لیے اچھا۔''

''ادب کے ایک رسیا کے لیے۔'' سَیِس نے جیر ینیڈ اس کی سمت یُوں نظریں اُٹھائیں جیسے میرے لفظوں کو تول رہا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے اپنا بڑا سا، تنگ اور چونچ جیسا لمبوترا سر میری طرف گھمایا۔ اپنی نیم وا آنکھوں، گالوں اور سُرخ وسفید چہرے کی زرد چھائیوں سے وہ مجھے ملول، غنودہ اور گرگِ باراں دیدہ لومڑ لگا۔

''ادب کے ایک رسیا کے لیے۔'' اُس نے پُرسکون لہجے میں دُہرایا۔ ''لیکن کس کے لیے اچھا ہے؟ کسی کو اِس سے کیا حاصل ہو گا؟ تم کہاں رہ رہے ہوں؟ تمھارے خیال میں تم کس سیارے پر ہو؟'' اُس نے بڑھتی ہوئی بےقراری سے دریافت کیا۔ ''اِس کاروبار سے وابستہ ایک بھی فرد نے کبھی تمھارا نام تک نہیں سُنا اور تم نے اُنھیں اپنا ناول بھیج دیا اور اُس پر مستزاد یہ کہ ایک ایسے موضوع پر ......''

''اور سَیِس۔'' مِجن ہیر گرواِن نے معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ ذرا بھی نہیں بدلا۔ یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے ...... وہ کیا کہتے ہیں ...... بزعمِ خُود چست وچالاک، کوے جیسا سیانا۔'' وہ

جن لفظوں کی تلاش میں تھا اُن کے مل جانے پر مسرت سے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''تمھیں یاد ہے جب.....''

لیکن اب سَیس اِس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی میں۔

''یعنی میں ایک اچھا ناول لکھنے کا اہل نہیں ہوں!'' میں نے اپنی طیش بھری غراہٹیں خود بھی سنیں۔

''اصل بات یہی ہے۔'' سَیس چلبلا ہو رہا تھا۔ ''میں خود اِسے بہتر طور پر بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے پُرانے دوست، تم سے کسی کو بھی اچھے ناول کی توقع نہیں۔ تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ایک اچھا ناول لکھ سکتے ہو؟ اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ تمھارا یہ ناول واقعی اچھا ہے تو اِس کی کیا ضمانت ہے؟ میرے پیارے دوست، کوئی بھی ماہر محض اپنی آنکھوں ہی پر اعتبار نہیں کرے گا! تمھارا نام نا آشنا ہے۔'' وہ اپنی اُنگلیوں پر شمار کرتا چلا گیا۔ ''تمھاری پشت پر کوئی نہیں ہے۔ موضوع مسائلِ حاضرہ پر نہیں ہے۔ کوئی بھی تمھیں ترپ کا پتا نہیں سمجھے گا۔ تم کیا توقع کرتے ہو؟''

''تو پھر کوئی۔'' میں نے دریافت کیا۔ ''اپنا شان دار ناول کسے بھیجے؟''

''تم یقیناً اپنے ہی بارے میں کہہ رہے ہو۔'' سَیس نے پول کھولا۔

''ہم فرض کیے لیتے ہیں۔'' میں نے اخفا رکھا۔

''سب سے پہلی بات، شان دار ناول جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔'' سَیس نے مجھے تحمّل سے آگاہ کیا۔ ''دُوسری یہ کہ اگر ایسا ہو بھی تو یہ نہایت بُری بات ہے۔ یہ ایک چھوٹا ملک ہے۔ اِسے نابغاؤں کی نہیں بل کہ دیانت دار اور محنتی شہریوں کی ضرورت ہے جو.....''

''ہاں، بالکل ٹھیک۔'' وان ڈی گروان ترحم بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن اب تو یہ کام کر بھی چکا اور غالباً اِس نے ناول مکمل بھی کر لیا ہے۔'' اُس نے محتاط انداز میں کہا۔ ''تم اُسے مجھے دے دو...... میں ابھی دو ہفتے مزید ٹھیروں گا، شاید میں اُسے پڑھ سکوں۔''

''یہ ہوئی نا بات!'' میں بولا۔ ''تم اُسے ترجمہ کر کے ہالینڈ میں شائع کروا سکتے ہو۔''

بجُن ہیر سکتے میں آ گیا۔ ''میں نے اُس کا ترجمہ ورجمہ نہیں کرنا۔'' وہ بولا۔ ''بعض اوقات مجھے خود زبان کے سلسلے میں مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔'' احتجاج کی وجہ سے اُس کی ہنگروی بگڑ گئی تھی۔

''وہ مکمل ہے..... کیا لفظ ہے..... لغو!..... بہر حال۔'' وہ آہستہ آہستہ مجتمع ہو گیا۔ ''حتّی کہ مغرب میں بھی ناولوں کی کامیابی آسان نہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہاں بھی تمھارے بڑے حمایتی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ کیا کیا ہے۔ اِس قسم کے موضوع سے دولت کمانے کے لیے تمھیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے! جرمنی کا اَین فرانک اِسی موضوع پر پہلے ہی لکھ چکا ہے۔ تم اِسے کیا کہتے ہو.....''

''پہلے ہی سے بہترین کام ہو چکا۔'' میں نے عجلت سے اُس کی مدد کی۔

''صرف یہی نہیں لیکن اگر تم کوئی نئی چیز پیش نہیں کر سکتے ...... تو کچھ اضافہ کرو...... حتیٰ کہ مغرب میں بھی کسی ناشر کا استرداد ی خط ناول کے لیے بہ مشکل ہی سفارشی خط ہوتا ہے ...... بلا شبہ جب تک۔'' اُس کے چہرے پر ایک ہچکچاہٹ بھرا پُر خیال تأثر نمودار ہوا۔ ''مصنف کی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو صرف تب بن سکتی ہے ......''

''میرا اپنی رہائش گاہ کے مقام پر پانچ روزہ حیرت کی خاطر اپنے آپ کو غارت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں!'' میں نے کہا۔

''کوئی اُمید!'' سَیس نے جلدی سے یقین دہانی کروائی۔ ''آج کل ایک کتاب کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، اتنا بھی آسان نہیں ہے۔''

''لیکن بھلے وقتوں میں ہوتا تھا!'' بجن ہیر گروان نے سکون کی سانس لیتے ہوئے حیرت و مسرت سے قہقہہ بلند کیا۔ ''تمھیں یاد ہے جب......''

''اب وہ ایسے معاملات سے نہایت مہذب اطوار سے نپٹتے ہیں۔'' سَیس نے تحمل سے بات جاری رکھی۔

''ہاں، میں نے سب ہی سے سُنا ہے کہ۔'' بجن ہیر نے ٹانگ اڑائی۔ ''یہاں حالات بہت اچھے ہیں۔ دُکانوں کی الماریوں میں دِل کش چیزوں کی نمائش دکھائی دیتی ہے۔ لوگ عمدہ لباس پہنتے ہیں ...... لیکن بڑا پیٹ کی پُرانے وقتوں والی وہ تمام عمدہ عورتیں اب کہاں چلی گئیں؟''

''وہ اب بھی یہیں ہیں۔'' سَیس بولا۔ ''صرف تم ہی اُن کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ پُرانے دوست، اب تم سترہ برس قبل والے جری سالار تو رہے نہیں ......''

قِصّہ مختصر کہ میرے ناول کا قِصّہ بیزار کُن گیت کے مانند حتمی طور پر ختم ہو رہا تھا۔ سَیس نے چند مزید پند و نصائح سے نوازا: مجھے مختصر کہانیاں لکھنا اور ادبی جرائد میں قدم جمانا چاہیے، اِس طرح وہ میرے آشنا ہو جائیں گے اور شاید میرے نام کا تذکرہ بھی کرنے لگیں۔ اُس نے کہا کہ پھر مجھے کسی ادبی گروہ میں شمولیت اختیار کرنا چاہیے، چاہے وہ جو بھی ہو، کیوں کہ ایسی چیز ہمیشہ غیر متوقع ہوتی ہے۔

''ادبی گروہ۔'' اُس نے مجھے تحمل سے سمجھایا۔ ''ایک لہر کے مانند ہوتا ہے، جو کبھی سر پر تاج سجا دیتا ہے تو کبھی غرقِ آب کر دیتا ہے لیکن وہ ہمیشہ، خواہ مَدّ پر ہو یا الحصاض میں (جزر) ہو، تہہِ آب کی بہت سی چیزیں اپنے ہمراہ لیے ہوتی ہے جنھیں انجام کار کسی نہ کسی ساحل پر پھینک دیتی ہے۔'' اُس نے معدّد مصنفین کی مثالیں دیں، جو اس راہ سے بخوبی منزل تک پہنچے تھے، کچھ جلد تو کچھ بہ دیر۔ جب کہ کچھ اس دوران میں خودکشی کرنے یا لکھنا ترک کرنے یا پاگل خانے پہنچ جانے کی وجہ سے اِس قطار سے

نکل گئے تھے لیکن باقی نے کام جاری رکھا اور تیس چالیس برسوں کے بعد، وہ عظیم مصنف بن کر سامنے آئے اور اصل بات یہ ہے کہ اُس کام کی بنا پر جسے پہلے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا۔ اگر وہ اُس وقت زندہ بچ رہے ہوتے تو اُن کے اعزاز میں تعریف و تحسین کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں اور یہ سب اُن قربانیوں کے مقابلے میں، جتنا اُنھیں ماضی میں نظرانداز کیا گیا تھا، نہایت ہی کم ہوتا۔

"یا پھر۔" اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تمھیں جوا کھیلنا پڑتا ہے۔ یُوں سمجھ لو کہ تمھیں ایک ایسے موضوع کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑتی ہیں جو، جیسا کہ کہتے ہیں، اُس وقت دھماکہ خیز ثابت ہو۔ اِس صُورت میں ممکن ہے کہ ایک غیرمعروف لکھاری راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چُھونے لگے کیوں کہ۔" سَیس کہہ رہا تھا۔ "وہ کتاب ٹھیک اُس وقت کسی ایک شخص یا کچھ افراد کے لیے سُودمند ہوتی ہے اور وہ اُسے دُوسروں کے کاموں میں کیڑے نکالنے یا پھریرے کی طرح حق یا مخالفت میں دلائل کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں۔"

مجن ہیر نے اِس بات کا سلسلہ مغرب سے جوڑا کہ وہاں بھی صُورتِ حال مختلف نہیں، گو وہاں کامیابی کے لیے مارکیٹ آزادانہ دوڑ لگانے دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی "غاصبین" کے روبرو سرنگوں ہونے سے بچنے کے لیے حربے آزمانا پڑتے ہیں۔ کسی نے عریاں ہو کر ملکہ کا استقبال کیا، کسی نے تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کیے یا کچھ لوگ متواتر ایک کے بعد ایک شادی کرتے اور طلاقیں دیتے رہے، یا اُنھوں نے مشکوک مذاہب اختیار کر لیے، یا پھر منشیات کے زیادہ استعمال سے ہسپتال پہنچ گئے۔ یہ تمام حربے اپنے آپ کو ذرائع ابلاغ میں رکھنے کے لیے اپنائے جاتے ہیں۔ خُود مجن ہیر وان ڈی گروان مزاحیہ کہانیاں لکھ لکھ اور اپنے آپ کو دُہرا دُہرا کر اُکتا چکا تھا۔ اُس کے پاس سنجیدہ ناول کے لیے ایک موضوع تھا اور اُس نے یہ بات اپنے ایجنٹ کو بھی بتا دی۔ ایجنٹ نے اعتراض میں ایک بھی لفظ نہیں کہا بس اُس کے سامنے دو معاہدے رکھ دیے۔

ایک معاہدہ اُنھی معمول کی مزاحیہ کہانیوں کے لیے تھا، جس میں معمول کے اعزازیے میں مزید ایک تہائی اضافے کے سوا کچھ نہیں تھا اور دُوسرا معاہدہ ناول کا تھا، جس کی رُو سے فاقوں تک نوبت لانے والی رقم کا اعزازیہ ملنا تھا اور اُس میں ایجنٹ کو یہ اضافی فوقیت حق کے طور پر حاصل تھی کہ وہ ناول کا آدھا مسودہ دیکھ کر چاہے تو یہ حقیر معاہدہ بھی ختم کر دے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں کبھی ناول کا معاہدہ نہیں کروں گا لیکن ابھی میں اِس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"یہی ہوتا ہے۔" آرپا ڈسَیس نے توجہ دِلائی۔ "کوئی بھی شخص ہمیشہ اپنی مرضی نہیں کر سکتا۔"

"دُوسری صُورت یہ ہے کہ قیمت تم خُود چکاؤ۔" مجن ہیر نے اضافہ کیا۔

وہ دونوں چالاک اور دُنیاوی سُوجھ بُوجھ والے شخص، خُوش کُن انداز میں اپنے درمیان پڑے مَگ کی قربت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پھر میرا دھیان اُن دونوں کی طرف نہیں رہا۔ ریستوران کا جھروکا بھر چکا تھا۔ خزاں کی دھوپ میرے منتشر دھیان ہی کے مانند پژمُردہ اور پریشان دِکھائی دے رہی تھی۔ دُوسرے لوگوں کی باتوں کے ٹکڑے بھی سَیسں اور جیرینیڈ اس کی مدہم گفتگو میں مدغم ہونے لگے تھے۔ رکابیاں کھنکھنانے لگی تھیں۔ کبھی کبھار سڑک پر کوئی بس چنگھاڑتی ہوئی گُزر جاتی تھی۔ میری دائیں جانب تلوار جیسی مُونچھوں اور استقلال والا گلے میں چمک دار رُو لگائے والا بڑی عمر کا شخص ایک لیے دیے رکھنے اور چہرے پر زبردستی کی مُسکراہٹ والی عورت کے سامنے بیٹھا تھا۔

''میں فلمیں دیکھنا پسند کرتی ہوں۔'' پتھر چہرے والی نے گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں سامَن کا ایک سینڈوچ تھا۔

''مجھے ڈی جور مُوسیقی اچھی لگتی ہے۔'' عورت نے مُسکراتے ہوئے خستہ انگریزی میں کہا۔ اُس کی مُسکراہٹ اُس کے اندازِ تکلم سے کہیں زیادہ پُراثر تھی۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، دو گٹھے اکٹھے باندھے گئے تھے۔'' پلّے کی ٹُوں ٹُوں جیسی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ آواز ضعیف خواتین کے جھرمٹ میں گھرے ایک کوتاہ ضعیف مرد کی تھی جس کی بڑی بڑی آنکھیں، کملایا ہوا چہرہ اور چندیا پر چپکائے گئے اِکا دُکا بال تھے۔ وہ ایک مشتعل بُوزار بندر کے سے مماثلت رکھتا تھا۔

اِسی بیچ میں نے جیسے اُڑتے اُڑتے سُنا کہ سَیسں نے آئندہ موسمِ بہار میں ایمسٹر ڈیم جانے کا ذکر کیا ہو۔

''یقینی امر یہ ہے کہ تب میں گھر نہ ہوں،'' ہجن ہیر نے کہا۔ ''بہار میں مجھے کچھ عرصے کے لیے امریکا جانا ہے لیکن بلا شبہ ایک مہمان خانہ.....'' تلوار جیسی مُونچھیں جھاگ سے لبریز بیئر کے گلاس میں غوطہ زن تھیں۔ ضعیف خواتین کی میز سے کھڑ کھڑ کی ایک تیکھی آواز اُبھری۔

''تم ہمیشہ بالکل درست جانتے ہو۔'' اُن میں سے ایک چلّائی۔ اُس کا چہرہ برہمی سے دمک اور لرز رہا تھا۔

''بے شک۔ مجھے ہر معاملے کے بارے میں فوراً ہی ٹھیک ٹھیک اطلاع دے دی جاتی ہے!'' عمر رسیدہ مرد غرایا۔ بدوضع بُوڑھیاں اچانک ہی ٹِک کر بیٹھتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔ عجیب وغریب وضع قطع والے بُوڑھے نے اُنھیں دیکھتے ہوئے بلند آواز میں پھنکارا۔ اُس کے مصنوعی دانتوں کی نچلی قطار دوبارہ اپنی جگہ پر قائم ہونے سے پہلے بُری طرح ہلنے لگی تھی۔

اِس دوران میں ہماری میز پر سَیسں کی چھوٹی انگریزی کار کے بارے میں بحث چِھڑ گئی تھی،

جسے کچھ اضافی پُرزوں یا کسی اَور شے کی ضرورت تھی۔ بعد کی گفتگو میں تجویز ہوا کہ وہ جیریلینیڈ اس کی غیر سیاسی مزاحیہ کتاب کو ترجمہ کرنے کی سعی کر کے اُس کے لیے ناشر تلاش کرے گا۔ ''اِس طرح آخر، مَیں بھی کچھ ڈچ سیکھ لوں گا۔ میں نے نا روینجن سے تو کچھ تراجم پہلے ہی کر رکھے ہیں۔ اگر میں نے یہ کام کیا تو تم میری مدد کر سکتے ہو۔'' اُس نے مسرت سے اعلان کیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے اِردگرد ہر شے حالتِ اضطراب میں اور بلبلے کے مانند تھی۔ ہر طرف سے تیکھی آوازوں کی ایک بھنبھناہٹ آ رہی تھی، جیسے غیر مرئی ٹیلی گراف کی تاریں غیر مرئی کھمبوں پر لگی ہوں: تجاویز، منصوبے اور توقعات ایک سرے سے دُوسرے تک برقی رَو کے کوندے کے مانند پھلانگیں لگا رہی تھیں۔ ہاں، کسی نہ کسی طور مجھے پیدا وار اور کھپت کی زندگی کے اُس وسیع وعریض نظام سے باہر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اُسی لمحے میری گرفت میں یہ بات آئی کہ یہی وہ چیز ہے، جس نے میری تقدیر کا فیصلہ کیا ہے۔ میں صارف نہیں ہوں اور نہ ہی صرف ہونے والی شے۔

''مجھے جانا ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے بھی مجھے روکنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔

''اب میں یہاں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔''

vvvv

لے مغربی افریقا کا سُرخ رنگ کا لمبی دم والا بندر۔

بیان برحلف
(Fiasco)

......ہماری خطائیں ویسے ہی معاف فرما جیسے ہم دُوسروں کو اپنے حقوق پامال
کرنے پر معاف کر دیتے ہیں اور ہمیں ترغیبِ گناہ کی راہ سے محفوظ رکھ اور
بُرائی سے بچا۔

پیش آمدہ بیان ایک دُوسرے بیان کے جواب میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں تاہم پھر بھی ہر لحاظ سے سرکاری سطح پر لیا گیا بیان ہے اور بلا اضافہ و ترمیم کے ایک خاص مقام، خاص دِن، خاص وقت میں شاملِ مسل کیا گیا، جس کی تفصیلات ہم یہاں درج کریں گے۔

یہ بیان محض اِس مقصد کے تحت نہیں دیا جا رہا ہے کہ ریکارڈ کو درست کیا جائے اور حقائق سے رُوگردانی یا اضافہ مقصود ہے یا ہمیں، مثال کے طور پر، حقائق کی اہمیت اور اتفاقاً سامنے والے سچ کی حیثیت سے اِس پر یقین ہے۔ اب ہمیں کسی بھی چیز پر اعتبار نہیں ہے۔ اگر مگر، سچائی اور جھوٹ کا بہرہ اور اندھا ہونا اب یکساں ہے۔ یہ محض اعتراف کی طاقت ہے جو ہمیں ہماری تنہائی کا رفیق بناتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ ہمیں ہماری انجام کار بصیرت کے لیے تیار کرتی ہے، جس کے خوف ناک نام کو یہ فی الفور ہمارے سامنے نہایت خُوش کن انداز میں پھلانگیں لگاتے میمنے میں بدل ڈالتی ہے کہ – یہ ہم پر صرف ابھی روشن ہوتی ہے۔ اختتام میں اعتراف کا ایک بھی لفظ کہے بغیر تسلیم کرتے ہیں کہ درحقیقت اِس کے حصول کے تعاقب میں ہم عرصۂ دراز سے تھے۔

* * *

اُنیس سو کچھ کے ایک عمدہ دِن میرے دماغ میں اچانک ایک مفید خیال آیا کہ میں کچھ روز– شاید دو یا زیادہ سے زیادہ تین روز – ویانا میں گزاروں۔ اپنی صحت کی خاطر کبھی کبھار کی تبدیلیِ آب وہَوا کی ناگزیریت میں کسے شبہ ہوگا۔ بے شک عمومی تخلیق کاری یعنی ذہنی مشقت کا تسلسل اُسی لمحے تر و تازہ کر ڈالنے والی مسرت میں بدل جاتا ہے، جس لمحے میں، اِس ملک کی سرحد پار کرتا ہوں۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی معاملہ ہے۔ مجھے کچھ خالصتاً ضروری نوعیت کے کاموں نے بھی اِس کی تحریک دی تھی۔ قصہ مختصر کہ مجھے وزارتِ ثقافت میں، جس کے تحت مَیں آسٹریّن مصنفوں کو ہنگروی زبان میں ترجمہ کرتا تھا،

ڈاکٹریٹ سے ایک رسمی ملاقات کے لیے جانا تھا۔ میرے تراجم حقیقتاً معتدل تھے اور اُنھوں نے خاصی توجہ حاصل کی تھی، جن پر وزارتِ ثقافت والوں نے اپنے مثبت اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ مزید برآں اُنھوں نے مجھے انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن سائنسز کی دعوت کے بارے میں چند روز قبل ہی بتا دیا اور ساتھ ہی آگاہ کر دیا کہ وہاں مجھے وِٹ جین سٹین *(Wittgenstein)* کے اُس وقت کیے ہوئے اپنے تازہ کار تراجم کا اعزاز یہ ویانا میں قیام و طعام کے اخراجات سمیت ادا کیا جائے گا--- ایک ایسا فیصلہ جو میری توقیر کا سبب بنا — تاہم جائے سکونت کے تمام مستلزم مسائل وغیرہم کی توضیح مناسب مقام پر ہوگی۔ میں یہاں یہ اضافہ ضرور کر دوں کہ ذہنی تر و تازگی کی خواہش سے ہٹ کر ہم سب میں اپنے آپ کو، چاہے ہم کسی بھی نوع سے تعلق رکھتے ہوں، ایک منفرد شخصیت سمجھنے کا زعم چھپا ہوتا ہے لیکن طویل عرصہ گزر جانے اور مدہم پڑ جانے والے اثرات کی بنا پر میرے اندر یہ تمنا نہیں اُبھرتی جس کی فوری وجوہات انفرادی آزادی کے وہ خیالات نہیں تھے، جن کا مسلمہ منبع بنیادی طور پر بے تابیوں میں تلاش کیا جاتا ہے، قابلِ مواخذہ بے صبرے پن (بیّن طور پر اچانک نمودار ہونے والا بے صبراپن) کی مجھے خود بھی ذہنی طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ باوجودے کہ آزادی کے تصورات جو — ناقابلِ تردید طور پر حالیہ مخصوص سرکاری مظاہر اور غیر ذمہ دارانہ اعلانات کی بنا پر پھلتے پھولتے دِکھائی دیے تھے۔

اِس مقصد کے لیے بڈاپیسٹ اور ویانا کے درمیان فوری نوعیت کے حامل ٹیلی فون کیے جاتے ہیں تاکہ وزارت اور انسٹی ٹیوٹ کی خواتین و حضرات کی یقینی آمد معلوم کر کے ارزاں مگر قابلِ اعتبار ہوٹل میں کمرے مخصوص کروائے اور اسی نوع کے دُوسرے فرائض سر انجام دیے جاسکیں۔ سوہانِ رُوح فکر بس یہی ہے کہ آیا میں اپنی مریضہ کو پیچھے تنہا چھوڑ جاؤں یا نہیں کیوں کہ اُس کی حالت نازک ہوتی دِکھائی دے رہی ہے۔ میں ٹرین کی ٹکٹ خریدنے کے ساتھ ساتھ نشست بھی مخصوص کروا لیتا ہوں۔ ٹھیک اُسی شام مجھے زکام اور بخار آ پکڑتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے ایک دانت میں درد ہونے لگتا ہے جس سے میرا چہرہ سُوج جاتا ہے۔ اُسی شب میرا واسطہ ایک ہول ناک بھوت سے پڑتا ہے۔ دروازے میں ایک کڑا نصب ہے اور اُس خفیہ طور پر دیکھنے والے دائرے سے، میں ایک نوجوان آدمی کو دیکھتا ہوں۔ جس پر نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرا نجات دہندہ مجھے ملنے آیا ہے لیکن پچھلی بار پُورے چار سال قبل نمودار ہونے والے بہروپ سے قطعی مختلف بہروپ میں۔ تب وہ سیدھا میرے بستر کے قریب اور اُوپر یُوں نمودار ہوا تھا جیسے سیدھا آسمان سے اُتر کر دیوار چیر کر مجھ تک پہنچا ہو، جو بظاہر اُس کی راہ میں ذرا بھی رُکاوٹ نہیں بنی تھی۔ سُرخ جھلک دیتی خُوش نُما داڑھی والے چہرے کی شک و شبہ کی پرچھائیں تک سے بالاتر لیکن ناقابلِ بیان عجز و انکسار کا تاثر لیے مجھ پر جمی اپنی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھوں سے میری موجودگی کو تسلیم کیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے، جو اگرچہ بھونڈا لیکن واضح

طور پر آشیر باد دینے والا انداز تھا، ایجاب بخشا کہ میں جس طرح کی زندگی بسر اور جو کچھ کر رہا ہوں ویسے ہی کرتا رہوں۔ اُس نے اِس ایجاب کو میرے ذہن میں ایک روشن سچائی کے مانند نقش کر دیا۔ جس کی حِدّت عرصۂ دراز تک میرے دِل میں جاگزیں رہی اور آج بھی وقتاً فوقتاً میرے اندر پھیلتی رہتی ہے۔

دروازے پر موجود وہ نوجوان اُس سے ذرا بھی مشابہت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اُن بے گھر لوگوں میں سے دِکھائی دیتا تھا جو شہر کی خستہ ترین گنجان آباد تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر یکا یک ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ اُس کی شرابیوں جیسی درماندہ حالت اور مُنھ رنگی ہوئی خشخشی داڑھی سے ڈھپا ہوا تھا لیکن مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ اِس طرح وہ اپنے آپ کو مشکوک ہونے، میری مریضہ کے ساتھ فضول اور استوار ہو جانے والے اوہام زدہ تعلقات کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہ میری مریضہ کے پاس کبھی کبھار آتا تھا (اور میں اِس بات سے پہلے سے آگاہ تھا) مثلاً کبھی مبلّغ بن کر تو کبھی کچھ اور۔ ایک بار تو اُس نے انجیل تک فروخت کی تھی۔ وہ اِس بار بھی اُسی کے بارے میں دریافت کرنے آیا تھا۔ گو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سچ سے کام لے رہا ہے لیکن وہ جو کہہ رہا تھا اُس میں ایک لفظ بھی مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کے مانند مجھے جانچ رہا تھا تا کہ اپنے روّیے کو میرے سلوک کے موافق بنا سکے۔ لیکن جُوں جُوں میرے اندر ایک رذیل لیکن نا قابلِ اختیار بے اعتباری بڑھتی گئی تُوں تُوں وہ بھی اُسی میں ڈھلتا چلا گیا۔ اگر چہ اُس کا چہرہ اور نیلی آنکھیں اب بھی عجز و انکسار کا پیکر بنی ہوئی تھیں گویا اُسے ذرا سا بھی اندازہ نہ ہو کہ اُس لمحے اُس کا ہاتھ کس مقصد کے لیے اُٹھا ہوا تھا۔ کیوں کہ اُس وقت اُس کا ہاتھ دھاگے کے مانند خفیہ طور پر دیکھنے والے سوراخ میں سے گُزر رہا تھا۔ میں خوف زدہ ہو کر پہلے ڈیوڑھی کے عقب اور پھر کچن میں پلٹا۔ لیکن ہاتھی کی سُونڈ یا عظیم الجثہ اژدھا کی مانند میرا تعاقب کرتا ہوا اُس کے بازو کا سرا، ہاتھ سے زیادہ شکنجۂ آہنی بنا میرا کھوج لگا تا میرے ہر نقشِ پا پر تھا۔ میں مدد کے لیے چلّانے لگا کیوں کہ اب تک میں نے اُسے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ اب میں اُسے اپنے قاتل کے رُوپ میں دیکھ رہا تھا، جس کے بارے میں ہم ایک لفظ کا بھی اظہار نہیں کر سکتے۔ دُوسرا دُنیاوی رشتہ ایذا دینے اور ایذا سہنے والے رشتے میں بدل گیا تھا اور مؤخر الذکر رشتہ نا قابلِ فہم اور مضحکہ خیز انداز میں پُولیس کو پُکار رہا تھا کہ وہ مجھے بچا لے۔ میری بیوی کے جھنجھوڑنے پر میں جاگا تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ میں نے خواب دیکھا تھا یا حقیقت تھی۔ لیکن فرق نہایت مبہم تھا۔ بہر حال معاملہ جو بھی تھا یا میں نے جو محسوس کیا تعبیر کا متقاضی تھا اور جیسا کہ اکثر اِس سے قبل، جیسا کہ میں اب بھی ہمیشہ کرتا ہوں، اور پھر کم و بیش اِسے ہمیشہ ہی (بہتری کی کم یابی کے سبب) اپنا شعبہ بنانے کی خاطر کرتا آیا ہوں: میں اِسے لکھت میں تلاشتا ہوں۔ لیکن پتا چلتا ہے کہ یہ تو قبل ازیں ہی واضح تھا کہ جسے علل سے ہٹ کر میری ناف کا درد، میرے اپنے آپ کے ساتھ تعلّق، عمومی اور خُود سے خصوصی الفت کہا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ فانی ہونے کی یادگار نشانی — اور اِس بار

میرے اچھے دِنوں کے مانند ہمت افزا تسکین نہیں ملی کہ متشدد دانہ اور سر دمہر دھمکی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ درویش پیغام دے رہا ہے کہ وہ مصیبت میں ہے۔ اُسے نظر انداز کیا گیا ہے اور وہ سزا دینے کی تیاری کر رہا ہے — بے شک — مجھے جان سے مارنے کی سزا۔ یہ اُس کا اپنا کہنا تھا۔ میں نے پھرتی سے شکستہ خط میں اپنی نوٹ بُک کے ایک صفحے پر لکھا: ''اپنے طور پر چوکس رہو۔ بنیادی خُوشی میں رابطہ ڈھونڈ و۔ تخلیق ہر شے میں پوشیدہ ہے۔ لکھو۔ میرے اِرد گرد کے دُوسرے لوگوں پر بھی توجہ دو۔ تنہائی ڈھونڈو، لیکن اگر ممکن ہو تو کسی بھی شے کو مجرمانہ طور پر برباد کیے بغیر تنہائی کی تخلیق کو اپنا طریق بنالو۔''

اگلے روز، صبح سویرے، مجھے ٹیلی فون پر مطلع کیا گیا کہ میری مریضہ چل بسی ہے۔ وہ میرے نہ ہونے سے مری تھی اور میں خُود بستر سے جالگا تھا۔ کیا یہ جائز توجیہہ تھی؟ ایک قابلِ قبول عذر؟ ہر صُورت میں جزوی الزام تو ہمیشہ ہی عائد ہوتا ہے۔ میں بخار کے باوجود، ڈانت نکلوانے دندان ساز کے پاس چلا گیا۔ اگلے روز ہسپتال میں، جہاں میری مریضہ نے دم توڑا تھا، میں مجزنُما اور مقدم رُوحانی مشیر آئی سے بات کرتا ہوں۔ ''اب ہمارے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں مرنے اور تم زندہ رہنے جا رہے ہو۔ لیکن خُدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کون زیادہ خُوش حال ہوگا۔'' وہ خاموش مُسکراہٹ کے ساتھ حوالہ دیتا ہے۔ ہم طویل بات چیت کرتے ہیں۔ میں پھر خُود کو ہر لحاظ سے بے رُوح لیکن کسی نہ کسی طور اپنی متانت برقرار رکھی ہوئی اور انجام کار سُودمند نوکر شاہی کی چکّی میں جوت لیتا ہوں۔ میں موت کی تصدیقی سند حاصل کرتا ہوں، جنازے کے انتظامات دیکھتا ہوں اور سب سے بڑھ کر — ادائیگیاں ہی ادائیگیاں کرتا ہوں۔

غور وخوض کے بعد بالآخر میں ویانا جانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ دوبارہ ٹیلی فون، معذرتیں، پُرانی ملاقاتیں منسوخ اور نئی طے پاتی ہیں۔ ایک بار پھر آنے جانے کے لیے نئی نشست مخصوص کرواتا ہوں۔ ٹکٹ گھر کی خاتون بالکل غیر ضروری طور پر خیال ظاہر کرتی ہے کہ عام طور آدھی ٹرین خالی ہوتی ہے۔ لیکن میں تمام سفری پریشانیوں اور خدشات سے محفوظ و مامون سفر کرنا پسند کرتا ہوں۔ اب مجھے یہ پروا نہیں کہ میں ضرورت سے زیادہ احتیاط برت رہا ہوں کیوں کہ پتا نہیں کیسے یہ میری زندگی کا اُصول بن چکا ہے۔ میں اِس سفر کو اپنے لیے یادگار سفر بنا دینا چاہتا ہوں۔ میں خُود کو اپنے آپ کا ایک سخی اور کھلے دِل والا دوست بن کر ایک یادگار دعوت دینا چاہتا ہوں۔ مجھے سفر کرنا اچھا لگتا ہے۔ اِس کام کو میں دِل سے پسند کرتا ہوں۔ جس طرح بَرن ہارٹ کا اپنے بارے میں بہ اصرار کہنا ہے اُسی طرح میں سفر پر جانے کے معاملے میں سدا سے اچھا اور واپسی کے معاملے میں بُرا ہوں۔ چار ہزار شلنگ کی گڈی میری میز کی دراز میں پڑی ہے لیکن کیا میں اپنے اُن دوستوں میں سے کسی ایک کو موقع دوں جنھیں میں اپنے ''مستقل قارئین'' گردانتا ہوں۔ وہ پہلے ہی آگاہ ہیں کہ اڑھائی برس قبل، ۱۹۸۹ء میں، مجھے ایک ماہ کے قیام کے

لیے وظیفہ ملا تھا۔ میں اُن پر ظاہر ہی نہ کروں کہ میں نے تین برسوں کی ساری رقم کا۔ جتنی رقم کی قانوناً اجازت ہے ۔ زرِمبادلہ یا سفری چیک خرید رکھے ہیں یا میرے پاس رقم موجود ہے۔ (عام طور پر مجھے اُن قانونی بیرے یا قواعد کے گھٹتے جانے کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا جس میں زندگی بسر کرنا میرا مقدر کر دیا گیا تھا۔ وہ بیرے اور شقیں جو میری پیدائش سے پہلے سے اب تک لاگو ہیں، میرے خلاف ہی رہی ہیں ۔ اکثر صرف اور صرف میرے وجود کے خلاف ۔ اور حد یہ کہ وہ شقیں شاید عملاً میرے ہی خلاف استعمال ہوسکتی تھیں ۔ باوجود یہ کہ اُن کا منشا میری حفاظت تھا لیکن عملاً وہ اس کے اُلٹ تھیں ۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے مطالعے کا کوئی فائدہ نہیں تھا) ۔ پس میں نے ۱۹۸۹ء سے محفوظ کیے ہوئے چار ہزار (۴۰۰۰) شلنگ بلا حیل وحجت جیب میں ڈالے ۔ میرا ویانا میں کنجوسی سے کام لینے کا ارادہ نہیں ۔ اگر مجھے اپنی آمد کی شام پتا چلتا کہ کونزرتھوس یا موسیک۔ ویرینسال میں کوئی اچھی تقریب ہونے والی ہے تو میں وہاں ضرور جاؤں گا، اگر مجھے باہر کھانا کھانے کی خواہش ہوئی تو میں باہر کھاؤں گا اور اسی طرح جو جی چاہا کروں گا۔

مجھے اپنے اسی حلفی بیان میں اِس ذکر سے بھی صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ میرے سفر سے پہلی والی شام مجھے ایک مفید ٹیلی فون موصول ہوا۔ فون کرنے والا دنیاوی لحاظ سے نہایت پُرانا اور سچا دوست تھا۔ اُس نے دریافت کیا کہ اُس کے پاس ایک اضافی ٹکٹ ہے تو کیا میں ورڈس ریکویم کو سننا چاہوں گا۔ پس میں نے اپنے سفر سے پہلی والی شام اوپیرا ہاؤس میں ورڈس ریکویم کو سنا۔ گھر لوٹتے ہوئے ''لبرا اڈومائن ڈی مورتے ایٹرینا'' کے بول میرے دماغ میں گونجتے رہے لیکن ساتھ ہی میرے اندر شکوک وشبہات اور گہرے جذبات میں جنگ بھی جاری رہی ۔ میں نے ہر شے کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے لیکن اُس روز دوبارہ زندہ ہونے کا خیال مجھے گرما نہیں سکا۔ جیسا کہ مارات کا یہ معروف قول ہے:

''تب تو میں کبھی نہیں مرنا چاہتا۔''

لیکن شب بھر میرے پلک نہ جھپکنے کی وجہ یہ نہیں تھی بلکہ سفر کو اعصاب پر طاری کر لینے کا طفلانہ خوف تھا جو بچپن ہی سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ جوان ہونے اور جوانی گزر جانے کے بعد اب سالوں بعد بھی مجھے بچہ بنا دیتا ہے۔ میں اس کے سامنے بے بس ہوں۔ یہاں تک کہ جب بھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ کسی قسم کی طفلگی میں مبتلا ہو گیا ہوں تو میں اس احساس کے سامنے شدید مزاحم ہوتا ہوں لیکن میں نے بتایا نا کہ میں اِس کے سامنے بے بس ہوں۔ یُوں کہہ لیں کہ طفلگی کے اِس پوشیدہ زہر کے اثرات غیر محسوس طور پر غالب نہیں آتے بلکہ میرے بدن کو اپنے شکنجے میں شراب یا کسی اور نشہ آور چیز کے مانند جکڑ لیتے ہیں۔

مجھے کہا گیا تھا کہ میں پانچ بجے اُٹھ جاؤں لیکن میں سویا ہی کہاں ہوں اور چار بجنے والے ہیں۔

مجھے علی الصبح اُٹھنا بہت بُرا لگتا ہے۔ لیکن جب مجھے صبح سویرے اُٹھنا پڑتا ہے تو میں وقت سے پہلے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ بے چاری تھکن کی ماری میری بیوی میرے لیے ناشتہ تیار کرتی ہے اور سفر کے لیے کچھ سینڈوچ، ایک نارنجی اور چاکلیٹ کی ایک تختی رکھتی ہے۔ شرقی سٹیشن پر اچانک ایسا سماں پیدا ہو جاتا ہے جیسے دریائے گنگا کے کنارے ہندوؤں کا کوئی جشن ہو رہا ہو۔ وہاں لنگڑے لُولے بھکاری، آوازیں لگاتے خوانچہ فروش اور چال باز نظر آنے والے شرابی ہیں۔ میں اُن کے درمیان سے سبک خرامی سے چلتا ہوا اپنے کندھے پر جھولتے بیگ پر حفاظتی نقطۂ نظر سے اپنا ہاتھ مضبوطی سے رکھ لیتا ہوں۔ میں بے اعتبارا ہو رہا ہوں۔ مجھ میں احساس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں، میں بے حس ہو جاتا ہوں۔ ٹرین آ جاتی ہے۔ میری مطلوبہ ٹرین آ جاتی ہے۔ اُس میں میری مخصوص کروائی ہوئی نشست بھی موجود ہے جو کھڑکی کے ساتھ والی ہے۔ اب میں قدرے محفوظ ہوں۔ گرم رکھنے والا نظام چل رہا ہے۔ دروازے خود کار طور پر بند ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ والی نشست خالی پڑی ہے۔ میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں بیٹھے گا۔ میرے اندر ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ میں اپنے رسائل و جرائد کا پلندہ کھول لیتا ہوں۔ روزنامہ اخبار کی خبریں مجھے بیزار کرتی ہیں۔ اندرونی صفحے پر سرِفہرست مضمون اخلاقیات کے کچھ احساس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہ چیز بھی حالات میں بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ ایک اخلاق باختہ دُنیا میں اخلاق یافتہ ہونا بذاتِ خود اخلاق باختگی ہے۔ میں کیا کروں؟ مجھے نہیں پتا۔ کتابی، دیانت داری کی بات ہے کہ مجھے نہیں پتا۔

میں روزنامہ تہہ کر کے سامنے والی خالی نشست پر رکھ دیتا ہوں۔ پھر میں میگزین ۲۰۰۰ اُٹھا لیتا ہوں۔ مشمولات کی فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ اِس جریدے میں میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز کون سی ہوگی۔ ایک نابغہ کا روزنامچہ — اِس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں۔ مجھے مضمون پڑھنا ہے۔ گو یہ نہایت مختصر لیکن عبارت آرائی سے خُوب مزّین ہے۔ نابغہ کے پہلے ہی الفاظ سے میں متاثر ہو جاتا ہوں، لفاظی کی طاقت کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتا ہوں، میرے اندر طفلانہ محرومی اور شیخی بگھارنے والے تجسس کا امتزاج پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سانس تک تھام ڈالنے والے خاص ماحول کے اثرات مجھے اپنی گرفت میں اتنا لے لیتے ہے کہ میں محض اُن مقامات پر سانس لے سکتا ہوں جہاں کہیں تحریر میں جُھوٹ یا کھوکھلا پن میرے لیے شگاف چھوڑتا ہے۔ اُس میں اور میرے روزنامچے میں ذرا سا خم دار لیکن نہایت سنجیدہ تعلّق تھا۔ میں نے اُسے کیا عنوان دیا تھا؟ گیلے (Galle)۔ بجرے کا روزنامچہ۔ اِس کے علاوہ نشاندہیوں اور اختلافات کی وسعت کی بنا پر اِس ملک میں ایک نابغہ اپنے آپ کو مجرم تصوّر کرتا ہے تا آں کہ وہ اُن مُٹھی بھر منفی نابغۂ روزگاروں میں سے نہ ہو جائے جو قاتل اور غاصب ہیں۔

اچانک بند کھڑکی سے ایسی عفونت اندر آنے لگی جیسے وہاں قریب ہی بدبودار انسانی فضلے کو کریدا اور اس کا تجزیہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے رسالے سے نظریں اُٹھائیں۔ وہ تا تاریا تھا۔ لُوٹ مار کے بعد تاخت و تاراج کیا ہوا شہر، ایک تکلیف دِہ مِل کر دُکھ بھرا نظارہ، عفریت شکلوں والوں گھرے بادلوں کی تہیں ہر شے کو مٹاتی ہوئیں، بانسری جیسی سیٹیاں نکالتیں، سیدھی آسمان تک یوں جا رہی تھیں جیسے کسی نے کسی چھوٹی سی عبارت یا زندگی کے مختصر دوران میں بے پر خطِ تنسیخ پھیر دیا ہو۔ اِس کا کوئی جواز نہیں تھا بس نا جائز انتفاع، سخت فوجی مہم، حقیقت جیسی معقولیت تھی: میں نے ڈالی کو جواب دیا۔ ایک ایسا زمینی منظر جس میں زمین کا وجود نہیں تھا، اب دہشت ناک تھا۔ محض تیرہ و تار۔ میرے پاسپورٹ کی جانچ پڑتال پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ اب یکا یک ہی ڈبے میں ہنگروی کسٹم خاکستری والوں کا غول داخل ہو جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک سیاہ رُو شخص میری طرف بڑھا۔ وہ بلند آواز میں بتاتا ہے: ہنگروی کسٹم۔ وہ سب سے پہلے مجھ سے، میرا پاسپورٹ جذبات سے عاری لیکن انکساری سے، یوں طلب کرتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو نہایت حقیر سمجھ رہا ہو۔ میں کوٹ ٹانگنے والی کھونٹیوں سے ٹنگی اپنی چمڑے کی جیکٹ کی اندرونی جیب سے پاسپورٹ نکالنے کے لیے، دوبارہ اپنی نشست سے اُٹھا۔ اُسی لمحے اچانک ایک نامعقول خیال میرے دماغ میں کوندے کے مانند لپکا کہ باہر سُورج اپنے جوبن پر ہے اور اِس شخص میں احساس نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ شاید دیر تک ڈالی کے غیر معمولی مطالعے نے میری نرگسیت اور اوائلِ طفلی ہی سے محبت کی پیاسی ادبی رُوح بہ یک وقت دفاع اور ہدف بننے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اِس دوران میں وہ شخص اپنا کام ختم کر لیتا ہے، پاسپورٹ بند کرتا ہے اور اُسے میرے حوالے کرنے ہی والا ہوتا ہے کہ پہلے ہی جیسی جذبات سے عاری اور قدرے تیز لہجے میں بلا رکھ رکھاؤ صاف لہجے میں کہتا ہے کہ، جو شاید تازہ تازہ سالوِیدار ڈالی کے مطالعے میں ڈوبے ہونے کے باعث میری سماعت چھیدتی ہوئی اندر ہی اندر مجھے نقصان پہنچاتی ہے۔ میں کتنی رقم (یا زرِ مبادلہ، غالباً میں فوری طور پر فرق بیان کرنے کا اہل ہی نہیں ہوتا) "لے کر جا رہا ہوں۔" میں بلا سوچے "ایک ہزار شلنگ۔" میں ذرا بھی غور کیے بغیر، فوری ہی جواب دے دیتا ہوں۔ "ایک ہزار شلنگ۔" کہتے ہوئے وہ نہایت غیر معمولی ردِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ "بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ۔" وہ بار بار زیرِ لب یوں کہتا ہے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو (بالکل ویسے ہی جیسے کسی زمانے میں سٹیج کے ہدایت کار کروایا کرتے تھے)۔ بہت زیادہ کیوں؟ میں تحیر بھری پریشانی سے دریافت کرتا ہوں کیوں کہ وہ بلا سوچے سمجھے "بہت زیادہ شمار" کر لیتا ہے۔ میں اُس کی بات سمجھ نہیں پاتا۔ وہ استدعا کرتا ہے کہ کیا میں اُسے ایک ہزار شلنگ دِکھاؤں گا۔ میں کانپ اُٹھتا ہوں کیوں کہ میں یہ سب پہلے سے جانتا ہوں، ایسے اہم تجربات سے پہلے بھی زندگی میں گزر چکا ہوں، خاص حالات میں ایک نوع کی بے کسی و بے بسی سے واسطہ پڑ چکا ہے اور مجھے اب بھی ادراک ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہونے والا

ہے وہ اُس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اِسی کے ساتھ اطمینان اور خُود کو اُن کے حوالے کرنے کا احساس بھی جُڑا ہوا ہے۔ یہ تقدیر کا لکھا جسے جھیلنا پڑتا ہے؛ ہمیشہ غیر مشروط اور بلا تسلسل۔ چاہے کوئی اِس لکھے کو اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعاؤں میں بھی یاد رکھتا ہو — اور پشیمان بھی نہ ہو — تب بھی اُسے اِسی سنگ دلانا انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ البتہ ایک شے، جسے ہم بچی کھچی بصیرت کے باوجود واضح طور پر دیکھ نہیں پاتے، جیسا کہ اِس صُورتِ حال میں تھا، ہم ایسے حالات میں متبادل طریقے چاہتے ہیں۔ ہم یقینی طور پر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کسی ہمہ وقتی غلط کاری کا حصّہ بن چکے ہیں جو — یا جس کا ہمیں یقین ہوتا ہے — مکمل طور پر ہمارے اور ہماری اصل کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں سرتاپا دِق کرتی ہے لیکن ہم نہایت سادہ لوحی سے اِس یک رُخ جھکتے چلنے اور ہمیں ریزہ ریزہ کرتی حرکات والے والے میکنزم پر نظر رکھنے کے اہل ہونے کے بجائے بے توقیری سے سر جھکائے اپنے شکم کے اطراف کے نشیب و فراز کی حرکات کو دیکھتے چلے جاتے ہیں۔

پس میں دوبارہ اپنی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ میرا ہاتھ کانپ تو نہیں رہا ہوتا لیکن کسی طلسمی طاقت کے زیرِ اثر کوئی کرشماتی طور پر تذبذب ضرور ہوتا ہے۔ میں دوہرے کیے ہوئے ہزار ہزار کے چار نوٹوں میں سے ٹٹول کر ایک نکالتا ہوں۔ اگلا سوال ہوتا ہے کہ میرے پاس ہنگروی رقم کتنی تعداد میں ہے۔ میں جواب دیتا ہوں کہ سات صد فورنٹس۔ وہ مجھے اُنھیں دِکھانے کے لیے کہتا ہے اور میں دِکھا دیتا ہوں۔ ہم گنتے ہیں۔ پُورے نکلتے ہیں۔ اور اب مجھے نہایت پُر اصرار لہجے میں اپنی جیبوں سے تمام چیزوں کو نکالنے کا حکم ملتا ہے۔ میں جیبیں بھی خالی کر دیتا ہوں: ایک کاغذی رُومال، برقی ریل گاڑی (ٹرام) کا ایک موسمی ٹکٹ، ایک بڑا چاقو، بھُولنے میں پکی ہوئی ایک تکونی ٹکیا۔ سب سے الگ کھڑا تجزیہ نگار، جس کی ایسے موقعوں پر مجھ پر چیپلینیسق (Chaplinesque) مسخرے سے کچھ زیادہ ہی نظر ہوتی ہے، جو سدا ٹٹولنے والے انداز میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اُنھیں ہلاتے ہوئے معذرات خواہانہ مُسکراہٹ کے ساتھ سر ناقابلِ فہم انداز میں مارتا رہتا ہے۔ بلا شبہ، بالآخر وہ شخص اشارہ کرنے پر مجبور ہوگیا اور اُس نے اپنی شہادت کی اُنگلی میری اُس جیب کی سمت اُٹھائی جسے میں نے دانستہ بھُلا دیا تھا۔ شاید اُس کے وجدان نے مجھے حیرت میں مبتلا کر دیا ہوگا لیکن اب، اِس لمحے، مجھے کوئی شے متحیّر نہیں کرتی اور نہ بعد میں کبھی کرے گی کیوں کہ مجھے یہ تلخ تجربہ ہو جاتا ہے کہ اُس کی چَنّی آنکھ — کم از کم ایک حد تک تو — کسٹم اور ایکسائز والوں کی آنکھوں کی طرح بے خطا ہے جو اُس زمانے سے ہزاروں برسوں کا تجربہ اور مکر و فن رکھتی ہے — جب مصریوں، فارس والوں، ایٹروئیا (Etruia) والوں (Etruscans) یا اِنکاس والوں نے کسٹم کا نظام وضع کیا تھا — اُس آنکھ نے اُس نہایت طویل عرصے قبل ہی میرے ہاتھ کے متذبذب ہاتھ کو بھانپ لیا تھا۔

لہٰذا میں جیب کو طفلانہ حماقت کے ساتھ مطلوبہ شے کی تلاش میں کھنگالتا ہوں لیکن ساتھ تین ہزار شلنگ سامنے لانے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔ میں واقعی سکتے میں آجاتا ہوں! بہر حال کسٹم افسر اُنھیں موقع ہی پر ضبط کر لیتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ وہ اُنھیں اِس بنا پر ضبط کر رہا ہے کہ میں نے صرف ایک ہزار شلنگ ''ظاہر'' کیے تھے جب کہ درحقیقت اُسے میرے پاس سے چار ہزار شلنگ ملے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ جو سچ ہو اُس سے منکر نہیں ہوا جا سکتا۔ تاہم میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا اِس جُھوٹ کے علاوہ مجھ سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے۔ آخراً سے میرے پاس سے جو رقم ملی ہے وہ میری اپنی ہے، نہ کسی اَور کی اور نہ چوری کی۔ درست، کسٹم والا کہتا ہے لیکن میں پُوچھتا ہوں کہ تمھارے پاس ''برآمدی پروانہ'' ہے۔ میں حقیقتاً ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔ مجھے اِس چیز کے بارے میں بالکل پتا نہیں ہوتا تھا، نہ ہی کسی نے مجھے اِس کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے تو بس یہی سُن رکھا تھا کہ ہر شے بلا قدغنوں کے ہوتی ہے۔ ماسوائے کارِ سرکار کے مخصوص ایام کے کوئی بھی بینک میں اپنی رقم آزادانہ جمع کروا اور نکلوا سکتا ہے۔ مجھے اپنے ہر دورے کے لیے ہر بار پاسپورٹ کے اندراج کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی کبھی مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ میری رقم، چاہے وہ اصل شکل میں (یعنی مغربی) ہو، ریاست کی ملکیت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اِتنا اہم معاملہ نہیں: وہ شخص کہتا ہے لیکن اِس تحریر کے ساتھ ہی وہ میرے تین ہزار شلنگ کے ساتھ ساتھ میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیتا ہے۔

اِس کے ساتھ ہی سحر ٹُوٹ جاتا ہے اور میں ایک جھٹکے سے اپنے آپ میں لوٹ آتا ہوں۔ میں اُسے نہایت پُر زور انداز میں یہ نہ کرنے کے لیے کہتا ہوں کیوں کہ دِن بارہ بجے ویانا میں وزارت کی ایک شخصیت سے میری ملاقات طے ہے، سہ پہر کو ایک اَور دفتر میں مجھے جانا ہے اور ہوٹل میں کمرہ پہلے سے مخصوص ہو چکا ہے۔ میں خالی جیب ویانا نہیں جا سکتا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ کوئی برآمدی پروانہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ وہ مجھے ایسی صُورتِ حال میں نہ دھکیلیں۔ ''بہت خُوب، مسٹر کیریٹس۔ اپنی نشست پر تشریف رکھیں۔ اب اِس کا وقت نہیں رہا۔ ہمیں اَور بھی کام کرنا ہیں۔ میں آپ سے بعد میں ملوں گا۔'' یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جو کسٹم افسر ادا کرتا ہے اور پھر وہ میری رقم اور پاسپورٹ سمیت وہاں سے چلا جاتا ہے۔

میں بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے ایک خاص نوع کی برہمی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ وقت گُزرنے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ درحقیقت سب کے سامنے میری توہین ہوئی ہے۔ حد یہ کہ یہ خیال بھی مجھے کچھ خاص پریشان نہیں کرتا کیوں کہ اِس طرح کے کاموں میں اِس طرح تو ہوتا ہے۔ میں ڈبّے میں پھیلتی ہوئی نظر دوڑاتا ہوں۔ میرے متوازی جڑواں نشست پر صرف ایک خاتون بیٹھی ہے جس سے میرا فاصلہ کافی زیادہ ہے کیوں کہ نشستوں کی دو رَوؤں کے درمیانی راستے کا فاصلہ خاصا چوڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک رسالے میں مستغرق ہے۔ اِس طرح سے بیٹھے ہوئے لوگ عام طور پر کسی چیز پر دھیان

نہیں دیتے۔ ویسے بھی وہ سارا واقعہ بمشکل دو منٹ میں رونما ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ میرے اور کسٹم کے تفتیش کار کے سوا۔ یہاں تک کہ اُس کے دُوسرے ساتھی بھی جو کافی فاصلے پر دیگر مسافروں کے ساتھ مصروف تھے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ حقیقتاً ہم دونوں کے بیچ کیا واقعہ ہوا ہے۔

میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا فرانسیسی عوام کے نام پر، وہ برسرِ عام میرا سر قلم کر دیں گے؟ ظاہر ہے اُنھیں آسٹرین سرحد پر پہنچنے سے پہلے پہلے میرا پاسپورٹ لوٹانا پڑے گا۔ تاہم مجھے تین ہزار شلنگ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ نقصان کے اِس خیال سے میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا دولت کے ساتھ کوئی جنونی رشتہ نہیں ہے۔ بس اِتنا ہے کہ وہ ایک لحاظ سے بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس وقت اُس رقم کے ہونے سے مجھے کئی فائدے پہنچتے۔ اور پھر ویانا میں میرے دوست بھی تو ہیں جو، اگر ضروری ہوا تو، اِن نامساعد حالات میں بخوشی میری مدد کریں گے۔

لیکن میں نے صرف ایک ہزار شلنگ ہی کیوں بتائے (جب کہ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ چار ہزار شلنگ کے بارے میں نہ بتانا محض ایک معمولی نوعیت ہی کا جرم تو ہے)؟ مجھے نہیں پتا۔ میں اِس معاملے میں اپنے دماغ پر خُوب زور ڈالتا ہوں لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ بس مجھے نہیں پتا۔ اُس کسٹم افسر میں نرمی نام کو نہیں تھی اور اگر ہوتی تو معاملہ کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک بھی ایسا کسٹم افسر دِکھا دیں جس میں ذرا بھی نرمی ہو۔ کیوں، تم نے ایک لاش پر گولیاں کیوں برسائیں؟ میں نے فوراً ہی چار ہزار شلنگ کی تمام رقم کا اظہار کیوں نہیں کر دیا؟ میں نہایت دھیان سے اپنے اندر دیکھتا ہوں۔ میں بعض معاملات میں اپنی ذات کی تحلیل نفسی کو فخر سے بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اب بھی نہیں پتا۔ ایمان داری کی بات ہے، کیتایا، مجھے نہیں پتا۔

میں رسالہ اُٹھا کر ڈالی کا سحر انگیز مضمون پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میں ڈالی اور تحلیل نفسی کرنے والوں کے درمیان تعلّق کو بالکل ویسے ہی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، جیسے بجے سنورے چہروں اور سونے کے مابین بیّن تعلّق سمجھنے کی سعی کیا کرتا ہوں۔ سچی بات ہے کہ میں اِس تعلّق کو بھی نہیں سمجھ پاتا گو میں اپنا ذہن خُوب دوڑاتا ہوں۔ دُوسری طرف مجھے یہ خیال بھی بار بار آتا ہے کہ، خواہ اِسے عقل تسلیم کرے یا نہ کرے، ایسے روابط یقیناً اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جو شخص چہروں اور سونے کے مابین قریبی تعلّق کی اتھاہ تک پہنچ جاتا ہے مِل کہ فتح مندی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کہ ہاں! اُسے اپنی گرفت میں بھی لے لیتا ہے وہ ڈالی ہی کے مانند امیر کبیر ہو جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ڈرامائی صُورتِ حال کی مخالفت نہ کرے تو یہ درخشندگی مکمل طور پر دانش وری سے مبرا ہوتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اب میں واقعی متجسس ہو رہا تھا کہ ڈالی کے بدن کا کون سا نرم حصہ اُس کی اپنی بے عیب اور خالص و حقیقی نابغہ سے واقعی متحرک ہوا تھا اور کون سا حرص بھرے بٹوے سے، جس کا تعلّق اُس کے کشکول کے اعمال سے تھا اور

ہمیشہ اِس پر نظر رہتی تھی کہ وہ کب خالی ہو۔ درحقیقت وہ خواہ اپنی زندگی کو کتنا ہی عیوب سے پاک بنا کر پیش کیوں نہ کرے، حقیقت یہی ہے کہ وہ کبھی مکمل طور پر بے عیب نہیں ہو سکتا۔ میں غور کرتا ہوں۔

اب ہم کوماروم (Komarom) اور گیویر (Gyoyr) پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ وقت پَر لگا کر اُڑا چلا جا رہا ہے۔ میرا پاسپورٹ کہاں ہو سکتا ہے؟ میں پریشان ہونے لگتا ہوں اگرچہ اُتنا نہیں، جتنی لائق فائق شخص (یا شاید اشخاص) سے واضح طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ بالآخر وہ شخص پہلے سے بھی زیادہ جلدی میں اور تند خو انداز میں دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ میرا پاسپورٹ لوٹانے کے بجائے وہ مجھ سے بچا ہوا ہزار شلنگ کا نوٹ طلب کر کے مجھے مطلع کرتا ہے کہ میں ہیگیے شیلوم (Hegyeshalom) کے سرحدی اسٹیشن پر ٹرین سے اُتر جاؤں۔ میں اُس کی بات تحیّر کے عالم میں سنتے ہوئے احتجاج کرتا ہوں۔ اُس پر میرا احتجاج بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ وہ معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُسے میرے "ظاہر کیے ہوئے" ایک ہزار شلنگ کے بجائے چار ہزار ملے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ، جو درحقیقت واضح طور پر حکم ہوتا ہے، میں ہیگیے شیلوم میں، اُسے آخری ڈبّے میں آ کر ملوں، جس کے بعد وہ چلا جاتا ہے۔

میں کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہتا ہوں یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پتّھر کے ستون کے مانند۔ پھر میں یکا یک اچھل کر کھڑا ہوتا ہوں۔ مجھے اپنے اندر وہی آگ دہکتی محسوس ہوتی ہے جو اشتعال، زندگی اور مشتعل اعمال کے لیے جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ میں اپنے کندھے کا بیگ سامان والے چھجے سے جھپٹتا ہوں اور ٹرین کے آخری ڈبّے تک پیر پٹختا ہوا جاتا ہوں۔ خاکی وردی والے سب سے آخری ڈبّے میں شیشے کے بند دروازے کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ نہایت خوش باش ہیں۔ مجھے شیشے میں سے سامنے ہی اُس آدمی کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے کہ وہ بھی وہاں موجود ہے۔ مختصر سی دستک کے بعد میں دروازہ کھولتا ہوں۔ وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور میری جانب ناراضی بھری نگاہوں کے تیر پھینکتے ہیں۔ فوراً ہی میرا احساس دِل کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ ایک عملی فن کار کی حیثیت سے میں جارحانہ کارروائی کے بجائے خوش آمد کو ترجیح دیتا ہوں۔ اِس بار خُدا میری مدد کرتا ہے۔ میں ایک شکست خوردہ کردار کی صُورت میں نمودار ہو رہا ہوتا ہوں۔ اولاً میرے ہاتھ یُوں بھی بندھے ہوتے ہیں کہ میں غیر دوستانہ ماحول میں اپنے مقدمے کے دلائل دینے کا اہل نہیں۔ نہ منطقی اور نہ ہی مربوط دلائل۔ ثانیاً طیش میری آواز کی راہ میں رکاوٹ بن کر اُس کا حلق ہی میں گلا گھونٹ دیتا ہے۔

میں ایک بار پھر چڑچڑے پن سے اسے ویانا میں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہوں۔ وہ دہراتا ہے کہ اُسے اُن میں کوئی دِلچسپی نہیں ہے۔ میں اُس سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے میرا پاسپورٹ اور ایک ہزار شلنگ لوٹا دے اور بقایا تین ہزار شلنگ اُس کے پاس امانتاً رکھنے کی پیش کش کرتا ہوں کیوں کہ میری پہلے سے محفوظ کرائی ہوئی نشست سے عیاں ہے کہ میں اگلی شام کی ٹرین سے واپس لوٹ آؤں گا

تب ہم معاملہ صاف کر لیں گے۔ لیکن تین ہزار شلنگ کی بات پر اُس شخص کے چہرے پر مُسکراہٹ (جو مکمل طور مہربان نہیں ہوتی) پھیل جاتی ہے۔ مجھے اُنھیں ہر حال میں چھوڑنا پڑے گا کیوں کہ وہ ایک ہزار شلنگ بھی پاسپورٹ کے ساتھ ضبط ہو چکے ہیں۔ وہ اختلافی تکلیف دہ حقیقت دہراتا ہے کہ اُنھوں نے میری بتائی ہوئی رقم سے زیادہ مجھ سے برآمد کی ہے۔ مجھے اُس کی اِس عظیم گرفت پر مبارک باد دینے کے سوا کچھ نہیں سُوجھتا ہے۔ وہ مجھے میرے ۴۰۰۰ شلنگ سے محروم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جب کہ ہر شخص آگاہ ہے کہ لوگ مجھ سے کہیں زیادہ، لاکھوں میں رقم ملک سے منتقل کر رہے ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ اگر میرے پاس کسی ایسے شخص کے بارے میں معلومات ہیں تو میں اُس کے بارے میں رپورٹ کروں لیکن میں دُوسروں پر بہتان تراشی سے گریز کروں کیوں کہ اُنھوں نے بہر حال صرف مجھ سے "بتائی ہوئی" رقم سے زائد برآمد کی ہے۔ جواب معقول تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ مجھے ادراک ہو جاتا ہے کہ میں نے جام سے تلچھٹ تک پی لی ہے اور اپنے لیے ایک قطرہ تک نہیں رہنے دیا۔ میں اُن پر دروازہ دھڑام سے بند کرتا ہوں اور اُس عقبی ڈبے کے سب سے پچھلے حصّے میں بڑھتے ہوئے تجسس کے ساتھ ہنگیے شیلوم پہنچنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔

ہنگیے شیلوم! عشروں سے موجود علامت: باہر سے ایک سیر گاہ، اندر سے قید خانہ اور قطار در قطار کتبے، جو ایک بار اِس میں داخل ہو جائے اُس کی تمام اُمیدیں ختم۔ کام ہر شخص کی عزت اور نیک نامی میں اضافے کا سبب بنتا ہے — کام ہی آزادی بخشتا ہے۔ بہ طور ایک حقیقت کے، بہ طور ایک مقام کے اور بہ طور ایک ٹرین اسٹیشن کے وہ ایک مہیب اور دُھول بھرا گڑھا تھا۔ میں بے شمار بار خاکی وردی والوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوں۔ مجھے ایک چُونے پھرے بے ساز و سامان کمرے میں انتظار کرنا پڑتا ہے جس کے عقبی حصّے میں ہجوم کو روکنے والا آڑا ترچھا جنگلا نصب ہے، جس کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں وہاں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے علاوہ ایک اَور شخص کو بھی ٹرین سے کھینچ کر وہاں لایا گیا ہے۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص ہے اور اُس کی عمر کا اندازہ ممکن نہیں۔ موٹی سی توند دردناک طور پر پاجامے سے نکل کر خمیدہ ہو رہی ہے، بیلٹ اور پُھولی ہوئی توند کے درمیان ایک بالاکش ہے۔ وہ سُرمئی قمیص، سُرمئی جیکٹ اور سُرمئی پاجاما پہنے ہوئے ہے۔ چہرہ قدرے موٹا اور عام سا، کمانی دار چشمے کے عقب میں ہر شے ناقابلِ ذکر اور توجہ کے نہایت کم قابل۔ جب نام نہاد بیان لیا جا رہا ہوتا ہے تو مجھے سننے میں آتا ہے کہ اُس کا پیشہ کسی قسم کے "شعبے کے سربراہ" کا ہے۔ وہ کش لیتا ہے، آہ بھرتا ہے، کھنگار کر اپنا گلا صاف کرتا ہے، اپنی عینک کا رُخ میری سمت کرتا ہے اور میرے پاس سے سبک خرامی سے گُزرتا ہے لیکن بے فائدہ کیوں کہ میں اُس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ میں اُسے میری طرح مصیبت کا مارا نہیں سمجھتا، نہ میں اُسے آپ بیتی سنانا چاہتا ہوں اور نہ ہی مجھے اُس کی کہانی میں کوئی دلچسپی ہے۔ مجھے نہایت ہی افسوس ہے۔ مجھ میں احساس نام کو نہیں

ہے۔اگر چہ میں اِس بے حسی کے ہاتھوں بے بس ہوں تاہم جس ناموزوں مستعدی بھری سرگرمی سے اُس نے اُس پر دستخط کیے تھے، جس پر اُسے دستخط کرنا چاہئیں تھے، وہ میں دیکھ لیتا ہوں۔کوئی پُکارتا ہے۔وہ باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا چھوڑ کر لوٹ آتا ہے۔ٹھنڈے کمرے میں ہَوا کا جھونکا میری گردن اور پیروں سے ٹکراتا ہے۔پیٹرول کی مہک کی بڑی سی لہر اندر داخل ہوتی ہے۔باہر ایک ریل گاڑی میں پیٹرول بھرا جا رہا ہوتا ہے۔میں اُسے دروازہ بند کرنے کا کہتا ہوں۔وہ اُسے بند کر دیتا ہے لیکن دروازہ ہَوا کو روک نہیں پاتا اور فوراً ہی دوبارہ کھل جاتا ہے۔میں خود دروازے تک جا کر، اُسے اپنی لات سے ٹھیل سکتا ہوں۔مجھے اعتراف ہے کہ وہ میری شامت تھی لیکن تب میں سمجھ نہیں پاتا کہ میرے اِرد گرد جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہو رہا۔میں دیکھتا ہوں کہ شعبے کا سربراہ غصّے میں ہے۔وہ بھرتی سے مجھ سے یُوں دُور ہوتا ہے مبادا میرے غیر مہذب پن کی ہلکی سی یکساں روشنی بھی اُس پر نہ پڑ جائے۔وہ علامتی انداز میں کہتا ہے کہ جو ہو گیا سو گیا، چڑ چڑے پن کا اب کوئی فائدہ نہیں۔میں تڑ کی پٹڑ کی جواب دیتا ہوں کہ میں رتّی برابر چڑ چڑا نہیں ہوں لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ مجھے یہاں ہَوا اور انجن میں بھرے جانے والے ڈیزل کی متلی آور بدبو میں بٹھا کر کس بات کی سزا کی دی جا رہی ہے۔

میرے خیالات پلٹ کر دوبارہ ڈالی کے روزنامچے میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔اُس کے نطشے کے ساتھ تعلّقات چشمک کے حامل ہیں۔ہسپانوی اور جرمن تاثرانگیزی نے بہت عرصہ قبل مجھے اپنی سمت کھینچا تھا۔اِسی طرح اَورٹیگا (*Ortega*) بھی نطشے کا مُقلّد تھا اور یُونامُو (*Unamuno*) نے بہ آسانی نطشے کا نہایت بیزار کُن شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا تھا۔''نطشے مریل تھا۔اُس کی ذہنی حالت اِس قدر خراب تھی کہ وہ اُس وقت پاگل ہو سکتا تھا، جب اِس دُنیا میں یہ ضروری تھا کہ پاگل نہ ہوا جائے!'' ڈالی کا یہ فقرہ مجھے بہت برافروختہ کرتا ہے۔وہ اِس امر کو گرفت میں کیوں نہیں لاتا کہ نطشے کی صحت مندانہ دیوانگی ہی اُسے کے لیے باعثِ عزّ وشرف اور وضع دار، بھلا مانس ہونے کی دلیل ہے؟ اور پھر یہ کہ سونے کے پانی کا فوارہ اِس کثرت سے نطشے کے اندر یُوں ہی تو نہیں پُھوٹ پڑا تھا کہ وہ ''متوازن'' رہتا یعنی خود ڈالی ہی جتنا اور خود غرض؟ آخر کسی کو تو دُوسروں کے اخلاق و اقدار کی قدر و قیمت میں اضافے کے لیے صلیب چڑھنا ہی تھا۔

لیکن میں اپنا تخیّل جاری نہیں رکھ پاتا کیوں کہ میرا نام پُکارا جاتا ہے۔''پس وہ کسٹم والوں کی پیروی میں اُس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔'' وہاں وہ سب بیٹھے ہوئے ہیں، خاکی وردی والا بھی۔''ایک تمباکو نوشی کر رہا تھا، دوسرا کسی قسم کے کاغذات پھرول اور تیسرا اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔وہ تینوں اُس کی دُھندلی نگاہوں میں ایک دُوسرے میں اِس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ بالآخر سٹون کو وہ تینوں؛ تین سَروں اور چھے ہاتھوں والی مشین دِکھائی دینے لگتے ہیں۔''۔یہ میرے ناول ''نائیں نائیں فِش'' میں لکھے

ہوئے میرے اپنے الہامی الفاظ ہیں۔ وہ شخص، چیف کسٹم افسر، میرے سامنے کچھ کاغذات رکھتا ہے: میں اُنھیں پڑھ کر اُن پر دستخط کر دوں۔ یہ کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: بیان۔ پہلے ہی فقرے پر، جو کم وبیش تین سطروں پر مشتمل ہوتا ہے، مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لمحے ذہن بصیرت کی ایک لہر میرا احاطہ کر کے مجھ پر طاری اور حاوی ہو جاتی ہے۔ اِسی لمحے مجھے حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ مجھ پر کیا مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ میں یہ پکارنے کے قابل بھی نہیں رہتا: میں نے پا لیا! اب میں ہر چیز، ہر شے دیکھ سکتا ہوں/اب میں سب کچھ سمجھ سکتا ہوں/میں تمھارے پہاڑی کوے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن سکتا ہوں ...... ہاں، اِن تین سطروں کا مفہوم ہوتا ہے کہ ۱۶/اپریل ۱۹۹۱ء کو مجھے زرِ اور زرِ مبادلہ کے متعلقہ ضوابط کے بارے میں، رقم بیرونِ ملک ساتھ لے جانے کی آخری بالائی حد اور زیادہ رقم کی صورت میں خصوصی اجازت نامے وغیرہم کے بارے میں آگاہ کیا گیا اور اُس کسٹم افسر نے تحقیقات کیں وغیرہم۔ اُس نے اب تک مجھے آگاہ کیا ہی نہیں تھا۔ جوں جوں تحقیقات آگے بڑھتی ہیں، گو اُس کی یہ تحقیقات مجوزہ طریق کار اور مکمل طور پر ضوابط کے مطابق نہیں تھیں لیکن جرح کے دوران میں مؤثر ثابت ہوئیں، تو طے کیا گیا کہ طرزِ عمل میں ایک خاص طریقہ اپنایا جائے۔ پچھلے پچاس برسوں سے، جب سے میرا ملک اپنے ہی شہریوں اور سب سے بڑھ کر خود اپنی ہی خلاف مصروفِ جنگ ہے۔ ماسوائے تین برسوں کے ایک وقفے کے۔ ملک کا ہر قانون جامد ہو کر لاقانون ہو چکا ہے۔ اپنے طور پر جرم فرض کر لینے والے کسٹم افسر کے عیارانہ سوال کے مضمرات کو میں نے سمجھ لیا تھا: میری نگاہوں کے سامنے فوجی بوٹوں کی تھاپ، سیاسی جلوسوں کا شور وغوغا، علی الصبح دروازوں کی گھنٹیوں کی آواز اور سلاخیں جڑی کھڑکیاں اور خاردار تار والی باڑ گھوم گئی۔ وہ میں تھا جس نے اُس سوال کا جواب دیا تھا مگر ایک ایسے شہری نے دیا تھا، جو عشروں سے ذہنی و روحانی کرب واذیت میں مبتلا تھا، جس کا ضمیر، شخصیت اور اعصاب مردہ تو نہیں ہوئے تھے البتہ تباہ و برباد ضرور ہو چکے تھے۔ جو حقیقتاً ایک شہری سے زیادہ زندانی تھا۔ حتّٰی کہ اب بھی، یہاں بھی، سیکنڈ کے اِس لمحے میں بھی، مَیں سکتے کا شکار ہوں اور خود ترسی کے جذبات میرے اندر اُمڈ رہے ہوئے ہیں۔ یہ احساس کہ میں نے اپنی زندگی ویسے ہی بسر کی جیسے بسر کر رہا ہوں اور اِس مہلک زندگی نے میری زندگی پر اپنے بد اثرات مرتب کیے ہیں۔ اُس شخص نے۔ غالباً اُس سے آشنا ہوئے بغیر۔ اپنے مخصوص اطوار اور خاص سلوک سے مجھے آغاز ہی جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فیصلہ یک لخت نہیں ہوتا، نالش کی کارروائی بتدریج فیصلے میں بدلتی ہے (فرانز کافکا کا دی ٹرائل)۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اُس شخص کو، کسٹم افسر کو، اپنی روشن خیالی میں شریک کر سکتا ہوں نہ اُس کے ساتھ ہماری اِس بیّن سچائی کو بتا سکتا ہوں۔ وہ بھی انسان ہے، اُس کے بھی احساسات اور جذبات ہیں۔ اُس کے احساسات اور جذبات کو بھی عشروں سے ویسے ہی ٹھیس لگی ہے جیسی میرے احساسات اور جذبات کو

لیکن متضاد طور پر۔ لیکن ہمارا تعلق، وہ جو بھی تعلق ہے۔ سرکاری کہہ لیں یا صدفی صد متحارب۔ میں کبھی اُسے سمجھا نہیں پاؤں گا، تب بھی نہیں کہ وہ سمجھنے کا اہل ہو، گو مجھے اِس کا یقین نہیں ہے۔ پس میں اُسے بتاتا ہوں کہ جس صُورت میں یہ بیان ہے میں اُس پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ کیوں نہیں ہو؟ کیوں کہ یہ بات مبنی بر حقیقت نہیں ہے کہ اُس نے مجھے سوال جواب کرنے سے قبل قانون سے آگاہ کیا تھا یا کہ نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے، میں کہتا ہوں، اگر تم اِس میں میرا ایک جملہ شامل کر لو تو میں اِس پر دستخط کر دوں گا۔ میں کیا جملہ شامل کروانے کا خواہش مند ہوں؟ یہ کہ اُس نے چھان بین سے قبل مجھے وضاحت کرنے، معاملے پر غور و خوض کرنے کا بالکل موقع نہیں دیا کہ میرا فوری رد عمل سنجیدگی کا حامل ہو سکتا۔ اُس کا جواب ہوتا ہے کہ یا تو اِسی بیان پر دستخط ہوں گے یا پھر نہیں ہوں گے۔ میں تڑ کی پٹر کی جواب دیتا ہوں کہ پھر نہیں ہوں گے۔ اگرچہ غصّے سے لیکن ہولے سے وہ کندھے اچکاتا ہے۔ جب کہ ایک کم درجے کا زرد بالوں، مونچھوں اور داڑھی والا کسٹم افسر بیچ میں کود پڑتا ہے۔ ''میں گواہ ہوں۔ جب آپ نے اِسے بتایا تھا تو میں بھی وہیں تھا۔'' یہ اعلان مجھے متحیر نہیں کرتا بل کہ اب مجھے متلی آور کیفیت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ میں ایک عام نوعیت کی بات بتاتا ہوں کہ تاریخ کے سب سے پہلے مقدمے سے لے کر قریب ترین ماضی کے آخری مقدمے تک، ہر معاملے کے لیے ہمیشہ گواہی دستیاب ہوتی ہے۔ اپنے پاسپورٹ کے ہمراہ ۴۰۰ شلنگ کے ضبط کی رسید وصول کرتے ہوئے میں اضافہ کرتا ہوں کہ اِس ملک کے باسیوں کے لیے یہ یقین کرنا نہایت مشکل ہوگا کہ یہ مفت دستیاب ہے۔ میں فوراً ہی اپنی اِس بات پر معذرت کرتا ہوں کہ بہر حال یہ جملہ علامتی، بعینہٖ مفہوم اور عملاً کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ تصور اپنے پنجے گاڑے ہوتا ہے کہ، جسے میں خُود تسکینی کے احساس کا نام دے سکتا ہوں، جو کچھ پہلے ہو چکا اور جو کچھ اب ہو رہا ہے، سب کا سب میرے تخیل کی کارستانی ہے۔ میں ایک بار پھر از خود اپنے ''مستقل قاری'' کو، جو صرف ایک ہی ہے اور وہ شاید محض میں خُود ہی ہوں، مخاطب کر کے بتاتا ہوں کہ اِس منظر کا میرے الہامی ناول میں تقریباً لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی سلوک، یہی طریقہ کار، یہی متلی آور اور اپنے دائرے سے باہر قانونی موشگافیاں، جن سے وہ ایک شخص کے کپڑے تک اُتار کر اُس کی تذلیل کرتے، الزامات کی بوچھاڑ کرتے اور دھمکیاں لگاتے ہوئے اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ سٹون ہی کے مانند، جو ناول میں میرا اجنبی ہم زاد ہے، مجھے بھی اِس اُجاڑ، کریہہ سرحدی اسٹیشن کی وسیع و عریض دُنیا میں اُترنا پڑتا ہے، جہاں میں سکون میں ہوتا ہوں: خستہ حالی، تقدیر کے ہاتھوں مجبور اور مہلک طور پر پُرسکون۔ یقیناً زندگی فن کی نقالی بھی کرتی ہے لیکن صرف اُس فن کی جو زندگی کی نقالی کرتا ہے جسے قانون کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی شے حادثاتی نہیں ہے۔ ہر شے میرے لیے اور میرے ہی ذریعے جنم لیتی ہے اور جب میرا سفر اختتام پذیر ہوتا ہے تو حتماً میں اپنی زندگی کو سمجھ لیتا ہوں۔

میں باہر کھلی جگہ پر قدم رکھتا ہوں تو سُورج چمک رہا ہوتا ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ گھر فون کروں۔ جس کی پہلی وجہ اس کھردری، خشک اور حبس زدہ دُنیا سے نکلنا اور دُوسری ایک پیاری سی انسانی آواز دوبارہ سننے کی تمنا ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ اطلاع دینا بھی مقصود ہوتا ہے کہ اپنے منصوبے کے برعکس میں آج رات کا کھانا گھر کھاؤں گا۔ لیکن مجھے کوئی ٹیلی فون نہیں ملتا۔

میں انتظار گاہوں میں دیکھتا ہوں: کوئی نہیں ہے۔ اسٹیشن کے بُوفے سے، جو جس طرح اپنی بُو میں ناقابلِ بیان ہے اُسی طرح اپنی ظاہری شکل وصُورت میں بھی، ایک بڑی عمر کا، سُرخ چھائیوں والا، ہٹا کٹا، پست قامت شخص نشے میں دھت ڈگمگاتا ہوا باہر نکل رہا ہوتا ہے۔ میں اُس سے دریافت کرتا ہوں کہ ٹیلی کدھر ہیں لیکن اُسے معلوم نہیں ہے۔ اپنے آپ میں نازاں، سُرخ آنکھوں والا، سر پر گول ٹوپی لیے اور اُس کے خدوخال بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ چلا جاتا ہے۔ بُوفے میں ایک عورت مشورہ دیتی ہے کہ میں اسٹیشن سے باہر جا کر پھاٹک کے پار دائیں مڑوں (یا شاید بائیں، مجھے اب یاد نہیں ہے) اور تقریباً تین سو میٹر آگے مجھے پیلے رنگ کی ایک عمارت دِکھائی دے گی جو ڈاک خانہ ہے، وہاں یقیناً ٹیلی فون موجود ہوگا۔ میں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آتا ہوں۔ میرے سامنے گرد آلود سڑک، گرد آلود آسمان، گرد آلود مکانات اور تین صد میٹر کا طویل فاصلہ ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ میں ٹیلی فون کرنے نہیں جاؤں گا۔ میں واپس بکنگ ہال میں جاتا ہوں تاکہ معلوم کرسکوں کہ میں جلد از جلد بُڈاپسٹ کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ میں کاؤنٹر پر موجود عورت سے دریافت کرتا ہوں کہ آیا ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقاتِ کار والے بورڈ پر درج تیز گام ٹھیک ایک بج کر پچاس منٹ پر آجائے گی۔ وہ کہتی ہے کہ ہاں لیکن وہ ایک بین الاقوامی ٹرین ہے۔ میں جواباً کہتا ہوں کہ میرے لیے نہایت مناسب رہے گی اور پھر سوال سے زیادہ تصدیق کرنے کے لیے اپنی بات بڑھاتا ہوں کہ میرا بُڈاپسٹ سے ویانا آنے جانے کا ٹکٹ اُس گاڑی پر چل جائے گا یا نہیں۔ ہاں، عورت جواب دیتی ہے لیکن وہ پہلے ہی یہ کہہ چکی ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی ٹرین ہے۔ میں فوراً مشکوک ہو جاتا ہوں۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟ وضاحت کی جاتی ہے کہ اِس کا مطلب ہے کہ اُس پر سوار ہونا ممنوع ہے۔ میں اُس پر حقیقت واضح کرتا ہوں کہ میں نے بین الاقوامی ٹکٹ کے لیے اڑھائی ہزار فورنٹ[۱۲] ادا کیے ہیں جس میں سے پہلا آدھا ٹکٹ میں جزوی استعمال کر چکا ہوں اور دُوسرا آدھا ابھی باقی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ میرے دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوتا: اگلی ٹرین، جہاں تک مجھے معلوم ہوتا ہے، جگہ جگہ رُکنے والی ٹرین ہے۔ جو سہ پہر کو چلتی ہے اور سست رفتاری سے فاصلہ ناپتی ہوئی بُڈاپسٹ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگاتی ہے۔ بالآخر کاؤنٹر پر موجود عورت مجھے نہایت اچھی صلاح دیتی ہے کہ میں کسٹم والوں کی اجازت سے اپنا اِس مقصد کے لیے خریدا ہوا ٹکٹ استعمال کر سکتا ہوں۔

میں پھر کسٹم والوں کی چوکی پر جاتا ہوں۔ وہ سب خُوش گوار اور ہلکے پھلکے مُوڈ میں بیٹھے ہیں۔ تو آخر کار تم ویانا نہیں جا رہے؟ وہی شخص پُوچھتا ہے۔ میں اُس کا سوال سمجھ نہیں پاتا: میں مذاق یا شناسائی کے مُوڈ میں نہیں ہوں۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے تو اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے، کسٹم والا کہتا ہے، لیکن صرف اُس کی رضامندی ناکافی ہے۔ مجھے سرحدی محافظ سے اجازت لینا ہوگی۔ میں بہت سے فوجیوں کو اِدھر اُدھر پھرتے دیکھتا ہوں۔ اُن میں سے ایک اپنی گردن کے گرد سفید پٹے سے دراز والی تپائی نُما میز لٹکائے ہوتا ہے۔ میں اپنی استدعا پیش کرتا ہوں۔ گونگے اور بے تاثر چہرے۔ میں دھیرے دھیرے اپنا اعتماد کھو بیٹھتا ہوں۔ میرے اندر یہ احساس سرایت کر آتا ہے کہ میں لاعلمی میں جاپانی یا کوئی اَور زبان بولنے لگا ہوں جو نہ صرف میرے بلکہ فوجیوں کے لیے بھی قطعی اجنبی ہے۔ بالآخر ایک اچانک بول اٹھتا ہے کہ میں کمانڈر کا انتظار کروں۔ طویل چوتھائی گھنٹے کے بعد چشمے والا ایک نہایت دُبلا پتلا لیکن عمر رسیدہ افسر بڑی کے ساتھ ساتھ منتظمانہ وقار بھری سبک خرامی سے چھوٹے درجے کی وردی والوں کے ہمراہ چلتا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ میں اُسے مخاطب کر کے اپنی عرض پیش کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری ملولیت مجھ پر ظاہر ہونے لگی ہے لیکن اُس افسر کے بشرے سے لگتا ہے کہ وہ میری بات سمجھ رہا ہے۔ ''تمھیں ویانا ایکسپریس سے اُتارا گیا ہے؟'' وہ چالباز لیکن سخت لہجے میں دریافت کرتا ہے۔ ہاں، مجھے اُترنا پڑا۔ ٹھیک ہے، وہ اجازت دیتے ہوئے کہتا ہے۔ اپنی سرعت بھری، غیر جذباتی اور بے حوصلہ کرنے والی نگاہوں اور پھر اپنے اس متواتر عمل سے میرا سر سے پاؤں تک احاطہ کرتا ہے۔ اب میری جبلت مجھے احساس دِلاتی ہے کہ اس افسر میں احساس ہے۔

جیلوں، کیمپوں اور ایسی ہی دُوسری جگہوں پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی افسر یا حاکم ایسا ضرور ہوتا ہے جو زندگی پر اعتماد بحال کرتا ہے۔ ہم اس قسم کے افسر پر بھروسا کرتے ہیں کہ اگر وہ تفتیش کرے تو جھوٹ نہیں بولتے، اپنی تسکین کے لیے اُس کی معیت کی تمنا کرتے ہیں اور حد یہ کہ اگر وہ ہمارے سر میں گولی بھی اُتارنے لگے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اُس نے یہ کام اپنے آپ کو بچانے کے لیے نہیں کر رہا بلکہ اُس کے پاس دُوسرا راستہ بچا ہی نہیں ہے۔

ٹرین آجاتی ہے۔ میں اُس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ آیا مجھے درجہ دوم کے تمباکو نوشی سے ممنوعہ بوگی میں سیٹ مل سکتی ہے۔ بوگی میں موجود مرد اور خاتون، جن کے درمیان عدم تعلّق دِکھائی دیتا ہے، ہنگری زبان نہیں سمجھتے۔ ایک حقیقت جس کا بالخصوص مجھے فوراً ہی پتا چل جاتا ہے۔ کنڈکٹر آتا ہے۔ وہ مجھے مطلع کرتا ہے کہ مجھے اپنے ٹکٹ پر اضافی رقم ادا کرنا پڑے گی۔ کتنی؟ میں بے حد عاجزی اور شائستگی سے دریافت کرتا ہوں۔ کیوں کہ...... وہ وضاحت کرنے لگتا ہے۔ میں یہ نہیں پُوچھتا کہ کیوں بلکہ نہایت عجز و انکسار اور خُوش خلقی سے قطع کلامی کرتا ہوں کہ کتنی؟ کیوں کہ شاید میرے

پاس رقم ناکافی ہو۔ جواب آتا ہے کہ پانچ صد چالیس فورنٹ ۔ مجھے دوبارہ یقین دہانی کروائی جاتی ہے اور میں ادائیگی کر دیتا ہوں ۔ پھر بھی کنڈکٹر وضاحت پیش کرتا ہے ۔ اُس کی سعی لاحاصل ہوتی ہے کیوں کہ میں بے حد عاجزی اور خوش اخلاقی سے اُس کی بات سنتا ہوں لیکن اُسے سمجھتا ہوں نہ سمجھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں ۔ اصل بات یہ ہے مجھے ٹرین سے اُترنا نہیں پڑتا ۔

ٹرین یکساں رفتار سے قریب قریب بلا شور چلتی جاتی ہے ۔ وہ بے آواز ہے ۔ وہ آدمی اُونگھ رہا ہے اور عورت مطالعے میں مصروف ہے ۔ سرورق پر میری نظر پڑتی ہے: وہ ایک انگریزی ناول ہے ۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ میری نگاہیں ایک جیسے مناظر کے عین اُوپر افق کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی جاتی ہیں ۔ میں باہر دیکھ رہا ہوں لیکن حقیقتاً میں کچھ نہیں دیکھ رہا اور نہ ہی دیکھنا چاہتا ہوں ۔ آہستہ آہستہ، نہایت آہستہ آہستہ شرمندگی کی ایک لہر میرے اندر پھیلتی جاتی ہے ۔ یہ میرے پیروں کے پنجوں سے شروع ہو کر سینے سے ہوتی ہوئی حلق میں آتی ہے اور گھومتی ہوئی دماغ کی طرف بڑھتی ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ اب مجھے کئی روز، ہفتے یا شاید مہینے دِل شکستگی کی کیفیت میں بسر کرنا ہوں گے ۔ مجھے ویانا کے سفر کا خیال کہاں سے آیا تھا؟ میں نے یہ سوچا ہی کیوں کہ میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اُس سے مختلف کچھ کر سکتا ہوں؟ اب تک میں نے ایک اسیر کی سی زندگی بسر کی ہے، اپنے خیالات، صلاحیتیں اور اپنی اصل شخصیت چھپا کر رکھی ہے کیوں کہ میں بخوبی آگاہ ہوں کہ یہاں، جہاں میں زندگی بتا رہا ہوں، میں ایک اسیر ہی کی حیثیت میں آزاد رہ سکتا ہوں ۔ میں بخوبی آگاہ ہوں کہ یہ آزادی ایک اسیر کی آزادی ہے جسے مغالطہ کہا جا سکتا ہے لیکن کم از کم — یا جو میرا یقین ہے — یہ ایک باعزت وہم ہے ۔ اِس امر سے زیادہ باعزت کہ میری زندگی آزادی کے مغالطے کی اسیر ہو ۔ میں نے واضح طور پر اِس وجودیت میں پنہاں خطرات دیکھ لیے ہیں ۔ دیکھ لیا ہے کہ ایک اسیر کی زندگی اُسے آخر میں بھی اسیر ہی بنا دیتی ہے ۔ یہ چیز مجھے اِس وطن کی ثقافتی سطح سے نیچے گھسیٹ لے جاتی ہے، میرا اُفق تنگ کر دیتی ہے اور میری صلاحیتیں ختم کر ڈالتی ہے ۔ اِس پر بھی میں اِس یقین کے ساتھ اِسی طرح زندہ رہنا چاہتا تھا کہ آخر یہ بھی تو زندگی ہی ہے — ایسی زندگی کہ جسے کوئی شخص، ممکنہ طور پر میں ہی، وضع کرنا چاہے گا ۔ پھر میں نے فرار کیوں چاہا یا کم سے کم چند روز کی تعطیلات ہی کیوں چاہی؟ میں نے یہ سوچا بھی کیوں کہ میں اِس زندگی میں تبدیلی لانے کا اہل ہوں، جسے میں عرصۂ دراز سے نہ اپنی زندگی سمجھتا اور نہ برتتا آ رہا تھا مگر کہ ایک امتحانی مضمون کے مانند اپنے ذمے لگائے گئے ایک عظیم فرض کی طرح نبھا رہا تھا، جس پر مجھے صرف ایک استحقاق حاصل تھا کہ — یا آزادی — اگر یہ ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں بیاری میرے لیے عذاب بن جائے تو میں نیند کی گولیوں کے دو پتوں اور نہایت گھٹیا البانوی شراب کی آدھی بوتل سے اِس کا خاتمہ کر لوں ۔

اِس مرحلے پر میرے حواس لوٹ آتے ہیں ۔ ہم ایک بار پھر تاتا بانیا (Tatabanya) سے

گزر رہے ہیں۔ اِسی اثنا میں میرا سفر ختم ہو جاتا ہے اور دیکھو! میں اپنی زندگی سمجھ لیتا ہوں۔ اب بھی میں ہمیشہ کے مانند کچھ نہیں کرسکتا۔ میں اپنے اُوپر کی جانے والی جارحیت کا خنجر مضبوطی سے تھام کر اُس کا پھل اپنی سمت کر لیتا ہوں لیکن میرے اِن خیالات کی قوی لیکن تلخ مسرت عین اُسی لمحے مجھ پر اپنے ہاتھ رکھ کر اپنی بے تصنع سفاکی سے مجھے صدمے سے دوچار کر دیتی ہے۔ اب میں سب کچھ دیکھتا ہوں؛ ہر شے، ہر چیز، اب میں سب کچھ سمجھ جاتا ہوں، میں پہاڑی کوے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن لیتا ہوں...... ہاں، پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب میں مزید زخم برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ آمریت کے چھے بوقلموں لیکن یکسانیت بھرے عشرے اور اُن کے اب بھی بے نام اثرات نے نجات کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں، جو میں نے اپنی برداشت سے — بے سمت برداشت سے — متعین کی تھیں۔ اعصاب میں اب کسی زیرِ جلد ٹیکے تک کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی ہے البتہ نیزے کی انی چبھوئی جا سکتی ہے۔ میں اِس ٹرین میں ہوں لیکن ٹرین اب صرف ایک لاش کو لے کر جا رہی ہے۔ وہ لاش میں ہوں۔ (بات کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں: میری آخری خواہش ہے کہ میری تنہائی کے احساس کو کم کرنے کے لیے دُنیا پر میرے وجود کی علامت کے طور پر، میری قبر یا میرے سماوار یا میرا جو کچھ بھی باقی بچے، بہرصورت معافی کے لیے کوئی کسٹم افسر پھول کی ایک ٹہنی ضرور رکھے......)

VVVV

۱؎ forint: ہنگروی روپے کا نام۔

۲؎ Incas: وادیٔ پیرو (Peru) میں بسنے والے کیوچوآن (Quechuan) لوگ جنھوں نے ۱۱۰۰ء میں پیرو اور اِرد گرد کے علاقے پر اپنی سلطنت بنا کر حکومت قائم کی جو ۱۵۳۰ء کے آغاز میں ہسپانویوں کے حملے اور قبضے سے ختم ہوئی تھی۔

جے۔ ایم کوئٹزی

(J.M.Coetzee)

۲۰۰۳ء کے نوبیل انعام سے جنوبی افریقا کے معروف ناول نگار، افسانہ نویس، مضمون نگار، نقاد، ماہرِ لسانیات اور مترجم جے۔ایم کوئٹزی کو، جن کا پُورا نام جان میکس ویل کوئٹزی ہے، نوازا گیا۔ وہ آج کل آسٹریلیا کے شہری ہیں اور جنوبی آسٹریلیا کے شہر ایڈ یلیڈا میں مقیم ہیں۔

نوبیل انعام ۲۰۰۳ء کے لیے جے ایم کوئٹزی کے نام کا اعلان کرتے ہوئے نوبیل کمیٹی نے موقف اختیار کیا۔ ''کوئٹزی بے شمار بہروپوں میں اجنبیوں کی ششدر کر ڈالنے والی شمولیت ڈالتے ہیں۔'' اور ''وہ نہایت ہی ہنرمند دُست کار، زرخیز مکالمہ نگار اور تجزیاتی تعقل کے حامل ہیں۔'' نوبیل انعام پانے سے قبل کوئٹزی دوبار بُکر پرائز جیت چکے تھے۔

جے۔ایم کوئٹزی ۹ ۰۔ فروری ۱۹۴۰ء کو یونین آف ساؤتھ افریقا، صوبہ کیپ (اب مغربی کیپ)، کے شہر کیپ ٹاؤن میں افریقا نیر نسل کے جوڑے کے ہاں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد، زاچاریاس کوئٹزی، ایک جز وقتی وکیل اور سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ بھیڑوں کا باڑا چلاتے تھے جب کہ اُن کی والدہ، ویرا ؤہمیئر کوئٹزی، ایک سکول میں استاذ تھیں۔ اُن کے گھر میں انگریزی بولی جاتی تھی لیکن عزیز و اقارب کے ہمراہ افریقی زبان میں بات چیت ہوتی تھی۔ جے۔ایم کوئٹزی سترھویں صدی کے جرمن مہاجرین کی اولاد اور ننھیال کی طرف سے پولش خاندان سے ہیں۔ بالٹازار ڈوبیل اُن کا نانا تھا۔

جے۔ایم کوئٹزی کی ابتدائی زندگی کا زیادہ عرصہ کیپ ٹاؤن اور ایک نزدیکی قصبے ؤورسیسٹر میں گُزرا کیوں کہ اُن کے والد کی ملازمت ختم ہونے کے بعد اُن کا خاندان ؤورسیسٹر منتقل ہو گیا تھا۔ کوئٹزی نے کیپ ٹاؤن کے سینٹ جوزف کالج نامی کیتھولک فرقے کے سکول اور جامعہ کیپ ٹاؤن سے تعلیم حاصل کی۔ جے۔ایم کوئٹزی نے برطانیہ میں کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے کام کرنے کے دوران ۱۹۶۳ء میں جامعہ کیپ ٹاؤن سے فورڈ میڈوکس کے ناولوں پر مقالہ لکھ کر ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۹۶۵ء میں آسٹن کی جامعہ ٹیکساس، امریکا میں فُل برائٹ پروگرام کے تحت چلے گئے۔ جہاں سے اُنھوں نے ۱۹۶۹ء میں لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر بفالو کی جامعہ نیویارک میں ادب پڑھانے لگے۔ وہ وہاں ۱۹۷۱ء تک رہے۔ ۱۹۷۱ء ہی

میں کوئٹزی نے امریکی شہریت کے لیے درخواست دی جسے اِس بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ وہ ویت نام جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں شامل رہے ہیں۔ وہ واپس جنوبی افریقا لوٹ آئے اور جامعہ کیپ ٹاؤن میں انگریزی ادب پڑھانے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایڈیلیڈا، آسٹریلیا چلے آئے اور جامعہ ایڈیلیڈا کے شعبہ انگریزی میں ریسرچ فیلو کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۰۶ مارچ ۲۰۰۶ء کو جے۔ ایم کوئٹزی نے آسٹریلیا کی شہریت اختیار کر لی۔ انھوں نے جامعہ شکاگو میں بھی معلم کی حیثیت سے کام کیا۔

کوئٹزی نے ۱۹۶۳ء میں فلپا جوبر سے شادی کی جو طلاق پر منتج ہوئی جس سے اُن کا ایک بیٹا نکولس اور ایک بیٹی جسیلا پیدا ہوئے۔ نکولس ۲۳ برس کی عمر میں ایک حادثے میں چل بسا۔

۱۹۶۹ء میں لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے دوران انھوں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ اِسی دوران اُنھوں نے اپنا ناول ''Dusk Lands'' شروع کیا جو ۱۹۷۴ء میں جنوبی افریقا سے منصۂ شہود پر آیا۔ اُن کا دوسرا ناول ''In the Heart of City'' ۱۹۷۷ء میں اشاعت پذیر ہوا جس نے اپنے عہد کا سب سے اہم جنوبی افریقن ادبی ایوارڈ، سی این اے ایوارڈ، جیتا۔ یہ ناول بعد برطانیہ اور امریکا سے بھی شائع ہوا۔ کوئٹزی کے اگلے ناول ''Waiting for Barbarins'' کو، جو ۱۹۸۰ء میں چھپا، عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور ۱۹۸۳ء میں چھپنے والے ناول ''Life and Times of Michael K'' نے کوئٹزی کی شہرت پر مہر ثبت کر دی۔ اِس ناول کو برطانوی ادبی اعزاز ''بکر پرائز'' سے نوازا گیا جس کا اُس وقت آغاز ہوا ہی تھا۔ یوں کوئٹزی ''بکر پرائز'' حاصل کرنے والے دُنیا کے پہلے ادیب ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ''Foe''، ۱۹۹۰ء میں ''Age of Iron''، ۱۹۹۴ء میں ''The Master of Petersburg'' اور ۱۹۹۹ء میں ''Disgrace'' منظر عام پر آئے۔ ناول ''Disgrace'' سے کوئٹزی ایک بار پھر ''بکر پرائز'' کے اہل قرار پائے۔

کوئٹزی کی دیگر کتب میں (1999) Boy Hood اور (2002) Youth (جو آپ بیتیاں ہیں لیکن وہ اُنھیں آٹو بائیوگرافی کی بجائے آٹر بائیوگرافی (Autrebiography) کہتے ہیں۔)، Lives of Animals (1999) (افسانوی طرز کے خطبے) جنھیں بعد میں ۲۰۰۳ء میں چھپنے والی کتاب ''Elizbeth Costello'' میں ضم کر دیا گیا، White Writing (1988) (جنوبی افریقن ادب پر مضامین)، Doubling the Point (1992) (مضامین اور انٹرویو)، Giving Offense (1996) (ادبی سنسر کا مطالعہ)، Stranger Shoes (2001) (ادبی مضامین کا مجموعہ) شامل ہیں۔ کوئٹزی نے جرمن اور افریقی ادب کے تراجم بھی کیے جن کی ایک طویل فہرست ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ اُن کے ناولوں ''In the Heart of City''، ''The Lives of Animal'' اور ''Disgrace'' پر فلمیں اور ڈرامے بھی فلمائے گئے۔

جے۔ ایم کوئٹزی اِس قدر عزلت نشین اور عام لوگوں سے دُور رہنے والے ادیب ہیں کہ اُنھوں نے

اپنے دونوں بکر پرائز تک خُود وصول نہیں کیے۔ مصنف آتھر ریان مالان کے بقول: ''کوئٹزی بے حد راہبانہ، اُصول پسند اور کام سے کام رکھنے والے ہیں۔ وہ شراب پیتے ہیں نہ سگریٹ اور نہ ہی گوشت کھاتے ہیں۔ اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کے لیے میلوں سائیکل چلاتے ہیں اور ہفتے کے ساتوں دنوں صبح سویرے کم از کم ایک گھنٹا اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ پندرہ سال تک کام کرنے والے ایک ساتھی نے بتایا کہ اُس نے اتنے طویل عرصے میں اُنھیں صرف ایک مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا۔ اُنھوں نے ایک شناسا کی متعدد ضیافتوں میں شرکت کی لیکن کبھی ایک لفظ تک نہیں بولے۔'' ایچ آئی وی/ایڈز سے متاثرہ بچوں کے لیے کام کرنے والی تنظیم Oak Tree Press' First Chapter Series نے جب عظیم ادبی شخصیات کے دستخطوں سے چندہ مہم شروع کی تو جے۔ ایم کوئٹزی کی گوشہ نشین فطرت کے باعث اُن کے دستخطوں کی سب سے زیادہ مانگ رہی۔

اگرچہ کوئٹزی کی شہرت تقریبِ انعامات میں شرکت نہ کرنے والے کی رہی لیکن اُنھیں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ اُن کا ناول ''Waiting for Barbarians'' بکر پرائز کے ساتھ James Tait Black Memorial Prize اور Geoffery Faber Memorial Prize کا بھی حق دار قرار پایا۔ اُنھوں نے تین بار سی این اے پرائز جیتا۔ ''Age of Iron'' نے Sunday Express Books of the year Award اور ''The Master of Petersburg'' نے Irish Times Fiction Prize حاصل کیے۔ اِس کے علاوہ کوئٹزی نے French Prix Femina Etranger، The Commonwealth Writers' Prize اور Jerusalem Prize for the Freedom of Individual in Society جیتے۔

۱۹۸۷ء میں یروشلم ایوارڈ وصول لیتے ہوئے اُس نے اپنی تقریر میں جنوبی افریقی ادب پر یوں رائے زنی کی:

''جنوبی افریقا کا ادب پابندیوں کا ادب ہے۔ یہ انسانی ادب سے کم تر درجے کا ہے۔ درحقیقت یہ ویسا ادب ہے جیسا آپ پابندِ سلاسل ادیب سے لکھنے کی توقع رکھتے ہیں۔''

اپنے نوبیل خطبے ''وہ اور اُس کا آدمی'' (He and His Man) میں جے ایم کوئٹزی نے اپنی خُود نوشتوں کی مانند صیغہ واحد غائب کو برتتے ہوئے افسانوی انداز اپنایا اور اپنی لکھتوں اور فن پر براہِ راست روشنی ڈالنے سے گُریز پائی اختیار کرتے ہوئے اشاروں کنایوں سے کام لیا۔ کوئٹزی کا خطبہ عام نوبیل خطبوں کے برعکس ایک انفرادیت کا حامل ہے اور وہ ہے اُن کا افسانوی انداز۔ اُنھوں نے اپنا، اپنی شبانہ روز محنت، اپنی لکھتوں کے محاسن وغیرہم پر راست روشنی ڈالنے کی بجائے ''وہ'' اور ''اُس کا آدمی'' کی اصطلاحات کو اپنایا۔ ''وہ'' رابنسن کروسو کو دِکھایا اور ''اُس کا آدمی'' ڈینیئل ڈیفو کو۔ لیکن درحقیقت لگتا یہ ہے جیسے ''وہ'' بھی کوئٹزی خُود

ہیں اور ''اُس کا آدمی'' بھی خُود ہی۔ ''وہ'' اپنے آدمی سے کبھی نہیں ملتا جو اُسے دُنیا بھر کی خُوب صُورتیوں اور بد صُورتیوں سے آگاہ رکھتا ہے جس سے وہ اپنی لکھتوں کا مواد حاصل کرتا ہے۔ مل کہ اپنے خطبے کے آخر میں کوئٹزی بتاتا ہے کہ وہ خوف زدہ کہ شاید وہ کبھی اپنے آدمی سے نہ مل پائے، کم از کم اِس زندگی میں تو نہیں۔ گویا ''وہ'' اور ''اُس کا آدمی'' دو ایسے بحری جہازوں پر سوار ہیں جو ایک دُوسرے کی مخالف سمت رواں ہیں، ایک مشرق میں تو دُوسرا مغرب کی جانب۔ شاید وہ دونوں کے جہاز کبھی ایک دُوسرے کے پاس سے گُزریں لیکن تب بھی وہ دونوں ایک دُوسرے نہیں مل پائیں گے کیوں کہ سمندر بہت خوں خوار اور طوفانوں سے بھرے ہیں، اُن کی آنکھوں پر پانی کی بوچھاڑیں پڑتی ہیں اور ہاتھ جھلسے ہوے ہیں۔ وہ ایک دُوسرے کے قریب سے گُزر جائیں گے، ایک دُوسرے کو ہاتھ تک ہلائے بغیر۔ اِس انداز کو اپناتے ہوے کوئٹزی نے اپنا خطبہ ڈینئیل ڈیفو، رابنسن کروسو کے قول سے شروع کیا۔ خطبے میں بھی اُنھوں نے اپنی سحر انگیز افسانوی نثر کے جوہر دِکھائے اور بہ یک وقت تمثیلات، استعارات اور علامات کو نہایت حسین انداز میں برتا۔

ڈینئیل ڈیفو، رابنسن کروسو کے قول ''اپنے نئے ساتھی کی جانب پلٹتے ہوے میں اُس سے بے حد مسرور رہوا۔ میں نے یہ اپنا فرض قرار دے لیا کہ کہ اُسے ہر وہ چیز سکھاؤں جو اُسے مفید، ہنر ور اور مدد کرنے والا بنانے بلکہ خصوصاً اُسے زبان عطا کرنے کے لیے ضروری ہو اور جب میں بات کروں تو وہ میری بات سمجھ جائے۔ وہ روئے ارض پر ایسا عالم بن گیا کہ اُس جیسا کوئی دُوسرا نہیں تھا۔'' کو اپنے خطبے کے آغاز میں نقل کرتے ہوے استعارے اور علامت کے راستے جے ایم کوئٹزی نے بتایا کہ ''وہ اپنی پُر ہنگام زندگی کی کتاب چھپواتا ہے۔...... جب برسوں بعد وہ صفحۂ قرطاس پر اپنے جزیرے کی کہانی لکھنے بیٹھا تو اُسے پتا چلا کہ لفظ اُس کے قریب نہیں آئیں گے، قلم حرکت نہیں کرے گا اور اُس کی اُنگلیاں سخت اور متذبذب ہیں۔ لیکن روز بروز اور قدم بہ قدم اُس کے لکھنے کے کام میں روانی آتی چلی گئی...... افسوس، لکھنے کی پہلے والی سہولت اُسے اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے اپنی چھوٹی سی لکھنے کی میز پر بیٹھا برسٹل کی بندرگاہ کو دیکھ رہا ہوتا تو اُسے اپنا ہاتھ پہلے ہی کے مانند بدنُما اور اجنبی دِکھائی دیتا۔......''

VVVV

بُوڑھی ہوتی عورت

(As s Woman Grows Older)

وہ اِتنے برسوں میں پہلی بار اپنی بیٹی کے ہاں نائس جارہی ہے۔اُس کا بیٹا امریکا سے کسی اجلاس وغیرہ میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے ،اُن کے ساتھ چند دِن کے لیے ٹھیرے گا۔اُسے اجلاس کی تاریخیں اچھی لگی ہیں۔وہ بھونچکا رہ جاتی ہے کہ آیا یہ حسنِ اتفاق ہے یا اُس کے سامنے ویسی ہی کوئی تجویز رکھنے کا اُن دونوں کا منصوبہ ہے، جیسے بچے تب پیش کرتے ہیں جب وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ بُوھیا اب اپنی دیکھ بھال خُود کرنے کے قابل نہیں رہی۔کتنی ہٹ دھرم ہے،اُنھوں نے ایک دُوسرے سے کہا ہوگا،کتنی ہٹ دھرم اور ضدّی؛ ہمیشہ مخالفت کرنے کی عادت سے بے حد مجبور۔ ہم دونوں جو کام مل کر کریں ،اُسے، ہٹ کر اُس کی ہٹ دھرمی سے کیسے نبھاہ کر پائیں گے؟

چاہے وہ اُس کے لیے منصوبے بنا رہے ہیں لیکن اِس میں شک نہیں ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو رُوم کے اُس اشرافیہ طبقے کا فرد محسوس کرتی ہے، جو مہلک چٹھی وصولنے کا منتظر ہوتا ہے،اِس انتظار میں کہ اُسے خُوب اعتماد میں لیتے ہوئے نہایت ہمدردانہ انداز میں بتایا جائے گا کہ وہ چٹھی کو مفادِ عامہ کی خاطر چُوں چراں کیے بغیر قبول کرلے۔

اُس کے بچے ہمیشہ اس کے تابع دار رہے ہیں۔دُوسری طرف ماں کی حیثیت سے وہ بھی ان کے حوالے سے اُتنی ہی اچھی اور فرض شناس رہی ہے۔لیکن اِس زندگی میں ہم ہمیشہ وہ نہیں پاتے جس کے ہم حق دار ہوتے ہیں؛اگر اُس کے بچّوں نے بہتر حالات پیدا کر لیے ہیں تو وہ ایک اَور زندگی، ایک اور رَاہ متعین کر رہے ہوں گے۔

اُس کی بیٹی نائس میں ایک آرٹ گیلری چلاتی ہے۔وہ اب عملاً ہر لحاظ سے فرانسیسی ہو چکی ہے۔اُس کا بیٹا ،اپنی بیوی بچّوں سمیت ، بہت جلد عملاً، ہر لحاظ سے،امریکی ہو جائے گا۔یوں وہ آشیانے سے اُڑ کر وہ بہت دُور جا چکے ہیں۔کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اُنھوں نے اِس قدر دُور رہ کر اُس سے فرار حاصل کیا ہے۔

وہ جو بھی تجویز پیش کریں، ہوگی غیر یقینی ہی۔جس میں ایک طرف محبت اور تنہائی ہوگی تو دُوسری طرف اس میں سخت سنگ دِلی اور اُس کی موت کی تمنا شامل ہوگی۔خُوب،غیر یقینی تجویز سے اُسے

پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اُس نے غیر یقینی حالات ہی میں زندگی گزر بسر کی ہے۔ اگر الفاظ ذومعنی نہ ہوں تو افسانے کا فن کہاں باقی رہتا ہے؟ اگر محض سر اور پیر ہی ہوتے اور درمیان میں کچھ نہ ہوتا تو خود زندگی کیا ہوتی؟

''میں جوں جوں بوڑھی ہو رہی ہوں اپنے آپ کو عجیب وغریب ہوتا پا رہی ہوں۔'' وہ اپنے بیٹے کو بتاتی ہے۔ ''میں اپنے مُنہ سے وہ الفاظ نکلتے سنتی ہوں جو کبھی میں بوڑھے لوگوں کو کہتے سنتی تھی اور قسم کھاتی تھی کہ میں خود کبھی یہ الفاظ استعمال نہیں کروں گی۔ دُنیا کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر اب کسی کو نہیں معلوم کہ 'غالبًا' کا لفظ فعل ماضی کا ہے۔ دُنیا کیا ہوتی جا رہی ہے؟ لوگ پیزا کھاتے اور فون پر باتیں کرتے ہوئے سڑک پر چلتے جاتے ہیں۔ دُنیا کیا ہوتی جا رہی ہے؟''

آج نائس میں اُس کے بیٹے کا پہلا اور اُس کا اپنا تیسرا دِن ہے: جون کا ایک روشن اور گرم دِن، ایسا دِن جو انگلستان کے کاہل لیکن خوش نصیب دولت مندوں کو ساحل کی اِس پٹی پر کھینچ لاتا ہے۔ اور وہ دیکھیے، وہ یہاں موجود ہیں۔ پومی نیڈ سے بالکل اُسی انداز میں آتے ہوئے دو افراد جس میں انگریز ایک صدی قبل اپنی چھتریاں اور ٹنکوں کے ہیٹ تھامے، تھامس ہارڈی کی نئی کاوش اور جنوبی افریقیوں کو اپنی مادری زبان بولنے پر بُرا بھلا کہتے ہوئے چلتے تھے۔

''مــذمــوم۔'' وہ کہتی ہے۔ ''ایک ایسا لفظ ہے جو آج کل شاذ ہی سننے کو ملتا ہے۔ جب تک کوئی خوش مذاق کا نشانہ نہیں بنتا وہ اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے تو کسی شے کی مــذمــوم نہیں کہتا۔ ایک متروک لفظ، متروک عمل۔ پھر بھلا کوئی کیا کرے؟ کیا کوئی تب تک اپنی تمام تر بیزاری کے ساتھ مذمتوں کے اظہار کو برداشت کرتا رہے جب تک اُسے اپنے جیسے بوڑھے ساتھیوں کے ہمراہ تنہا ہونے کا موقع نہ ملے؟''

''ماں آپ جتنا چاہیں میرے سامنے مذمت کر سکتی ہیں۔'' اُس کا تابع دار بیٹا کہتا ہے۔ ''میں اظہارِ ہمدردی میں سر ہلاؤں گا لیکن آپ کا مذاق نہیں اُڑاؤں گا۔ آج آپ پیزا کے علاوہ اور کس کس شے کو بُرا بھلا کہنا چاہیں گی؟''

''میں پیزا کو بُرا نہیں کہہ رہی ہوں۔ پیزا اپنی جگہ اچھی چیز ہے۔ میں چلتے ہوئے بہ یک وقت کھانے اور باتیں کرنے کو گستاخانہ عمل سمجھتی ہوں۔''

''مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ یہ گستاخی یا کم سے کم غیر اخلاقی حرکت ضرور ہے۔ مزید کچھ؟''

''اِتنا ہی کافی ہے۔ میں جس کی مذمت کرتی ہوں وہ زیادہ دِلچسپی کی حامل نہیں ہے۔ دِلچسپی کی بات یہ ہے کہ میں نے برسوں قبل عہد کیا تھا کہ میں یہ کام نہیں کروں گی۔ لیکن میں یہاں یہی کر رہی ہوں۔ یہ مجھ پر حاوی کیسے ہوگیا؟ میں دُنیا کی مذمت کر رہی ہوں کہ یہ کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے۔ میں

تاریخ کے عمل کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں ۔ میں دِل سے اِس کی مذمت کر رہی ہوں ۔لیکن جب میں اپنے اندر کی آواز سنتی ہوں تو پتا ہے کیا سنتی ہوں؟ میری ماں منی سکرٹ کو بُرا بھلا کہہ رہی ہے، برقی گٹار کی مذمت کر رہی ہے اور مجھے اپنے تاثرات یاد آتے ہیں ۔'ہاں ماں ۔' میں کہتی اور اپنے دانت پیستے ہوئے دُعا کرتی کہ وہ اپنی جھک جھک بند کرے اور یہ.....''

''اور آپ سوچ رہی ہیں کہ میں اپنے دانت پیستے ہوئے دُعا کر رہا ہوں کہ آپ اپنی جھک جھک بند کر دیں ۔''

''ہاں ۔''

''میں یہ نہیں کر رہا ۔ یہ کاملاً قابل قبول ہے کہ دُنیا کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے ۔ میں خود تخلیے میں اِس کی مذمت کرتا ہوں ۔''

''لیکن تفصیل، جان، تفصیل! میں محض تاریخ کی عظیم تبدیلی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہی ہوں بل کہ ہر ہر عمل کو — بداطوار، بُری گرامر، چیخ پکار! یہ چیزیں ایسی ہیں جو مجھے ہیجان میں مبتلا کر دیتی ہیں ۔ اور یہ اِس قسم کی چیزیں ہیں جو مجھے یُوں ہیجان زدہ کرتی ہیں کہ میں مر جانے کی حد تک مایوسی کا شکار ہو جاتی ہوں ۔ کتنی غیر اہم بات ہے! تم سمجھ رہے ہو نا؟ یقیناً نہیں سمجھ رہے ۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں خود مذاق کا نشانہ بن رہی ہوں ۔ نہیں، میں خود مذاق کا نشانہ نہیں بن رہی ہوں ۔ یہ تمام باتیں سنجیدگی کی حامل ہیں! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں سنجیدہ بھی ہو سکتی ہوں؟''

''بے شک، میں سمجھتا ہوں ۔ آپ اپنا موقف بخوبی واضح کر رہی ہیں ۔''

''نہیں! بالکل نہیں! یہ محض الفاظ ہیں اور اب ہم سب لفظوں سے بیزار ہیں ۔ اپنے آپ کو سنجیدہ ثابت کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ختم کر لیا جائے ۔ اپنی سوچوں کو ختم کر لینا اپنے آپ کو خنجر گھونپ لینے کے مترادف ہے ۔ پھر میں جب بھی بات کرنے لگتی ہوں تو تم مسکرانا چاہتے ہو ۔ مجھے پتا ہے ۔ کیوں کہ میں سنجیدہ، مکمل طور پر سنجیدہ نہیں ہوں — میں اتنی بوڑھی ہو گئی ہوں کہ سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی ۔ بیس برس کی عمر میں خودکشی کرنا بہت بڑا المیہ ہے، بیس کی عمر میں خودکشی کرنا المناک فعل ہے ۔ چالیس کی عمر میں خودکشی پر لوگ مختلف سنجیدہ تبصرے کریں گے ۔لیکن ستر برس کا ہو کر خودکشی کی جائے تو لوگ کہیں گے: 'کتنی شرمناک بات ہے، اُسے سرطان ہو گیا ہوگا ۔''

''لیکن آپ نے تو کبھی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کی ۔''

''میں نے کبھی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کی کیوں کہ میں نے ہمیشہ لفظ مستقبل پر یقین رکھا ہے ۔ تاریخ مجھے بری کر دے گی — میں اپنے آپ کو یہی بتاتی تھی ۔لیکن اب تاریخ جیسی بن چکی ہے اُس پر میرا بھروسا ختم ہوتا جا رہا ہے — اِس کی طاقت پر اعتماد کھو کر سچائی تک پہنچ رہی ہوں ۔''

''اوراب تاریخ کیا بن چکی ہے، ماں؟ اوراب جب کہ ہم اِس سے متعلق ہیں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ایک مرتبہ پھر مجھے ایک راست مرد یا راست لڑکے کی سطح پر گھسیٹ لانے کے حربے استعمال کررہی ہیں، اُس سطح پر جو مجھے یکسر ناپسند ہے۔''

''میں معذرت کرتی ہوں، معافی چاہتی ہوں۔ایسا تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے سبب ہوا ہے۔ میں اپنا بیشتر وقت ایسی ہی گفتگو سوچتے ہوئے گزارتی ہوں۔اس سے مجھے سکون ملتا ہے کہ میں لوگوں کو چت کرنے کا کھیل کھیل سکتی ہوں۔''

''مخاطب کو۔لوگوں کو نہیں، مخاطب کو۔''

''میں مخاطب کو چت کرسکوں۔''

''اُنھیں چت کریں۔''

''مخاطب کو چت کرسکوں۔ مجھے افسوس ہے۔ میں یہ ختم کردوں گی۔نورما کیسی ہے؟''

''نورما اچھی ہے۔اُس نے آپ کو پیار بھیجا ہے۔ بچے بھی اچھے ہیں۔تاریخ کیا بن چکی ہے؟''

''تاریخ اپنی آواز گُم کر بیٹھی ہے۔کلیو، جو شخص کسی زمانے میں اِس کے کُن اور عظیم لوگوں کے گیت گاتا تھا، آج ایک نہایت احمق قسم کی بوڑھی عورت کے مانند متذبذب اور ہرزہ سرا ہو چکا ہے۔ میں اپنے وقت کے کچھ حصے میں تو یہ سوچتی ہوں اور بقایا وقت یہ سوچتے ہوئے گزارتی ہوں کہ تاریخ مجرموں کے گروہ کے ہاتھوں یرغمال ہو گئی ہے، وہ اُس پر تشدد کرتے ہیں اور اُس سے وہ باتیں کہلواتے ہیں جو وہ نہیں کہنا چاہتی۔ میں تمھیں تاریخ کے بارے میں اپنے تمام تاریک خیالات نہیں بتا سکتی۔یہ میرا وہم بن چکی ہے۔''

''وہم۔کیا اِس کا مطلب ہے کہ آپ اِس کے بارے میں لکھ رہی ہیں؟''

''نہیں، لکھ تو نہیں رہی ہوں۔اگر میں تاریخ کے متعلق لکھ سکتی تو میں اس پر حکمرانی کرتے ہوئے چل رہی ہوتی۔نہیں میں تو بس اِس پر جل کُڑھ سکتی ہوں یا اِس کی مذمت کرتے ہوئے اپنے آپ کو لعن طعن کرسکتی ہوں۔ مجھے تو کلیشے نے جکڑ لیا ہے اور مجھے یقین نہیں ہے کہ تاریخ اِس کلیشے پر قابو پا سکے گی۔''

''کیسا کلیشے؟''

''میں اِس کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتی۔یہ نہایت مایوسی کا سبب ہیں۔جمود والے ریکارڈ کا کلیشے، جواب بے معنی ہو چکا ہے کیوں کہ اب نہ تو گراموفون رہے اور نہ ہی ریکارڈ۔ ہر سمت سے میرے کانوں میں ایک ہی لفظ گونجتا ہے اور وہ ہے 'مایُوس کُن'۔جس کا دُنیا کے لیے پیغام ہے: ناقابلِ

تلافی مایُوس کُنی۔ اِس کا کیا مطلب ہے: 'مایُوس کُن'؟ ایک لکھاری کے منظر کا لفظ جو کسی طرح میرے ذہن سے چپک گیا۔ بالکل ایک دوغلی نسل والے کُتے کے مانند جو بھؤں بھؤں کرتا پیچھے پیچھے آتا رہتا ہے اور جان نہیں چھوڑتا۔ میں اِس سے دھوکا کھاجاتی ہوں۔ یہ میرا قبر تک پیچھا کرے گا۔ یہ میری قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر قبر کو گھورتے ہوئے بھونکے گا: مایُوس کُن، مایُوس کُن، مایُوس کُن!''

''ماں، اگر آپ مایُوس نہیں ہیں تو کون ہے؟''

''جان تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔''

''بے شک، میں جانتا ہوں۔ پھر بھی بتائیں لفظوں میں بتائیں۔''

''میں ہنس مُکھ ہوا کرتی تھی لیکن اب نہیں رہی۔ رونے پیٹنے والی ہو گئی ہوں۔''

اُس کی بیٹی ہیلن پُرانے شہر میں ایک آرٹ گیلری چلاتی ہے۔ گیلری ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ ہیلن اُس کی مالک نہیں ہے۔ وہ سوِس (Swiss) باشندوں کی ملازم ہے جو سال میں دو بار برلن حساب کتاب کرنے اور اپنی جیبیں بھرنے آتے ہیں۔

ہیلن، یا ہیلینے، جان سے چھوٹی ہے لیکن بڑی لگتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اُس کے بال ادھیڑ عمر والوں کے سے تھے، جنھیں وہ سلجھائے بغیر ہی گردن کے گرد، اُن کی گٹھڑی سی بنائے رکھتی، چُست لہنگے، اُلّو کی آنکھوں جیسی موٹی عینک پہنتی اور اُوپر کی جانب سیدھے بال بناتی تھی۔ ایسی حالت میں رہتی جسے فرانسیسی مجرد اور سخت گیر دانش وَر کا مقام اور عزت دیتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اُس حالت میں انگلستان میں ہوتی تو پہلی نظر میں لائبریرین لگتی اور مضحکہ خیز سمجھی جاتی۔

درحقیقت اُس کے پاس ہیلن کو نام وَر سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہیلن اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی لیکن جان نے اُسے بتایا ہے کہ اُس کا لیون کے ایک تاجر سے کئی برسوں سے معاشقہ چل رہا ہے، جو اُسے ہفتہ وار تعطیلات پر اپنے ہم راہ لے جاتا ہے۔ کسے معلوم لیکن شاید وہ اپنی ہفتہ وار تعطیلات کے دِنوں میں چمک دمک اُٹھتی ہو۔

کسی کے لیے بھی اپنے بچّوں کی زندگی کا، خاص طور پر جنسی زندگی کا، قیاس مناسب نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ، وہ یہ اعتبار کر ہی نہیں سکتی تھی کہ اگر کوئی اپنے آپ کو فنونِ لطیفہ کے لیے وقف کر دے تو، خواہ وہ صرف مصوری کی خرید و فروخت ہی کیوں نہ ہو، اُس کے جذبات مرجاتے ہیں۔

اُسے، اُن کی طرف سے مشترکہ حملے کی توقع ہوتی ہے کہ ہیلن اور جان اُسے دِکھا کر اُس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھیں گے، جو اُنھوں نے اُس کی آزادی کے لیے پہلے سے تیار کر رکھا ہے۔ لیکن نہیں، اُن کی پہلی شام خُوش گوار بیتتی ہے۔ یہ موضوع اگلے روز ہیلن کی کار میں تب زیرِ بحث آتا ہے جب جان کو کسی اجلاس کے لیے مسودے پر کام کرنے کے لیے گھر پر ہی چھوڑ کر؛ وہ دونوں ہیلن کی طرف سے

ٹھہرانے کے لیے منتخب کردہ جنوبی سمت واقع مقام ہاسس ایلپس جا رہے ہوتے ہیں۔

''ماں، تمھیں یہاں رہنا کیسا لگے گا؟'' ہیلن اچانک پوچھتی ہے۔

''تمھارا مطلب ہے ان پہاڑوں پر؟''

''نہیں، فرانس میں۔ نائس میں۔ میری ہی عمارت میں ایک اپارٹمنٹ ہے جو اکتوبر میں خالی ہو جائے گا۔ زمینی منزل پر ہے۔ اُسے آپ یا ہم دونوں مل کر خرید سکتی ہیں۔''

''تم چاہتی ہو کہ ہم اکٹھے رہیں، میں اور تم؟ یہ نہایت چونکا دینے والی بات ہے، میری پیاری۔ کیا واقعی تمھارا یہی مطلب ہے؟''

''ہم اکٹھے نہیں رہیں گے۔ آپ مکمل طور پر خود مختار ہوں گی۔ لیکن کسی بھی ناگہانی کی صورت میں آپ مجھے بُلا سکیں گی۔''

''شکریہ، پیاری۔ لیکن میلبورن میں نہایت اچھے لوگ بستے ہیں، جو بزرگوں کا دھیان رکھنا اور اُنھیں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی ناگہانیوں سے نمٹنا بخوبی جانتے ہیں۔''

''براہِ مہربانی، ہمیں کھیل نہیں کھیلنا چاہیے۔ آپ بہتر برس کی ہو چکی ہیں۔ آپ کو دِل کا عارضہ بھی ہے۔ آپ سدا تو اپنا خیال خود نہیں رکھ سکتیں۔ اگر آپ ......''

''کچھ اور مت کہنا، میری پیاری۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مجاز الفاظ تمھیں بھی اُتنے ہی ناپسند ہیں جتنے مجھے۔ میرے کولہے کی ہڈی ٹوٹ سکتی ہے، میں سٹھیا سکتی ہوں اور سال ہا سال بستر پر پڑ سکتی ہوں۔ ہم اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ چیزیں خارج از امکان نہیں ہیں لیکن میرے سامنے یہ سوال ہے کہ میں اپنی دیکھ بھال کا بوجھ اپنی بیٹی پر کیوں ڈالوں؟ اور میرا خیال ہے کہ تمھیں یہ سوال درپیش ہے کہ: کیا تمھارے لیے اپنے تئیں زندگی بسر کرنا ممکن ہو گا کہ تم نے ایک بار نہیں، متعدد بار کامل خلوص سے مجھے دیکھ بھال اور نگہبانی کی پیش کش بھی کی ہے؟ کیا میں، ہمارے مسئلے کو؛ ہمارے مشترکہ مسئلے کو، ٹھیک سے بیان کر رہی ہوں؟''

''جی، میری تجویز پُر خلوص ہے۔ یہ قابلِ عمل بھی ہے۔ میں نے اس بارے میں جان سے بھی بات کی ہے۔''

''تب تو ہمیں اس نکتے میں اُلجھ کر اس خوب صورت دِن کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔ تم نے اپنی تجویز دی، میں نے اِسے سُنا اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس پر غور کروں گی۔ ہمیں اِسے یہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ تمھارا قیاس درست ہے کہ میں اِسے قبول نہیں کروں گی۔ میرے خیالات کی رَو ایک اور ہی سمت بہہ رہی ہے۔ ایک بات تو ہے کہ نوجوانوں سے بُوڑھے بہتر ہیں اور وہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بُوڑھوں سے اُن کی اچھی موت کے لیے مناسب سلوک روا رکھا جاتا ہے (دُنیا کتنی عجیب ہے!)، اُنھیں

یہ دکھانے کے لیے کہ اچھی موت کیا ہوتی ہے۔ میرے خیالات کی سمت یہ ہے۔ میں اپنی موت کو اچھا بنانے پر توجہ دوں گی۔"

"آپ اپنی موت کو جتنا اچھا میلبورن میں بنا سکتی ہیں اُتنا ہی نائس میں بھی بنا سکتی ہیں۔"

"لیکن یہ درست نہیں ہے، ہیلن۔ تم اس پر غور کرو گی تو تمھیں خود پتا چل جائے گا کہ یہ درست نہیں ہے۔ مجھ سے یہ پوچھو کہ اچھی موت سے مراد کیا ہے؟"

"اچھی موت سے آپ کی کیا مراد ہے، ماں؟"

"اچھی موت وہ ہے جو اپنوں سے دُور آئے جہاں جسدِ خاکی کو غیر لوگ ٹھکانے لگائیں، وہ لوگ جو تجہیز و تکفین کا کاروبار کرتے ہیں۔ اچھی موت وہ ہے جس کا آپ کو ٹیلی گرام کے ذریعے پتا چلے: مجھے یہ بتاتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے، وغیرہم۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب ٹیلی گراموں کا زمانہ ہی نہیں رہا۔"

ہیلن اشتعال بھری آہ بھرتی ہے۔ وہ خاموشی سے سفر کرنے لگتے ہیں۔ نائس بہت پیچھے رہ گیا ہے: نیچے جاتی ہوئی سڑک سے وہ ایک طویل وادی میں جا اُترتے ہیں۔ بظاہر تو موسم گرما ہے لیکن ہَوا میں ٹھنڈک ہے گویا سُورج نے اُن پنہائیوں کو چھوا تک نہ ہو۔ وہ کپکپا اُٹھتی ہے اور کھڑکی کا شیشہ چڑھا لیتی ہے۔ وہ گویا مجاز میں سفر کر رہے ہیں!

"تنہائی میں مرنا درست نہیں ہے کہ۔۔۔" بالآخر ہیلن کہتی ہے۔ "کوئی آپ کا ہاتھ بھی تھامنے والا نہ ہو۔ یہ غیر سماجی ہے۔ یہ غیر انسانی ہے۔ یہ بے رحمانہ ہے۔ میں معذرت چاہتی ہوں لیکن میرا مطلب یہی تھا۔ میں آپ کا ہاتھ تھامنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس ہونا چاہتی ہوں۔"

بچوں میں سے ہیلن ہمیشہ سے لیے دیے ٹل کہ اپنی ماں سے دو ہاتھ دُور رہنے والی تھی۔ ہیلن نے ایسے لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ شاید وہ کار میں سہولت محسوس کرتی ہے کہ کار اپنے چلانے والے کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ جس سے بات کر رہا ہو اُس کی آنکھوں میں دیکھنے سے بچ سکے۔ اُسے کاروں کے بارے میں یہ بات معلوم ہونا چاہیے۔

"میری پیاری، یہ تمھاری نہایت محبت اور شفقت ہے۔" وہ کہتی ہے۔ اُس کے مُنھ سے برآمد ہونے والی آواز غیر متوقع طور پر دھیمی ہے۔ "میں اسے کبھی نہیں بُھولوں گی۔ لیکن کیا یہ عجیب نہیں لگے گا کہ اِتنے برسوں کے بعد مرنے کے لیے فرانس لوٹ آؤں؟ سرحد پر موجود شخص جب میری آمد کا مقصد دریافت کرے گا تو اُسے کیا کہوں گی، کاروبار یا تفریح؟ اِس سے بھی بُری بات کہ جب وہ دریافت کرے گا کہ کتنے عرصے رہنے کا قصد ہے؟ ہمیشہ کے لیے؟ مرتے دم تک؟ مختصر عرصے کے لیے؟"

''کہہ دیجیے گا کہ ری یُونر لا فامِلِے۔ وہ سمجھ جائے گا۔ خاندان سے دوبارہ جڑت کے لیے۔ یہ روز ہوتا ہے۔ وہ مزید کچھ دریافت نہیں کرے گا۔''

وہ لیس ڈیوکس ارمائیجیس نامی مسافروں کے لیے شب و روز چلنے والے ہوٹل پر کھانا کھاتی ہیں۔ اِس نام کے پیچھے کوئی کہانی ہوسکتی ہے لیکن وہ نہیں چاہتی کہ اُسے وہ کہانی سنائی جائے۔ اگر وہ کہانی اچھی ہے تب بھی اغلباً کسی نہ کسی طور گھڑی گئی ہوگی۔ سرد اور نشتر جیسی ہَوا چل رہی ہے۔ وہ شیشے کی آڑ میں بیٹھ کر برف پوش چوٹیوں کو دیکھنے لگتی ہے۔ موسم کا آغاز ہے اور ان کے علاوہ صرف دو اَور میزوں پر لوگ بیٹھے ہیں۔

''حسین؟ ہاں، بلا شبہ یہ حسین ہے، ایک حسین ملک، ایک خُوب صُورت ملک جو اِس کہاوت کے بغیر بھی خُوب صُورت ہے: لا بیلے فرانس۔ لیکن ہیلن یہ مت بُھولو کہ میں کس قدر خُوش نصیب ہوں کہ مجھے اِتنی اچھی تعطیلات میسر آئی ہیں۔ میں نے زندگی میں جہاں کا قصد کیا، چلی گئی۔ جب میں نے چاہا میں نے حسن کی گود میں بیٹھ کر زندگی بسر کی۔ اب میرے سامنے یہ سوال کھڑا ہے کہ اِس تمام خُوب صُورتی نے میرے کیا بھلائی کی؟ کیا حسن بھی شراب ہی کے مانند محض ختم ہونے والی شے نہیں؟ ایک شخص اِسے جرعہ جرعہ نوش کرتا ہے، ایک شخص اِسے یک لخت ختم کرڈالتا ہے تو یہ اُسے مختصر مسرت انگیز ذہنی سرور بخشتی ہے لیکن یہ اپنے پیچھے کیا چھوڑتی ہے؟ شراب کی تلچھٹ، اِن الفاظ پر معذرت خواہ ہوں، پیشاب ہے لیکن حسن کا کیا باقی کیا بچتا ہے؟ اِس کا اچھا پن کیا ہے؟ کیا خُوب صُورتی ہمیں بہتر انسان بناتی ہے؟''

''ماں، اِس سے قبل کہ آپ مجھے اِس سوال کا جواب دیں، کیا میں اپنا جواب بتاؤں؟ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ مجھے پتا ہے کہ آپ کیا کہنے جارہی ہیں۔ آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ دیکھ سکتی ہیں کہ خُوب صُورتی نے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ آج کل آپ، اپنے آپ کو جنت کے دروازے پر خالی ہاتھ پاتی ہیں اور آپ کے دماغ میں ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ یہ آپ کی حد تک کاملاً درست ہے۔ یہ بات الزبیتھ کوسٹیلو کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ یہی کہا جاتا ہے اور یہی یقین کیا جاتا ہے۔''

''تم جواب نہیں دوگی۔ کیوں کہ یہ الزبیتھ کوسٹیلو کے کردار سے باہر کا معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ تم نے بطور لکھاری تخلیق کیا اُس میں تخلیقی حسن ہی نہیں ہے۔ محدود حسن: ودیعت کیا گیا حسن ہے۔ یہ شاعری نہیں بل کہ حسن بااِیں ہمہ متشکل، شستہ، معیشت بھی ہے۔ بل کہ اُس نے دیگر لوگوں کی زندگی بدل دی ہے۔ اُنھیں بہتر انسان یا کچھ بہتر انسان بنایا ہے۔ یہ بات صرف میں نہیں کہتی، دُوسرے لوگ، اجنبی لوگ بھی، میرے سامنے، میرے مُنھ پر کہتے ہیں۔ اِس لیے نہیں کہ تم جو لکھتی ہو اُس میں نصیحت آموز باتیں ہیں بل کہ وہ خُود نصیحت آموز ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے مربع مچھلی۔''

''مجھے نہیں معلوم مربع مچھلی کون سی ہے۔''

''پانی پر تیرنے والا کیڑا یا لمبی ٹانگوں والی مکھی۔ایک کیڑا ہے۔مربع مچھلی سمجھتی ہے کہ وہ محض خوراک کے لیے شکار کر رہی ہے۔ جب کہ درحقیقت تالاب پر اُس کی بار بار حرکت کے نشانات خدا کا نام بناتے ہیں جو تمام الفاظ سے زیادہ خُوب صُورت ہیں۔کاغذ پر قلم کی حرکت خدا کا نام لکھتی ہے جسے آپ دیکھ سکتی ہیں لیکن میں نہیں۔''

''ہاں،اگر تم بھی چاہو تو دیکھ سکتی ہو۔لیکن معاملہ اِس سے بھی آگے کا ہے۔تم لوگوں کو سکھاتی ہو کہ کیسے محسوس کرنا ہے۔خُوش سلیقگی کے مل بوتے پر۔قلم کا سلیقہ خیالات کی پیروی کرتے ہوئے حرکت کرنا ہے۔''

اُسے لگتا ہے کہ اُس کی بیٹی جو اخلاقی نظریہ پیش کر رہی ہے وہ زمانۂ قدیم یا ارسطو کے زمانے کا ہے۔کیا ہیلن نے اِسے خُود دریافت کیا ہے یا محض کہیں پڑھا ہے اور یہ مصوری کے فن پر کیوں کر لاگو ہوتا ہے؟ اگر قلم کا ردھم خیال کا ردھم ہے تو برش کا ردھم کیا ہے اور فوارے سے بننے والی تصاویر کی کیا حیثیت ہے؟ ایسی مصورانہ تخلیقات ہمیں بہتر انسان بننا کیسے سکھاتی ہیں؟

وہ آہ بھرتی ہے۔''تمھاری یہ بات نہایت پیاری ہے،ہیلن۔اپنے یقین کی بحالی کے لیے میں تمھاری ممنون ہوں۔آخر ایک زندگی تو برباد نہیں ہوئی۔وہ جو تم کہتی ہو تا کہ اگر میں قائل ہو سکتی تو میں میں نہ رہتی۔لیکن یہ کوئی تسلی آمیز چیز نہیں ہے۔تم دیکھ رہی ہو کہ میں خُوش طبع نہیں ہوں۔میری موجودہ طبیعت کی وجہ،وہ زندگی ہے،جو میں نے شروع سے لے کر اب تک گزاری ہے؛ جو کسی طور بھی دلچسپی کی حامل نہیں رہی۔ مجھے اب لگتا ہے کہ اگر کوئی واقعی بہتر انسان بننا چاہتا ہے تو اُسے اِس کام کے لیے افسانوی نثر کے اوراق جیسی پیچ دار راہوں کے بجائے کم سے کم موڑ والے سیدھے راستے اختیار کرنا چاہئیں۔''

''ایسا کیوں؟''

''ہیلن، یہ دِلچسپ گفتگو نہیں ہے۔کم از کم میرے تجربے میں تو یہی ہے کہ مایوس ذہن دِلچسپ خیالات کو جنم نہیں دیتے۔''

''تو کیا ہمیں گفتگو نہیں کرنا چاہیے؟''

''ہاں نہیں کرنا چاہیے بل کہ ہمیں پُرانی ریت رواج کا کوئی کام کرنا چاہیے۔آؤ، یہاں بیٹھ کر کوئل کی کوکو سنیں۔''

بلا شبہ ریستوران کے عقبی کُنج میں کوئل کوک رہی ہے۔اگر وہ محض درز بھر کھڑکی کھول لیں تو

ہَوا کے دوش پر کُوک واضح سنائی دینے لگے گی: بلند اور زیریں سُروں کو مخصوص وقفے سے دُہراتی ہوئی کُوک۔ یــاد دِلانــے والــی، وہ سوچنے لگتی ہے۔ کیٹس کے الفاظ۔ گرمیوں کا موسم اور گرما کی آسائش یاد دِلانے والی۔ ایک کریہہ صُورت پرندہ لیکن کیسا زبردست مغنّی، کیسا درویش منش! کُوکو، کوئل کی زبان میں خُدا کا نام۔ بجھارتوں سے بھرا لفظ۔

وہ، وہ کام کررہے ہیں جو اُنھوں نے کبھی اکٹھے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ تب بھی؛ جب بچّے بچّے تھے۔ وہ بحیرہ اوقیانوس کی شب کی پُرلطف حرارت میں ہیلن کے اپارٹمنٹ کے جھروکے میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ تین افراد والی، وہ برج کھیل رہے ہیں جسے وہ سنتے کا نام دیتے ہیں، جو ہیلن یا ہیلنے کے بقول فرانس میں رَمی کہلاتا ہے۔

شام کو تاش کھیلنے کا خیال ہیلن کی ذہنی اختراع ہے۔ شروع میں یہ خیال عجیب اور مصنوعی لگتا ہے لیکن جیسے جیسے کھیل زور پکڑتا ہے وہ مسرور ہو جاتی ہے۔ ہیلن کتنی وجدانی ہے: اُسے کبھی ہیلن کے وجدانی ہونے کے بارے میں شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔

اُسے اب یہ بات ششدر کرتی ہے کہ کس قدر بہ آسانی، وہ تیس برس قبل والے اشخاص سے تاش والی شخصیات میں بدل گئے ہیں۔ اُن شخصیات میں؛ جن سے اُنھوں نے ایک دُوسرے سے جُدا ہوتے ہی چھٹکارا پا لیا تھا۔ ہیلن لاپروا اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی؛ جان کچھ سطحی اور کچھ عیاں ہو جانے والا ہے اور وہ خُود، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ دونوں اُس کا خُون ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ پَیلی کین اپنے بچّوں کو کھلانے کے لیے اپنا سینہ چاک کردے گا، حیرت انگیز طور پر مبارز۔ اگر وہ جوا کھیل رہے ہوتے تو وہ بھرے ہوئے عمودی ہاتھ سے اُن کی رقم ہتھیا لیتی۔ وہ اِس بارے میں کیا کہتے؟ وہ اِس تمام صُورتِ حال کے بارے میں کیا کہتے؟ کیا وہ یہ کہتے کہ شخصیت ناقابلِ اصلاح ہوتی ہے، ناقابلِ توجہ۔ یا محض اتنا کہتے کہ خاندان، خُوش وخرم خاندان کھوٹوں کے عقب سے کھیل کے مخزن ہی سے جُڑتے ہیں۔

''لگتا ہے کہ میری صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر جیتنے کے بعد تبصرہ کرتی ہے۔ ''معذرت خواہ ہوں۔ کتنی پریشان ہوں۔'' جو بلا شبہ جھوٹ ہے۔ وہ پریشان نہیں ہے، ذرا بھی نہیں۔ ''دوکسی کی برسوں کی اُن اہلیتوں پر جھجک ہوتا جنھیں وہ کھونا شروع کردیتا ہے۔''

وہ جو اہلیت رکھتی ہے اور جس اہلیت کا اِس وقت مظاہرہ کررہی ہے وہ محض اُس کی بصری صلاحیت ہے۔ ذرا سا بھی ذہنی تگ ودو کے بغیر وہ اپنے بچّوں کے ہاتھوں میں موجود پتّے دیکھ سکتی ہے، ایک ایک پتّا دیکھ سکتی ہے۔ وہ اُن کے ہاتھوں میں، اُن کے دِلوں میں جھانک سکتی ہے۔

''تم کس اہلیت کو کھوتا ہوا محسوس کررہی ہو، ماں؟'' اُس کا بیٹا چوکنّے پن سے دریافت کرتا ہے۔

''میں اپنی تمنا کی اہلیت کھو رہی ہوں۔'' وہ خُوش دِلی سے جواب دیتی ہے۔ ''ایک پیسے کے عوض، ایک روپے کے عوض۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تمنا کی اہلیت ہوتی ہے۔'' جان نے پتّا اُٹھاتے ہوئے جھک کر کہا۔ ''دِلچسپ بات یہ ہے کہ غالبًا یہ وقتی رَو ہے لیکن اہلیت کسی بھی طرح نہیں۔ تمنا پہاڑ پر تو چڑھا سکتی ہے لیکن اُسے سر نہیں کروا سکتی۔''

''سر کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

''توانائی، حوصلہ جو آپ کے اندر تیاری کے وقت مجتمع ہوگا۔''

''توانائی۔ کیا تم توانائی کے بارے میں میرا نظریہ جاننا چاہتے ہو، ایک بُوڑھے شخص کی توانائیاں؟ فکر مند مت ہو۔ اِس میں تمھیں پریشان کرنے والی ذاتی نوعیت کی کوئی بات ہے نہ مابعدالطبیعاتی، بالکل بھی نہیں۔ یہ مادے ہی جیسا نظریہ ہے۔ لو، سنو۔ جُوں جُوں ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے جسم کے بیرونی عضو خلیوں تک برباد ہوتے چلے جاتے ہیں، قوتِ ترسیل متاثر ہوتی جاتی ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے بڑھاپے کا یہی مطلب ہے۔ اُن لوگوں میں بھی، جن کے اعصاب تک مضبوط ہوں پُرانے خلیے خزاں رسیدہ ہوجاتے ہیں۔ (ایک استعارہ، میں اعتراف کرتی ہوں، لیکن استعارے کے لیے چھوڑی ہوئی خالی جگہ مابعدالطبیعات سے پُر نہیں ہوتی۔) ایسا سب سے زیادہ دماغ کے خلیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

''بالکل ویسے ہی جیسے موسمِ بہار موسمِ گرما کا پیش بیں ہوتا ہے اِسی طرح خزاں کا موسم پس منظر ہوتا ہے۔ خزاں رسیدہ ذہنی خلیات کی خواہشات بھی خزاں رسیدہ ہوتی ہیں، ناسٹلجائی اور دماغ کی تہوں میں نہاں۔ اُن میں گرما کی سی حرارت اور ہم آہنگی نہیں ہوتی اور ان رجحان مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف ہوتا ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ میرا یہ نکتہ، دماغی علم میں میری طرف سے ایک اضافہ ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''میں کہوں گا کہ۔۔۔'' اُس کا دانا بیٹا کہتا ہے۔ ''دماغی علم کم اور ذہنی فلسفہ زیادہ ہے جو فلسفے کی خاص شاخ سے متعلّق ہے۔ کیا ہم محض یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ خزاں رسیدہ طبیعت محسوس کرتی ہیں اور اِسے اپنے اُوپر طاری رہنے دیتی ہیں۔''

''کیوں کہ اگر یہ کیفیت ہوتی تو تبدیل ہو جاتی جیسا کہ اکثر مزاج بدلتا رہتا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ میری کیفیت دھوپیلی ہو جائے گی لیکن رُوح کی طبیعتیں کیفیتوں سے زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ناستلجیا کی کیفیت مزاج نہیں بل کہ وجودی کیفیت ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ

کیا نا ستلجیائی کیفیت ذہن سے متعلق ہے یا دماغ سے؟ میرا جواب ہے کہ دماغ سے۔ دماغ کا منبع اشکال میں ہوتا ہے لیکن گرد آلود، بکھری ہوئی اشکال میں، جس طرح یہ ابتدائی لیس دار حالت میں عمل کرتا ہے اور واپس لوٹنے کی تمنا رکھتا ہے۔ ایک ایسا مادہ ہے جو اپنے ہی خلیوں سے نجات کا متمنی ہوتا ہے۔ خیال سے زیادہ موت کی سمت دھکیلنے والی شے۔"

یہ باتیں عمدہ لگتی ہیں، بالکل گپ شپ ایسی اور بالکل بھی جنونی نہیں لگتیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچ رہی ہے۔ وہ سوچ رہی ہے: اِس طرح اُس کے بچوں سے، جن سے شاید وہ دوبارہ کبھی نہ مل پائے، کون باتیں کرتا ہوگا؟ وہ یہ بھی سوچ رہی ہے: ایسی سوچ اُسی عورت کو آ سکتی ہے جو اپنی عمر کی خزاں رسیدگی میں ہو۔ میں جو کچھ دیکھتی ہوں اور جو کچھ کہتی ہوں وہ سب ماضی کا پرتو لیے ہوتا ہے۔ میرے لیے اب بچا ہی کیا ہے؟ میرا کام تو بس رونا پیٹنا ہی رہ گیا ہے۔

"کیا آپ کا ذہن آج کل یہی باتیں سوچتا رہتا ہے۔ دماغی علم؟" ہیلن پُوچھتی ہے۔ "کیا آپ یہی لکھ رہی ہیں۔"

عجیب سوال، مداخلتِ بے جا۔ ہیلن کبھی اُس کے کام کے بارے میں اُس سے بات نہیں کرتی۔ یہ اُن کے درمیان ممنوعہ موضوع تو نہیں لیکن حدود ضرور متعین ہیں۔

"نہیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔ "تمھیں یہ جان کر مسرت ہوگی کہ میں اب بھی افسانہ نویسی تک محدود ہوں۔ میں نے اپنی آرا ابھی لکھنا شروع نہیں کیں۔ 'الزبیتھ کوسٹیلو کی آرا' ترمیم شدہ ایڈیشن۔"

"کیا یہ آپ کا ناول ہے؟"

"ناول نہیں کہانیاں ہیں۔ کیا تم اُن میں سے ایک کہانی سننا چاہو گے؟"

"جی ضرور۔ بہت عرصے سے آپ نے کوئی کہانی نہیں سنائی۔"

"بہت خُوب۔ یہ رات کو سوتے وقت پڑھنے والی کہانی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ۔۔۔ لیکن پُرانے زمانے کا نہیں۔ ایک شخص ہوتا ہے۔ وہ ملازمت کے انٹرویو کے لیے ایک عجیب وغریب شہر میں جاتا ہے۔ بے چینی واضطراب کا شکار ہو کر مہم جوئی کی نیت سے وہ اپنے ہوٹل کے کمرے سے ایک طوائف کو فون کرتا ہے۔ ایک لڑکی آتی ہے اور اُس کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ نہ جانے کن احساسات سے مغلوب ہو کر وہ اُس کے ساتھ اِتنا کُھل جاتا ہے جتنا اپنی بیوی کے ساتھ نہیں کُھلتا اور اُس سے اپنی کچھ خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔

"اگلے روز اُس کا انٹرویو اچھا ہوتا ہے۔ اُسے ملازمت کی پیش کش ہوتی ہے، جسے وہ قبول کر لیتا ہے اور کہانی آگے بڑھتی ہے جس میں وہ اُس شہر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان کام کرتے

ہوئے بطور سیکریٹری یا کلرک یا ٹیلی فون آپریٹر کام کرتے ہوئے اُسے دفتر میں وہی لڑکی، وہی طوائف لڑکی، دِکھائی دیتی ہے جسے وہ دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے۔لڑکی بھی اُسے پہچان لیتی ہے۔''

''پھر؟''

''میں آگے نہیں بتا سکتی۔''

''لیکن یہ کہانی نہیں، محض کہانی کا منظرنامہ ہے۔آپ کی کہانی تب تک مکمل نہیں ہوگی جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گی کہ آگے کیا ہوا۔''

''وہ لڑکی سیکریٹری نہیں ہوتی۔آدمی کو نوکری کی پیش کش ہوتی ہے جسے وہ قبول کر لیتا ہے اور وہ اُس شہر میں چلا آتا ہے۔پھر کہانی کے پیرایے میں وہ اپنے عزیزوں کے ہاں جاتا ہے۔ایک عم زاد کے ہاں یا بیوی کے عم زاد کے ہاں جس سے وہ بچپن کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملا ہوتا۔عم زاد کی بیٹی کمرے میں داخل ہوتی ہے اور وہ ششدر رہ جاتا ہے کہ وہ وہی لڑکی تھی۔''

''بتایئے، آگے کیا ہوتا ہے؟''

''یہ چیز انحصار کرتی ہے۔شاید کچھ بھی نہ ہو۔شاید یہ ایک ایسی کہانی ہو جو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔''

''لغو، اِس کا انحصار کس پر ہے؟''

اب جان بولتا ہے۔''اِس کا انحصار اُس پر ہے جو کچھ اُن کے مابین ہوٹل کے کمرے میں ہوتا ہے۔اُن خواہشات پر ہے جو وہ اُس سے کرتا ہے۔ماں، کیا آپ وہ خواہشات بتاتی ہیں جو وہ کرتا ہے؟''

''ہاں، میں بتاتی ہوں۔''

اب وہ سب خاموش ہیں۔یہ بات غیر اہم ہو جاتی ہے کہ نئی نئی ملازمت والا شخص اب کیا کرے گا یا جسم فروشی کا اضافی کام کرنے والی لڑکی کیا کرے گی۔اصل کہانی باہر جھروکے میں شروع ہوتی ہے جہاں وسطی عمر کے دو بچے ایک ایسا ماں کا سامنا کر رہے ہیں جس کی اُنھیں پریشان اور مایوس کرنے کی صلاحیت ابھی ختم نہیں ہوئی۔میں وہ ہوں جو بُن کرتی رہتی ہوں۔

''کیا آپ ہمیں بتائیں گی کہ وہ خواہشات کیا تھیں؟'' ہیلن تیکھے لہجے میں دریافت کرتی ہے کیوں کہ بات کرنے کو اب کچھ اور بچا ہی نہیں ہے۔

بہت دیر ہو گئی ہے لیکن اِتنی بھی نہیں۔اب وہ دونوں بچے نہیں رہے۔بھلے یا بُرے کی وجہ سے وہ اُس سوراخ زدہ کشتی میں اکٹھے سوار ہیں جسے زندگی کہتے ہیں اور جو بے نیاز اندھیرے سمندر میں موہوم پیکر کو محفوظ کیے بغیر بہی چلی جاتی ہے (اُسے آج کیسے کیسے استعارے سُوجھ رہے ہیں!)۔کیا وہ

دونوں ایک دُوسرے کو نوچ کھائے بغیر زندہ رہنا سیکھ سکتے ہیں؟

''مرد عورت سے جن خواہشات کا اظہار کرتا ہے وہ میرے لیے صدمہ انگیز ہیں لیکن شاید تمھارے لیے نہ ہوں کیوں کہ تمھارا تعلق مختلف نسل سے ہے۔ شاید دُنیا میری مذمت کرتے ہوئے مجھے پچھلے ساحل پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔ شاید یہی کہانی کا عروج ہو کہ جب وہ شخص، بڑی عمر کا شخص، اُس لڑکی کا سامنا کرتے ہی شرمسار ہو جاتا ہے لیکن جو کچھ ہوٹل میں ہوا ہوتا ہے وہ اُس کے لیے محض اُس کے کاروبار کا ایک حصہ ہوتا ہے، زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ 'مسٹر جونز...... انکل ہیری...... کیسے ہیں آپ؟'''

بچے، جو اَب بچے نہیں رہے، آپس میں نظروں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ بس؟ وہ کہنے لگتے ہیں۔

کہانی کچھ بنی نہیں۔

''کہانی والی لڑکی بے حد حسین و جمیل ہے۔'' وہ کہتی ہے۔ ''ایک نہایت دِل کش پھول۔ میں تمھیں اِتنا بتا سکتی ہوں کہ مسٹر جونز، انکل ہیری اِس سے قبل ایسے کسی معاملے میں کبھی ملوث نہیں رہا، حسن کی تذلیل کے معاملے میں، جو اُس کی رسوائی کا سبب بن سکے۔ جب اُس نے فون کیا تب بھی اُس کا یہ ارادہ نہیں تھا۔ اُسے خُود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اُس کی یہ نیت ہے۔ اُس کی نیت تب خراب ہوئی جب لڑکی اُس کے سامنے آئی اور اُس نے اُسے دیکھا جیسا میں نے بتایا ہے کہ وہ ایک پھول تھی۔ اُسے یہ ظلم لگا کہ وہ عمر بھر حسن کو ترستا رہا! اور شاید آئندہ بھی ترستا رہے۔ بے انصاف دُنیا! وہ اندر ہی اندر بَین کرتا رہا اور وہاں سے تلخی کے عالم میں روانہ ہو گیا۔ مجموعی طور پر وہ کوئی اچھا شخص نہیں تھا۔

''ماں، میرا خیال ہے کہ'' ہیلن کہتی ہے۔ ''حسن اور اُس کی اہمیت کے بارے میں تمھارے اپنے اندر شکوک و شبہات ہیں۔ آپ نے بتایا ہے کہ اُس کا اضافی کام۔''

''کیا میں نے یہی بتایا ہے؟''

''کم و بیش۔''

جان آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ بہن کے بازو پر رکھتا ہے۔ ''کہانی والا آدمی۔'' وہ کہتا ہے۔ ''مسٹر جونز۔ اُسے اب بھی حسن پر اعتبار ہے۔ وہ حسن کے سحر کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حسن سے نفرت کرتا ہے اور حسن سے جھگڑتا ہے۔''

''ماں، کیا آپ کا یہی مطلب ہے؟'' ہیلن استفسار کرتی ہے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میرا کیا مطلب ہے۔ کہانی ابھی تک لکھی نہیں گئی۔ عموماً میں کہانیوں پر گفتگو سے احتراز کرتی ہوں جب تک وہ مکمل طور پر بوتل سے باہر نہ آ جائیں۔ مجھے اب پتا چلا کہ کیوں۔''

اگر چہ رات گرم ہے لیکن وہ ہولے سے کپکپاتی ہے۔ ''مجھے بہت سے دخل دَر معقولات ملتے ہیں۔''

"بوتل۔" ہیلن کہتی ہے۔

"محسوس مت کرنا۔"

"یہ دخل دَرمعقولات نہیں ہیں۔" ہیلن کہتی ہے۔ "دُوسرے لوگوں کی جانب سے تو یہ دخل دَرمعقولات ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ بھی یقیناً یہ بات جانتی ہیں۔"

آپ کے ساتھ؟ کیسی احمقانہ بات ہے! بچّے اپنے والدین کے ساتھ نہیں اُن کے خلاف ہوتے ہیں۔ لیکن آج ہفتے کی خاص شام ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ تینوں آئندہ کبھی زندگی میں دوبارہ اکٹھے نہیں ہوں گے۔ غالباً اِس بار اُنھیں خُود سے ماوراہونا چاہیے۔ شاید اُس کی بیٹی کے الفاظ دِل سے ہی نکلے ہوں، جھوٹے دِل سے نہیں بل کہ سچے دِل سے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اور وہ الفاظ اُس کے اپنے دِل میں اُتر گئے — شاید یہ الفاظ بھی سچے دِل ہی سے نکلے ہیں۔

"پھر مجھے بتاؤ کہ آگے کیا ہونا چاہیے؟" وہ دریافت کرتی ہے۔

"اُسے گلے لگا لے۔" ہیلن کہتی ہے۔ "سارے گھر والوں کے سامنے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے اور گلے لگا لے۔ خواہ یہ کتنا ہی عجیب لگے۔ 'میں نے تمھیں جس اذیّت سے دوچار کیا اُس پر مجھے معاف کردو۔' اُس سے یہ بات کہلوائیں۔ اُس کے اُس لڑکی کے سامنے گھٹنے ٹکوائیں۔ 'مجھے اپنے اندر دُنیا بھر کے جمال کی ایک بار پھر پُوجا کرنے دو۔' یا اِسی قسم کے الفاظ۔"

"بالکل آرٗش ٹویلائٹ کا انداز۔" وہ بُڑبُڑاتی ہے۔ بالکل دوستوفسکی کا انداز۔ مجھے نہیں یقین کہ یہ بات میری تخلیقات میں ہے۔"

آج جان کا ناکس میں آخری دِن ہے۔ اگلے روز وہ صبح سویرے اپنے اجلاس کے سلسلے میں ڈُوبرفنک چلا جائے گا۔ لگتا ہے کہ وہاں وہ وقت سے قبل، وقت اور وقت کے خاتمے کے بعد، وقت پر مضمون پڑھے گا۔

"ایک وہ بھی وقت تھا جب میں بچّہ تھا تو دُوربین سے دیکھنا پسند کرتا تھا۔" وہ اُس سے کہتا ہے۔ "اب میں اپنے آپ کو ایک فلاسفی کے طور پر متعارف کروانا چاہتا ہوں اور ایک ماہرِ دینیات کے طور پر بھی۔ یہ زندگی کی یک سر تبدیلی ہے۔"

جب تم اپنی دُوربین سے، وقت سے پہلے وقت میں دیکھتے ہو تو۔" وہ دریافت کرتی ہے۔

"تمھیں کیا دِکھائی دیتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ جواب دیتا ہے۔ "شاید خُدا جس کا ایسا کوئی پہلو نہیں ہے جو پوشیدہ ہو۔"

"خوب، میری تمنا ہے کہ میں بھی اُسے دیکھ پاؤں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اس کی اہل نہیں

ہوں۔ اُسے میری طرف سے سلام کہہ دینا۔ کہہ دینا کہ میں جلد ہی اُس کے پاس آنے والی ہوں۔"

"ماں!"

"مجھے افسوس ہے۔ یقیناً تمھیں معلوم ہوگا کہ ہیلن نے تجویز دی ہے کہ میں یہاں ٹائس میں ایک اپارٹمنٹ خرید لوں۔ دلچسپ تجویز ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ میں اس پر عمل کروں گی۔ وہ کہتی ہے کہ تمھارے پاس بھی کوئی تجویز ہے۔ یہ تمام تجاویز نہایت پُرمغز ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے دوبارہ بیاہ کرنا۔ تمھاری کیا تجویز ہے؟"

"آپ آکر ہمارے ساتھ بالٹی مور میں رہیں۔ بڑا گھر ہے۔ بہت جگہ ہے۔ ہم نے ایک اَور غسل خانہ بھی بنوایا ہے۔ بچّوں کو بھی اچھا لگے گا۔ اُن کے لیے یہ اچھی بات ہوگی کہ اُن کی دادی اُن کے پاس ہے۔"

"اُنھیں یہ تب تک ہی اچھا لگے گا جب تک وہ آٹھ دس سال کے رہیں گے۔ لیکن جب بارہ پندرہ برس کے ہوں گے اور اپنے دوستوں کو گھر لائیں گے تو یہ بات اُنھیں بالکل اچھی نہیں لگے گی کہ دادی اپنے چپل گھسٹتی ہوئی باورچی خانے میں کھٹ پٹ کرے، بڑبڑاتی پھرے، اپنے دانت کٹکٹائے اور شاید بدن سے نکلنے والی بو بھی ناگوار گزرے۔ جان، تمھارا شکریہ۔ لیکن نہیں۔"

"آپ فوری فیصلہ نہ کریں۔ میری دعوت برقرار ہے اور سدا برقرار رہے گی۔"

"جان، میں ایسی سطح پر نہیں کہ تبلیغ کرسکوں جو آسٹریلوی امریکی غلام اپنے آقا امریکا کے حکم پر کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں بٹھالو تم مجھے وہ ملک چھوڑنے کا کہہ رہے ہو جس کے ایک گھر میں اِس لیے پیدا ہوئی تھی کہ 'مہا شیطان' کے شکم میں رہائش اختیار کروں اور یہ بھی کہ اِس بارے میں میرے اپنے تحفظات بھی ہیں۔"

وہ، جو اُس کا بیٹا ہے، ٹھہر جاتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی وہ بھی پگڈنڈی پر رُک جاتی ہے۔ وہ اُس کے الفاظ پر غور کرتا ہوا لگتا ہے۔ اُن الفاظ کو وہ چالیس برس قبل سالگرہ کے تحفے کی پڈنگ اور جیلی کے مُلغّم پر ملحوظ کرتا ہے جس کے خلیے ابھی تک تکان زدہ نہیں ہوئے اور اب بھی اُتنے ہی توانا ہیں کہ وہ وقت سے قبل وقت، وقت بعد از وقت اور بوڑھے ہوتے والدین کا کیا کیا جائے جیسے چھوٹے بڑے مسائل سے نبرد آزما ہو سکتے ہوں۔

"یعنی میں مذمت تو کرسکتی ہوں لیکن قطع تعلق نہیں کرسکتی۔"

"راست بازی، ماں۔ میں اِس کی نشاندہی کر رہا ہوں: راست بازی کا لہجا اور جذبہ۔ مجھے معلوم ہے کہ اِسے ترغیب آمیز ہونا چاہیے، ایک طویل عرصے تک لفظوں کو لکھنے سے پہلے تو لنے کے بعد، اِنھیں آگے جانے دیں، جذبے میں بہہ جانے دیں لیکن یہ اپنے پیچھے بہت بُرا اثر چھوڑتا ہے۔ آپ کو

اس سے آگاہ ہونا چاہیے۔"

"راست بازی کا جذبہ۔ میں یہ یاد رکھوں گی کہ تم اسے کیا کہتے ہو۔ میں اس پر غور کروں گی۔ تم اُن لوگوں کو احمق کہتے ہو۔ مجھے وہ بالکل جنونی نہیں بل کہ خود غرض اور عیار لگتے ہیں، یک سر واضح سوچ کے حامل۔ اور دُنیاوی تاریخ کی جستجو والے بھی۔ وہ تاریخ کے جہاز کا رُخ موڑنا چاہتے ہیں یا اُسے ڈُوبنے سے بچا رہے ہیں۔ کیا یہ منظر نامہ تمھارے لیے بسیط نہیں؟ کیا یہ بُرا تاثر چھوڑتا ہے؟ جہاں تک متضاد الخیال نظریے کا معاملہ ہے تو میرے تجربے کے مطابق اس نظریے کا پہلا سبق یہ ہے کہ اس نظریے پر اعتبار نہ کرو۔ اگر تم متضاد الخیال نظریے پر بھروسا کرتے ہو تو یہ نظریہ تمھیں نیچا دِکھا دیتا ہے۔"

وہ اُس کا بازو تھامتی ہے اور دونوں خاموشی سے اپنی پگڈنڈی پر چلنے لگتے ہیں۔ لیکن اُن کے مابین سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ اُس کی سختی اور زود رنجی کو محسوس کر سکتی ہے۔ اُسے یاد آتا ہے کہ وہ ایک زود رنج بچہ تھا۔ سب کچھ رَیلے کے مانند پلٹتا ہے اور اُسے اپنی کسی رنجیدگی سے باہر آنے کے لیے گھنٹوں درکار ہوتے ہیں۔ رنجیدہ والدین کا رنجیدہ بچہ۔ وہ اُس کے اور اُس کی سختی سے بھینچے مُنہ والی ناپسندیدہ بیوی کے ہم راہ رہنے کا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی۔

وہ سوچتی ہے کہ کم از کم وہ مجھ سے احمقوں جیسا سلوک نہیں کرتے۔ میرے بچے کم از کم مجھے عزت تو دیتے ہیں۔

"لڑنا جھگڑنا بہت ہوا۔" وہ کہتی ہے (کیا اب وہ رنجیدگی سے نکل رہی ہے؟ کیا دفاع کر رہی ہے؟)۔ "ہمیں سیاسی باتیں کر کے اپنے آپ کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم گرما کی اس فرحت بخش شام کو یہاں بحیرہ اوقیانوس کے ساحل پر ہیں جو یورپ کا گہوارہ ہے۔ مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ اگر تم اور نورما امریکا نہ رہ سکو، اُس کی ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی کو برداشت نہ کر سکو تو میلبورن میں تمھارا اپنا گھر ہے جو ہمیشہ تمھارا اپنا رہا ہے۔ تم ملنے، پناہ لینے اور جیسا کہ ہیلن کہتی ہے کہ ری یُونزلا فامِلّے کے لیے آ سکتے ہو۔ اور اب تمھارا کیا خیال ہے کہ ہم ہیلن کو ساتھ لیں اور شاہراہ گیمبیا پر واقع اُس کے اُس چھوٹے سے ریستوران میں چل کر خوش گوار ماحول میں اکٹھے اپنا آخری کھانا کھائیں؟

VVVV

ہسپانیہ کا ایک گھر
(A House in Spain)

وہ جُوں جُوں بُوڑھا ہوتا جا رہا ہے تُوں تُوں محسوس کرتا ہے کہ وہ زبان، اُس کے ناقص برتاؤ اور تنزلی پر چڑ چڑا ہوتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر محبت میں گرفتار ہونا کے متعلق جب اُس کا ایک دوست کہتا ہے۔ ''ہمیں گھر سے محبت ہو گئی ہے۔'' تو وہ جواب دینا چاہتا ہے کہ تم کسی مکان سے کیوں کر محبت کر سکتے ہو جب کہ وہ پلٹ کر محبت کا جواب نہیں دے سکتا؟ جب تم چیزوں سے محبت کرنے لگتے ہو تو جس طرح محبت کو برتا جا رہا ہے حقیقی محبت کے لیے کیا بچے گا؟ لیکن کسی کو پروا ہی نہیں ہے۔ لوگ مشجروں اور پُرانی کاروں کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

وہ ان نئے وضع کردہ الفاظ کو رد کرنا چاہتا ہے، لیکن نہیں کر سکتا۔ کیا ہوا اگر اُسے کسی شے یا لوگوں میں محسوسات کی تبدیلی کا ادراک ہو جائے؟ کیا ہوا اگر رُوح، جسے وہ ایسے مادے سے بنی تصور کرتا تھا جس پر زمان اثر نہیں کرتا لیکن وہ بھی لازمان نہیں بل کہ ہلکی ہونے کے عمل سے گزرتی ہوئی کم متین اور وقت سے تباہ کرنے والی ہے؟ کیا ہوا اگر رُوح کی اشیا سے محبت مزید استعجاب انگیز نہ رہے بل کہ درحقیقت بچوں کا کھیل بن کر رہ جائے؟ کیا ہوا اگر اُس کے آس پاس کے لوگ اپنی نئی اور تازہ کار رُوحوں سے زمینی قطعوں کے بارے میں محسوسات رکھنے لگیں، وہ درد جو محبت میں گرفتار ہونے سے ہوتا ہے؟ طرّہ یہ کہ اگر اُس کا چڑچڑا پن اُس پر وہ ظاہر نہ کرتا ہو جو وہ اپنے آپ کو جتاتا ہے۔ زبان کے متعلق، پُرانے زمانے کا ذوق۔ البتہ اِس کے برعکس (وہ اِس خیال پر ایمان داری سے غور و خوض کرتا ہے) حسد، نہایت ضعیف العمر ہو جانے والے شخص کا حسد، بے حد چکیلا اور حد یہ کہ دوبارہ محبت میں گرفتار ہونے کی نہاں حسرت؟

درحقیقت کسی خاص جائیداد سے محبت کے وسیلے سے اپنی کہانی سہولت سے بیان کی جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں دو گھر، ایک اپارٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ عرصے کے لیے ساحلِ سمندر پر واقع ایک کاٹیج اُس کی مِلک رہے تھے۔ وہ اُس تمام عرصے کی یادیں لکھے تو اُن میں محبت کا لفظ شامل تک نہیں ہو گا۔ دراصل اُس کے پاس احساسات کی یادیں بہت ہی کم ہیں کہ وہ اُس کی ملکیت میں آئے اور کب چلے گئے۔ جب ایک مرتبہ اُس نے کسی گھر کو پیچھے دھکیل دیا تو اُس کی تقدیر سے لاپروا ہو گیا بل کہ لاپروا

سے بھی زیادہ! اُس نے اُسے دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہا۔ اُس کا ملکیت کا رشتہ آغاز سے انجام تک عملی رہا جو نہ محبت جیسا تھا اور نہ بیاہ جیسا۔

وہ اپنی زندگی میں آنے والی دو عورتوں کے بارے میں سوچتا ہے، خاص طور پر اپنی دونوں بیویوں کے بارے میں۔ وہ اُن دونوں عورتوں، اپنی بیویوں کے لیے اپنے اندر کیا احساسات وجذبات رکھتا ہے؟ الجھے ہوئے احساسات وجذبات، جو زیادہ تر نشتر کے مانند چبھتے ہوئے تأسف اور افسوس کے حامل ہیں۔ جن پر شرم آتی ہے لیکن بااین ہمہ وہ تمنا کے حامل بھی ہیں اور مردہ نہیں ہوئے۔ محبت اور ملکیت کے جذبات اُسے گھیرے رکھتے ہیں اور اِس کا بھی ایک سبب ہے۔ اُس نے ایک برس قبل پردیس میں، ایک دُوسرے برِاعظم کے ملک ہسپانیہ کے شہر کاتالونیا میں، ایک گھر خریدا۔ ہسپانیہ کی ملک مہنگی تھی نہ ہسپانیہ کے ساحل کے اُجڑتے ہوئے گاؤوں سے دُور تھی۔ وہاں ہزاروں بدیسیوں نے، جن میں زیادہ تر یورپی تھے، اُس قسم کے ساحلی گھر لیے تھے۔ اب وہ بھی اُن میں سے ایک تھا۔

اُس کے نزدیک منتقلی محض عملی رُخ ہے۔ وہ اپنی روزی لکھاری کی حیثیت سے کماتا ہے اور اِس زمانے اور اِس عمر میں لکھاری گماشتوں اور مدیروں سے گاؤں یا شہر ہر جگہ سے ہمہ وقت برقیاتی رابطہ رکھتے ہوئے کہیں بھی اقامت اختیار کر سکتا ہے۔ اپنی جوانی کے ایام ہی سے وہ ہسپانیہ کا، جو کم کو فخر اور قدیم اقدار کا حامل تھا، دِلدادہ رہا تھا۔ (کیا وہ ہسپانیہ سے محبت کرتا ہے؟ کسی وطن، اُس کے لوگوں، وہاں کے طرزِ حیات سے محبت کوئی نئی گتھی نہیں ہے۔) اگر وہ اکثر وبیشتر ہسپانیہ جاتا رہتا ہے تو اِس سے اُسے احساس ہوتا ہے کہ اُس کے پاس ایک ایسا مقام ہے جسے وہ اپنا کہہ سکتا ہے، ایک ایسا گھر جو کپڑے اور کھانے پینے کے برتن بنانے میں اپنا شہرہ رکھتا ہے اور اُسے دیگر لوگوں کے انبوہ سے نپٹنا نہیں پڑتا۔

بلا شبہ، وقت بتانے کے لیے ہسپانیہ میں جائیداد خریدنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹلوں سے ہٹ کر کرائے کی عمارتوں میں بھی بہتر زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ ہوٹل مہنگے پڑتے ہیں لیکن ہندسوں کے حساب سے، تمام ضمنی اخراجات شامل کرنے پر بھی، مہنگے ثابت نہیں ہوتے۔ ہوٹل (محبت کے جذبات پلٹنا جاری رہتے ہیں) وقت گزاری والی محبت جیسے ہیں۔ روانگی کے ساتھ ہی سب ختم ہو جاتا ہے اور یہی اِس کا انجام ہے۔

گھر کی خریداری کفایت شعارانہ تو نہیں البتہ ایک گہرا احساس ضرور رکھتی ہے۔ وہ اپنی عمر کی پچاس کی دہائی میں ہے۔ اگر وہ آخری منزل پر نہیں ہے تو بھی آخری منزل کی سمت بڑھ تو رہا ہے۔ اب اُس کے پاس کھلواڑ کرنے اور اُمنگوں کے پیچھے بھاگنے کا وقت نہیں بچا۔ کاتالونیا والا گھر لمحاتی جذبات کا نتیجہ ہے نہ وقتی خانہ پُری بل کہ یہ نمایاں طور پر گہری سوچ وبچار کے طویل عمل کا پھل ہے۔ اگر یہ بیاہ سے مشابہ ہے تو یہ بیاہ طے شدہ ہے جس میں دُلہا کے لیے دُلھن کا انتخاب بچولے نے کیا ہے۔

ہاں، البتہ طے شدہ شادی والے مرد و زن بھی ایک دُوسرے کی محبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ کیا اس کا امکان ہے کہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں وہ ہسپانیہ میں اپنے لیے حاصل کردہ مکان کی محبت میں مبتلا ہونے جا رہا ہے؟

بَیل پُونیگ گاؤں کے سرے پر ایک تنگ گلی میں واقع مکان سے سُورج مُکھی اور مکئی کے کھیتوں کا نظارہ ہوتا ہے جن میں انجیر کا ایک بڑا سا درخت نمایاں ہے۔ ایک طرف باغیچے کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں وہ مٹر اور ٹماٹر اُگا سکتا ہے۔ خرگوشوں کا ایک غول بھی ہے جو اُس کے خرگوش کے گوشت کے ذوق کو اشتہا دیتا ہے۔ اگر وہ دلّال پر اعتبار کر لے تو وہ مکان تیرھویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ اُس نے کاتالونیا کی عہدِ عتیق کی اشیا کے بارے میں پڑھ رکھا ہے اِس لیے یہ دعویٰ خارج از امکان بھی نہیں۔ دِیواریں اِتنی ہی قدیم ہو سکتی ہے۔ بعض مقامات پر تو گز گز بھر چوڑی ہیں کہ سردیوں کی ٹھنڈک کو باہر اور گرمیوں کی حرارت کو اندر رَو کے رکھیں۔ بسولی سے تراشے ہوئے پتّھر، پسے ہوئے چُونے سے جڑے ہوئے ہیں ورنہ وہ اب تک کب کے ریت کا ڈھیر بن چکے ہوتے۔

تعمیر کے لحاظ سے گھر ہمیشہ عجیب وضع کا رہے گا۔ سامنے کا دو پٹوں والا دروازہ، گھر کے اندر ایک ایسی جگہ کھلتا ہے جو اِس قدر کشادہ ہے کہ اُسے گیراج یا مرمت گاہ کے طور پر استعمال کرنا انتہائی مناسب ہے یا پھر فن کدے کے لیے۔ دروازے کے ایک سمت لگی سیڑھی، رہائشی کمروں اور باورچی خانے تک جاتی ہے۔ غور کرنے پر تعمیر کا انداز یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ گھر کا مرکزی حصہ باڑے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ رہائش گاہیں باڑے کے چاروں طرف اور بلند تعمیر کی گئی ہیں تا کہ سرد راتوں میں انسان اور مویشی اپنے خُون کی حرارت ایک دُوسرے کو پہنچا سکیں۔

گھر کے عقبی حصے میں، جو ایک پہاڑی کی سمت بنا ہوا ہے، بارشی پانی کے اخراج کے لیے زیرِ زمین نالیاں موجود ہیں۔ جہاں تک چھت کا تعلق ہے تو اُس کی ٹائلیں جدید ہیں جن پر سُرو ویرا نامی بھٹے کی مہریں ثبت ہیں لیکن کڑیوں اور بالوں کی لکڑی نہایت دیمک خوردہ اور میدے جیسی ہیں جو یقیناً صدیوں پرانی ہو سکتی ہیں۔ چند عشرے اور گُزرے تو سالم چھت دھڑام سے نیچے آ گرے گی لیکن تب تک وہ اُس کی پروا کرنے کے لیے نہیں رہے گا۔

سابقہ مالک (سابقہ خاوند، وہ سوچتا ہے) تیس کلومیٹر دُور واقع سانت کلی میز کا ایک راج مستری تھا۔ اُس نے اِسے فروخت کرنے سے قبل منافع پانے کی غرض سے اپنے فالتو وقت میں اِس میں کچھ کام کیے تھے: کھڑکیاں بڑی کیں، دِیواروں کو پلستر کیا، دروازوں کی چوکھٹیں تبدیل کیں، بجلی کی نئی تاریں ڈالیں، ایک غسل خانہ اور انتظار گاہ تعمیر کی۔ بلا شک و شبہ، وہ اب کسی اور گاؤں کے ایک اَور منصوبے والے نئے گھر میں منتقل ہو چکا تھا۔

مقامی لوگ خُوش آمدیدی نہیں تھے۔ وہ جو ہسپانوی بولتا ہے وہ اٹکتی ہوئی اور کتابی نوع کی زبان ہے جو اُسے دیہی کاتالونیا میں کہیں نہیں ملتی اور وہاں کاتِلئیں اجنبی زبان ہے۔ جُوں ہی وہ مُنھ کھولتا ہے بدیسی بن جاتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ اُسے حق حاصل نہیں کہ اُسے خُوش آمدید کہا جائے۔ البتہ جس چیز کی وہ توقع رکھتا ہے اور جو شے وہ چاہتا ہے وہ ہے برداشت کا مادہ۔ اب تک لوگ، حد یہ کہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک میں، بدیسیوں کی آمد کے عادی ہو گئے ہیں۔ بدیسی فرانس، ہسپانیہ، پُرتگال میں برسوں سے جائیدادیں خرید رہے ہیں۔ ہسپانوی حکام اِس کے خلاف نہیں ہیں۔ جب تک وہ ملازمت کے خواہاں نہیں، جب تک دولت درآمد کرتے رہیں گے تب تک اُن کے لیے جگہ موجود ہے۔

یہی حال اُس کے اپنے وطن کا بھی ہے جہاں ساحلِ سمندر کی بہترین جائیدادیں اجنبیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہیں۔ بے شک وہ بھی اُن بدیسیوں کو اُن کے اطوار وعادات کی بنا پر پسند نہیں کرتا لیکن اُس کی پسند ناپسند سے کیا حاصل؟ اُس کے خیال میں کیتالان والے ہمسائے بھی اُس کے بارے میں یہی احساس رکھتے ہیں۔ لازمی طور پر وہ بھی اُسے پسند نہیں کرتے۔ اغلب طور پر اُن کے مابین اُس کی اور اُس کی نسل کی چغلیاں ہوتی ہیں اور موقع ملنے پر دُکان دار یہ جواز اپناتے ہوئے زائد رقم ہتھیا لیتے ہیں کہ بدیسیوں کے پاس خُوب رقم ہوتی ہے اور وہ احمق ہوتے ہیں۔ البتہ اُسے عملی نقصان پہنچانے کی منصوبہ سازی کے بارے میں، اُس کا خیال ہے کہ وہ اِس حد تک نہیں جا سکتے۔ بس وہ یہ نہیں کریں گے کہ اُس میں یہ احساس جنم لینے دیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے، بالکل ویسے ہی جیسے وہ جرمنوں اور انگریزوں میں یہ احساس پیدا ہونے نہیں دیتا۔

رہائش کے ابتدائی ماہ کے دوران میں اُس نے مکان کی حالت سنوارنے میں گھنٹوں صرف کیے۔ اُس نے سامنے والا دروازہ اُتارا، اُس کی رگڑائی کی اور رنگ وروغن کر کے دوبارہ جڑا۔ یہی کام اُس نے لکڑی کے پٹوں کے ساتھ کیا۔ اگرچہ اُسے اَور ہی رنگ اور، اَور ہی رنگوں کے ادغام سے بننے والے رنگ پسند تھے لیکن اُس نے گاؤں میں استعمال ہونے والے اُنھی سُرمئی مائل نیلے اور گہرے سُرخ رنگوں کا، جنھیں وہاں باسق (Basque) کہا جاتا ہے، انتخاب کیا۔

اُس نے دروازے کے قفل کو، جو پہلے ہی مضحکہ خیز حد تک پُرانا ہو چکا تھا، کھول کر ایک ایک پرزہ الگ کر دیا۔ ایک بچہ بھی اُسے توڑ سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اُسے تبدیل کرنے کے بجائے محض اُس کی صفائی کی، تیل دیا اور دوبارہ نصب کر دیا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ قفل علامتی ہیں۔ یہاں قفل لگانے سے مراد ہے کہ قفل لگا گھر کسی کی مِلک میں ہے نہ کہ چوروں سے حفاظت کے لیے ہے اور کسی کو اندر گھسنے کے لیے غیر سماجی ہونا چاہیے۔

اُس نے جو مکان خریدا وہ ایک خاص مفہوم میں اُس کی ملکیت ہے۔ دُوسرے میں وہ اب بھی

اُس گاؤں کی مِلکیت ہے جس میں وہ کھڑا ہے۔ خُوب، اُسے بالکل خواہش نہیں کہ استعمال میں آنے والے گاؤں کے اُس گھر کو اہمیت دے۔ وہ اُسے اُس کی موجودہ حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا۔

آغاز میں اُس کا ارادہ تھا کہ وہ ہر سال کے دو موسم وہاں گُزارے گا۔ موسمِ گرما اور سرما دونوں؛ کہ دونوں موسم وہاں نہایت شدید ہوتے ہیں۔ مردوں کی اکثریت اُس جیسی شادیاں کرتی ہے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ مثال کے طور پر ملاح جو اپنی آدھی زندگی سمندر میں بسر کرتے ہیں۔

لیکن جُوں جُوں برس بیتے، اُسے لگا، جیسے اُس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ وہ گھر کو اپنے دماغ سے نکال نہیں پا رہا۔ وہ پانچ ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر جگراتوں کے دوران میں اندھیرے خالی گھر میں چکراتا پھرتا ہے۔ گویا وہ سات سمندر دُور پہاڑوں کے پار اپنی رُوح اُس خوابیدہ گاؤں میں بھیج رہا ہے جو اُسے پیغام بھیج رہا ہے یا پُکار رہا ہے۔ حد یہ کہ حیرت انگیز طور پر دِن میں بھی اُسے عقبی کمرے میں پڑی گھوڑوں کی زنگ آلود نعلیں، دروازے میں دستی کی سلاخ کا مڑا ہوا حصہ، نشست گاہ کی دیوار کی بلندی پر لگا دھبّا، جہاں ایک مکڑی کو جھاڑو سے مارا گیا تھا، تصورات میں دِکھائی دیتے۔ ایسے لمحات بھی آتے جب اُسے یقین ہونے لگتا کہ محض اُس کے ارتکازِ توجہ کی قوت سے وہ مقام عدم وجودیت سے محفوظ و مامون ہے۔

پس وہ وسطِ گرما میں کاتالونیا میں ہے۔ صبح کی ٹھنڈک میں وہ چھت پر چڑھتا ہے۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل وہ گرنی سے نالوں میں اُگ آنے والی کائی کھرچتا ہے۔ سامنے والی قطار سے دو گھر چھوڑ کر سیاہ لبادے والی ایک عورت اپنے جھروکے سے یہ منظر دیکھتی ہے۔ وہ اُمید کرتا ہے کہ وہ اُس کے کام کو پسند کرے گی۔ وہ توقع رکھتا ہے کہ وہ سوچ رہی ہوگی کہ گو بدیسی ہے لیکن متین شخص ہے۔ وہ ہمسایوں ہی کے مانند سُرخی مائل مٹّی کے گملوں میں جیرانیم کے گلابی اور سُرخ پھول اُگا کر سامنے والے دروازے کے دونوں اطراف رکھ دیتا ہے۔ وہ اُنھیں مخاطب کرتا ہے تو وہ اُس پر کم ہی دھیان دیتے ہیں۔ وہ اُس کے گھر پر بھی کم ہی دھیان دیتے ہیں جس طرح کوئی شخص ناپسندیدہ عورت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھے۔

اگر یہ بیاہ ہے تو، وہ خُود کلامی کرتا ہے، میں ایک بیوہ سے عقد کر رہا ہوں، ایک پختہ سن عورت سے جس کی عادات و اطوار پختہ ہو چکے ہیں۔ جیسے میں ایک مختلف شخص نہیں بن سکتا۔ پس مجھے بھی اُس سے توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ میری خاطر مختلف عورت بن جائے گی: نوجوان، تاباں اور شہوت انگیز۔

اپنی حرکتوں سے وہ گاؤں سے اپنا غیر تحریری معاہدہ کسی حد تک توڑ رہا ہے۔ جب کوئی اجنبی کسی جگہ منتقل ہوتا اور جائیداد خریدتا ہے تو معاہدے کی رُو سے، اُسے مقامی لوگوں کے لیے سُودمند ہونا

چاہیے۔ مقامی تاجروں سے خریداری کرے، مقامی دست کاروں اور کاری گروں کو کام دے۔ وہ جو کام جھروکے میں کر رہا ہے اُنھیں کرنے کا حق وہاں کے کاری گروں کا ہے۔ لیکن وہ اِسے تسلیم کرنے سے منحرف ہے۔ وہ جس کام میں لگا ہوا ہے وہ عام تزئین و آرائش سے بڑھ کر ہے۔ ایسا گہرا کام ہے، جسے ہر صُورت، اُسے خُود اپنے ہاتھوں سے کرنا ہے۔ وہ اُمید رکھتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ سمجھ جائیں گے۔

بے شک، گاؤں کے پاس اُس گھر کی یادیں، اُس کے زمانے سے قبل کی ہیں مل کہ سانٹ کلائمینز کے ہرفن مولا سینٹ ٹور اس کے زمانے سے بھی قبل کی ہیں۔ گاؤں والے جانتے ہیں—یا وہ نہیں جانتے تو اُن کے والدین، تائے، چاچے، ماموں، خالو، پھوپھے اور تائیاں، چاچیاں، مامیاں، خالائیں اور پھوپھیاں جانتی تھیں — کہ وہاں کون سا خاندان اقامت پذیر تھا، کس خاندان کے بچے اندھیرے حجرہ نما تنگ کمروں، سیلن زدہ دِیواروں، پرانی وضع قطع کے نظامِ آب رسانی سے گزرتے ہوئے اُس گھر میں پلے بڑھے اور یُوں ہی اُن کے والدین پرلوک سدھارے اُنھوں نے اِس جگہ سے جان چھڑائی اور اِسے محض سینٹ ٹور، اس کے ایک گیت کے مول (یعنی کوڑیوں کے مول: مترجم) بیچ دیا۔ جس نے اُس کی مرمت کروائی اور اُس نے اُسے ایک اور بدیسی کے ہاتھوں فروخت کر دیا کیوں کہ بدیسی، نا قابلِ وضاحت طور پر، قدیم گھروں کو ترجیح دیتے ہیں اور اُن کی اصل قیمت سے زیادہ ادائگی کرتے ہیں۔

جب کوئی شخص شادی کرتا ہے تو وہ اُس کا خاص دھیان رکھتا ہے کہ اُس سے پہلے اُس کی بیوی کس کی منکوحہ تھی اور یہاں تک کہ اُس کا کس کس کے ساتھ معاشقہ چلتا رہا تھا۔ مکان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا کہ اُس میں پہلے کون کون رہائش پذیر رہا ہے۔ مکان کی ملکیت، شادیوں اور بیویوں میں ایک اَور ہی نوع کی مشابہت ہے، جو اُن کا اُوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ اِن دِیواروں کے بیچ مردوں اور عورتوں، نسلوں کی نسلوں نے قربت بھری زندگیاں بسر کیں۔ وہ ایک دُوسرے سے بولتے چالتے، لڑتے جھگڑتے اور اُس زبان میں اظہارِ محبت کرتے رہے تھے، جس سے وہ نابلد ہے اور اُن کی عادات، اُس کے لیے اجنبی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے پیچھے کوئی بُھوت پریت نہیں چھوڑا کہ اُسے تو کسی ایسی شے کا گمان نہیں ہوتا۔ ہوتا تو بھی اُسے فرق نہ پڑتا۔ وہ اُن پر چھا جاتا، جس طرح اجنبی لوگوں پر چھایا جاتا ہے۔ اگر اُسے، اُن کی تصویریں مل جاتیں تو وہ اُنھیں دِیواروں پر ٹانگ دیتا: سخت گیر جوڑے کی اتوار کے ایک بہترین دِن کی تصویر، جن کے قدموں میں، اُن کے خرگوش جیسے معصوم بچے بیٹھے ہوں۔

پھر حیرت انگیز طور پر اُس کا دِل چاہنے لگتا ہے کہ بدیس کے اُس گھر اور اُس کے مابین رشتہ استوار ہو جائے، انسانی رشتہ۔ پتھروں اور گارے کو چُھونے کے ساتھ انسانی رشتے کی استواری کس قدر

احمقانہ خیال ہے۔اُس مکان،اُس کی تاریخ اور مجموعی طور پر سارے گاؤں سے رشتے کی استواری۔ایسا گاؤں جو ہائی وے سے یوں دِکھتا ہے جیسے وہ فردِ واحد کی سوچ اور محض دو ہاتھوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اُس رشتے کے بدلے میں وہ گھر کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے کے لیے تیار ہے جیسا عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اُس کی ضروریات کا، حتیٰ کہ اُس کی عجیب وغریب عادات تک کا، خیال رکھا جاتا ہے،اُس پر دولت خرچ کی جاتی ہے، بستر پر اُس کے جذبات کو تسکین پہنچائی جاتی ہے اور اُس پر جان نچھاور کی جاتی ہے۔

شفقت، دوستی، عقیدت، خدمت لیکن محبت نہیں البتہ ایسی ہی کوئی چیز۔بوڑھے ہوتے مرد اور جوان نہ رہ جانے والے مکان کے بیچ بیاہ کی ایک قسم۔

VVVV

اَورحان پامُوک

(Orhan Pamuk)

۱۲-اکتوبر ۲۰۰۶ء کو سویڈش اکیڈمی نے ترکی کے معروف ادیب اَورحان پامُوک کو ادب کا نوبیل انعام دینے کا اعلان کیا۔ سویڈش اکیڈمی کے بقول ''پامُوک نے اپنے آبائی شہر کی افسردہ رُوح کی تلاش میں ثقافتوں کے تنازعات اور اُن کو (ثقافتوں) کو باہم مدغم کرنے کی نئی علامتیں دریافت کی ہیں۔''

۰۷-جُون ۱۹۵۲ء کو پیدا ہونے والے ترکی ناول نگار فیرٹ (فرید) اورحان پامُوک (Ferit Orhan Pamuk) کو عام طور پر صرف اورحان پامُوک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُن کا شمار ترکی کے نُمایاں ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُنھیں معتدد اعزازات بشمول ادب کا نوبیل انعام ۲۰۰۶ء مل چکے ہیں۔ اورحان پامُوک نے ثانوی تعلیم استنبول کے رابرٹ کالج سے حاصل کرنے کے بعد استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی کے تین سالہ آرکیٹکچر پروگرام میں شرکت کی کہ اُن کا خواب مصوّر بننے کا تھا اور مابعد استنبول یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم سے ۱۹۷۶ء میں گریجوایٹ کیا۔ اُنھوں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز ۱۹۷۴ء سے کیا۔ بائیس سے تیس برس کی عمر تک کا عرصہ اُنھوں نے اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہوئے گزارا اور اِسی دوران اپنا پہلا ناول ''اندھیرا اُجالا'' قلم بند کیا۔ وہ مسلمان ہیں اور خود کو ایسا مہذب گردانتے ہیں جس کی شناخت تاریخ اور ثقافت کے ہمراہ مذہب سے ہے۔

اورحان پامُوک کے پہلے ناول نے ۱۹۷۹ء میں ملّیت پریس ناول کا انعام دُوسرے ناول کے اشتراک میں جیتا۔ دُوسرا ناول ''کیوڈیٹ اور اُس کے بیٹے'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جس نے اورحان کمال ناول پرائز بھی جیتا۔ اِس ناول میں استنبول کے ضلع نسان تاسی میں، جہاں خُود اورحان پامُوک پلے بڑھے، بسنے والے ایک متموّل خاندان کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اورحان پامُوک نے ابتداء ہی سے معتدد انعامات حاصل کیے جن میں ۱۹۸۴ء کا مالدارالی (Maldarali) ناول پرائز اُن کے ناول ''خاموش گھر'' اور ۱۹۹۱ء میں اِس ناول کے فرانسیسی ترجمے پر *Prix de la deconverte Europeene* کا انعام شامل ہیں۔ اُن کے تاریخی ناول ''سفید قلعہ'' نے، جو ترک زبان میں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا، ۱۹۹۰ء کا انڈیپینڈنٹ ایوارڈ فار فارن فکشن جیتا علاوہ بیرونِ ممالک اُن کی شہرت میں اضافہ کیا۔ نیویارک ٹائمز نے اپنے بُک ریویو میں لکھا: ''مشرق سے طلوع ہونے والا ایک اَور ستارہ ..... اورحان پامُوک۔''

ابھی کامیابی اُورحان پاموک سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی لیکن ۱۹۹۰ء میں اُن کا ناول ''سیاہ کتاب'' اپنی پیچیدگی اور عمدہ اُسلوب کی وجہ سے ترکی میں بہ یک وقت متنازعہ اور معروف کتاب کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۹۲ء میں اُنھوں نے فلم ''خفیہ چہرہ'' کا سکرین پلے لکھا جس کا مآخذ اُن کا ناول ''سیاہ کتاب'' تھا اور جس کی ہدایات معروف ترک ہدایت کار عمر کیور نے دی تھیں۔ پاموک کے اگلے ناول ''نئی زندگی'' نے ۱۹۹۵ء میں ایک نئی لہر کو جنم دیا اور ترکی کی تاریخ میں بہت تیزی سے بکنے والی کتاب بن گیا۔ اُس وقت تک پاموک کُردوں کے سیاسی حقوق کے علم بردار کے طور پر ترکی میں بہت اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں وہ مصنفین کے ایک گروہ میں شامل ہو کر کُردوں کے ساتھ ترکی کے نا رَوا روّیے کے خلاف مضامین لکھنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ ۱۹۹۹ء میں اُنھوں نے اپنے مضامین کی کتاب ''رنگِ دیگر'' شائع کی۔

۲۰۰۰ء میں ''میرا نام ریڈ ہے'' کی اشاعت نے پاموک کی بین الاقوامی عزت و شہرت میں گوناں گوں اضافہ کیا۔ یہ ناول سولھویں صدی کے استنبول کے ماحول میں اَسراریت، رومانویت اور فلسفیانہ گتھیوں کا حسین امتزاج ہے۔ اِس ناول کے مطالعے سے قاری کو سلطنتِ عثمانیہ کے سلطان مُرات سوم کے موسمِ سرما کے برف باری والے نو (۹) دِنوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ جس سے قاری کو شرق و مغرب کے مابین سانس تک منجمد کر ڈالنے والی کشمکش کا تجربہ ہوتا ہے۔ ''میرا نام ریڈ ہے'' کا ترجمہ اُردو سمیت پچیس زبانوں میں ہو چکا ہے اور اِس نے ادب کا کثیر الرقم بین الاقوامی انعام the IMPAC Dublin Award برائے سال ۲۰۰۳ء حاصل کیا۔

پاموک کا اگلا ناول ۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والا ''برف'' تھا، جس کا انگریزی میں ۲۰۰۴ء میں ترجمہ ہوا۔ اِس کا جائے وقوع ترکی کا سرحدی شہر کارس ہے۔ یہ جدید ترکی میں اسلام اور مغرب کے مابین تضاد کو بیان کرتا ہے۔ نیویارکر ٹائمز نے اپنی ۲۰۰۴ء کی بہترین دس کتابوں کی فہرست میں اِس ناول کو شامل کیا۔ پاموک نے اپنی یادوں اور استنبول کے جغرافیے پر ۲۰۰۳ء میں ''یادیں اور شہر'' شائع کیا جس کا انگریزی میں ترجمہ ۲۰۰۵ء میں ''استنبول: یادیں اور شہر'' کے عنوان سے ہوا۔ اُن کے آنے والے ناول کا عنوان ہے: ''معصومیت کا عجائب گھر''۔

پاموک کو ۲۰۰۵ء میں اُن کے ادبی کام ''*Europe and Islamic Turkey find a place for one another*'' پر *Peace Prize of the German Book Trade* کا پچیس ہزار پاؤنڈ کی مالیت کا انعام ملا۔ انعام کی تقریب پال چرچ فرینکفرٹ میں منعقد ہوئی۔

اورحان پاموک پر مصنفین کے ایک گروہ نے الزامات عاید کیے ہیں کہ اُن کے کام کے بیشتر حصے دیگر لکھاریوں کی ملکیت ہیں، خاص طور پر اُنھوں نے کچھ کتابوں کے ابواب کے ابواب سرقہ کیے ہیں۔ ترکی کے اخبار ''حریّت'' کے ایک لکھاری مُورت باردا کی نے ۲۶ مئی ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں ثبوتوں کے ساتھ اورحان پاموک پر سرقہ بازی کا الزام عاید کیا کہ اورحان پاموک کا ناول ''میرا نام ریڈ ہے'' امریکی ناول نگار نارمن میلر کی کتاب *Ancient Evenings* کی کہانی اور اُسلوب کی نقل ہے۔ دیگر الزامات میں دعوے کیے گئے ہیں کہ

اورحان پاموک نے اپنے ناول ''سفید قلعہ'' میں سالم پیرے ٹن وعن فواد کریم کے ناول '' کانونی کے زمانے میں استنبول'' سے اُٹھا کر رکھ دیے ہیں۔ اورحان پاموک نے اِن الزامات کی کبھی تردید نہیں کی جس نے ہمیشہ شبہات کو تقویت دی۔

اورحان پاموک نے اپنا نوبیل لیکچر سویڈش اکیڈمی سٹاک ہوم میں ''میرے ابا کا سوٹ کیس'' کے عنوان سے ترک زبان میں دیا۔

''اپنی وفات سے دو برس قبل میرے والد نے مجھے اپنی لکھتوں، مسودوں اور روزنامچوں سے بھرا سوٹ کیس دیا...... اِسے دیکھ لینا۔ شاید اِس میں سے انتخاب کر کے تم شائع کروالو۔..... اب میں اُس بوجھ کے مفہوم کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جسے کوئی شخص اپنے آپ کو ایک کمرے میں مقید کر کے، میز پر بیٹھ کر اور ایک کونے میں الگ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ادب کا یہی مفہوم ہے۔......لکھاری وہ شخص ہے جو صبر و تحمل سے برس ہا برس اپنے اندر ایک اور شخص اور اُس دنیا کی دریافت کی سعی میں لگا رہتا ہے جو اُسے وہ بناتی ہے جو وہ ہوتا ہے۔ جب میں لکھت کی بات کرتا ہوں تو میرے ذہن میں جو پہلی چیز آتی ہے وہ کوئی ناول، نظم یا ادبی روایت نہیں بلکہ وہ شخص ہوتا ہے جو خُود کو ایک کمرے میں بند کر کے، میز پر بیٹھ کر، تنہا ہو کر اپنے سایوں کے بیچ بیٹھ کر اپنے اندر جھانکتا ہے۔ وہ لفظوں سے ایک نئی دُنیا تشکیل دیتا ہے۔......بعینہ ویسے ہی جیسے پُل یا گنبد تعمیر کرتا ہے، ایک ایک پتھر جوڑ کر...... وہ پیاری تُرک کہاوت۔ سُوئی سے کنواں کھودنا۔ مجھے لگتا ہے جیسے لکھاری ہی کو ذہن میں رکھ کر کہی گئی ہے۔......عدم اطمینان وہ واحد خُوبی ہے جو کسی شخص کو لکھاری میں بدلتی ہے۔...... سچے ادب کا نقطۂ آغاز کتابوں کے ہم راہ اپنے آپ کو کمرے میں قید کرنا ہے۔ لیکن ایک بار کمرے میں بند ہونے کے بعد ہم دریافت کرتے ہیں کہ جتنا ہم خیال کرتے تھے ہم اُتنے تنہا نہیں ہیں۔......میرے نزدیک لکھاری ہونا اپنے اندر چھپے زخموں کا اعتراف کرنا ہے...... آج ادب کو یہ بتانے اور جاننے کی بے حد ضرورت ہے کہ انسانیت کے بنیادی خوف کیا ہیں: باہر چھوڑ دیے جانے کا خوف، کسی شمار قطار میں نہ ہونے کا خوف اور ایسے خوفوں سے پیدا ہونے والے بے توقیری کے احساسات؛ اجتماعی تذلیل...... استحصال، حساسیت، متصورہ توہین اِن کی اگلی اقسام ہیں۔'' اُنھوں نے ''میں کیوں لکھتا ہوں؟'' کے جواب میں کئی وجوہات بھی اپنے خطبے میں شمار کیں مثلاً لکھنے کی اپنی اندرونی ضرورت کے تحت؛ اِس لیے کہ دُوسرے لوگوں کی طرح میں کوئی عام کام نہیں کر سکتا؛ اِس لیے کہ ہم کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں؛ اِس لیے کہ مجھے کاغذ، قلم اور روشنائی کی مہک پسند ہے؛ اِس لیے کہ یہ ایک عادت، ایک جذبہ ہے؛ اِس لیے کہ کبھی خُوش نہیں رہا، خُوش رہنے کے لیے۔ وغیرہم۔

VVVV

دُور کے رشتے

(Distant Relations)

میری زندگی کو مکمل طور پر بدل ڈالنے والے حالات و اتفاقات کی لڑی کا آغاز ۲۷ اپریل ۱۹۷۵ء کو اُس وقت ہوا، جب ہم موسم بہار کی ٹھنڈی رات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شاہراہِ ویلی کوناگی پر، ہَوا خوری کر رہے تھے کہ سیبل نے ایک دُکان کی کھڑکی میں مشہور و معروف جینی کولون کے بنے ہوئے ایک پرس کو دیکھا۔ ہماری رسمی منگنی ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ہم مدہوش اور بہت خوش تھے۔ ہم دونوں، تھوڑی دیر قبل، میرے والدین کے ہمراہ، نسان تاسی کے ایک شان دار نئے ریستوران فیوئے میں موجود تھے۔ ہم نے تفصیل سے منگنی کی تقریب کی تیاری پر بات کی تھی جو جون کے وسط میں ہونا طے پائی تھی تاکہ نور جہاں بھی، جو سیبل کا پیرس میں لیسی نوٹرے ڈیم ڈی سیان میں گزرے دِنوں کی دوست تھی، فرانس سے آکر منگنی میں شرکت کر سکے۔ سیبل نے بہت پہلے انتظام کر لیا تھا کہ اُس کی منگنی کا لباس ریشمی عصمت سے تیار ہو سکے جو اُس زمانے میں استنبول کا نہایت مہنگا درزی تھا اور اُس کی بہت طلب تھی۔ اُس شام سیبل اور میری والدہ نے طے کیا کہ وہ کس طرح اُن جواہر کو لباس پر ٹانکیں گی جو میری والدہ نے اُسے اِسی مقصد کے لیے دیے تھے۔ میرے ہونے والے سسر نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اُس کی اکلوتی بیٹی کی منگنی شادی ہی کی طرح دھوم دھام سے ہو اور میری ماں مسرور تھی کہ وہ اِس خواہش کو، جس حد تک بہتر طور پر ممکن ہو سکے پورا کرنے میں مدد کرے۔ میرے والد اِسی بات پر ہی کافی مطمئن تھے کہ اُن کی بہو نے ''سوربونے'' سے تعلیم حاصل کی تھی جیسا کہ اُس زمانے میں استنبول کے بورژوائی طبقے میں، ہر اُس لڑکی کے لیے کہا جاتا تھا، جو کسی بھی نوع کی تعلیم کے لیے پیرس گئی ہو۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں سیبل کو اُس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا، میرا بازو اُس کے بھرے بھرے کندھوں کے گرد پیار سے لپٹا ہوا تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ وہ بولی: ''اوہ، کس قدر خوب صورت بیگ ہے!'' اگرچہ رات کے کھانے کے وقت پی ہوئی شراب سے میرا دماغ دُھندلایا ہوا تھا لیکن میں نے پرس اور دُکان کا نام نوٹ کر لیا اور اگلے ہی روز میں وہاں چلا گیا۔ حقیقتاً میں کبھی اُن شائستہ مہم جُو کھلاڑیوں میں سے نہیں رہا تھا جو عورتوں کے لیے تحائف خریدنے یا پھول بھیجنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بہانے ڈھونڈتے ہیں؛ گو کہ شاید مجھے بھی ویسا بننے کی تمنا تھی۔ اُس

زمانے میں مغرب زدہ بیزار خواتین سسلی، نسان تاسی اور بے بیک میں آرٹ گیلریاں نہیں کھولتی تھیں جیسا کہ اُنھوں نے بعد میں یہ کام شروع کر دیا، لیکن بوتیک ضرور چلاتی تھیں جنھیں وہ چھوٹے چھوٹے سستے زیورات اور اپنے سامان میں پیرس اور میلان سے سمگل کر کے لائے گئے، جملہ لوازمات یا پھر درآمد کیے گئے ایلے (Elle) اور ووگ جیسے رسائل میں دیے گئے ''جدید تراش خراش'' کے لباسوں کی نقلوں سے بھرا رکھتی تھیں اور اُن چیزوں کو اپنی ہی جیسی بیزار متمول خواتین کو بے انتہا مہنگے داموں فروخت کرتی تھیں۔

سانزے لورے (یہ نام پیرس کی داستانی شاہراہ کا تھا جو دُوسرے رسم الخط میں رقم تھا) کی مالکہ سیناخانم والدہ کی طرف سے میری دُور پرے کی رشتے دار تھی لیکن تقریباً بارہ بجے جب میں وہاں گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میرے داخلے پر اُونٹ کے گلے میں بندھی گھنٹی جیسے دوہرے قفو دوبار بجے جواب بھی میرے دِل کی دھڑکن بڑھا سکتے ہیں۔ وہ ایک گرم دِن تھا لیکن دُکان کے اندر ٹھنڈک اور اندھیرا تھا۔ شروع میں مجھے خیال آیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میری آنکھیں دوپہر کی دھوپ کے بعد اندھیرے سے لڑنے کی کوششوں میں مصروف تھیں کہ مجھے لگا جیسے میرا دِل ساحلِ سمندر سے ٹکرانے والی ایک بڑی موج کی طاقت کے ساتھ اُچھل کر حلق میں آ گیا ہے۔

''میں بیرونی الماری میں نمائش کے لیے ٹنگے ہوئے ہینڈ بیگ کو خریدنا چاہتا ہوں۔'' اُسے دیکھ کر میں نے بدحواس ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کا مطلب ہے وہ کریم رنگ کا جینی کولون؟''

جب ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے اُسے فوراً پہچان لیا۔

''بیرونی الماری میں ٹنگا ہوا ہینڈ بیگ۔'' میں نے خوابناکی کی کیفیت میں دھرایا۔

''اوہ، ٹھیک ہے۔'' وہ بولی اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ پلک جھپکتے میں، اُس نے اپنی اُونچی ایڑی کے پیلے جوتے اُتارے، اپنا پیر آگے نمائشی حصّے کے فرش پر رکھا جس کے ناخنوں پر اُس نے احتیاط سے سُرخ رنگ کی نیل پالش کی ہوئی تھی، اور اپنا ہاتھ نمونے کی طرف بڑھایا۔ میری نگاہوں نے اُس کے خالی جوتوں سے لمبی عریاں ٹانگوں کا سفر کیا۔ ابھی مئی کا مہینہ بھی نہیں آیا تھا اور وہ ابھی سے سنولا گئی تھیں۔ اُن کی طوالت کے سامنے جھالر نما مہین نفیس سکرٹ چھوٹا پڑتا دِکھائی دیتا تھا۔ بیگ پکڑے ہوئے وہ کاؤنٹر کی طرف پلٹی اور اُس نے اپنی دُبلی پتلی مشّاق اُنگلیوں سے چُرسیں پڑے مہین کاغذ کو اُتار کر، زِپ لگی چھوٹی چھوٹی دو جیبوں (دونوں خالی) اور ایک خفیہ خانے کو، جس میں سے اُس نے ''جینی کولون'' کے الفاظ چھپے ہوئے کارڈ کو نکالا تھا، مجھے دِکھایا۔ اُس کے تمام ڈھنگ میں ایک پُراسراریت اور سنجیدگی تھی جیسے وہ مجھے کوئی بہت ہی ذاتی شے دِکھا رہی ہو۔

''ہیلو فُسوں۔'' میں نے کہا۔'' تم کافی بڑی ہو گئی ہو۔شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''بے شک کمال۔ جناب، میں نے آپ کو فوراً ہی پہچان لیا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا تو میں نے سوچا کہ آپ کو پریشان نہ کرنا بہتر ہو گا۔''

خاموشی چھا گئی۔ میں نے بیگ کے اندر اُس کی دِکھائی ہوئی جیبوں میں سے ایک کو دیکھا۔ اُس کا حسن یا اُس کا سکرٹ جو یقیناً بہت مختصر تھا یا کسی اَور چیز نے مِل جُل کر مجھے منتشر کر دیا تھا اور میں فطری انداز میں عمل نہیں کر پا رہا تھا۔

''خُوب......آج کل کیا کر رہی ہو؟''

''میں جامعہ میں داخلے کے امتحان کے لیے تیاری کر رہی ہوں اور میں یہاں بھی روز آتی ہوں، یہاں اِس دُکان پر۔ میں بے شمار نئے نئے لوگوں سے مِل رہی ہوں۔''

''حیرت انگیز۔تو اب بتایئے، اِس ہینڈ بیگ کی کیا قیمت ہے؟''

''پان صد لیرا۔'' (اُس زمانے میں اتنی رقم ایک جونیئر سرکاری ملازم کی چھے ماہ کی تنخواہ کے برابر تھی) ''لیکن مجھے یقین ہے کہ سینے ہَنم آپ کو خصوصی رعایت کر دیں گی۔وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر گئی ہیں اور اب یقیناً قیلولہ کر رہی ہوں لہٰذا میں اُنھیں فون بھی نہیں کر سکتی۔اگر آپ شام کو آ سکیں تو......''

''یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اپنا بٹوہ نکالتے ہوئے، میرے چہرے پر ایک کڈھب سا تاثر آ گیا، جس کا بعد میں اکثر فُسوں سوانگ بھرتی رہی تھی۔ میں نے گِن کر مرطوب روپے نکالے۔فُسوں نے پرس کو احتیاط لیکن نا تجربے کاری سے کاغذ میں لپیٹ کر پلاسٹک کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔اُس ساری کارروائی کے دوران میں وہ جانتی تھی کہ میں اُس کے شہد رنگ بازوؤں، پھر تیلیا اور شستہ اطوار کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے خریداری کا تھیلا مجھے پکڑایا تو میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔'' براہِ مہربانی، خالہ نصیبے اور اپنے والد کو میرا اسلام کہیے گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے عین وقت پر اُس کے والد کا نام بھول گیا تھا۔پھر ایک لمحے کے لیے میں ٹھہرا: میری رُوح میرے بدن سے نکل گئی تھی اور جنّت کے کسی کونے میں فُسوں کو سینے سے لگائے بوس وکنار کر رہی تھی۔ میں نے سرعت سے دروازے کا رُخ کیا۔گھنٹی بجی اور میں نے کناری کی چہچہاہٹ سنی۔ میں سڑک پر آ گیا۔تپش کو محسوس کرتے ہوئے، مجھے مسرت کا احساس ہوا۔ میں اپنی خریداری پر خُوش تھا۔ مجھے سیبل سے بہت محبت تھی۔ میں نے اُس دُکان اور فُسوں کو بھول جانے کا فیصلہ کیا۔

با ایں ہمہ، رات کے کھانے پر میں نے اپنی ماں سے ذکر کیا کہ سیبل کے لیے ہینڈ بیگ خریدتے ہوئے، مجھے ہماری دُور کی رشتے دار فُسوں ملی تھی۔

''او ہاں، نصیبے کی بیٹی سینے کی دُکان پر کام کر رہی ہے اور یہ کتنی شرم کی بات ہے!'' میری ماں بولی۔ ''اب تو وہ ہمارے ہاں چھٹی کے دِن بھی نہیں آتے۔ مقابلۂ حسن نے اُنھیں ایسی ہی شرمناک صُورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے۔ میں روزانہ دُکان کے پاس سے گُزرتی ہوں لیکن میں کبھی اُس بیچاری لڑکی سے علیک سلیک تک کے لیے اندر جانے کا حوصلہ نہیں کر سکی، نہ ہی یہ بات کبھی میرے ذہن میں آئی۔ لیکن تم تو جانتے ہو کہ جب وہ چھوٹی تھی تو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ جب نصیبے کپڑے سلائی کرنے آتی تھی تو بعض اوقات وہ بھی ساتھ آجاتی تھی۔ میں الماری سے تمھارے کھلونے نکال دیتی اور جب تک اُس کی ماں سلائی کرتی رہتی وہ خاموشی سے کھیلتی رہتی تھی۔ نصیبے کی والدہ مہر وَر، اللہ اُسے کروٹ کروٹ چین نصیب کرے، بھی کمال کی شخصیت تھیں۔''

''ہماری ان سے اصل رشتے داری کیا ہے؟''

چُوں کہ میرے والد ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے اور اُن کی توجہ، ہماری باتوں پر نہیں تھی، میری والدہ نے اُس کے والد کی تفصیلی کہانی سنائی۔ وہ ٹھیک اُسی برس پیدا ہوا تھا، جس برس اتاترک؛ اور وہ جمہوریہ کے بانیوں کی طرح تھا۔ اُس نے افندی سکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یُوں تھا کہ میرے نانا عثیم کمال نے میری نانی سے شادی کرنے سے بہت پہلے جلدبازی میں اپنی پہلی شادی فُسون کی پڑنانی سے کی تھی۔ وہ بوسنیائی تھی اور اَدرنہ سے انخلا کے دوران میں بلقان کی جنگ میں ماری گئی تھی۔ اگر چہ اُس بدقسمت عورت سے عثیم کمال کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، تاہم اُس کی میہ ریورما می ایک بیٹی پہلے ہی سے ایک شیخ کے نطفے سے تھی، جس کی اُس نے جب کہ ''وہ ابھی بچہ تھی'' شادی کر دی تھی۔ لہٰذا خالہ میہ ریور (فُسوں کی نانی جسے بھانت بھانت کے لوگوں نے پالا پوسا تھا) اور اُس کی بیٹی نصیبے خانم (فُسوں کی والدہ) صحیح معنوں میں ہمارے رشتے دار تھے؛ وہ خُونی رشتے داروں سے زیادہ سسرالی تھے۔ ہماری ماں نے ہمیشہ اِس بات پر اصرار کیا تھا اور وہ اب بھی ہدایت کرتی تھیں کہ ہم خاندان کی اُس دُور پار کی خواتین کو ''خالہ'' کہہ کر پُکاریں۔ آخری بار جب وہ چھٹی کے دِن آئے تھے تو میری والدہ نے اُن قلاش رشتے داروں کا (جو تشوقیہ کی عقبی گلیوں میں رہتے تھے) معمول سے ہٹ کر رُکھائی بھرا استقبال کیا تھا جس سے اُن کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ دو سال قبل خالہ نصیبے نے ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنی سولہ سالہ بیٹی کو، جو اُس وقت نسان تاسی لیسی فار گرلز کی طالبہ تھی، مقابلۂ حسن میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ میری ماں کو بعد میں معلوم ہوا کہ خالہ نصیبے نے درحقیقت اپنی بیٹی کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی تھی بل کہ اُسے، اُس کی اِس حرکت پر فخر بھی تھا جس پر کہ اُسے محض شرمندہ ہونا چاہیے تھا؛ تو اُن کا دِل خالہ نصیبے کی طرف سے سخت ہو گیا تھا جس سے وہ کبھی بہت محبت کرتی تھیں۔

دُوسری طرف خالہ نصیبے نے ہمیشہ میری والدہ کو عزت بخشی تھی جو اُس سے دس برس بڑی تھیں

اور اُس کی، اُس وقت مددگار تھیں جب وہ جوان تھی اور رزن کے کام کی تلاش میں متمول پڑوسیوں کے ہاں استنبول میں گھر گھر جاتی تھی۔

''وہ نہایت غریب تھے۔'' میری ماں نے کہا۔ اُنھوں نے مبادا مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اگر چہ وہ اکیلے ہی غریب نہیں تھے، میرے بیٹے ......اُن دِنوں سارا ترکی ہی غریب تھا۔'' میری والدہ نے اپنی تمام دوستوں سے خالہ نصیبے کی سفارش کی تھی اور سال میں ایک بار (بعض اوقات دو مرتبہ) وہ خود بھی اُسے، ہمارے گھر کسی تقریب یا شادی کے لیے کپڑے سلوانے کو بلواتی تھیں۔

چُوں کہ سلائی کے لیے یہ آمد و رفت سکول کے اوقات میں ہوتی تھی لہٰذا میں اُسے زیادہ نہیں ملا تھا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں، اگست کے آخر میں، میری والدہ کو ایک شادی کے سلسلے میں فوری طور پر ایک لباس کی ضرورت تھی تو اُنھوں نے نصیبے کو ہمارے موسمِ گرما والے مضافاتی گھر میں بلوایا۔ دُوسری منزل پر عقبی کمرے میں جا کر وہ اور نصیبے کھڑکی کے قریب بیٹھ گئیں جہاں سے سمندر کا نظارہ بہت دل کش ہوتا تھا۔ کھڑکی میں سے پام کی کونپلوں کے بیچ سے چپوؤں اور موٹر والی کشتیوں اور ستونوں کے ساتھ اچھلتے کودتے لڑکے بھی نظر آتے تھے۔ جب نصیبے نے اپنا سلائی والا بکسا کھولا، جس کے ڈھکن پر استنبول کے منظر کی تصویر کشی کی ہوئی تھی تو وہ قینچیوں، سُوئیوں، پیائش فیتے، انگشتانوں اور جھالر کی کترنوں اور دُوسرے ساز و سامان میں گھر گئیں۔ وہ گرمی، مچھروں اور ایسے دباؤ میں سلائی کی مجبوری کی شکایت اور بہنوں کی طرح آپس میں مذاق کرتے ہوئے، میری والدہ کی سنگر کی سلائی مشین پر آدھی رات تک کام کرتی رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ باورچن بکری اُس کمرے میں لیموں کی سکنجبین کے گلاس پر گلاس لے جاتی رہی تھی (گرم ہَوا دُھول کے وَیلوٹ سے بھاری ہو رہی تھی) کیوں کہ نصیبے کو، جو بیس سالہ اور حاملہ تھی، بار بار طلب ہو رہی تھی۔ جب ہم سب کھانا کھانے بیٹھے تو میری ماں نے بکری کو نیم مزاحیہ انداز میں بتایا: حاملہ عورت کو، جس شے کی بھی خواہش ہو اُسے دو ورنہ بچّہ بدصُورت پیدا ہو گا اور مجھے اِس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاص دلچسپی کے ساتھ نصیبے کے چھوٹے سے آماس کو دیکھنا یاد ہے۔ یہی فُسوں کے وجود سے میری پہلی آشنائی تھی، اگر چہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔

''حتّٰی کہ نصیبے نے اپنے خاوند کو بھی نہیں بتایا ......بس اُس نے اپنی بیٹی کی عمر کے بارے میں جھوٹ بولا اور اُسے مقابلۂ حسن میں شامل کروا دیا۔'' میری ماں نے اپنے ہی خیال پر گو حتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے خُدا کا وہ جیتی نہیں۔ جس کی بنا پر وہ لوگوں کی طرف سے ہتک کا نشانہ بننے سے بچ گئے۔ اگر سکول انتظامیہ کو اِس کی سُن گُن مل جاتی تو وہ لڑکی کو نکال باہر کرتے ......اب تک اُسے لیسی کی تعلیم مکمل کر لینا چاہیے تھی۔ مجھے توقع نہیں ہے کہ وہ آگے پڑھ رہی ہو گی۔ جب سے اُنھوں نے چھٹی کے دِنوں میں آنا بند کیا ہے تب سے میرے پاس تازہ معلومات نہیں ہیں ......اِس ملک میں کوئی بھی ایسا نہیں جو نہ

جانتا ہو کہ کس قماش کی لڑکی، کس قبیل کی عورت مقابلۂ حسن میں شرکت کرتی ہے۔ تمھارے ساتھ اُس کا رویّہ کیسا تھا؟''

میری ماں کا یہ طرزِ تکلم ظاہر کرتا تھا کہ فُسوں نے مردوں کے ساتھ سونا شروع کر دیا ہے۔ میں نے یہی بات نسان تاسی کی لڑکیوں کے کھلاڑی لڑکوں سے تب سنی تھی، جب فُسوں کا فائنل میں پہنچنے والی دُوسری لڑکیوں کے ساتھ ملبّیت میں فوٹو شائع ہوا تھا لیکن میں نے سب سے دشوار عدم دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش تھی۔ ہم دونوں کے خاموش ہو جانے کے بعد، میری والدہ نے میری سمت تنبیہاً انگلی اُٹھائی کر ہلائی اور بولی: ''محتاط رہو! تمھاری ایک بہت خاص، بہت دِل کش، بہت پیاری لڑکی سے منگنی ہونے والی ہے! تم مجھے یہ پرس کیوں نہیں دِکھا رہے جو تم نے اُس کے لیے خریدا ہے۔'' ممتاز!.....'' وہ میرے والد کو پکار رہی تھیں..... ''دیکھو! کمال نے سبیل کے لیے پرس خریدا ہے۔''

''واقعی؟'' میرے والد نے کہا۔ اُن کے بشرے سے اطمینان کا اظہار ہوتا تھا۔ انھوں نے بیگ کو، جو اُن کے بیٹے اور بہو کی خُوشی کا مظہر تھا، دیکھا بھی اور پسند بھی کیا، اگرچہ اُنھوں نے ایک بار بھی ٹیلی ویژن کی سکرین سے اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

جب میں نے امریکا کے بزنس سکول سے گریجوایشن کے بعد اپنی فوجی تربیت مکمل کر لی تو میرے والد نے مطالبہ کر دیا کہ میں اپنے بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلوں اور اُن کے کاروبار سیت سیت میں مینیجر کا عہدہ سنبھال لوں، جو بے تحاشا پھول پھل رہا تھا۔ یوں مجھے، اپنی نوجوانی ہی کے دنوں میں، اپنی تقسیم کار اور برآمداتی فرم سیت سیت (اس کا انگریزی میں ''Sellsell'' اور اُردو میں ''بیچو بیچو'' ترجمہ کیا جا سکتا ہے) میں جنرل مینیجر تعینات کر دیا۔ سیت سیت کا بہت بڑا بجٹ تھا اور وہ خوب منافع کما رہی تھی، جس کے لیے میرا نہیں بل کہ اُن مختلف اکاؤنٹنگ حربوں کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا، جن کے ذریعے میرے والد کی دُوسری فیکٹریوں اور کاروباروں سے منافع کھینچ کر سیت سیت میں ڈال دیا جاتا تھا۔ میں خوب استعمال ہو چکے افسرانِ حسابات، جو مجھ سے بیس بیس تیس تیس برس سینئر تھے، اور بڑے بڑے پستانوں والی، میری ماں کی عمر کی خواتین کلرکوں سے بزنس کے ارفع نکات میں مہارت حاصل کرنے میں شب و روز صرف کرنے لگا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ بات رہی کہ اگر میں مالک کا بیٹا نہ ہوتا تو کبھی بھی انچارج نہ بن پاتا اور میں نے کچھ عاجزی و انکساری دکھانے کی کوشش کی۔

چھٹی کے وقت جب سیت سیت کے کلرکوں جتنی بُوڑھی بسیں اور کاریں گڑگڑ کرتیں عمارت کی بنیادیں ہلاتی ہوئی شاہراہ پر گُزرنے لگتیں تو میری ہونے والی منگیتر سبیل مجھے ملنے آ جاتی اور ہم دفتر ہی میں ایک دوسرے پر نچھاور ہونے لگتے۔ اپنے جدید وضع کے نسوانی نظریات کے باوجود، جنھیں وہ یورپ سے واپسی پر اپنے ہمراہ لائی تھی، سبیل کے سیکریٹریوں کے بارے میں خیالات، میری ماں سے مختلف

نہیں تھے۔''ہمیں یہاں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔اِس سے مجھے سیکریٹری ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔''وہ بسا اوقات کہتی لیکن جیسے ہی ہم دفتر کے چمڑے کے صوفے کی طرف جاتے، اُس کے تحفظات کی اصل وجہ...... کہ اُس زمانے میں ترک لڑکیاں شادی سے قبل جنسی تعلقات سے ہراساں تھیں...... سامنے آجاتی۔

رفتہ رفتہ مغرب زدہ خاندانوں کی متصنّع لڑکیوں نے، جنھوں نے یورپ میں وقت گزارا تھا، اِس ممنوعہ کو توڑنا اور شادی سے قبل، اپنے دوست لڑکوں کے ساتھ سونا شروع کر دیا۔سیبل جو کبھی کبھی شیخی بگھارتی تھی کہ وہ اُن ''بہادر''لڑکیوں میں سے ہے، میرے ساتھ گیارہ ماہ بعد سوئی تھی۔لیکن اِس مقام تک پہنچنے سے پہلے اُس نے ادراک کیا کہ معاملات بہت آگے چلے گئے ہیں اور شادی کا وقت قریب ہے۔میں اپنی منگیتر کے بارے میں مبالغہ آمیزی یا عورتوں کے جنسی استحصال کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ ایسا صرف تب ہوا تھا جب سیبل نے دیکھ لیا کہ میرے ''ارادے سنجیدہ'' تھے۔جب اُسے اعتماد ہو گیا کہ میں ایسا شخص تھا جس پر ''بھروسہ کیا جا سکتا تھا''...... بالفاظِ دیگر جب اُسے حتمی طور پر یقین ہو گیا کہ بالآخر شادی ہو کر رہے گی...... تو اُس نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا۔خود پر یہ یقین رکھتے ہوئے کہ میں عمدہ اور ذمہ دار شخص ہوں، میری نیت اُس سے شادی کرنے کی تھی تاہم اگر میرا ایسا ارادہ نہ ہوتا تو بھی کسی اَور انتخاب کا سوال ہی نہیں تھا کیوں کہ اُس نے ''میرے حوالے اپنی دوشیزگی کر دی تھی۔'' کچھ عرصہ اِس بوجھ کا سایہ ہم دونوں پر مشترکہ طور پر پڑتا رہا کہ ہم خود پر فخر کرتے تھے۔''آزاد اور جدید''(گو ہم نے اپنے لیے اِن الفاظ کا کبھی استعمال نہیں کیا تھا) ہونے کے وہم میں مبتلا ہونے کے باعث ہم نے شادی سے قبل صحبت کر لی تھی...... اور ایک طرح سے یہ امر بھی ہمیں مزید قریب لانے کا باعث بنا تھا۔

ہم پر ایسا ہی ایک اَور سایہ بھی ہر مرتبہ آجاتا تھا جب سیبل تشویش زدہ ہو کر جلد تاریخ مقرر کرنے کے اشارے کنائے کرنے لگتی۔لیکن ایسے بھی وقفے گزرے جب وہ اور میں دفتر میں پیار کرتے ہوئے بہت خوش ہوتے تھے اور مجھے یاد آتا ہے کہ میں ملگجے میں اُس کے گرد اپنے بازو حمائل کیے ہوتا، ٹریفک اور گڑگڑاتی بسوں کا شور شاہراہ خلاص کرغیزی کی سمت سے اُٹھتا اور میں خود کو بتا رہا ہوتا کہ میں کس قدر خوش قسمت ہوں اور زندگی بھر کتنا آسودہ رہوں گا۔ایک بار ہمارے مشقت بھرے کام کے بعد جب میں سیت سیت کے مخصوص نشان والی ایش ٹرے میں سگریٹ کا ٹکڑا بجھا رہا تھا تو سیکریٹری کی کرسی پر نیم برہنہ بیٹھی، سیبل ٹائپ رائٹر پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے، اپنے ہی چھپکلے سنہرے نقوش پر تمسخرانہ ہنستی رہی، جیسے اُس زمانے میں مزاحیہ رسالوں میں شائع کیے جاتے تھے۔

اُسی شب فیوئے میں رات کے کھانے پر، میں پرس بھی لے گیا۔میں نے سیبل سے دریافت کیا:''کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آئندہ ہم مرحمت اپارٹمنٹس میں، میری والدہ کے لیے ہوئے فلیٹ

میں ملا کریں؟ اُس کے باہر ایک خُوب صُورت باغ بھی ہے۔"

"کیا تمھیں لگتا ہے کہ شادی ہونے کے بعد ہم اپنے گھر تاخیر سے جائیں گے؟" اُس نے پُوچھا۔

"نہیں پیاری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مجھے اس طرح خفیہ اپارٹمنٹوں میں ملنا اچھا نہیں لگتا جیسے میں تمھاری داشتہ ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"اُس اپارٹمنٹ میں ملنے کا خیال کیسے آیا؟"

"چھوڑو اس بات کو۔" میں نے کہا۔ میں نے اپنے گرد خُوش باش لوگوں کے ہجوم کو دیکھا۔ میں نے جب سے پرس خریدا تھا وہ پلاسٹک کے بیگ میں چھپا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سہیل نے تحفے کا ادراک کرتے ہوئے پُوچھا۔

"سرپرائز! کھول کر دیکھو۔"

"واقعی؟" جب اُس نے پلاسٹک بیگ کو کھول کر پرس دیکھا تو اُس کے چہرے پر بچوں کی سی اُبھر آنے والی خُوشی نے پہلے اُسے مضحکہ خیز بنایا پھر اُس کے چہرے پر مایوسی نمودار ہو گئی، جسے اُس نے چھپانے کی کوشش کی۔

"تمھیں یاد ہے؟" میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ رات، جب میں تمھیں گھر چھوڑنے جا رہا تھا تو تم نے، اِسے، اُس دکان کی کھڑکی میں دیکھا اور پسند کیا تھا۔"

اوہ، ہاں۔ تم کتنا خیال رکھتے ہو۔"

"مجھے خُوشی ہے کہ یہ تمھیں پسند آیا۔ ہماری منگنی کی تقریب میں یہ تمھارے ہاتھ میں بہت عمدہ لگے گا۔"

"مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے لیکن میں نے، ہماری منگنی پر، جو پرس لینا تھا، اُس کا بہت پہلے انتخاب کر لیا تھا۔" سہیل بولی۔ "اوہ، اتنے غمگین مت ہو! یہ بڑی بات ہے کہ تم نے یہ پیارا تحفہ خرید لانے کی زحمت کی....... چلو ٹھیک ہے۔ تم یہ مت سوچو کہ میں اتنی سنگ دِل ہوں۔ لیکن میں اس پرس کو منگنی کی تقریب کے موقع پر، اس لیے نہیں لے سکتی کیوں کہ یہ جعلی ہے۔"

"کیا؟"

"پیارے، یہ اصل جینی کولون نہیں ہے۔ یہ نقل ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اِس پر محض ایک نظر ڈال کر، پیارے۔ لیبل کو دیکھو کہ چمڑے کے ساتھ کیسے سیا گیا ہے؟

اب اس اصل چینی کولون کی سلائی کو دیکھو جو میں نے پیرس سے خریدا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ فرانس اور پوری دُنیا میں واحد یہی برانڈ ہے۔ چینی کولون اتنا گھٹیا دھاگا کبھی استعمال نہیں کرتے۔''

لمحے بھر کے لیے میں نے، اصل سلائی کی طرف دیکھتے ہوئے خود سے دریافت کیا کہ میری مستقبل کی بیوی کا لہجہ اِس قدر رفاتحانہ کیوں تھا۔ سیبل کا والد ایک ریٹائر ڈسفیر تھا، جس نے عرصہ قبل اپنے پاشا دادا کا رقبہ فروخت کر دیا تھا اور اب پائی پائی کا محتاج تھا۔ تیکنیکی اعتبار سے، یہ اُسے، ایک سرکاری ملازم کی بیٹی تو بناتی تھی لیکن یہی چیز کبھی کبھار اُسے بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس بھی دلاتی تھی۔ جب اُس کی پریشانیاں اُس پر غلبہ پا لیتی تھیں تو اپنی دادی کے بارے میں گفتگو کرنے لگتی تھی جو پیانو بجاتی تھی یا پھر اپنے دادا کی باتیں کرتی تھی، جس نے جنگِ آزادی لڑی تھی یا وہ مجھے بتاتی تھی کہ اُس کے نانا سلطان عبدالحامد کے کتنے قریب تھے۔ لیکن اُس کی بزدلی مجھے تحریک دیتی اور میں اُسے اسی بنا پر زیادہ محبت کرنے لگتا۔ ستر کی دھائی کے آغاز میں ٹیکسٹائل اور برآمدات کے کاروبار میں اضافے اور ازاں بعد استنبول کی آبادی تین گنا ہو جانے کی وجہ سے، شہر اور خاص طور پر، ہمارے علاقے جیسے علاقوں کی زمینوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ میرے والد کی قسمت بھی اُس دور میں دھکا لگنے سے اس سے اگلی دھائی میں خُوب چمکنے اُٹھی تھی، تقریباً پانچ گنا۔ ہمارے لقب (باسمیسی (Basmaci)۔ کپڑے پر چھاپے لگانے والا) نے اِس میں کوئی شک نہیں چھوڑا تھا کہ ہماری نسلوں کی دولت کپڑا اُبنے کی وجہ سے تھی۔ ہماری جمع کی ہوئی تمام تر ترقی کے باوجود، اِس بات نے مجھے پریشانی کی حد تک مضطرب کر دیا کہ پرس ''جعلی'' تھا۔

سیبل نے پیار سے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''تم نے بیگ کی کتنی ادائیگی کی ہے؟''

''پندرہ سولیرے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ تمھیں نہیں چاہیے تو کل میں اِسے بدلوا دوں گا۔''

''پیارے، اِسے بدلواؤ مت۔ اپنی رقم واپس لو کیوں کہ اُنھوں نے واقعی تمھیں دھوکا دیا ہے۔''

''دکان کی مالکہ سینے ہَنُم ہے اور ہم دُور پار کے رشتے دار ہیں!'' میں نے مایوسی سے اپنی ابرو چڑھاتے ہوئے کہا۔

سیبل نے مجھ سے بیگ لے لیا جس کی اندرونی جیبیں، میں خاموشی سے کھول رہا تھا۔

''پیارے، تم بہت چالاک اور بہت مہذب ہو۔'' اُس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''لیکن تمھیں قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ ایک عورت تمھیں کتنی آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے۔''

اگلے روز دوپہر کے وقت میں پلاسٹک کے اُسی تھیلے میں پرس ڈالے سانزے لوے لے گیا۔ میرے اندر داخل ہونے پر گھنٹی بجی لیکن ایک بار پھر دُکان اتنی اندھیری تھی کہ میں سمجھا وہاں کوئی

نہیں ہے۔ کم روشنی والی دُکان کی عجیب وغریب روشنی میں بلبل چہچہائی: چِک چِک چِک۔ پھر میں نے فُسون کا سایہ ایک شیشے میں دیکھا۔ وہ ایک بڑے گُل دان میں لگی بیل کے پتوں کے بیچ میں سے نظر آرہی تھی۔ وہ ایک موٹی عورت کا انتظار کر رہی تھی جو کپڑوں کے ماپ کی جانچ کرنے والے کمرے میں لباس پہن کر دیکھ رہی تھی۔ اس بار اُس نے ایک جاذبِ نظر بلاؤز زیبِ تن کر رکھا تھا، جس پر ہیا سنتھس کے پھول، پتوں اور جنگلی پھول کے ساتھ گُوندھ کر بنے ہوئے تھے۔ شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے جب اس کی نظر، مجھ پر پڑی تو وہ دل کش انداز میں مُسکرا دی۔

''تم مصروف دِکھائی دیتی ہو۔'' میں نے آنکھوں سے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم بس فارغ ہونے ہی والے ہیں۔'' اُس نے یُوں کہا جیسے وہ اور اُس کی گاہک اِس نکتے پر کاہلی سے بات کر رہی ہوں۔

میری نگاہوں نے، پنجرے میں اُوپر نیچے پھڑ پھڑاتی کناری، ایک کونے میں فیشن میگزینوں کے ایک ڈھیر اور یورپ سے درآمد شدہ نوع بہ نوع فاضل چیزوں کی ڈھیری کا، احاطہ کیا لیکن میری توجہ کسی بھی شے پر جم نہیں سکی۔ میں جتنا اِس احساس کی عمومیت کو رد کرنا چاہتا تھا اُتنا ہی، میں اُس چونکا دینے والی حقیقت سے انکار نہیں کر پا رہا تھا کہ جب میں نے فُسون کو دیکھا تو وہ مجھے اپنی اپنی سی لگی تھی، جیسے ہمارا بہت قریبی تعلق رہا ہو۔ وہ مجھ سے مشابہ تھی۔ اُس کے وہی بال جو بچپن میں گھنگھریالے اور گھرے ہوا کرتے تھے اب سیدھے ہوتے چلے گئے۔ اُس پر، اُس کے بالوں کا سنہری سایہ پڑ رہا تھا، جو اُس کی صاف رنگت کی طرح، اُس کے چھاپہ دار بلاؤز سے تکمیل پا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں خود کو بہ آسانی اُس کی جگہ پر رکھ سکتا ہوں، اُسے گہرائی میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایک اذیّت ناک یاد میرے اندر دَر آئی: میرے دوست اُسے کہتے تھے ''پلے بوائے جیسی چیز۔'' کیا وہ اُن کے ساتھ سو سکتی تھی؟ ''پرس کی طرف پلٹو، اپنی رقم لو اور بھاگ نکلو۔'' میں نے خود سے کہا۔ ''تمھاری ایک حیرت انگیز لڑکی کے ساتھ منگنی ہونے والی ہے۔'' میں باہر نسان تاسی چوک کی سمت دیکھنے لگا۔ لیکن جلد ہی دھندلے شیشے میں فُسون کا بھُوت جیسا عکس نمودار ہو گیا۔

جب عورت، کمرے میں سے اپنا سکرٹ ٹھیک کرتی ہوئی، کچھ خریدے بغیر ہی نکل کر چلی گئی تو فُسون نے مسترد کی ہوئی اشیا کو تہہ کر کے، انھیں، اُن کی جگہوں پر رکھا۔ ''میں نے کل شام تمھیں سڑک پر سے گُزرتے دیکھا تھا۔'' وہ اپنے خُوب صُورت ہونٹوں کو گھماتے ہوئے بولی۔ اُس نے مِس رلن کے نام سے فروخت ہونے والی ہلکی گلابی سُرخی لگا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ ایک عام سی ترک سُرخی تھی لیکن اُس کے لبوں پر درآمد شدہ اور موہ لینے والی لگ رہی تھی۔

''کب دیکھا تھا تم نے؟''میں نے پُوچھا۔

''رات کے آغاز میں۔تم سیبل پٹم کے ہمراہ تھے۔میں سڑک کے دُوسرے کنارے پر تھی۔ کیا تم کھانا کھانے جا رہے تھے؟''

''ہاں۔''

''تم دونوں کی جوڑی بہت خُوب صُورت لگتی ہے!''وہ اِس طرح بولی جیسے بزرگ نوجوان خُوش باش لوگوں کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔

میں نے اُس سے یہ نہیں پُوچھا کہ وہ سیبل کو کیوں کر جانتی تھی۔''ہمیں آپ کی تھوڑی سی عنایت درکار ہے۔''میں نے کہا۔میں نے بیگ نکالا تو مجھے پریشانی اور دُکھ محسوس ہوا۔''ہم اِس بیگ کو واپس کرنا چاہتے ہیں۔''

''ضرور۔تمھاری خاطر اسے تبدیل کر کے خُوشی ہوگی۔تم جدید وضع کے اِن نئے دستانوں کو پسند کرو گے اور ہمارے پاس یہ ہیٹ بھی ہے جو حال ہی میں پیرس سے آیا ہے۔سیبل پٹم کو یہ بیگ پسند نہیں آیا؟''

''میں اسے تبدیل نہ کرنے پر ترجیح دوں گا۔''میں نے شرمندہ چہرے کے ساتھ کہا۔''میں اپنی رقم واپس چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟''اُس نے پُوچھا۔مجھے اُس کے چہرے پر صدمے مل کر کچھ خوف کے تاثرات نظر آئے۔

''بظاہر یہ اصل جینی کولون کا بیگ نہیں ہے۔''میں نے سرگوشی کی۔''یہ جعلی لگتا ہے۔''

''کیا؟''

''درحقیقت میں اِن چیزوں کو نہیں سمجھتا۔''میں نے بےبسی سے کہا۔

''اِس جیسی چیز یہاں کبھی نہیں آئی!''اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔''کیا تمھیں اپنے پیسے ابھی واپس چاہئیں؟''

''ہاں۔''میں نے بےاختیار کہا۔

وہ گہری اذیت میں دِکھائی دی۔اوہ خُدایا، میں نے سوچا، کیوں نہ میں نے بیگ کو محض ٹھکانے ہی لگا دیا ہوتا اور سیبل سے کہہ دیتا کہ میں نے اپنی رقم واپس لے لی ہے؟''دیکھو، یہ تمھارے یا سینے پٹم کا مسئلہ نہیں ہے۔ہم ترک خُدا کی عبادت کرتے ہیں۔ہر یورپی فیشن کی نقل کرتے ہیں۔''میں نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''میرے لیے......یا مجھے کہنا چاہیے کہ ہمارے لیے......اتنا ہی کافی ہے کہ ایک بیگ، جس ضرورت کے لیے ہے اُسے پُورا کرے، عورت کے ہاتھ میں اچھا لگے۔اِس

بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ کس برانڈ کا ہے یا اُسے کس نے بنایا ہے یا یہ کہ وہ اصل بھی ہے۔" لیکن فُسوں کو، میری ہی طرح، میرے کہے ہوئے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں تھا۔

"نہیں، میں تمھیں تمھارے پیسے واپس کر رہی ہوں۔" اُس نے اُسی تند لہجے میں کہا۔ میں خاموش ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ میں نے خود کو ہونّی کے لیے تیار کر لیا۔ مجھے اپنی حیوانیت پر شرمندگی تھی۔

وہ اپنی بات پر عمل کرنے میں صمیم تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فُسوں اپنی مرضی پر قادر نہیں تھی۔ وہ غلک کو یُوں تک رہی تھی جیسے کسی نے اُس پر سحر پھونک دیا ہو، جیسے اُس میں بھُوت ہوں اور وہ اُسے چھو نہ پا رہی ہو۔ جب میں نے اُس کے چہرے کو سُرخ ہوتے، اُس پر جھرّیاں پڑتے اور اُس کی آنکھوں کو بھیگتے دیکھا تو مجھے صدمہ پہنچا اور میں دو قدم مزید اس کے قریب ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔ مجھے بالکل ادراک نہیں ہو پایا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ لیکن میں نے اپنے، بازو اُس کے گرد حمائل کر دیے تھے اور وہ میرے سینے سے اپنا سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ "فُسوں، مجھے افسوس ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔ میں نے چمکارتے ہوئے، اُس کے ملائم بالوں اور پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "براہِ کرم، بھول جاؤ کہ یہ بات کبھی ہوئی تھی۔ یہ ایک جعلی پرس ہے اور بس اتنی سی بات ہے۔"

گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے بچّے کے مانند ایک دو بار سسکیاں بھریں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گو مختصر وقفے کے لیے سہی لیکن اُس کے بدن اور خُوب صُورت بازوؤں کے لمس، میرے سینے پر اُس کی دبی ہوئی چھاتیوں اور اس طرح اُسے ساتھ لپٹائے ہونے کے احساس نے، میرا دماغ چکرا دیا۔ شاید یہ خواہش کو کچلنے کی سعی میں ہوا تھا، جو اُسے ہر بار چھونے پر زیادہ مضبوط ہوتی گئی تھی کہ میں نے اِس وہم کو تصویر کیا تھا کہ ہم ایک دُوسرے کے برسوں سے آشنا تھے، کہ ہم پہلے ہی سے ایک دُوسرے کے قریب تھے۔ وہ میری پیاری، بے چاری، دُکھی اور خُوب صُورت بہن تھی! ایک لمحے کے لیے —اور شاید اِس بنا پر کہ میں جانتا تھا کہ ہم رشتے دار رہیں، خواہ دُور پار ہی کے سہی ...... اُس کی لمبی ٹانگوں، عمدہ پسلیوں اور نازک کندھوں نے مجھے اپنا آپ یاد دِلا دیا تھا۔ اگر میں لڑکی ہوتی، اگر میں بارہ سال چھوٹی ہوتی تو میرا بدن بھی ایسا ہی ہوتا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اُسے بالوں پر سے چمکارتے ہوئے کہا۔

"میں تمھاری رقم واپس کرنے کے لیے غلک نہیں کھول سکتی۔" اُس نے واضح کیا۔ "کیوں کہ جب سینے بَیْہم کھانا کھانے گھر جاتی ہے تو وہ اُسے تالا بند کر کے چابی ساتھ لے جاتی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔" میں نے احتیاط اور دلار سے اُس کے بالوں پر چمکارنا جاری رکھا تو وہ سر کو میرے سینے پر ڈالتے ہوئے ایک بار پھر رونے لگی۔ "میں یہاں صرف لوگوں سے میل ملاقات اور وقت گزاری کی خاطر کام کرتی ہوں، پیسوں کے لیے نہیں۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''پیسے کے لیے کام کرنا باعثِ پریشانی تو نہیں ہے۔'' میں نے احمقانہ انداز میں بے دِلی سے کہا۔

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''میرے والد ریٹائرڈ اُستاد ہیں...... دو ہفتے قبل میں اٹھارہ برس کی ہوگئی ہوں اور میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔''

شہوت انگیز چھاتیوں سے، جواب اپنا سر اُٹھا کر خطرے کا احساس دِلا رہی تھیں، ہراساں ہو کر میں نے اُس کے سر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ فوراً سمجھ گئی اور اُس نے خود کو سمیٹ لیا۔ ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے۔

''براہِ مہربانی کسی کو بتایئے گا نہیں کہ میں روئی تھی۔'' اُس نے اپنی آنکھیں مَلنے کے بعد کہا۔

''وعدہ رہا۔'' میں بولا۔ ''فقسوں یہ دوستوں کے مابین مقدس عہد ہے۔ ہم ایک دُوسرے پر اپنے اپنے رازوں کے سلسلے میں بھروسہ کر سکتے ہیں۔''

میں نے اُس کی مُسکراہٹ دیکھی۔ ''میں پرس چھوڑے جاتا ہوں'' میں نے کہا۔ ''میں پیسے لینے بعد میں آ سکتا ہوں۔''

''آپ کی مرضی ہے۔ چاہیں تو بیگ چھوڑ جائیں لیکن بہتر ہوگا کہ پیسے لینے یہاں نہ آئیں۔ سینئے پَنّم اصرار کرے گی کہ یہ نقل نہیں ہے اور تمھیں معذرت کرنی پڑے گی کہ تمھارا مطلب کچھ اَور تھا۔''

''تب میں اِسے کسی اور شے سے تبدیل کیے لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اب ایسا نہیں کر سکتی۔'' اُس نے مغرور لڑکی کے سے انداز میں اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، واقعی یہ اہم نہیں ہے۔'' میں نے پیش کش کی۔

''لیکن میرے لیے تو ہے۔'' اُس نے مضبوطی سے کہا۔ ''جب سینئے پَنّم دُکان پر لوٹے گی تو میں اُس سے پیسے لے لوں گی۔''

''میں نہیں چاہتا کہ وہ عورت تمھیں مزید پریشان کرے۔'' میں نے جواب دیا۔

''فکر مت کریں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا ہے۔'' اُس نے بہت ہی مدہم مُسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں کہوں گی کہ سیبیل پَنّم کے پاس پہلے ہی اسی برانڈ کا پرس موجود ہے، جس کی وجہ سے وہ اِسے واپس کر رہی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟''

''بہترین خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہی بات سینئے پَنّم سے میں کیوں نہ کہہ دوں؟''

''نہیں، تم اُس سے کچھ نہیں کہو گے۔'' اس نے بہ اصرار کہا۔ ''کیوں کہ وہ محض تمھارے ساتھ چال کھیلنے اور تم سے ذاتی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ دُکان پر بالکل نہیں آنا۔ میں رقم خالہ وَجیہہ کو دے دوں گی۔''

''اوہ، براہِ خُدا، میری ماں کو اِس قضیے میں شامل مت کرنا۔ وہ زیادہ ہنگامہ پرور ہے۔''
''پھر میں تمھارے پیسے کہاں پہنچاؤں؟'' فُسوں نے اپنی بھنوئیں اُٹھاتے ہوئے پُوچھا۔
''مرحمت اپارٹمنٹس، ۱۳۱ ٹیس وکیے میں جہاں میری والدہ کا ایک فلیٹ ہے۔'' میں نے کہا۔''امریکا جانے سے پہلے، میں اُسے اپنی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ میں وہاں پڑھنے اور موسیقی سننے جایا کرتا تھا۔ وہ ایک رُوح پرور جگہ ہے، جس کے عقب میں ایک باغ ہے...... میں اب بھی دوپہر کے کھانے کے وقت وہاں دو سے چار بجے کے درمیان لکھنے کا کام کرنے جاتا ہوں۔''
''بے شک، میں تمھاری رقم وہاں لا سکتی ہوں۔ اپارٹمنٹ کا نمبر کیا ہے؟''
''چار۔'' میں نے سرگوشی کی۔ میں بمشکل اگلے تین الفاظ ادا کر سکا جو حلق ہی میں مرتے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔''دُوسری منزل، خُدا حافظ۔''
میرے دِل نے اندازہ لگالیا تھا اور بلّیوں ناچ رہا تھا۔ تیزی سے باہر کی طرف جانے سے قبل میں نے اپنی قوت مجتمع کی اور یُوں ظاہر کیا جیسے کچھ بھی غیر معمولی وقوع پذیر نہ ہوا ہو اور اُس کی طرف الوداعی نظر ڈالی۔
اپریل کی اُس سہ پہر کی بے موسمی گرمی میں میری خطا اور سعادت کے متعدد پہلو، یُوں جذب ہوئے کہ پُراسرار پیلاہٹ سے نسان تاسی کی کلیاں چٹکنے لگی تھیں۔ میرے قدموں نے سایہ دار راستہ منتخب کیا اور مجھے عمارتوں کی اولتیوں اور دُکانوں کی کھڑکیوں کے نیلے اور سفید دھاریوں والے سائبانوں تلے لے گئے اور جب اُن میں سے ایک کھڑکی میں، مَیں نے پیلے رنگ کا ایک جگ دیکھا تو میں نے خود کو اندر جانے اور اُسے خریدنے پر مجبور پایا۔ اِس طرح اتفاقاً خریدی گئی دیگر اشیا کے برعکس اُس جگ پر بیس برسوں میں کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اُس میز پر دھرا رہتا تھا جہاں میری والدہ اور والد اور بعد میں میری والدہ اور مَیں کھانا کھاتے تھے۔ جب کبھی میں نے اُس جگ کو چھوا تو مجھے وہ دِن یاد آ گئے جب میں نے پہلی بار بے چارگی محسوس کی تھی، جس نے میرا رُخ موڑ دیا تھا۔ تب میری والدہ کھانے پر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہتی۔
گھر پہنچ کر میں نے بوسہ لے کر ماں کو سلام کیا۔ اگرچہ وہ مجھے سہ پہر کو جلد گھر دیکھ کر خوش ہوئی تھیں لیکن وہ متحیر ہرگز نہیں تھیں۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ میں نے ترنگ میں آ کر جگ خرید لیا تھا۔ پھر اضافہ کیا: ''کیا آپ مجھے مرحمت اپارٹمنٹس کی چابی دے سکتی ہیں؟ بعض اوقات دفتر میں اتنی افراتفری مچ جاتی ہے کہ میں ارتکاز نہیں رکھ پاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اپارٹمنٹ میں ایسا ممکن ہو سکے۔ جب میں نوجوان تھا تو ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔''
میری ماں بولی: ''وہاں انچ انچ بھر دُھول جمی ہوگی۔'' لیکن وہ سیدھی اپنے کمرے میں

عمارت کی چابی لینے چلی گئی، جو اپارٹمنٹ کی چابی کے ساتھ ایک سُرخ فیتے میں بندھی تھی۔ ''تمھیں وہ کیونا ہیا گُل دان یاد ہے، جس میں سُرخ پھول ہوتے تھے؟'' اُس نے مجھے چابیاں دیتے ہوئے دریافت کیا۔ ''وہ مجھے گھر میں کہیں نہیں ملا۔ دیکھنا کہیں اُسے میں وہاں نہ لے گئی ہوں؟ اور اتنی محنت مت کرو...... تمھارے والد نے اپنی تمام زندگی سخت محنت کرتے گزار دی تا کہ اُس کے بچے زندگی کا لطف اُٹھائیں۔ تمھیں خوشی کا حق ہے۔ سیبل کو باہر لے جاؤ اور بہار کی ہوا کا مزا لو۔'' پھر چابیاں میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اُس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''محتاط رہنا۔'' وہ ایسی نظر تھی جس سے وہ ہمیں ہمارے بچپن میں تنبیہ کرنے کے لیے دیکھا کرتی تھیں کہ زندگی میں غیر متوقع خطرات ہیں جو تمثیلاً چابی کی صحیح حفاظت میں ناکامی سے زیادہ گہرے اور زیادہ دھوکے باز ہیں۔

vvvv

معروف ہستیاں
(Famous People)

اگر سُننے کو کوئی کہانی یا دیکھنے کو کچھ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہوتی ہے۔ جب میں بچہ تھا تو ہم کھڑکی سے باہر گلی سے گُزرنے والوں کا نظارہ؛ مقابل عمارت کے، جس کی چھت پر ہمیشہ ایک چینی مٹی کا بنا ہوا کتا سویا ہوتا تھا، اپارٹمنٹس میں تانکا جھانکی نہ کر رہے ہوتے تو ریڈیو سُن رہے ہوتے۔ ۱۹۵۸ء میں ترکی میں ٹیلی ویژن نہیں ہوا کرتا تھا لیکن ہم یہ اعتراف کبھی نہیں کریں گے کہ ٹیلی ویژن نہیں ہوتا تھا بلکہ ہم خُوش گمانی سے وہی کہیں گے جو ہم نے ہالی وُڈ کی اُس داستانی فلم کے بارے میں کہا تھا جسے استنبول پہنچنے میں کچھ برس لگ گئے تھے: وہ ابھی آئی ہی نہیں۔

کھڑکی سے باہر تکنے کی عادت اِتنی پختہ ہو چکی تھی کہ بالآخر جب ٹیلی ویژن کی آمد ہوئی تو لوگ اُسے بھی یُوں دیکھتے گویا کھڑکی سے باہر تک رہے ہوں۔ میرے والد، چچا اور دادی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھے بغیر بالکل اُسی انداز میں باتیں اور بحث کرتے رہتے جیسے وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کرتے تھے۔

مثال کے طور پر صبح سے ہونے والی برف باری کو دیکھتے ہوئے میری پھوپھی تبصرہ کرتی۔

"اگر برف اِسی رفتار سے پڑتی رہی تو خُوب موٹی تہہ جمے گی۔"

"وہ حلوہ فروش دوبارہ نشانتاش پہنچ گیا ہے۔" وہ دُوسری کھڑکی سے ریل کی پٹڑی کو تکتے ہوئے کہتا۔

اتوار کی اتوار ہم اپنی پھوپھیوں اور چچاؤں کے ہمراہ، جو ہماری ہی مانند عمارت کی نچلی منزلوں پر رہائش پذیر تھے، اُوپری منزل پر دادی کے ہاں دوپہر کے کھانے کے لیے جاتے۔ میں کھانے کے انتظار کے دوران میں کھڑکی سے باہر تکتا رہتا۔ عزیز و اقارب کے اُس شور مچاتے اکٹھ سے میں اِس قدر مسرور ہوتا کہ کھانے کی میز پر لٹکے شمع دان سے مدہم روشن نشست گاہ بھی میری آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرنے لگتی۔

دُوسری منزلوں کی نشست گاہوں کے مانند میری دادی کی نشست گاہ میں بھی ہمیشہ نیم اندھیرا ہوتا تھا لیکن وہ مجھے نسبتاً زیادہ اندھیری لگتی تھی۔ شاید اِس کا سبب جھروکوں کے سروں پر سدا بند

رکھے جانے والے دروازوں پر لگے خوف ناک سایوں والے جالی دار پردے اور آراستہ کی ہوئی چنٹوں والی بھاری بھرکم جھالریں تھیں۔ شاید مجھے تھلسے اور بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے کمروں کی بنا پر ایسا لگتا ہو، جن سے دُھول کی مہک اُٹھتی تھی اور وہ لکڑی کے قدیمی خستہ صندوقوں، شیشوں پر سیپیوں کی بُنت کاری، خُوش وضع بنچوں جیسے پایوں والے جہازی حجم کے بلوط کے میز اور تین نسلوں پُرانے چھوٹے سے پیانو سے، جس کا ڈھکن چوکھٹے میں جڑی تصویروں سے ڈھپا تھا، بھرے ہوئے تھے۔

ایک اتوار کو ظہرانے کے بعد چچا نے، جو کھانے کے کمرے میں کھلنے والے ایک اندھیرے کمرے میں تمبا کو نوشی کر رہے تھے، بہ آواز بلند کہا۔ "میرے پاس فٹ بال میچ کے دو ٹکٹ ہیں لیکن میں نہیں جا رہا۔ تمھارے والد تم دونوں کو کیوں نہیں لے جاتے؟"

"ہاں ابا جان، ہمیں کھیل دِکھانے لے جائیں۔" میرا بڑا بھائی دُوسرے کمرے سے بولا۔

"اِس سے لڑکوں کی ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔" امّی نے کہا۔

"تم ہی انھیں کیوں نہیں لے جاتیں؟" ابا جان بولے۔

"میں اپنی ماں کے ہاں جا رہی ہوں۔" ماں نے جواب دیا۔

"ہم نانی کے گھر نہیں جانا چاہتے۔" بھائی نے کہا۔

"آپ گاڑی لے جا سکتے ہیں۔" چچا بولے۔

"چلو نا، ابا جان۔" بھائی نے ترلا لیا۔

ایک طویل اور تکلیف دہ خاموشی یُوں چھا گئی گویا ابا جان اندازہ لگانا چاہ رہے ہوں کہ وہاں موجود ہر شخص اُن کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، مجھے چابیاں دے دو۔" ابا جان نے چچا سے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم زمینی منزل پر تھے۔ ابا تمبا کو نوشی کرتے ہوئے طویل ڈیوڑھی میں جا رہے تھے۔ ہماری ماں نے ہمیں منقّش اُون کی موٹی موٹی جُرابیں اور دو دو سویٹر پہنا دیے تھے۔ چچا کی ۱۹۵۲ء موتیا رنگ کی شان دار ڈاج کار تیش وکیے مسجد کے سامنے کھڑی تھی۔ ابا جان ہم دونوں کو اگلی نشست پر بٹھانے پر رضامند ہو گئے۔ انجن پہلی مرتبہ چابی گُھماتے ہی چالُو ہو گیا۔

سٹیڈیم میں داخلے پر قطار نہیں تھی۔ "یہ ٹکٹ ان دونوں کی ہے۔" میرے والد نے چکر دار دروازے پر موجود شخص سے کہا۔ "ایک آٹھ سال کا ہے اور دُوسرا دس کا۔" ہم ٹکٹ والے سے نظریں چراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ قطاروں میں بے شمار نشستیں خالی پڑی تھیں۔ ہم بیٹھ گئے۔

ٹیمیں پہلے سے کیچے میدان میں موجود تھیں۔ مجھے سفید کچھے پہنے کھلاڑیوں کا اپنے آپ کو گرمانے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنا بھاگنا اچھا لگا۔ "اُس چھوٹے کھلاڑی کو دیکھو۔" بھائی نے اشارہ کیا۔

''اُسے جونیئر ٹیم سے لیا گیا ہے۔''

''مجھے پتا ہے، شکریہ۔''

کھیل شروع ہونے کے بعد جب سٹیڈیم کے سب تماشائی پُراسرار طور پر خاموش ہو گئے تو میں نے کھلاڑیوں سے دھیان ہٹا کر اپنے ذہن کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ فٹ بال کے تمام کھلاڑی ایک ہی جیسی وردی پہنتے ہیں تو پھر اُس پر اپنے اپنے نام کی پٹی کیوں لگاتے ہیں؟ وہ بھاگ دوڑ کے دوران میں جوں ہی قریب آتے میں اُن کے نام دیکھنے لگتا۔ دھیرے دھیرے اُن کے گچھے دُھول میں اُٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد مجھے میدان کے بینچوں کے عقب میں ایک بحری جہاز کی سست رَوحرکت دکھائی دی، جو باسفورس سے گزر رہا تھا۔ کھیل کا آدھا وقت بیتنے تک کسی ٹیم نے کوئی گول نہیں کیا تھا اور ہمارے والد ہمارے لیے مخروطی شکل کے کاغذ میں لپٹے ہوئے بھنے ہوئے خستہ دانے اور پِٹا (pitta) ڈبل روٹی لے آئے۔

''ابا جان، میں اپنی ساری پِٹا ختم نہیں کر سکتا۔'' میں نے اُنھیں اپنے ہاتھ میں بچی ہوئی پِٹا دِکھاتے ہوئے کہا۔

''نیچے پھینک دو۔'' اُنھوں نے کہا۔ ''کوئی دھیان نہیں دے گا۔''

وقفے کے دوران میں سب کھڑے ہو کر اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابا جان کی طرح بھائی اور میں نے بھی پاجامے کی جیب میں ہاتھ اُڑسے اور میدان کی جانب پیٹھ کر لی۔ ہم دُوسرے تماش بینوں کو دیکھ رہے تھے کہ ایک آدمی نے میرے والد کو پُکار کر کچھ کہا۔ ابا جان نے کان پر ہاتھ کو بھونپو بنا کر اشارہ دیا کہ وہ شور کے باعث اُس کی بات سُن نہیں سکے۔

''میں اِس وقت تو نہیں آ سکتا۔'' اُنھوں نے ہماری سمت اشارہ کیا۔ ''میرے ساتھ بچے ہیں۔''

وہ شخص بنفشی گلوبند پہنے ہوئے تھا۔ وہ قطاروں سے نیچے، نشستیں پھلانگتا، راہ میں رُکاوٹ بننے والے لوگوں کو دھکیلتا ہوا ہمارے پاس بیٹھنے کے لیے آ گیا۔

''کیا یہ تمھارے بچے ہیں؟'' اُس نے ابا جان سے معانقہ کرنے اور اُن کے دونوں گالوں پر بوسہ دینے کے بعد دریافت کیا۔ ''کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ یہ نا قابلِ یقین بات ہے۔''

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یہ سب تم نے کیسے کر لیا؟'' وہ آدمی بولا۔ ''کیا سکول سے فارغ ہوتے ہی فوراً شادی کر لی تھی؟''

''ہاں۔'' ابا جان نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اُنھوں نے کچھ اور باتیں بھی کیں۔ اُس کے جانے کے بعد ابا جان چُپ ہو کر بیٹھ گئے۔

صاف ستھرے کپڑے پہنی ٹیمیں میدان میں دوبارہ اُتری ہی تھیں کہ ابا جان بولے۔ ''آؤ، واپس گھر چلتے ہیں۔ تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''مجھے سردی نہیں لگ رہی۔'' بھائی نے کہا۔

''نہیں لڑکو، تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' ابا جان نے بہ اصرار کہا۔ ''علی کو لگ رہی ہے۔ چلو، اُٹھو یہاں سے۔''

آپس میں ٹکراتے گھٹنوں اور ٹھُڈے مارتے ہوے ہم وہاں سے اُٹھے تو ہم نے زمین پر، میرے پھینکے ہوئے پنیر لگی پتا کو پیروں تلے روند ڈالا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہم نے کھیل کا دُوسرا حصہ شروع کرنے والی ریفری کی سیٹی سُنی۔ ''کیا تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے؟'' بھائی نے مجھ سے دریافت کیا۔ ''تم نے یہ کیوں کہا کہ تمھیں سردی لگ رہی ہے؟''

میں نے جواب نہیں دیا۔

''تم احمق ہو۔'' بھائی نے کہا۔

''کیا تم کھیل کا آدھا حصہ ریڈیو پر نہیں سُن سکتے؟'' ابا جان بولے۔

''یہ ریڈیو پر نشر نہیں ہو رہا۔'' بھائی بولا۔

''ہُش۔'' ابا جان بولے۔ ''واپسی پر میں تمھیں تاکسم چوک کے راستے لے کر جاؤں گا۔''

ہم خاموش رہے۔ چوک پار کرنے کے بعد ابا جان نے ہمارے قیاس کے عین مطابق کار سڑک سے ہٹ کر بنی ہوئی جوئے کی کھڑکیوں کے ساتھ کھڑی کی۔ ''کسی کے لیے بھی دروازہ مت کھولنا'' وہ بولے۔ ''میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

وہ باہر نکل گئے۔ اُن کے دروازوں کو باہر سے تالے لگانے سے قبل ہی ہم نے اندر سے تالوں کے کِل نیچے گرا لیے لیکن ابا جان جوئے والی کھڑکیوں کی طرف نہیں گئے۔ وہ سنگریزوں پر دوڑتے ہوئے سڑک کے پار ایک ایسی دُکان میں گئے جہاں کھڑکیوں میں بحری جہازوں کے اشتہار، ہوائی جہازوں کے پلاسٹک سے بنے بڑے بڑے نمونے اور ساحلوں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

''ابا جان کہاں جا رہے ہیں؟'' میں بولا۔

''جب ہم گھر پہنچیں گے تو تم 'اُوپر یا سب سے نیچے' کھیلنا چاہو گے؟'' بھائی نے پُوچھا۔

جب ابا جان لوٹے تو بھائی گیئر کے دستے سے کھیل رہا تھا۔ ہم تیز رفتاری سے نشا نتاشی پہنچے۔ اُنھوں نے کار، دوبارہ مسجد کے سامنے کھڑی کی۔ جب ہم اللہ دین کی سستے داموں والی دُکان کے پاس سے گزرنے لگے تو ابا جان کہنے لگے۔ ''کیوں نہ میں تم دونوں کو کچھ لے دوں؟ لیکن وہ ''معروف ہستیاں'' والی سیریز نہیں لے کر دوں گا۔''

''اوہ براہِ مہربانی، ابا جان، براہِ مہربانی۔'' ہم کودتے ہوئے بولے۔

ابا جان نے ہمیں دس دس چیونگمیں خرید کر دیں، جن میں مشہور لوگوں کی تصاویر تہہ کی ہوئی نکلیں۔ گھر واپسی کے راستے میں مجھے لگا، جیسے مارے جوش کے میرا پیشاب خطا ہو جائے گا۔ اپارٹمنٹ گرم تھا اور ہماری والدہ ابھی تک نہیں لوٹی نہیں تھیں۔ ہم نے جلدی سے چپکے ہوئے ٹکڑے کھولے اور اُن پر لپٹے ہوئے کاغذ فرش پر پھینک دیے۔ میرے پاس مارشل فیوزی کیکمیکس اور اتاترک کی دو دو اور چیپلین، پہلوان ہیمت کیپلان، گاندھی، موزارٹ اور گریٹا گاربو کی ۱۲ نمبر تصاویر نکلیں جو میرے بھائی کے پاس نہیں تھیں۔ میرے پاس کل ۱۷۳ معروف ہستیوں کی تصاویر ہو چکی تھیں لیکن اب بھی مجھے سلسلہ مکمل کرنے کے لیے ستائیس تصاویر کی ضرورت تھی۔ میرے بھائی کے پاس مارشل فیوزی کیکمیکس کی چار، اتاترک کی پانچ اور ایڈیسن کی ایک تصویر تھی۔ ہم دونوں نے اپنے مُنھوں سے گوند اُتارا اور تصویروں کے عقب میں لکھی سُرخی پڑھنے لگے:

مارشل فیوزی کیکمک

ترکی کی جنگِ آزادی کا کمانڈنگ آفیسر

(۱۸۷۶-۱۹۵۰)

مامبو کینڈی اینڈ گم کمپنی

تمام معروف ہستیوں کی تصاویر جمع کرنے والے خُوش نصیب کو چمڑے کا ایک فٹ بال دیا جائے گا۔

میرے بھائی کے پاس جمع کی ہوئی ۱۶۵ تصاویر ڈھیر کی صُورت میں اُس کی مٹھی میں پکڑی ہوئی تھیں۔ ''آؤ 'اُوپر سے تیتنک' کھیلیں۔'' وہ بولا۔

''نہیں۔''

''میں تمھیں گریٹا گاربو کی ایک تصویر کے بدلے میں مارشل کیکمس کی بارہ تصاویر دوں گا۔'' اُس نے کہا۔ ''اِس طرح تمھارے پاس کل ۱۸۴ تصاویر ہو جائیں گی۔''

''لیکن تمھارے پاس گریٹا گاربو کی دو تصاویر ہیں۔''

''میں نے یہ بات نہیں کی۔''

''کل سکول میں جب ہمیں حفاظتی ٹیکے لگیں گے تو تمھیں بہت زیادہ تکلیف ہو گی۔'' وہ بولا۔ ''لہٰذا مجھ پر مت چلّاؤ، سمجھے؟''

''نہیں ہو گی۔''

رات کا کھانا خاموشی سے کھانے کے بعد ہم نے سپورٹس ورلڈ پروگرام سُنا تو ہمیں پتا چلا کہ

کھیل دو دو گول سے برابر رہا تھا۔ جب امّی ہمیں اپنے اپنے بستروں پر ڈالنے کے لیے ہمارے کمرے میں آئیں تو بھائی اپنا بستہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نشست گاہ کی طرف دوڑا۔ میرے والد باہر سڑک کی جانب تک رہے تھے۔

[''ابا جان، میں کل سکول نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے کہا۔

''اِس کی وجہ؟''

''ہمیں ٹیکے لگنے ہیں۔'' میں بولا۔ ''جس سے مجھے بخار چڑھ جائے گا اور میرے لیے سانس تک لینا دشوار ہو جائے گا۔ امّی کو یہ بات معلوم ہے۔''

اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا بس میری طرف دیکھتے رہے۔ میں دوڑتا ہوا گیا اور دراز سے کاغذ قلم نکال لایا۔

''تمھیں یقین ہے کہ تمھاری ماں کو یہ بات پتا ہے۔'' اُنھوں نے کاغذ کو کیر کےگاپر رکھتے ہوئے دریافت کیا جس کا وہ ہمیشہ مطالعہ کرتے تھے لیکن کبھی ختم نہیں کر پائے تھے۔ ''تم سکول جاؤ گے لیکن تمھیں ٹیکا نہیں لگایا جائے گا۔'' وہ بولے۔ ''میں یہی بات لکھ رہا ہوں۔''

اُنھوں نے رقعے پر دستخط کیے۔ میں نے روشنائی پر پھونک ماری، کاغذ تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ میں بھاگتا ہوا اپنے سونے کے کمرے میں گیا، رقعے کو بستے میں رکھا اور اپنے بستر پر اُچھلنے کودنے لگا۔

''تمیز اختیار کرو۔'' امّی نے کہا۔ ''اور اب سو جاؤ۔''

سکول میں ساری جماعت دو رَووں میں بٹ کر بدبودار قہوین کے عقب کی جانب ٹیکے لگوانے چل پڑی۔ ہم میں سے کچھ رو رہے تھے تو کچھ وقت سے پہلے ہی خوف کا شکار تھے۔ جب سانس کے راستے آئیوڈین کی مہک میرے اندر پہنچی تو میرے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں قطار سے نکل کر سب اُوپر والی سیڑھی پر کھڑی معلّمہ کی طرف گیا۔ جماعت میں افراتفری سی مچ گئی۔

میں نے جیب سے والد صاحب کا لکھا ہوا رقعہ نکالا اور معلّمہ کے حوالے کر دیا۔ اُس نے تیوریاں چڑھا کر اُسے پڑھا۔ ''لیکن تمھارے والد ڈاکٹر نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔ اُس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا اور پھر کہا۔ ''اُوپر چلے جاؤ اور ۲-الف میں انتظار کرو۔''

اُوپر ۲-الف میں میری ہی طرح کے چھے یا سات حیلہ ساز بچّے موجود تھے۔ ایک بچّہ سخت دہشت کے عالم میں کھڑکی سے باہر گھورے جا رہا تھا۔ باہر برآمدے میں مسلسل ہنگامہ اور شور برپا تھا۔ چشمے والا ایک موٹا بچہ سُورج مُکھی کے بیج چباتے ہوئے، کوواکی کارٹونوں والی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو گنجا مددگار اندر داخل ہوا۔

''تم میں سے جو واقعی بیمار ہیں اُنھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' وہ کہنے لگا۔ ''سزا صرف اُن کو ملے گی جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایک روز تم سب کو اپنے وطن کی حفاظت مل کر اس پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے بھی بلایا جائے گا۔ اگر تم میں سے اُنھوں نے آج حفاظتی ٹیکا لگوانے سے گریز کیا جن کے پاس معقول وجہ نہیں ہے تو تم غداری کے مرتکب ہو گے۔ شرم آنی چاہیے تمھیں!''

ہم چُپ رہے۔ اتاترک کی تصویر کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بعد میں ہم خاموشی سے اپنی اپنی جماعت کے کمروں میں چلے گئے۔ ٹیکے لگنے والوں کے مُنھ لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنی آستینیں تہہ کر کے اُوپر چڑھا رکھی تھیں تو کچھ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ ایک دُوسرے کو دھکّے اور کندھے مار رہے تھے۔

''تم میں سے جن کے گھر قریب ہیں وہ جا سکتے ہیں۔'' معلّمہ نے کہا۔ ''تم میں سے جن کو سہاروں کی ضرورت ہے وہ آخری گھنٹی ہونے تک یہیں انتظار کریں۔ ایک دُوسرے کے بازو پر اس طرح ضربیں مت لگاؤ! کل سکول بند ہو گا۔''

ہم خُوش ہو گئے۔ نچلی منزل کے مرکزی دروازے پر کچھ طالب علم دربان حلمی آفندی کو اپنی آستینیں اُوپر چڑھا چڑھا کر آئیوڈین کے نشان دِکھا رہے تھے۔

میں جیسے ہی سکول سے نکل کر سڑک پر پہنچا میں نے گھر کی سمت دوڑ لگا دی۔ ایک تانگے نے کارابیت قصاب کی دُکان کے سامنے کی روش بند کر رکھی تھی۔ میں حیاری کپڑے اور صالح پھولوں والے کی دُکانوں کے پاس سے بھاگتا ہوا نکلا۔ ہمارے دربان اعظم آفندی نے مجھے اندر جانے دیا۔

''تم اتنی جلد گھر کیسے آ گئے؟'' وہ بولا۔

''اُنھوں نے ہمیں ٹیکے لگائے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر سکول سے ہماری چھٹی کر دی۔''

''تمھارا بھائی کہاں ہے؟ کیا تم اکیلے آئے ہو؟''

''میں ریل کی پٹڑی پار کر کے آیا ہوں۔ کل سکول کی چھٹی ہے۔''

''تمھاری ماں گھر پر موجود نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم اپنی نانی کے ہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''میں بیمار ہوں۔'' میں بولا۔ ''میں اپنے ہی گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے جانے دو۔''

اُس نے دِیوار گیر کھونٹی سے چابی اُتاری اور ہم لفٹ میں سوار ہو گئے۔ لفٹ کے، اُوپری منزل پر پہنچنے تک لفٹ اُس کے سلگائے ہوئے سگریٹ کے دھویں سے بھر گئی، جس سے میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اُس نے مجھے اپارٹمنٹ میں چھوڑا۔

''روشنیوں سے چھیڑ چھاڑ مت کرنا۔'' وہ جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے

ہوئے بولا۔

اگرچہ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں نے پھر بھی پکارا۔ ''کوئی ہے گھر میں؟'' ''میں گھر پر ہوں، میں گھر پر ہوں! میں نے بستہ پھینکا، اپنے بھائی کی میز کا دراز کھولا اور فلم کی اُن ٹکٹوں کو دیکھنے لگا جو اُس نے ہمیشہ مجھ سے چھپائی تھیں۔ اِس کے بعد میں اپنی تراشے چپکانے والی کتاب میں منہمک ہوگیا جس میں مَیں نے فٹ بال کے کھیل کے اخباری تراشے چسپاں کر کے، اُن کے گرداگرد پنسل سے حاشیے لگا رکھے تھے۔ تبھی میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی۔ مجھے قدموں کی چاپ سے پتا چل گیا کہ وہ امّی نہیں ابا جان ہیں۔ میں نے احتیاط سے اپنے بھائی کی ٹکٹوں اور چپکے ہوئے اخباری تراشوں کی کتابوں کو دھیان سے رکھا تاکہ وہ یہ نہ دیکھ سکیں کہ میں نے اُن کی ترتیب خراب کر دی ہے۔

ابا جان اپنی خواب گاہ میں گئے، کپڑوں کی الماری کھولی اور اُس کے اندر دیکھنے لگے۔

''اوہ، تم گھر پر ہو؟''

''نہیں، میں پیرس میں ہوں۔'' میں نے اُسی انداز میں کہا جس میں ہم سکول میں کہتے تھے۔

''کیا تم آج سکول نہیں گئے؟''

''آج ٹیکے لگنے کا دِن تھا۔''

''تمھارا بھائی کہاں ہے؟ خیر، ٹھیک ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر ٹِک کر بیٹھو۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔''

میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ میں کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر باہر دیکھنے لگا۔ اُن کی کھٹ پٹ سے لگ رہا تھا کہ وہ نشست گاہ کی کپڑوں کی الماری سے سُوٹ کیس نکال رہے ہیں۔ وہ واپس اپنے کمرے میں گئے۔ اُنھوں نے الماری سے اپنی سپورٹس جیکٹ اور ٹراؤزر نکالا۔ مدہم آوازوں سے میں نے اُنھیں ہینگروں کی آوازوں کے طور پر شناخت کیا۔ اُنھوں نے اپنی قمیص اور جُرابیں رکھنے والے دراز کھولے۔ میں نے اُن تمام چیزوں کے سُوٹ کیس میں رکھنے کی آوازیں سُنیں۔ وہ غسل خانے میں گئے اور باہر نکلے۔ اُنھوں نے اپنا سُوٹ کیس بند کیا اور اُس کی کُنڈیاں پُوری احتیاط سے جڑیں۔ وہ میرے پاس کمرے میں آ گئے۔

''تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوں۔''

''اِدھر آؤ۔'' وہ بولے۔

اُنھوں نے اُٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھایا اور ہم باہر دیکھنے لگے۔ ہمارے اور دُوسری سمت کے اپارٹمنٹوں کے درمیان لگے سرو کے درختوں کے بلند سروں کے ہلکی ہلکی ہَوا سے جُھومنے سے پرے

کی عمارتیں چُھو لے لیتی لگ رہی تھیں۔ مجھے اپنے والد کے بدن کی خُوش بو اچھی لگ رہی تھی۔

''میں دُور جا رہا ہوں۔'' وہ بولے اور میرا بوسہ لیا۔ ''اپنی ماں کو کچھ مت بتانا۔ میں بعد میں خُود اُسے بتاؤں گا۔''

''ہوائی جہاز سے؟''

''ہاں۔'' وہ بولے۔ ''پیرس۔ کسی سے کوئی بات مت کرنا۔'' اُنھوں نے اڑھائی لیرا کا بڑا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔ ''اِس کا کسی سے بالکل بھی ذکر مت کرنا۔'' اُنھوں نے اضافہ کیا اور دوبارہ میرا بوسہ لیا۔ ''اور یہ بھی کہ میں گھر آیا تھا......''

میں نے پیسے فوراً جیب میں ڈال لیے۔ جب اُنھوں نے مجھے اپنی گود سے اُتار کر اپنا سُوٹ کیس اُٹھایا تو میں نے کہا۔ ''نہ جائیں، ابا جان۔''

اُنھوں نے ایک بار پھر میرا بوسہ لیا اور چلے گئے۔

میں اُنھیں کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اللّٰہ دین کی دُکان کی طرف جا رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے پاس سے گُزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی میں جھک کر بیٹھنے سے پہلے اُنھوں نے مُڑ کر اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا اور میری سمت ہاتھ ہلا دیا۔ میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا اور وہ چلے گئے۔

میں خالی سڑک تکتا رہا۔ پھر وہاں سے ایک بندہ اور پھر ماشکی اپنے پانی ڈھونے والے گھوڑے کو کھینچتا ہوا گُزرا۔ میں نے گھنٹی بجا کر اعظم کو بُلایا۔

''کیا گھنٹی تم نے بجائی تھی؟'' اُس نے آکر پُوچھا۔ ''گھنٹی سے مت کھیلو۔''

''یہ اڑھائی لیرے لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اللّٰہ دین کی دُکان پر جاؤ اور میرے لیے فرنچ مین ببل گَم لے کر آؤ۔ اور ہاں، پچاس کروس کی بھان لانا مت بُھولنا۔''

''کیا یہ پیسے تُمھارے والد نے تمھیں دیے ہیں؟'' اُس نے دریافت کیا۔ ''تمھاری ماں ناراض تو نہیں ہوگی یا ہوگی؟''

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں کھڑکی سے اُسے دُکان پر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ چند منٹ بعد پلٹا تو اُسے راستے میں پار کے اپارٹمنٹ کا دربان مل گیا۔ وہ دونوں آپس میں گپیں ہانکنے لگے۔

واپس آکر اُس نے مجھے بھان دی۔ میں نے گَم کھولی: مارشل فیوزی کیکمیکس کی تین، اتا ترک کی ایک اور لینڈبرگ، لیونارڈو دا ونچی، سلطان سلیمان، چرچل کی ایک ایک اور نمبر ۲۱ والی گریٹا گاربو کی ایک اَور تصویر نکلی جو میرے بھائی کے پاس نہیں تھی۔ اب میرے پاس کل ۱۸۳ تصاویر ہوگئی تھیں۔ لیکن اب بھی سلسلہ مکمل کرنے کے لیے میرے پاس ۲۶ تصاویر کم تھیں۔

مجھے پہلی بار لنڈبرگ کا ۹۱ نمبر والا فوٹو اچھا لگا تھا، جو اُس جہاز کے سامنے کھینچا گیا تھا جس پر

اُس نے اٹلانٹک پار کیا تھا۔ میں نے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ امّی! میں نے جلدی سے گم پر سے اُتار کر گرائے ہوئے کاغذوں کو اُٹھا کر دُور پھینک دیا۔

''ہمیں ٹیکے لگ گئے ہیں۔ میں ذرا جلد گھر آ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کو پتا ہے معیادی بخار، چیچک اور خسرے کے ٹیکے لگے ہیں۔''

''تمھارا بھائی کہاں ہے؟''

''اُس کی جماعت کو ابھی تک ٹیکے نہیں لگے۔'' میں نے کہا۔ ''انھوں نے ہمیں گھر بھیج دیا۔ میں تو خود قطار سے آگے نکل گیا تھا۔''

''کیا درد ہو رہا ہے؟''

میں کچھ نہیں بولا۔

جلد ہی بھائی بھی گھر آ گیا۔ اُسے درد ہو رہا تھا اور وہ تیوریاں چڑھا کر بستر پر دائیں کروٹ یُوں لیٹ گیا جیسے سو رہا ہو۔ جب وہ اُٹھا تو اندھیرا قریب قریب چھا چکا تھا۔ ''ماں، واقعی بہت درد ہو رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''تمھیں رات تک بخار چڑھ جائے گا۔'' ماں نے کپڑے استری کرتے ہوئے نشست گاہ سے جواب دیا۔ ''علی، کیا تمھیں بھی درد ہو رہا ہے۔ ساکت ہو کر پڑ جاؤ۔''

ہم آرام سے بے حرکت لیٹ گئے۔ قیلولے کے بعد بھائی اُٹھ کھڑا ہوا اور اخبار سے کھیلوں والا صفحہ پڑھتے ہوئے مجھے بتانے لگا کہ میری وجہ سے ہم کل چار گول ہوتے نہیں دیکھ سکے۔

''اگر ہم وہاں سے نہ آتے تو شاید وہ ایک بھی گول نہ کر پاتے۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

ایک بار پھر نیند لینے کے بعد بھائی نے اتاترک کی چار اور تین دیگر لوگوں کی تصاویر کے بدلے مجھے مارشل فیوزی ٹیکمیکس کی چھ تصاویر کی پیش کش کی۔ میرے پاس گریٹا گاربو کی ایک تصویر پہلے سے موجود تھی۔

میں نے انکار کر دیا۔

''اُوپر یا نیچے کھیلو گے؟'' میرے انکار پر اُس نے پُوچھا۔

''ٹھیک ہے، کھیل لیتے ہیں۔''

کھیل کچھ یُوں تھا کہ آپ معروف ہستیوں کی تصاویر کی ایک گڈی کو اپنی مُٹھی میں بند کر لیتے اور پُوچھتے۔ ''اُوپر یا نیچے؟'' اگر مقابل کہتا۔ ''نیچے۔'' تو گڈی سے سب سے نچلی تصویر نکالی جاتی۔ فرض کیا کہ مثلاً سب سے نچلی تصویر ۸۷ نمبر، ریٹا ہے ورتھ، نکلتی ہے اور سب سے اُوپر والی تصویر ۱۸ نمبر،

دانتے، ہوتی ہے۔ اِس طرح سب سے نچلی تصویر کا نمبر بڑا ہونے کی وجہ سے مقابل جیت جائے گا اور آپ کو اُسے وہ تصویر دینا پڑتی جو آپ کو سب سے کم پسند ہوتی۔ کھیل کے دوران میں ہمارے درمیان مارشل فیوزی کیلمیکس کی تصاویر کا تبادلہ رات تک چلتا رہا۔ رات کے کھانے کے وقت ماں بولی۔ ''تم میں سے کوئی ایک چھت پر جا کر دیکھے، شاید تمھارے ابا گھر آ رہے ہوں۔''

ہم دونوں اُوپر چلے گئے۔ میرے والد نہیں آ رہے تھے۔ میرے چچا تمبا کو نوشی کر رہے تھے ہم ریڈیو پر خبریں سنتے اور اخبار سے کھیلوں کا صفحہ پڑھنے لگے۔ جب دادی اور چچا رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو ہم نچلی منزل پر لوٹ آئے۔

''تم لوگ کہاں تھے؟'' اَمی نے پُوچھا۔ ''تم نے اُوپر کچھ کھایا ہے یا نہیں؟ بہتر ہے کہ اب تمھیں دال کا شوربہ دے دوں تاکہ تم اپنے ابا کے آنے تک تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو۔''

''توس نہیں ہے؟'' بھائی نے پُوچھا۔

ہمارے چُپ چاپ شوربہ کھانے کے دوران میں ماں ہمیں دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے کان لفٹ کی آواز کی سمت اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ وہ ہم سے نظریں ہٹائے بغیر ہی اپنا سر گھما لیتی تھیں۔ جب ہم ختم کر چکے تو اُنھوں نے پیالے دیکھ کر پُوچھا۔ ''اَور چاہیے؟'' مجھے ٹھنڈ بڑھ جانے سے پہلے پہلے اَور چاہیے تھا لیکن وہ کھڑکی کے پاس جا کر نشانتاشی چوک پر نظر ڈالتے ہوئے خاموشی سے نیچے گھورنے لگیں۔ وہ میز کی طرف پلٹیں اور اپنا شوربہ کھانے لگیں۔ میں اور بھائی گزرے ہوئے کل کے کھیل کے بارے میں باتیں کرنے لگے کہ وہ اچانک بولیں۔ ''شش، کیا لفٹ میں کوئی ہے؟''

ہم غور سے سننے لگے۔ لفٹ میں کوئی نہیں تھا۔ ایک ریل گاڑی گزری تو میز اور جگ میں موجود پانی ہولے ہولے مرتعش ہونے لگے۔ جب ہم اپنے سنگترے کھا رہے تھے تو ہم نے واقعی لفٹ کی آواز سنی جو ہمارے قریب آتے آتے ہمارے پاس سے گزر کر بالائی منزل کو چلی گئی۔ ''وہ اُوپر چلی گئی ہے۔'' اَمی بولیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بولیں۔ ''اپنی اپنی رکابیاں باورچی خانے میں رکھ آؤ لیکن اپنے ابا کی رکابی پڑی رہنے دینا۔'' ہم نے میز صاف کی۔ ہمارے ابا کی خالی رکابی میز پر دھری رہی۔

اَمی پولیس سٹیشن والی کھڑکی کی طرف گئیں اور باہر تکنے لگیں۔ اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر اُنھوں نے میرے والد کی رکابی، چاقو، کانٹا اور چمچ سمیٹا اور باورچی خانے میں لے گئیں۔ اُنھوں نے برتن نہیں دھوئے۔ ''میں اُوپر تمھاری دادی کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ بولیں۔ ''آپس میں لڑنا مت۔''

بھائی اور میں نے ''اُوپر اور نیچے'' کا دور شروع کر دیا۔

''اُوپر۔'' میں پرے دیکھتے ہوئے بولا۔

اُس نے اپنی گڈی میں سے مجھے سب سے اُوپر والی تصویر دِکھائی۔ ''دُنیا کا معروف ترین پہلوان 'یوسف حسن' نمبر۳۴۔'' وہ بولا۔ پھر اُس نے گڈی کی تہہ کو دیکھا۔ ''اتاترک، نمبر ۵۰۔'' اُس نے کہا۔ ''تم ہار گئے۔ اب مجھے تصویر دو۔''

ہم جتنی دیر کھیلتے رہے وہ جیتتا رہا۔ جلد ہی اُس نے مجھ سے ۱۹ نمبر والا مارشل فیوزی کیکمیکس اور اتاترک کی دو تصویریں جیت لیں۔

''میں کھیل چھوڑتا ہوں۔'' میں نے ناراضی سے کہا۔ ''میں اُوپر اُمی کے پاس جا رہا ہوں۔''

''وہ پاگل ہو جائیں گی۔''

''تم یہاں اکیلے رہنے سے خوف کھا رہے ہو، چوزے!''

ہمیشہ کی طرح دادی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ رات کا کھانا ختم کر چکے تھے۔ باورچن بیکر (Bekir) برتن دھو رہی تھی۔ دادی اور چچا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُمی کھڑکی سے لگ کر کھڑی نشاتاشی چوک کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

''اِدھر آؤ۔'' وہ اپنی نظریں کھڑکی سے ہٹائے بغیر بولیں۔ میں تیزی سے کھڑکی اور اُمی کے درمیان خالی جگہ میں گھس گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جگہ خاص طور پر میرے ہی لیے خالی رکھی گئی ہے۔ میں نے اپنا جسم اُن کے بدن سے چپکایا تو مجھے اچھا لگا۔ میں بھی باہر نشاتاشی چوک کو تکنے لگا۔ اُمی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگیں۔

''مجھے پتا ہے کہ تمھارے ابا گھر آئے تھے اور تم نے اُنھیں کمرے میں دیکھا تھا۔'' اُنھوں نے سرگوشی کی۔

''جی۔''

''میرے پیارے بیٹے، کیا اُنھوں نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اُنھوں نے مجھے اڑھائی لیرے کا نوٹ دیا تھا۔''

ہمارے نیچے سڑک پر دُکانوں کے اندھیرے ٹھڑے، کاروں کی بتیاں، اپنی معمول کی جگہ سے ٹریفک پولیس والے کی غیر موجودگی، بھیگے ہوئے سنگریزے، درختوں سے لٹکے ہوئے اشتہاری کاغذ؛ سب کے سب تنہا اور اُداس لگ رہے تھے۔ بارش شروع ہوئی تب بھی اُمی میرے بالوں میں دِھیرے دِھیرے اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ چچا اور دادی کے درمیان رکھا سدا چلتے رہنے والا ریڈیو بند پڑا تھا۔ جس سے میں خوف زدہ ہو گیا۔

''میری پیاری بیٹی، وہاں مت کھڑی رہو۔'' کچھ دیر بعد دادی بولیں۔ ''براہِ مہربانی، یہاں

آ کر بیٹھ جاؤ۔"

اِسی دوران میں بھائی بھی اُوپر آ چکا تھا۔

"تم دونوں باورچی خانے میں جاؤ۔" چچا نے کہا۔ "بیکر۔" وہ پُکارے۔ "اِنھیں گیند بنا دو تا کہ یہ بڑے کمرے میں فٹ بال کھیل لیں۔"

بیکر باورچی خانے میں برتن دھو چکی تھی۔ "بیٹھو۔" وہ بولی۔ وہ دادی کے کمرے کی ڈیوڑھی کے چھوٹے چھوٹے شیشوں سے اُتارے ہوئے اخباروں کو توڑ مروڑ کر گیند بنانے لگی۔ "کیسی ہے؟" جب گیند اُس کی مٹھی جتنی بڑی بن گئی تو اُس نے پُوچھا۔

"تھوڑی سی اَور بڑی۔" بھائی بولا۔

بیکر نے گولے کے گرد اخبار کے چند اَور ٹکڑے لپیٹ کر اُسے موٹا کر دیا۔ اگرچہ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا لیکن میں نے دیکھ ہی لیا کہ امّی؛ دادی اور چچا کے پاس بیٹھی تھیں۔ بیکر نے دراز سے رَسّی لے کر اخباری گیند کے گرد اُسے مضبوطی سے لپیٹ کر اُسے بالکل گول کر دیا اور پھر گانٹھ باندھ دی۔ اخبار کے نکلے ہوئے کونوں کو ٹھیک طور پر بٹھانے کے لیے اُس نے گیند پر گیلا کپڑا پھیر دیا۔ بے اختیار ہو کر بھائی نے اُسے جھپٹ لیا۔

"اوئے لڑکے، یہ تو پتھر کی طرح سخت ہے۔"

"اپنی اُنگلی یہاں رکھو۔" بیکر نے کہا۔

بھائی نے اُنگلی اُس جگہ رکھی جہاں رَسّی باندھی گئی تھی تو بیکر نے آخری گانٹھ باندھ کر گیند مکمل کر دی۔ بھائی نے اُسے ہَوا میں اُچھالا اور ہم اُسے ٹھوکریں مارنے لگے۔

"باہر ڈیوڑھی میں جاؤ۔" بیکر بولی۔ "تم یہاں ہر چیز توڑ ڈالو گے۔"

ہم بہت دیر تک جوش و خروش سے کھیلتے رہے۔ میں نے خُود کو فینر باہسے (Fenerbahce) کا بائیں طرف کھیلنے والا کھلاڑی تصوّر کیا اور یہ کہ اُسی کے مانند اپنے ہر مخالف کو ڈاج کر سکتا ہوں۔ دِیوار کے قریب سے گیند کو ٹھوکر مارتے ہوئے میں اپنے بھائی کے دُکھتے ہوئے بازو سے ٹکرا بیٹھا۔ اُس نے بھی میرے ایک لگائی لیکن مجھے ذرا بھی درد محسوس نہیں ہوا۔ ہم پسینے میں شرابور تھے اور گیند بکھرنے لگی تھی۔ جب میں اُس کے بازو پر گرا تو میں نے اُسے تین چار رجڑ بھی دیں۔ وہ زمین پر گر کر چلّانے لگا۔ "جب یہ ٹھیک ہو جائے گا تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔" وہ اپنی جگہ پر پڑے پڑے بولا۔

میں نشست گاہ میں غوطہ لگا گیا۔ دادی، امّی اور چچا اپنی ہی سوچوں میں مستغرق تھے۔ دادی فون کی طرف گئیں اور کوئی نمبر گھمانے لگیں۔

''ہیلو پیارے۔'' اُنھوں نے وہی مدہم لہجہ اپنایا جو وہ میری ماں کو 'میری پیاری بیٹی' کہتے ہوئے اپنایا کرتی تھیں۔ ''کیا یہ بشلکو ئے ایئرپورٹ ٹرمینل ہے؟ ہاں جناب، ہم ایک مسافر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو آج ہی کسی جہاز سے یورپ گیا ہے۔'' اُنھوں نے میرے والد کا نام بتایا اور ٹیلی فون کی تار کو اپنی اُنگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے انتظار کرنے لگیں۔ ''جا کر میرے لیے سگریٹ لاؤ۔'' اُنھوں نے میرے چچا سے کہا۔ جب وہ کمرے سے چلے گئے تو دادی نے ریسیور کو اپنے کان سے ذرا سا ہٹا لیا۔

''میری پیاری بیٹی، براہِ مہربانی۔'' وہ امّی سے بولیں۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ کسی اَور عورت کا معاملہ ہے؟''

میں اپنی ماں کا جواب سن نہیں پایا۔ دادی نے اُس بارے میں یہی سمجھا جیسے اُنھوں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔ فون کی دُوسری طرف والے شخص نے کچھ کہا تو دادی نے طیش بھرے لہجے میں چچا سے، جو اپنے ہاتھ میں سگریٹ اور رَاکھ دانی پکڑے لوٹ آئے تھے، کہا۔ ''وہ مجھے جواب نہیں دے رہے ہیں۔''

چچا کے چہرے کے تاثرات سے امّی میری موجودگی سے آگاہ ہو کر چوکنا ہو گئیں۔ اُنھوں نے مجھے بازو سے پکڑا اَور کھینچتی ہوئی بڑے کمرے میں لے گئیں۔ اُن کا ہاتھ میری گدی تک پھیلا ہوا تھا کہ وہ یہ تک محسوس کر سکتی تھیں کہ میں پسینے میں کتنا بھیگا ہوا ہوں لیکن وہ مجھے سردی لگ جانے کے اندیشے سے بھی لاپروا لگ رہی تھیں۔

''امّی، میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔'' بھائی بولا۔

''اب ہم نیچے جائیں گے اور میں تمھیں بستر پر لٹا دوں گی۔''

ہم تینوں خاموشی سے اپنی زمینی منزل پر آئے۔ بستر پر جانے سے قبل میں اپنے پاجامے ہی میں باورچی خانے میں جا کر پانی پینے کے بعد نشست گاہ کی طرف چلا گیا۔ امّی کھڑکی کے سامنے کھڑی تمباکو نوشی کر رہی تھیں۔

''ننگے پاؤں پھرنے سے تمھیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' وہ میرے قدموں کی چاپ سُن کر بولیں۔ ''کیا تمھارا بھائی سو گیا؟''

''جی امّی، وہ سو گیا ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' میں اپنے جسم کو امّی اور کھڑکی کے بیچ لانا چاہتا تھا۔ جب امّی نے میرے لیے مناسب جگہ بنا دی تو میں اُس میں گھس گیا۔ ''ابّا جان پیرس گئے ہیں۔'' میں بولا۔ ''اور کیا آپ کو پتا ہے کہ وہ کون سا سُوٹ کیس لے کر گئے ہیں؟''

وہ کچھ نہیں بولیں۔ رات کے سکوت میں ہم سڑک پر برستی بارش دیکھتے رہے۔

میری نانی کا گھر شِشلی مسجد کے عین مقابل برقی ریل گاڑی کے آخری سٹیشن کے احاطے کے سامنے واقع تھا۔ آج کل تو شِشلی چوک پر؛ بڑی اور چھوٹی لاریوں کے اڈّوں، فحش بورڈوں سے

ڈھلمی اپارٹمنٹوں کی کئی منزلہ عمارتوں، دفاتر سے اَٹی بدنما لمبی لمبی عمارتوں اور سینڈوچ لے جانے والے فوجیوں کے جتھوں، جو کھانے پینے کی اشیاپر چیونٹیوں کے غولوں کے مانند روِشوں پر اُمڈ آتے ہیں، افراتفری کا سماں رہتا ہے۔ اُس زمانے میں وہ چوک کھلا ڈھلا پُرسکون اور صاف ستھرا ہوا کرتا تھا، جس سے ہمارے گھر کا پیدل راستہ پندرہ منٹ کا تھا۔ تُوت اور لیموں کے درختوں تلے اپنی ماں کا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے لگتا تھا جیسے ہم شہر کے آخری سرے پر آ گئے ہوں۔

نانی کا پتھروں سے بنا ہوئے چار منزلہ گھر، جس کی شکل ماچس کی ڈبیا جیسی تھی، غرب میں استنبول کے پُرانے شہر کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اُس کی شرقی سمت میں تُوت کے باغات اور باسفورس سے پرے ایشیا کی پہلی پہاڑیاں تھیں۔ اپنے خاوند کے چل بسنے اور تینوں بیٹیوں کی شادی کے بعد نانی گھر کے صرف ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ گھر زمینی منزل سے آخری منزل تک میزوں، الماریوں، لاتعداد پیانوؤں اور ٹُوٹے پُھوٹے فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ میری ایک خالہ؛ امّی کی بڑی بہن، اُن کا کھانا تیار کر کے اپنے گھر سے خُود لاتیں یا پھر ٹفن میں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔ نانی دُوسرے کمروں میں بالکل نہیں جاتی تھیں، جو دھول کی گہری تہوں اور مکڑی کے ریشمی جالوں سے اَٹے پڑے تھے۔ وہ اُن کی صفائی ستھرائی کی زحمت اُٹھانے کی کوشش تو نہیں کرتی تھیں البتہ اگر اُنھیں اپنے لیے بالائی منزل سے زمینی منزل تک کھانا لینے دوبارہ بھی جانا پڑتا تو وہ بلا سہارا بھی چلی جاتیں۔ اپنی ماں ہی کی طرح، جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری برس لکڑی سے بنی ہوئی ایک وسیع وعریض حویلی میں تنہا بسر کی تھی، نانی بھی کسی دیکھ بھال کرنے یا گھر کا خیال رکھنے والی کو اجازت دیتیں نہ ہی کوئی خادمہ تنہائی کے دورے کے دوران میں اُن کے ہاتھوں پٹنے کے بعد دوبارہ کبھی اُس گھر میں داخل ہوتی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو امّی نے دیر تک گھنٹی بجائی اور دروازے کو خُوب زور زور سے پیٹا۔ بالآخر نانی نے دُوسری منزل کی مسجد کے سامنے والی زنگ آلود کھڑکی کے پَٹ کھول کر نیچے ہماری طرف گھور کر دیکھا۔ چوں کہ اُن کی کم بصارت اُن کے لیے ناقابلِ اعتبار تھی اس لیے اُنھوں نے ہمیں پُکارنے اور اپنے ہاتھ ہلانے کے لیے کہا۔

''لڑکو، دروازے سے دُور ہٹ جاؤ تاکہ تمھاری نانی تمھیں دیکھ لیں۔'' امّی نے کہا۔ وہ بھی بلند آواز میں پُکارتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئیں، ہمارے ساتھ روِش کے وسط میں آ گئیں۔ ''ماں، یہ میں اور لڑکے ہیں۔ کیا آپ ہماری آواز سُن رہی ہیں؟''

اُن کی نرم مُسکراہٹ بھرے دمکتے چہرے سے ہمیں پتا چل گیا کہ اُنھوں نے ہمیں دیکھا اور پہچان لیا ہے۔ وہ جلدی سے واپس اندر اپنے کمرے میں گئیں، بڑی سی چابی نکالی جسے وہ ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھتی تھیں، اُسے اخبار میں لپیٹا اور کھڑکی سے باہر ہماری طرف پھینک دیا۔ میں اور میری ماں

اُسے فضا ہی میں تھام لینے کی کوشش میں آپس میں ٹکرا گئے۔

چوں کہ بھائی کا بازو درد کر رہا تھا اس لیے اُس نے چابی پکڑنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ میں بھاگ کر روش کی طرف گیا اور اُسے اُٹھا کر امّی کو لا دیا۔ اُنھوں نے اُسے نہایت تنگ وزو سے تالے کے سوراخ میں داخل کیا۔ ہم سب نے مل کر بڑے دروازے پر اپنا زور ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اندر اندھیرے کے ساتھ ساتھ کافی عرصے سے بند اور گھٹنے ہونے کی ناگوار بُو کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایسی بدبُو جس سے میرا پہلے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ دروازے کے ساتھ دھرے کوٹ سٹینڈ پر نانا کا پشم دار کالر والا کوٹ ٹنگا تھا، لگتا تھا جیسے نانی نے اُسے چوروں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے وہاں لٹکا رکھا ہے، اور اُس کی ایک سمت اُن کے بُوٹ بھی پڑے تھے جن سے مجھے ہمیشہ خوف آتا تھا۔

ہم نے دُور ہی سے اپنی نانی کو اندھیرے میں ڈوبی چوبی سیڑھی کے بالائی قد مچے پر کھڑے دیکھا جو سیدھی دو منزل اُوپر تک جاتی تھی۔ نقش ونگار والے دُھندلے شیشوں سے چھنتی روشنی میں وہ ہاتھ میں چھڑی تھامے ساکت وصامت کھڑی سایوں کا بھوت لگ رہی تھیں۔

چرچراتی ہوئی سیڑھی سے اُوپر چڑھتے ہوئے اُنھوں نے اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی۔ [''کیسی ہو، پیاری امّی؟'' وہ ہر آمد کے دیگر موقعوں پر کہتی تھیں۔ ''میں نے آپ کی کمی بہت محسوس کی، پیاری امّی۔'' ''موسم کافی سرد ہے، پیاری امّی!'']۔ سیڑھی کے بالائی قد مچے پر میں نے نانی کے ہاتھ کا بوسہ لے کر اُسے اپنی پیشانی پر رکھا جو ہم تب کرتے تھے جب ہمیں اُن کی یا اُن کی کلائی پر اُبھرے ہوئے بڑے سے مَسّے کو دیکھنے سے گریز کرنا ہوتا تھا۔ ایک بار پھر ہم اُن کے مُنہ میں بچ جانے والا واحد دانت، لمبی سی ٹھوڑی اور چہرے پر بال دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اُن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم اپنی ماں کے دائیں بائیں چپک کر بیٹھ گئے۔ نانی اپنی شب باشی کی لمبی سی عبا اور موٹی اُونی صدری میں اپنے بستر پر چڑھ گئیں جہاں وہ دِن کو بیشتر وقت گزارتی تھیں۔ ہماری سمت مُسکراتے ہوئے ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں جو کہہ رہی تھیں۔ ''ہاں تو اب میرا دِل بہلاؤ!''

''ماں، آپ کا چُولھا ٹھیک کام نہیں کر رہا۔'' امّی بولیں۔ اُنھوں نے چمٹا اُٹھا کر چُولھے میں لکڑیاں دھریں۔

نانی کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد بولیں۔ ''اِسے چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا خبریں ہیں؟ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں۔''

''کیا تمھارے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے؟''

ہمارے کچھ دیر خاموش رہنے پر نانی نے پُوچھا۔ ''کیا تم نے کسی کو نہیں دیکھا؟''

''نہیں ماں، کسی کو نہیں۔'' امّی نے کہا۔
''اللّٰہ کے واسطے! کیا واقعی کوئی خبر نہیں ہے؟''
وقفہ چھا گیا۔
''نانی اماں۔'' میں بولا۔ ''ہمیں ٹیکے لگے ہیں۔''
''تمھیں؟'' نانی نے اپنی نیلی آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''درد ہوا تھا؟''
''میرا بازو سُوجا ہوا ہے۔'' بھائی نے کہا۔
''اوہ، میرے خُدایا!'' نانی مُسکراتے ہوئے بولیں۔
ایک بار پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ میں اور بھائی اُٹھ کر کھڑکی سے باہر دُور پہاڑ کی چوٹیوں، تُوت کے درختوں اور عقبی صحن میں مُرغیوں کا خالی ڈربہ دیکھنے لگے۔
''مجھے سُنانے کے لیے تمھارے پاس کوئی کہانی نہیں ہے؟'' نانی نے تحیّر بھرے لہجے میں پُوچھا۔ ''تم اپنی ساس کے ہاں بالائی منزل پر جاتی ہو۔ کیا وہاں کوئی نہیں آتا جاتا؟''
''کل سہ پہر دِل رُبا خاتون آئی تھی۔'' امّی نے بتایا۔ ''وہ بچّوں کی دادی کے ساتھ بِزیک[1] کھیلتی رہی۔''
اِس پر نانی مسرور ہو کر بولیں کہ کیا ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا کہتی ہے۔ ''وہ کہتی ہے کہ وہ محل میں پلی بڑھی ہے!''
بے شک ہم محل سے اُس کی مُراد سمجھ گئے تھے یعنی دولماباہچے (Dolmabahce) محل نہ کہ مغرب کے محلوں جیسا کوئی رنگا رنگ محل، جن کے بارے میں، مَیں نے برسوں پہلے کہانیوں کی کتابوں اور اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں بہت عرصے بعد نانی کی اِس بات میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھ پایا کہ دِل رُبا خاتون ایک کیریے *(cariye)* تھی، سلطان کے حرم کی ایک کنیز، جس نے اپنی جوانی حرم میں گزاری اور بعد میں ایک کاروباری شخص سے شادی کر لی تھی۔ اُن کا منشا نہ صرف دِل رُبا خاتون بلکہ میری دادی کی بھی توہین کرنا تھا جو دِل رُبا خاتون کی سہیلی تھیں۔ اِس کے بعد وہ اپنی باہمی دلچسپی کے موضوع پر گفتگو کرنے لگیں جو ہمارے ننھیال آنے پر ہر بار زیرِ بحث آتا تھا: بیوگلو (Beyoglu) ضلع میں عبداللّٰہ آفندی کے معروف اور مہنگے ترین ریستوران میں ہفتے میں ایک بار میری دادی تن تنہا دوپہر کا کھانا کھانے جاتیں اور لوٹ کر اُنھوں نے وہاں جو خوان کھائے ہوتے اُن سب میں کیڑے نکالتی تھیں۔ تیسرا باقاعدہ موضوع نانی کے اچانک سوال نے پیدا کر دیا۔ ''لڑکو، کیا تمھاری دادی تمھیں کھانے کو انجیر[2] دیتی ہیں؟''
ہم سے پہلے ہی ہماری ماں بول اُٹھیں اور جو اُنھوں نے کہا ہم نے بھی بہ یک زبان وہی دُہرا

دیا۔ ''نہیں، نانی اماں۔ وہ نہیں دیتی ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح نانی نے بتایا کہ کیسے اُنھوں نے ایک باغ میں ایک بلی کو اَمرود پر پیشاب کرتے دیکھا تھا اور پھر اضافہ کیا کہ غالباً وہی اَمرود بعد میں بنا دھوئے کسی کھانے میں شامل کر کے کھلا دیا گیا ہوگا۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ اُنھوں نے نشانتاشی اور شِشلی کے سبزی فروشوں سے، جو اَب بھی اَمرود فروخت کر رہے تھے، جھگڑا کیا تھا اور اُنھیں رضامند کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ چیز فروخت کرنا بند کر دیں۔

''ماں۔'' امّی بولیں۔ ''لڑکے بے چین ہیں۔ یہ کھل کر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ کیوں نہ میں اُنھیں بڑے کمرے کے پار والے کمرے کا تالا کھول دوں؟''

گھر کو چوروں کے گھس آنے سے بچانے کے لیے نانی ہر دروازے کو تالا لگا کر رکھتی تھیں۔ امّی نے بڑا سا سرد کمرہ کھولا جو ریل کی پٹڑیوں کا سا دِکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم سب کھڑے سفید کپڑوں سے ڈھکی ہاتھ کرسیوں اور دیوانوں، دُھول سے اَٹے زنگ آلود لیمپوں، زرد پڑے اخباروں کے ڈھیروں اور ایک کونے میں لڑکی کی آڑی کھڑی اکیلی سائیکل کے ہینڈل کی مڑی ہوئی سلاخیں اور پھٹی ہوئی گدی دیکھتے رہے۔ لیکن اِس بار اُنھوں نے دراز کھول کھول کر ہمیں اُس مسرت سے کوئی شے نکال کر نہیں دِکھائی جیسا وہ اپنی اچھی صحت کے ایام میں کیا کرتی تھیں۔ (''جب یہ میری ننھی سی پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی تب تمھاری ماں یہ چپلیں پہنا کرتی تھی۔'' ''دیکھو، یہ تمھاری خالہ کے سکول کی فراکیں ہیں!'' ''کیا تم اپنی ماں کا اُس وقت کا وہ چھوٹا سا غلک دیکھنا چاہو گے جب یہ میری ننھی سی پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی۔'')

''اگر زیادہ ٹھنڈ ہو جائے تو دُوسرے کمرے میں واپس چلے آنا۔'' اُنھوں نے جاتے ہوئے کہا۔

میں اور بھائی دوڑے دوڑے کھڑکی کی سمت گئے اور باہر سڑک کے پار والی مسجد اور چوک میں برقی ریل گاڑی کے ویران پڑے اسٹاپ کو دیکھنے لگے۔ پھر ہم نے اخباروں سے فٹ بال کے پُرانے کھیلوں کے احوال پڑھے۔ ''میں بیزار ہو گیا ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ ''کیا تم اُوپر یا نیچے کھیلنا چاہو گے؟''

''تمھارا دوبارہ ہارنے کا ارادہ ہے؟'' بھائی اخبار سے سر اُٹھائے بغیر بولا۔ ''میں اِس وقت پڑھ رہا ہوں۔''

گزشتہ شب کے کھیل کے بعد ہم صبح دوبارہ کھیلے اور بھائی مجھے لگاتار ہراتا رہا۔

''براہ مہربانی۔''

''ایک شرط پر۔ اگر میں جیتوں تو تم مجھے دو تصویریں دو گے اور تم جیتتے ہو تو میں تمھیں ایک تصویر دوں گا۔''

''نہیں۔''

''تو میں نہیں کھیل رہا۔'' بھائی بولا۔''تم دیکھ رہے ہو کہ میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔''

اُس نے بناوٹی انداز میں اخبار کو اُس سیاہ وسفید فلمی جاسوس کے انداز میں تھام لیا جو ہم نے حال ہی میں آنجمل تھیٹر میں دیکھی تھی۔ کچھ دیر کھڑکی سے باہر تکتے رہنے کے بعد میں نے بھائی کے وضع کردہ قواعد وضوابط کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اپنی اپنی جیبوں سے گڈیاں نکالیں اور کھیلنے بیٹھ گئے۔ آغاز میں مَیں جیتتا رہا لیکن پھر میں یکے بعد دیگرے سترہ تصویریں ہار بیٹھا۔

''میں ہمیشہ یُوں ہی ہارتا ہوں۔'' میں نے کہا۔''اگر ہم پہلے والی شرائط پر نہیں کھیلتے تو میں کھیل چھوڑ رہا ہوں۔''

بھائی نے جاسوس کی نقالی کرتے ہوئے کہا۔''میں بھی اخبار پڑھنے لگا ہوں۔''

میں کھڑکی کے پاس گیا اور احتیاط سے اپنی تصاویر شمار کرنے لگا۔ میرے پاس ۱۲۱ بچی تھیں۔ کل، ابا جان کے جانے کے بعد، وہ ۱۸۳ تھیں! میں خود کو اِتنا اُکتایا ہوا کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ میں نے اُس کی شرائط مان لیں۔

مَیں نے شروع میں چند تصاویر جیتیں، پھر وہ مجھے ہرانے لگا۔ اپنے ڈھیر میں مجھ سے جیتی ہوئی تصاویر شامل کرتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو مُسکرانے سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ مبادا میں مشتعل نہ ہو جاؤں۔

''اگر تم چاہو تو ہم دُوسرے قواعد پر بھی کھیل سکتے ہیں۔'' وہ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔''جو بھی جیتے گا اُسے ایک ہی تصویر ملے گی۔ اگر میں جیتوں گا تو اپنی مرضی کی تصویر لوں گا کیوں کہ میرے پاس کچھ ایسی تصاویر نہیں ہیں جو تمھارے پاس ہیں اور تم اُنھیں کسی طور دینے کے لیے تیار نہیں۔''

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شروع میں تو میں ہی جیتوں گا اِس شرط کو تسلیم کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیوں کر ہوا: میں مسلسل تین بار ہار گیا اور مجھے وجہ کا پتا لگنے سے پہلے ہی ۲۱ نمبر والی گریٹا گاربو کی دو اور ۷۸ نمبر والی شاہ فاروق کی ایک تصویر میرے بھائی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ میں اُن تمام کو فوری طور پر واپس جیتنا چاہتا تھا۔ پس میں نے تمام پتّے اُوپر رکھ دیے تھے۔ اِس طرح میں دو ہی باریوں میں اپنی ۶۴ نمبر والی آئن سٹائن کی تصویر ۔ جو اُس کے پاس نہیں تھی ۔ ۳ نمبر والی رُومی کی تصویر، ۱۰۰ نمبر والی سارکس نذرین ۔ جو مبوگم اینڈ کینڈی کمپنی کا بانی تھا۔ اور کلیوپیٹرا کی تصویر نمبر ۵۱ ہار گیا تھا۔

میرا حلق خشک ہو گیا۔ اِس خوف سے کہ میں رونے نہ لگوں میں دوڑتا ہوا کھڑکی تک گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ پانچ منٹ قبل ہر شے کتنی حسین تھی! اپنے اسٹاپ کو پہنچتی ہوئی برقی ریل گاڑی، گرتے ہوئے پتوں والے خزاں رسیدہ شاہ بلوط کے درختوں کے جھرمٹ میں گھری دُور واقع اپارٹمنٹوں والی

عمارت، سنگریزوں پر لیٹا کاہلی سے کھجلی کرتا ہوا کتا۔ کاش! وقت ٹھیر بھی جائے۔ کاش! پانسے والے کھیل میں دوڑنے والے گھوڑے کے مانند میں واپس پانچ منزلیں پیچھے لوٹ جاؤں تو میں اب دوبارہ کبھی اپنے بھائی کے ساتھ ''اُوپر یا نیچے'' نہیں کھیلوں گا۔

''آؤ، ایک بار پھر کھیلیں۔'' میں نے کھڑکی کے شیشے پر ٹکی پیشانی اُٹھائے بغیر کہا۔

''میں نہیں کھیل رہا۔'' وہ بولا۔ ''تم رونے لگو گے۔''

''جیوات (Jewat)، میں حلف دیتا ہوں کہ میں نہیں روؤں گا۔'' میں نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''بس ہم ایمان داری سے کھیلیں گے، جس طرح پہلے کھیلا کرتے تھے۔''

''میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بولا۔ میں نے تصویروں کی اپنی گھٹتی ہوئی گڈی کو پھینٹا۔ ''اُن ہی قواعد کے ساتھ جن کے ساتھ ہم نے ابھی کھیلا تھا۔ اُوپر یا نیچے؟''

''تب ٹھیک ہے لیکن رونے کی اجازت نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اُوپر۔''

''میں جیت گیا اور اُس نے مجھے مارشل فیوزی کیکمیکس کی ایک تصویر دی، جسے میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ''براہِ مہربانی، مجھے میری ۸۷ نمبر والی شاہ فاروق کی تصویر دے دو۔''

''نہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''یہ ہم نے طے نہیں کیا تھا۔''

ہم دوبارہ اَور کھیلے اور دونوں بار میں ہار گیا۔ مجھے تیسری بار نہیں کھیلنا چاہیے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنی ۴۹ نمبر والی نپولین کی تصویر اُس کے حوالے کر دی۔

''میں کھیل چھوڑتا ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے اُس کی منّت سماجت کی۔ ہم دوبارہ اَور کھیلے۔ جب میں ہارا تو میں نے اُس کی مطلوبہ تصویر دینے کے بجائے اپنی بچی ہوئی گڈی اُس کے ہاتھ پر دے ماری۔ نمبروں والے تمام پتے، ۲۸ نمبر والی مائی ویسٹس (Mae Wests)، ۸۲ نمبر والی جولز ورنیس، ۷ نمبر والی فاتح اعظم سلطان محمود اور ۷۰ نمبر والی ملکہ الزبتھ، ۱۴ نمبر والی صحافی سیلال سالک اور ۴۲ نمبر والی وولٹائرس کی تصویر، جن میں سے ہر ایک کے بارے میں، مَیں نے سوچا، بمشکل چھپا کر رکھا اور پچھلے اڑھائی ماہ میں، ایک ایک کر کے جمع کیا تھا، فضا میں تتلیوں کے مانند اُڑے اور بے بسی سے زمین پر گر گئے۔

کاش! میری کسی اَور مقام پر مکمل طور پر مختلف زندگی ہوتی۔ میں نانی کے کمرے میں گیا اور چُپ چاپ مُڑ کر چرچراتی ہوئی سیڑھیاں اُترتے ہوئے، ایک دُور پار کے عزیز کے بارے میں سوچنے لگا جو ایک انشورنس سیلز مین تھا اور اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ میری دادی نے بتایا تھا کہ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں اُنھیں ہمیشہ کے لیے پاتال کے ایک اندھیرے مقام میں قید کر دیا جاتا ہے اور وہ کبھی جنت

میں نہیں جا سکتے۔ جب میں قریب قریب آخری قدمچوں پر پہنچا تو ٹھیر کر غور کرنے لگا۔ پھر میں پلٹا اور واپس سیڑھیاں چڑھ کر اپنی نانی کے کمرے کے ساتھ سب سے بالائی قدمچے پر بیٹھ گیا۔

''میری صحت تمھاری ساس جتنی اچھی نہیں ہے۔'' میں نے نانی کو کہتے سُنا۔ ''تم اپنے بچّوں کی دیکھ بھال اور انتظار کرو۔''

''لیکن ماں، میں آپ سے یہ پُوچھ رہی ہوں کہ میں بچّوں سمیت یہاں واپس آنا چاہتی ہوں۔'' امّی نے کہا۔

''تم اِس گرد آلود، بُھوتوں کے بسیرے اور چور لٹیروں کی زد میں آئے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔'' نانی نے کہا۔

''لیکن ماں، تمھیں یاد نہیں کہ ابّا جان کی زندگی کے آخری برسوں میں، میری بہنوں کے بیاہ کے بعد، ہم تینوں اکٹھے یہاں کتنے خُوش وخرم رہا کرتے تھے!''

''میری پیاری می بر ورر، تم سارا دِن اپنے باپ کے پُرانے رسالے کھنگالتی رہتی تھیں۔'' نانی بولیں۔

''میں بڑے چُولھے کو نچلی منزل پر دہکا دوں گی اور دو ہی دِنوں میں پُورا گھر گرم ہو جائے گا۔''

''میں نے شادی سے پہلے ہی تمھیں اُس کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا۔'' نانی بولیں۔

''خادمہ کی مدد سے گھر کی مکمل جھاڑ جھنکاڑ میں محض دو دِن لگیں گے۔''

''میں کسی چور اُچکی خادمہ کو گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' نانی نے کہا۔ ''اِس کے علاوہ تمھیں گھر کی صفائی اور مکڑی کے جالوں سے چھٹکارا پانے میں چھے ماہ لگیں گے۔ اِس دوران میں تمھارا خود سر شوہر لوٹ چکا ہوگا۔''

''کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟'' امّی نے پُوچھا۔

''میری نہایت می بر ورر، اگر تم اور بچّے بھی یہاں آ کر رہنے لگو تو ہم دونوں گزارہ کیسے کریں گی؟''

''لیکن ماں، میں آپ سے کتنی ہی بار کہہ چکی ہوں کہ حکومت کے بے دخل کرنے سے قبل ہی بیبیک (Bebek) والی جائیداد فروخت کر دیں۔''

''میں خود لینڈ رجسٹرار کے دفتر جانا، دستخط کرنا اور اُن کریہہ لوگوں کو اپنی تصویر دینا نہیں چاہتی۔''

''لیکن ماں، ہم نے آپ کے پاس وکیل صرف اِسی لیے تو بھیجا تھا کہ آپ کو اِس جھنجھٹ میں نہ پڑنا پڑے۔'' میری ماں کی آواز بلند ہو گئی۔

''مجھے اُس وکیل پر ذرا بھی اعتبار نہیں آیا تھا، بالکل بھی نہیں۔'' نانی نے کہا۔''اُس کے چہرے ہی سے لگتا تھا کہ وہ ایک دھوکے باز شخص ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ وہ واقعی وکیل بھی تھا۔ اور ہاں، مجھ سے اُونچی آواز میں بات مت کرو۔''

''ٹھیک ہے، اب میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔'' اَمّی بولیں۔ اُس نے پُکارا۔''بچو، تیار ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔ ہم چل رہے ہیں۔''

''ٹھیرو، تم کہاں جارہے ہو؟'' نانی نے پُوچھا۔''ہم نے ابھی باتیں تو کی ہی نہیں ہیں۔''

''آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے۔'' اَمّی نے سرگوشی کی۔

''یہ لو، بچوں کے لیے کچھ مٹھائی خرید لینا۔''

''اِنھیں دوپہر کے کھانے سے قبل کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اَمّی بولیں اور میرے پیچھے پیچھے بڑے ہال کے پار والے کمرے کی طرف چلنے لگیں۔''یہ تصویریں کس نے بکھیری ہیں۔ اِنھیں فوراً اُٹھاؤ۔ تم اِس کی مدد کرو۔'' اُنھوں نے بھائی سے کہا۔

ہم خاموشی سے معروف ہستیوں کی تصویریں اُٹھانے لگے تو اَمّی پُرانے دراز کھول کر اپنے بچپن کے لباس دیکھنے لگی: اُن کا رقص والا لباس، فرشتوں والا لباس اور دراز کے اندر رکھی ہوئی ہر شے۔ پیڈل والی سلائی مشین کے ڈھانچے تلے سے دُھول میرے نتھنوں میں گھس گئی، جس سے میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

جب ہم حجرے میں اپنے ہاتھ دھو رہے تھے تو نانی نے نرم اور لجاجت بھری آواز میں کہا۔''مِی بڑور، تم اپنی نہایت پسندیدہ چائے دانی کیوں نہیں لے لیتیں؟ تم اِس کی حق دار ہو۔ میرے نانا — جو نہایت عمدہ انسان تھے — جب وہ دمشق کے گورنر تھے تو اِسے میری ماں کے لیے لائے تھے۔ یہ اصل چینی کی ہے۔ براہِ مہربانی، اِسے لے لو۔''

''ماں، مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔'' اَمّی بولیں۔''اِسے واپس الماری میں رکھ دیں۔ کہیں آپ اِسے توڑ نہ بیٹھیں۔ بچو، آؤ، اپنی نانی کے ہاتھ پر بوسہ دو۔''

''لیکن نہایت ہی پیاری مِی بڑور، اپنی بے کس ماں سے ناراض ہونے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔'' نانی ہمارے بوسوں کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔''براہِ مہربانی، میں تمھاری مِنّت کرتی ہوں۔ یہاں آنا جانا ترک کر کے مجھے تنہا مت چھوڑنا۔''

ہم سرعت سے سیڑھیاں اُترے اور تینوں نے مل کر آہنی دروازہ کھولا۔ تیز دھوپ سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں اور ہمارے پھیپھڑے تازہ ہَوا سے بھر گئے۔

''دیکھ لو کہ تم نے دروازہ ٹھیک سے بند کر دیا ہے۔'' بالائی منزل سے نانی پکاریں۔''مِی بڑور،

اِسی ہفتے ایک بار پھر آنا، ٹھیک ہے؟''

ہم اپنی ماں کے ساتھ خاموشی سے چل پڑے۔ برقی ریل گاڑی کے چلنے تک ہم چُپ چاپ بیٹھے دُوسرے مسافروں کی کھنگاریں سنتے رہے۔ جوں ہی گاڑی چلی میں اور بھائی کنڈکٹر کو دیکھنے کا بہانہ بنا کر نشستوں کی اگلی قطار میں جا بیٹھے اور ''اُوپر یا نیچے'' کھیلنے لگے۔ میں نے اپنی گنوائی ہوئی چند تصاویر واپس جیتیں اور پھر تیزی سے ہارنے لگا۔ عثمان بے کے اسٹاپ پر بھائی نے گڈی چھینٹی۔ ''اگر میں جیتا تو تمھاری ساری گڈی میری اگر ہارا تو تم اپنی مرضی سے پندرہ تصویریں لے لینا۔''

ہم کھیلنے لگے۔ میں نے دو تصویریں چھپاتے ہوئے ساری گڈی اُس کے حوالے کر دی۔ میں پچھلی قطار پر جا کر ماں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں رویا نہیں۔ بس اپنی ماں کے مانند افسردگی سے اندر ہی اندر گریہ کرتے ہوئے رفتار پکڑتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے اور غائب ہوتے لوگوں اور درختوں کو تکنے لگا۔ یورپ سے برآمدی کپڑوں کے رنگا رنگ تھانوں سے بھری ہوئی درزیوں کی بہ کثرت دُکانیں، ایک ہی جیسی کھڑکیوں والی مٹھائی کے دُکانوں کے دھوپ سے اُڑے رنگوں اور بارشوں سے چیتھڑے بنے تنبو، الماریوں میں نفاست سے سجی ڈبل روٹیوں والی بیکریاں، تان فلم تھیٹر کی اندھیری ڈیوڑھی، جہاں ہم نے قدیم رُومی فلمیں دیکھی تھیں جن میں دیویوں سے زیادہ حسین وجمیل کنیزوں کی بھرمار ہوتی تھی، سینما کے سامنے والی سڑک جہاں بے گھر بچے مزاحیہ کتب بیچتے تھے، نوکیلی مونچھوں اور تیز دھار قینچیوں والا حجام، جس سے مجھے ہمیشہ خوف آتا تھا اور ایک نیم عریاں مقامی شخص جو ہمیشہ حجام کی دُکان کے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔

ہم ہاربیے (Harbiye) کے اسٹاپ پر گاڑی سے اُترے۔ گھر لوٹتے ہوئے بھائی کے چہرے کی آسودہ مُسکراہٹ نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں نے جیب سے لنڈبرگ کی چھپائی ہوئی تصویر نکالی۔ اُس نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ''نمبر ۹۱۔ لنڈبرگ''۔ اُس نے استعجاب سے پڑھا۔ ''اُس نے جہاز کے ذریعے بحرِ اٹلانٹک پار کیا تھا! یہ تمھیں کہاں سے ملی؟''

''میں نے کل ٹیکا نہیں لگوایا تھا،'' میں نے کہا۔ ''میں سکول سے جلد لوٹ آیا تھا اور ابا جان کے جانے سے پہلے اُن سے ملا تھا۔ اُنھوں نے مجھے یہ خرید کر دی تھی۔''

''اِس کا مطلب ہے کہ اِس میں میرا آدھا حصّہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''اِس کے علاوہ پچھلی باری، ہم نے تمھاری تمام تصویروں کے لیے کھیلی تھی۔'' اُس نے میرے ہاتھ سے تصویر چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا پھرتیلا ثابت نہیں ہوا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔ میں نے اُس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ ہم لڑنے لگے۔

''بند کرو!'' ماں چلّائی۔ ''تم دونوں جھگڑنا بند کرو! ہم سڑک کے بیچوں بیچ ہیں۔''

ہم نے لڑنا بند کیا۔ سُوٹ اور ٹائی پہنے ایک مرد اور شان دار ہیئت والی ایک عورت قریب سے گزرے۔ میں پریشان ہو گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے جھگڑے تھے۔ میرا بھائی دو قدم آگے بڑھا اور لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بَل گر گیا۔ ''بہت درد ہو رہا ہے۔''

''اُٹھو۔'' اُمّی نے ناراضی کا اظہار کیا۔ ''فوراً اُٹھو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

بھائی اُٹھا اور جنگ پر مبنی فلم کے زخمی ہیرو کے مانند لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا کہ وہ واقعی زخمی نہ ہو گیا ہو لیکن میں اُسے اِس حالت میں دیکھ کر مسرور بھی تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے چلنے کے بعد وہ بولا۔ ''گھر پہنچ کر تم سے اِس کا بدلہ لوں گا۔'' وہ اُمّی کی طرف مُڑا اور کہنے لگا۔ ''اُمّی، علی نے ٹیکا نہیں لگوایا۔''

''اُمّی، میں نے لگوایا ہے۔''

''ہُش۔'' وہ چیخیں۔

ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ سڑک پار کرنے سے قبل ہم مکہ سے آنے والی گاڑی کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ اُس کے فوراً بعد بیشِکتاش (Beshiktash) بس کے بعد ایک ٹرک اور پھر ایک ہلکے بنفشی رنگ کی ڈی سوٹو (De Soto) گزری۔ تبھی میری نظر کھڑکی سے باہر سڑک پر جھانکتے اپنے چچا پر پڑی۔ اُنھوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ آتی جاتی کاروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر اُنھیں طیش بھری نگاہوں سے گھورتا رہا۔

سڑک کافی دیر سے خالی ہو چکی تھی۔ جب میں اپنی ماں کی سمت یہ دیکھنے کے لیے گھوما کہ وہ ہمارے ہاتھ تھام کر ہمیں سڑک کے پار کیوں نہیں لے جا رہی ہیں تو میں نے اُنھیں خاموشی سے آنسو بہاتے دیکھا۔

VVVV

۱۔ Kierkegaard: ۱۸۱۳۔۵۵ء معروف ڈینش فلسفی اور ماہرِ مذہب۔

۲۔ bezique: تاش کا ایک کھیل۔

۳۔ parsley: اجمود۔ سلاد جیسی پتّوں والی ایک خوش بُودار سبزی جو سالن کے اُوپر سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اُسے علیحدہ سے کچا بھی کھایا جا سکتا ہے۔

ڈورِس لیسنگ

(Doris Lessing)

۲۰۰۷ء میں لیسنگ کو ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔سویڈش اکیڈمی نے انعام کے اعلان کے وقت مؤقف اختیار کیا کہ: ''وہ نسوانی تجربے کی وہ رزمیہ نگار ہیں جس نے ارتیاب، جوش اور قوتِ متخیلہ سے منقسم تہذیب کی پرکھ پڑچول کو موضوع بنایا ہے۔''نوبیل انعام کی ۱۰۶ سالہ تاریخ میں لیسنگ نوبیل انعام پانے والی گیارہویں خاتون اور عمر رسیدہ ترین ادیب ہیں۔

ڈورس مے لیسنگ برطانوی ناول نگار، شاعرہ، ڈراما نگار، منظوم ڈراما نگار، سوانح نگار، اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ لندن میں رہائش پذیر ہیں۔ اُن کے اہم ترین ناولوں میں "The Grass is singing" (۱۹۵۰ء)، پانچ ناولوں کا سلسلہ جس کے مجموعے کا نام "Children of Violence" (۶۹-۱۹۵۲ء)، "The Golden Notebook" (۱۹۶۲ء) اور پانچ ناولوں کا ایک اَور مجموعہ "Canopus in Argos: Archives" (۸۳-۱۹۷۹) شامل ہیں۔

لیسنگ برطانوی انگریز جوڑے کپتان الفریڈ ٹیلر اور ایملی موڈ ٹیلر کے ہاں ۲۲-اکتوبر ۱۹۱۹ء کو فارس (اب ایران) کے شہر کرمان شاہ میں پیدا ہوئیں جہاں اُن کے والد امپیریل بینک آف فارس میں کلرک کی ملازمت کرتے تھے۔لیسنگ نے پہلے کونوینٹ بورڈنگ سکول اور پھر سالسبری (اب ہرارے) کے لڑکیوں کے ایک سکول ڈومینی کین کونوینٹ ہائی سکول سے تعلیم حاصل کی جو ایک رومن کیتھولک کونوینٹ تھا۔چودہ برس کی عمر میں اُنھوں نے سکول چھوڑ کر اپنے طور پر تعلیم جاری رکھی۔پندرہ برس کی عمر میں گھر چھوڑا اور دائی، ٹیلی فون آپریٹر، آفس ورکر، سٹینوگرافر اور صحافی کے طور پر کام کیا۔سیاسیات اور سماجیات کا مطالعہ کیا اور اُسی دوران خود بھی لکھنے کا آغاز کر دیا۔اُس زمانے میں اُن کے متعدد مختصر افسانے شائع ہوئے۔۱۹۳۷ء میں لیسنگ سالسبری چلی گئیں اور ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کرنے لگیں۔

اُن کی پہلی شادی فرانک وزڈم سے ہوئی۔اُن کے ہاں دو بچے ہوئے: جان، بیٹا اور جین، بیٹی۔یہ شادی ۱۹۴۳ء کو اپنے انجام پر پہنچ کر طلاق پر منتج ہوئی۔طلاق کے بعد لیسنگ کی دلچسپی لیفٹ بک کلب کے معروف لوگوں میں بڑھ گئی، جس میں اُنھوں نے ایک سال قبل ہی شمولیت اختیار کی تھی۔یہ گروپ نسلی معاملات

سے متعلق تھا۔ وہاں اُن کی ملاقات ایک جرمن یہودی تارکِ وطن گوٹ فرائڈ لیسنگ سے ہوئی۔ اُنھوں نے ۱۹۴۵ء میں شادی کر لی اور اُن کی ازدواجی زندگی کے خاتمے اور طلاق سے قبل اُن کے ہاں ایک بیٹا، پیٹر پیدا ہوا۔ اِن دونا کام شادیوں کے بعد لیسنگ نے تیسرا بیاہ نہیں رچایا۔ ازاں بعد گوٹ فرائڈ لیسنگ یوگنڈا میں مشرقی جرمنی کا سفیر مقرر رہوا اور اِدی امین دادا (Idi Amin Dada) کے خلاف بغاوت کے دوران ۱۹۷۹ء میں قتل ہو گیا۔

جب لیسنگ نے بطور لکھاری اپنے کیریئر اور اشترا کی عقائد کے تعاقب میں لندن کا قصد کیا تو انھوں نے اپنے دونوں بڑے بچے اُن کے باپ کے پاس جنوبی افریقا میں چھوڑے۔ تاہم دُوسرے خاوند سے ہونے والا بیٹا اُن کے ہمراہ رہا۔ نیوکلیائی اسلحے اور جنوبی افریقا کی نسلی تقسیم کے خلاف تحریک کے سبب ڈورس لیسنگ پر جنوبی افریقا اور رہوڈیشیا کے دروازے کئی برسوں (۱۹۵۶ء تا ۱۹۹۵ء) کے لیے بند کر دیے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لندن چلی گئیں۔ اُن کا پہلا ناول The Grass is Singing ۱۹۵۰ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اُن کا اہم ترین کام The Golden Notebook ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں لیسنگ نے جین سومرس کے فرضی نام سے دو ناول یہ دکھانے کے لیے لکھے کہ نئے لکھاریوں کو اپنی تصنیفات چھپوانے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیسنگ کے اپنے برطانوی ناشر نے اُن ناولوں کو مسترد کر دیا۔ تاہم بعد میں ایک اَور انگریز اور ایک امریکی ناشر اُنھیں شائع کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اِس طرح (The Diary of a Good Neighbour) ۱۹۸۳ء میں اور ''اگر بوڑھا کر سکتا'' ۱۹۸۴ء میں بہ یک وقت انگلستان اور امریکا سے اشاعت پذیر ہوئے۔ ۱۹۸۴ء ہی میں دونوں ناول ''ایک اچھے پڑوسی کا روزنامچہ'' اور ''اگر بوڑھا کر سکتا'' دونوں ہی ممالک سے مکرر ایک جلد میں ایک ہی عنوان ''جین سومرس کے روزنامچے'' (The Diaries of Jane Somers) شائع ہوئے لیکن اِس بار مصنف کے نام کی جگہ جین سومرس کی بجائے ڈورس لیسنگ درج تھا۔

۱۹۹۹ء کے آخر میں اُنھیں ''نمایاں قومی خدمات'' سرانجام دینے پر کمپینئن آف آنر قرار دیا گیا۔ رائل سوسائٹی فار لٹریچر نے بھی اُنھیں ادب کی کمپینئن قرار دیا۔ ۲۰۰۱ء میں لیسنگ کو برطانوی ادب کا ڈیوڈ کوہن پرائز فار لائف ٹائم اچیومنٹ دیا گیا۔ جب کہ ۲۰۰۸ء میں اُنھیں ''۱۹۴۵ء تا حال کے عظیم لکھاری'' کی فہرست میں پانچویں نمبر پر رکھا گیا۔

۲۰۰۷ء میں جب اُنھیں ادب کے نوبیل انعام سے نوازا گیا تو اُن کی عمر ۸۷ برس تھی۔ اِس طرح وہ ادب کا نوبیل انعام پانے والی معمر ترین ادیب اور کسی بھی شعبے میں نوبیل انعام پانے والے معمر ترین ہستیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں۔ جس وقت انعام کا اعلان ہوا وہ گھر سے کریانے کا سامان خریدنے نکلی ہوئی تھیں۔ واپسی پر اپنے گھر کے گرد جمع رپورٹروں سے اُنھوں نے کہا۔ ''اوہ، میرے خُدا! میں نے یورپ کے تمام اعزازات

حاصل کیے ہیں۔ ہر اعزاز کو پا کر مجھے خوشی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ ایک عظیم الشان مسرت ہے۔''

لیسنگ کے افسانوی ادب کو عام طور پر تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اولاً اشتراکی موضوعات (۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۶ء)، اِس دوران اُنھوں نے بنیادی طور پر سماجی مسائل کو موضوع بنایا (اِس موضوع پر اُن کی واپسی دوبارہ ''اچھا دہشت گرد'' (The Good Terrorist) ۱۹۸۵ء میں ہوئی)۔ ثانیاً نفسیاتی موضوعات (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۹ء) اور ثالثاً صوفی اِزم، جس کا اظہار Canopus in Argos کے عنوان سے سائنس فکشن (جسے وہ ''سپیس فکشن'' کا نام دیتی ہیں) کے ناولوں اور ناولچوں میں ہوتا ہے۔ لیسنگ کا پسندیدہ کینوپس (Canopus) سلسلہ اہم ادبی نقادوں کے ہاں پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ یہ ناول ایک ایسے آفاقی معاشرے کو پیش کرتے ہیں جو بشمول زمین دیگر دُنیاؤں کے اِرتقا کے لیے کوششیں کرتا ہے۔ صوفیانہ خیالات کے حامل ناولوں کی سیریز میں وہ بیسویں صدی کے ابتدائی رجحانات سے استفادہ کرتی ہیں۔

لیسنگ کے ناول The Golden Notebook کو کچھ دانش وروں نے نسوانی کلاسیکی ناول کا درجہ دیا ہے لیکن مصنفہ خود ایسا نہیں سمجھتیں۔ اُنھوں نے اِس بارے میں لکھا کہ اِس میں ذہنی توڑپھوڑ بطور صحت یابی اور ابہامات سے آزادی کے موضوع کو نقادوں نے نظر انداز کیا ہے۔ اُنھوں نے اِس پر بھی اظہارِ افسوس کیا کہ ناول کی استثنائی ساخت کو بھی نقاد تحسین دینے میں ناکام رہے ہیں۔ لیسنگ کو محض عورتوں کی مخصوص مصنف ہونے کا لقب ناپسند ہے۔

نوبیل انعام وصول کرتے ہوئے اپنے نوبیل خطبے ''نوبیل انعام کا نہ جیتنا'' میں ادب اور ادیب کے بارے میں اُن کا کہنا تھا:

''میری پرورش سروؤں سے بنی گارے کی ایک جھونپڑی میں ہوئی۔ ...... جس گھر میں میری پرورش ہوئی اُس میں ساتھ ساتھ چار کمرے تھے اور وہ گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا ...... وہ کتابیں میری نوجوانی کی مسرت تھیں ...... لکھنتیں اور لکھاری بے کتاب گھروں سے نہیں نکلتے ...... لکھنے کے لیے، ادب کی تخلیق کے لیے کتب خانوں، کتب اور روایات سے جڑا ہونا ضروری ہے ...... تمام لکھاریوں کو پڑھنے کی دشوار راہ سے گزرنا اور لکھاری بننے کے لیے تنہائی سہنا پڑتی ہے ...... اِن مشکلات سے گزر کر ہی لکھاری بنتے ہیں ...... اُن لوگوں کے آبا و اجداد یقیناً قصہ گو رہے ہوں گے۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی کہانیاں ایک دو نسلوں کے بعد چھپنے لگیں، کتب تخلیق ہونے لگیں۔ کتنی بڑی کامیابی ہے! ...... یہاں میں اُن کتابوں کی بات کر رہی ہوں جو کبھی نہیں لکھی گئیں، لکھاری اُنھیں کبھی نہیں لکھ پائے کیوں کہ کہ ناشر نہیں ہیں۔ ناشنیدہ آوازیں۔ اِن عظیم صلاحیتوں اور جوہر کے زیاں کا اندازہ ممکن نہیں۔ کتاب کی تخلیق ناشر مانگتی ہے، حوصلہ افزائی مانگتی ہے جس کی کمی ہے۔ لکھاریوں سے اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ وہ کیسے لکھتے ہیں؟ کمپیوٹر پر؟ برقی ٹائپ رائٹر پر؟ پَر سے بنے قلم سے؟ ہاتھ سے؟ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ''آپ نے وہ جگہ، وہ خالی (تنہا) جگہ کیسے پائی جو لکھتے ہوئے آپ کے اردگرد موجود تھی؟''

اُس جگہ، جو سمع کی ایک صُورت ہے، الفاظ آئیں گے، آپ کے کردار بولیں گے، خیالات آئیں گے، تحریکات ہوں گی۔ اگر لکھاری کو ایسی جگہ دستیاب نہیں ہوتی تو شعر اور کہانیاں بے جنم رہیں گی...... ماضی میں مصریوں، یونانیوں، رومیوں کی طرف جائیں تو ہمارے پاس ادب کا ایک خزانہ ہے۔ ادب کے اُس خزانے تک رسائی پانے والا ہر خُوش قسمت اُسے بار بار دریافت کرتا رہے گا۔ خزانہ، فرض کیجیے کہ اُس کا وجود نہیں ہے تو ہم کس قدر مفلس اور کھوکھلے ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس ماضی کے اُن قصّہ گوؤں کی کہانیوں اور قصّوں کا ورثہ ہے جن میں سے کچھ کے نام ہم جانتے ہیں اور کچھ کے نہیں۔ قصّہ گو پیچھے اور پیچھے، جنگل کے درمیان ایک صاف جگہ پر جاتے جہاں الاؤ روشن ہوتا اور قدیمی شمن[1] رقص ہو رہا ہوتا اور گیت گائے جا رہے ہوتے۔ ہماری وراثت اُسی الاؤ، طلسم اور رُوحوں کی دُنیا سے شروع ہوئی اور یہ آج بھی وہیں موجود ہے۔ کسی بھی جدید کہانی کار سے پُوچھ لیجیے، وہ یہی کہے گا کہ ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب اُسے آگ چُھوتی ہے، جسے ہم الہام (یا تخلیقی تحریک: مترجم) کہنا پسند کرتے ہیں، اور یہ چیز پیچھے، اور پیچھے، ہماری نسل کے آغاز تک، اُن تیز ہواؤں تک جاتی ہے جنھوں نے ہمیں اور ہماری دنیا کو متشکل کیا تھا۔ قصّہ گو ہم سب کے اندر بہت گہرائی میں موجود ہے۔ کہانی کار ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ آیئے فرض کرتے ہیں کہ ہماری دنیا جنگ اور اُن تمام خطروں کے سبب تاراج ہو جاتی ہے جن کا ہم سب بہ آسانی ادراک کر سکتے ہیں۔ فرض کریں کہ سیلاب ہمارے شہروں کو کرۂ ارض سے مٹا ڈالیں، سمندروں کی سطح بلند ہو جائے۔ لیکن قصّہ گو موجود رہے گا کیوں کہ ہمارا تخیل ہی ہے جو ہمیں برا چھائی اور برائی کے لیے شکل وصُورت عنایت اور ہماری تخلیق کرتا ہے۔ جب ہم ٹُوٹ پھُوٹ کا شکار اور دُکھی حتّٰی کہ ختم ہو جائیں گے تو یہ کہانیاں ہی ہوں گی جو ہمیں تخلیق کریں گی۔ یہ کہانی کار ہی، خواب بُننے والا ہی، اسطورہ بنانے والا ہی تو ہمارا قُقنُس (Phoenix) ہے جو ہمیں بہترین طور پر پیش کرتا ہے اور ہمارا سب سے زیادہ تخلیق کار ہے۔"

vvvv

[1] shaman: شمال مشرقی ایشیا اور یورپ کا ایک قدیمی مذہب جس کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں، شیطانوں، بزرگوں کی رُوحوں کے نسلِ انسانی کے لیے تمام اچھے برے فیصلوں کا اطلاق صرف اِس مذہب کے مذہبی رہنماؤں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اِس کے مذہبی رہنماؤں کو بھی شمن کہا جاتا تھا جو جادو ٹونا بھی جانتے تھے۔

معجزے بکتے نہیں

(No Witchcraft for Sale)

جب ننھا ٹیڈی پیدا ہوا تو فارقواز خاندان کئی برسوں سے بے اولاد تھا۔ اُن کے ملازم بھی اُن کی خوشیوں میں شریک ہوے۔ جب وہ بچّے کی پیدائش پر مسرت کے اظہار کے لیے آئے تو اپنے ساتھ حلال پرندے، انڈے اور پھول لائے۔ وہ اُس کے سُنہرے سر اور نیلی آنکھیں دیکھ کر خوشی سے چلا اُٹھتے۔ وہ بیگم فارقواز کو یُوں مبارک باد دیتے جیسے اُس نے بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہو......اور اُسے بھی یہی لگتا......مقامی لوگوں کے لیے اُس کی مُسکراہٹ گرم جوش اور تشکرانہ ہوتی۔

بعد میں جب ٹیڈی کی جھنڈ اُتروائی گئی تو باورچی گِڈیون نے زمین سے بالوں کے سُنہرے نرم گچھا اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیے۔ پھر وہ ننھے ٹیڈی کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بولا۔ ''ننھے سُنہرے سر۔'' یہ بچّے کا پیار کا نام پڑ گیا۔ گِڈیون اور ٹیڈی پہلے ہی روز سے ایک دُوسرے سے خُوب مانوس ہو گئے۔ گِڈیون جیسے ہی اپنے کام سے فرصت پاتا، ٹیڈی کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر بڑے درخت تلے لے جاتا اور اُس کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ وہ اُس کے لیے ننھی ٹہنیوں، پتّوں اور گھاس کے کھلونے بناتا یا پھر گارے سے جانوروں کی شبیہیں گوندھتا۔ جب ٹیڈی نے چلنا سیکھا تو یہ گِڈیون ہی تھا جو گھٹنوں کے بَل جھک کر اُس کے آگے آگے چلتا، اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے مختلف آوازیں نکالتا اور جب وہ گرنے لگتا تو آگے بڑھ کر اُسے تھام لیتا۔ اُسے تب تک ہَوا میں اُچھالتا رہتا جب تک کھلکھلاتے کھلکھلاتے دونوں کا سانس نہ پھول جاتا۔ بیگم فارقواز اپنے بچّے سے پیار کرنے کی وجہ سے بُوڑھے باورچی کو بہت پسند کرتی تھی۔

دُوسرا بچہ نہ ہوا تو ایک روز گِڈیون بولا۔ ''بیگم صاحب، بیگم صاحب، اُوپر بیٹھے مالک نے اِسے عطا کیا ہے۔ ننھا سُنہرا سر ہمارے گھر کی سب سے انمول شے ہے۔'' اُس ''ہمارے'' کی وجہ سے بیگم فارقواز کو اپنے باورچی کے لیے نسوانی تحرک محسوس ہوا۔ اُسے اب اُس کے پاس برسوں بیت گئے تھے۔ وہ اُن مقامی نوکروں میں سے تھا، جن کے بیوی بچّے وہیں احاطے ہی میں رہائش پذیر تھے لیکن اُس نے کبھی اپنے گاؤں اپنے گھر جانے کی خواہش نہیں کی، جو وہاں سے چند سومیل کے فاصلے پر تھا۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سیاہ فام بچہ، جو اُنھی ایام میں پیدا ہوا تھا جب ٹیڈی نے جنم لیا تھا، جھاڑیوں کی اَوٹ سے

جھانکتا ہوا دکھائی دیتا۔ وہ غیر معمولی صاف ستھرے بالوں اور شاہی نیلی آنکھوں والے چھوٹے سفید لڑکے کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتا۔ دونوں بچے ایک دُوسرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دلچسپی سے دیکھتے رہتے اور ایک بار ٹیڈی نے متجسس ہو کر اپنے ہاتھ سے اُس سیاہ فام بچے کے گال اور بالوں کو چھو لیا۔

گِڈ یون جو یہ تمام ماجرا دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''بیگم صاحب، یہ دونوں بچے ہیں لیکن ایک بڑا ہو کر آقا بنے گا اور دُوسرا غلام۔'' بیگم فارقوار اُداسی سے مُسکرائی اور کہنے لگی۔ ''ہاں گِڈ یون، میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' اُس نے آہ بھری۔ گِڈ یون نے، جو ایک مذہبی شخص تھا، کہا: ''یہ خدا کی مرضی ہے۔'' فارقوار مذہبی لوگ تھے اور خدا پر ایمان کے اُن مشترکہ جذبات نے مالکہ اور ملازم کو ایک دُوسرے کے اور قریب کر دیا۔

ٹیڈی تقریباً چھے برس کا تھا، جب اُسے سکوٹر دیا گیا تو اُسے تیز رفتاری کے نشے کا ادراک ہوا۔ وہ سارا دِن گھر کے اِردگرد پھولوں کی کیاریوں کو روندتا، زور زور سے کُٹ کُٹ کُٹاک کرتی مُرغیوں کو دوڑاتا اور کتوں کو زِچ کرتا سکوٹر اُڑائے پھرتا۔ اُس کا بڑا سا ڈگمگاتا اور پُر رفتار چکّر باورچی خانے کے دروازے پر ختم ہوتا۔ وہاں پہنچ کر وہ چلّاتا۔ ''گِڈ یون، اِدھر مجھے دیکھو!'' اور گِڈ یون قہقہہ لگاتے ہوئے کہتا۔ ''بہت خُوب، ننھے سُنہرے سر۔'' گِڈ یون کا سب سے چھوٹا بیٹا، جو اَب ایک چرواہا بن چکا تھا، احاطے سے خاص طور پر سکوٹر دیکھنے آیا۔ وہ اُس کے نزدیک آنے سے ڈر رہا تھا لیکن ٹیڈی سکوٹر اُس کے عین سامنے لے آیا۔ ''حبشی۔'' ٹیڈی چیخ کر بولا۔ ''میرے راستے سے ہٹ جاؤ!'' پھر وہ سیاہ فام بچے کے چکّر لگانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ سہم کر واپس جھاڑیوں میں بھاگ گیا۔

''تم نے اُسے کیوں ڈرایا؟'' گِڈ یون نے دِھیمے لیکن سخت لہجے میں ناراضگی سے پُوچھا۔

ٹیڈی بدتمیزی سے بولا۔ ''وہ صرف ایک کالا لڑکا ہی تو ہے۔'' اور ہنسنے لگا۔ پھر جب گِڈ یون کچھ کہے بغیر پلٹا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ فوراً گھر کے اندر گیا اور ایک سنگترہ گِڈ یون کے پاس لا کر بولا۔ ''یہ تمھارے لیے ہے۔'' اُس نے معذرت کا ایک لفظ تک نہیں کہا لیکن وہ گِڈ یون کی شفقت کھونا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ گِڈ یون نے بددِلی سے سنگترہ لے کر آہ بھری۔ ''تم جلد ہی سکول جانے لگو گے، ننھے سُنہرے سر۔'' اُس نے حیرانی سے کہا۔ ''اور پھر تم بڑے ہو جاؤ گے۔'' اُس نے اپنا سر نرمی سے نفی میں ہلایا اور بولا۔ ''اور ہماری زندگیاں اِسی طرح بسر ہوتی ہیں۔'' لگتا تھا جیسے وہ اپنے اور ٹیڈی کے درمیان فاصلہ قائم کر رہا ہو، غصّے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے جیسے کوئی شخص ناگزیر امر کو قبول کر لے۔ اب گِڈ یون اپنا بدن سفید فام بچے کے بدن سے چُھونے نہیں دیتا تھا۔ وہ مہربان تھا لیکن اُس کے لہجے بہت زیادہ رسمی ہوتا جس نے ٹیڈی کو خفا اور آزردہ کر دیا۔ اِس چیز نے اُسے مرد میں بھی بدل دیا۔ وہ گِڈ یون

کے ساتھ شائستہ رہتا اور اپنے آپ کو لیے دیے رکھتا کہ اگر باورچی خانے میں کسی چیز کے بارے میں کہنے جاتا تو اُس کا انداز ویسا ہوتا جیسا ایک مالک کا اپنے نوکر کے ساتھ؛ اور اُسے توقع ہوتی ہے کہ اُس کا حکم مانا جائے گا۔

لیکن ایک روز ٹیڈی لڑکھڑاتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا تو اُس کی بھِنچی ہوئی مٹھیاں آنکھوں پر تھیں اور وہ درد سے چلّا رہا تھا۔ گِڈیون کے ہاتھ میں پکڑا یخنی سے بھرا برتن گر گیا۔ وہ بچے کی طرف دوڑا اور اُس نے زور لگا کر اُس کی اُنگلیاں ہٹائیں۔ ''سانپ۔'' وہ چیخا۔ ٹیڈی اپنا سکوٹر چلا رہا تھا کہ وہ سانس لینے کے لیے پودوں کے ایک جھنڈ کے قریب اپنا ایک پیر زمین پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ چھت سے دُم کے بَل لٹکے درختوں پر بسنے والے ایک سانپ نے اپنا سارا زہر اُس کی آنکھوں میں تھوک دیا تھا۔ بیگم فارقوار شور سُن کر دوڑی آئی۔ ''یہ اندھا ہو جائے گا۔'' وہ ٹیڈی کو گلے سے لگا کر روتی ہوئی بولی۔ ''گِڈیون، یہ اندھا ہو جائے گا۔'' اُس کی آنکھیں کم و بیش پہلے ہی دو گھنٹوں میں اپنی نصف بینائی کھو کے سُوج کر مُٹھی جتنی موٹی ہو چکی تھیں۔ ٹیڈی کا چھوٹا سا سفید چہرہ گہرے بنفشی مواد کے دائرے سے خراب ہو گیا تھا۔ گِڈیون بولا۔ ''بیگم صاحبہ، ایک منٹ انتظار کریں۔ میں دوا لاتا ہوں۔'' وہ جھاڑیوں کی طرف بھاگ گیا۔

بیگم فارقوار بچے کو اُٹھا کر گھر میں لے گئیں اور پرمینگنیٹ سے اُس کی آنکھیں دھوئیں۔ اُس نے گِڈیون کی بات نہیں سُنی تھی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا تو اُسے یاد آنے لگا کہ اُس نے سانپ کے زہر تھوکنے سے مقامی لوگوں کو نابینا ہوا دیکھا ہے۔ وہ اپنے باورچی کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ اُس نے مقامی جڑی بوٹیوں کے مؤثر ہونے کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ وہ سہمے اور روتے ہوئے بچے کو تھامے کھڑکی کے پاس کھڑی بے بسی سے جھاڑیوں میں دیکھتی رہی۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ گِڈیون اپنے ہاتھ میں ایک پودا پکڑے لوٹ آیا۔

''بیگم صاحبہ، ڈریں مت۔'' گِڈیون نے کہا۔ ''مجھے سُنہرے سر کی آنکھوں کو آرام آ جائے گا۔'' اُس نے پودے کے پتّے اُتار کر ایک چھوٹی سی سفید نرم جڑ نکالی جسے دھوئے بغیر ہی اپنے مُنہ میں ڈال کر خوب چبایا اور پھر اپنے مُنہ میں پتلے تھوک کو جمع کرتے ہوئے اُس نے بچے کو زبردستی بیگم فارقوار سے لیا۔ اُس نے ٹیڈی کو اپنے گھٹنوں میں دبوچا اور اپنے انگوٹھوں کی پوروں سے اُس کی سُوجی ہوئی آنکھوں کو دبایا جس سے بچہ چیخنے چلّانے لگا اور بیگم فارقوار احتجاجاً چلّا اُٹھی۔ ''گِڈیون، گِڈیون!'' لیکن گِڈیون نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اُس نے بَل کھاتے ہوئے بچے پر جھک کے پھُولی ہوئی پلکوں کو پیچھے کی طرف اِتنا موڑا کہ آنکھوں کی پتلیاں دِکھائی دینے لگیں اور پھر وہ باری باری دونوں آنکھوں میں

اچھی طرح تھو کنے لگا۔ آخر کار اُس نے ٹیڈی کو نرمی سے اُس کی ماں کے بازوؤں میں تھمایا اور بولا۔ ''اِس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔'' لیکن بیگم فارقوار ڈر کے مارے رو رہی تھی اور اُس کے لیے اُس کا شکریہ بھی ادا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹیڈی کی بصارت کا بچنا نا قابلِ یقین حد تک مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد سوجن اُتر گئی، آنکھوں میں جلن اور دُکھن تو تھی لیکن ٹیڈی دیکھ پا رہا تھا۔ بیگم اور فارقوار دونوں باورچی خانے میں گِڈیون کے پاس گئے اور اُس کا بار بار شکریہ ادا کیا۔ وہ احسان کے بوجھ تلے دبے بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اُن کے پاس اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے گِڈیون کو اُس کی بیوی اور بچوں کے لیے تحائف دیے اور اُس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا لیکن یہ چیزیں ٹیڈی کی ٹھیک بینائی کے سامنے حقیر تھیں۔ بیگم فارقوار نے کہا۔ ''گِڈیون، خدا نے تمھیں اپنی رحمت کا وسیلہ بنایا ہے۔'' گِڈیون بولا۔ ''جی بیگم صاحبہ، خدا نہایت مہربان ہے۔''

اب جب بھی ایسا کوئی واقعہ کھیتوں میں پیش آتا تو فوراً ہی ہر ایک کو یہ قصہ سُنایا جاتا۔ فارقوار اور ان کی بیگم نے یہ قصہ اپنے ہمسائیوں کو سنایا اور پھر یہ علاقے بھر میں زبانِ زدِ عام ہو گیا۔ جھاڑیاں اَسراروں سے بھری ہیں۔ کوئی شخص افریقا یا کم از کم لمبی گھاس والے میدان میں زندہ نہیں رہ سکتا...... جب تک کہ وہ جلد ہی یہ نہ جان لے کہ وہاں مٹی اور موسم کی اپنی ایک قدیمی دانش ہے...... اور شاید سب سے اہم یہ کہ انسانی دماغ کے چھپے ہوئے پہلو ہیں...... جو سیاہ فام لوگوں کا ورثہ ہیں۔ علاقے کے ہر حصے میں لوگ روایات بیان کرتے اور ایک دُوسرے سے اپنے اپنے تجربات دہراتے رہتے ہیں۔

''لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ میں نے خُود دیکھا ہے۔ وہ ایک سانس پی جانے والا ناگ تھا۔ حبشی کا بازو خُوب چمکیلے مٹانے کے مانند کہنی تک سُوج گیا تھا۔ ایک ہی منٹ میں وہ نڈھال ہو گیا۔ وہ مر رہا تھا۔ پھر اچانک ایک اَور حبشی جھاڑیوں سے اپنے ہاتھ میں کافی سارا سبزہ لیے بر آمد ہوا۔ اُس نے سانپ کے کاٹے والی جگہ پر کسی چیز کا لیپ کیا اور اگلے ہی روز میرا بیٹا اپنے کام پر پہنچ گیا۔ آپ سب خُود اُس کی جلد میں دو سوراخ دیکھ سکتے ہیں۔''

وہ اس قسم کا قصہ ہمیشہ نہایت پُر جوش انداز میں سناتے تھے کیوں کہ اُن سب کو علم تھا کہ افریقا کی جھاڑیوں کے تنوں، عام دِکھائی دینے والے پتوں اور جڑوں میں انمول ادویات چھپی ہیں۔ لیکن اُن کے بارے میں مقامی لوگوں سے معلومات لینا ناممکن امر تھا۔

کہانی قصبے تک پہنچ گئی اور شاید شام گئے کی وہ کوئی تقریب یا کوئی ایسی ہی محفل تھی جس میں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اُس نے اِسے للکار دیا۔ ''نِری حماقت۔'' وہ کہنے لگا۔ ''یہ مبالغہ آمیز کہانیاں ہیں۔ ہم نے جب بھی ایسی کہانیوں کو پرکھا، جھوٹی ہی نکلیں۔''

خیر ایک روز ایک اجنبی کار، کھیتوں میں واقع ڈیرے پر آ کر رکی، جس سے قصبے کی لیبارٹری کا ایک کارکن ٹیسٹ ٹیوبوں اور کیمیکلوں سے بھرے تھیلے لیے اُترا۔

بفارقواراور بیگم گھبرائے بھی اور خوش بھی ہوے، اُنھوں نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی اوراس سائنس دان کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھتے ہوئے ایک بار پھر سوویں مرتبہ تمام کہانی سُنائی۔ تھاٹیڈی بھی اپنی صحت مند نیلی آنکھیں جھپکاتے ہوئے وہاں موجود تھا، جو کہانی کی صداقت کی گواہی دے رہی تھیں۔ سائنس دان نے بتایا کہ اگر اس نئی دوا کو فروخت کے لیے پیش کر دیا جائے تو اس سے انسانیت کو بے حد فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس پر فارقوار خاندان مزید خوش ہوا۔ وہ مہربان اور سادہ لوگ تھے جو اپنی وجہ سے ہو جانے والی بھلائی کو نیک خیال کرتے تھے۔ لیکن جب سائنس دان نے حاصل ہونے والی رقم کا تذکرہ شروع کیا تو اُن کے جذبات سرد پڑ گئے۔ اُس معجزے پر اُن کے احساسات (جو اُس کے بارے میں اُن کے تھے) اِس قدر پختہ، گہرے اور مذہبی تھے کہ رقم کے بارے میں سوچنا ہی اُن کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اُن کے چہروں کے تأثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سائنس دان اپنے سابقہ مؤقف پر پلٹا کہ اِس سے انسانیت کو کتنا فائدہ ہوگا۔ وہ شاید ایک معمولی کارکن تھا اور یہ اُس کا پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ جنگل کا عظیم الشان راز خریدنے آیا تھا۔

بالآخر جب کھانا ختم ہو گیا تو فارقوار خاندان نے گِڈیون کو نشست گاہ میں بلایا اور اُسے بتایا کہ وہ گورا ''بڑے شہر'' کا ''بڑا ڈاکٹر'' ہے اور گِڈیون سے ملنے آیا ہے۔ اِس پر گِڈیون سہم گیا اور صورتِ حال سمجھ نہیں پایا تو بیگم فارقوار نے جلدی سے وضاحت کی کہ وہ ''بڑا صاحب'' اُس حیرت انگیز کارنامے کی وجہ سے آیا ہے جو اُس نے ٹیڈی کی آنکھوں کے سلسلے میں سرانجام دیا ہے۔

گِڈیون نے ایک نظر فارقوار کی طرف دیکھا اور پھر چھوٹے لڑکے کی طرف، جو موقع کی مناسبت سے اہمیت اختیار کیے ہوئے تھا۔ بالآخر وہ تلخی سے بولا۔ ''بڑا صاحب' یہ جاننا چاہتا ہے کہ میں نے کون سی دوا استعمال کی ہے؟'' اُس نے ایسی بے یقینی سے کہا جیسے اُسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ اُس کے پُرانے دوست اُس سے یُوں بھی دغا کر سکتے ہیں۔ فارقوار نے وضاحت کی کہ اُس جڑی بوٹی سے کس قدر مفید دوا تیار ہو سکے گی اور کیسے بڑاعظم افریقا کے سانپ کے تُھو کے زہر سے بھری آنکھوں والے ہزاروں سیاہ اور سفید فام لوگوں کو بچایا جا سکے گا۔ گِڈیون زمین پر نظریں جھکائے سنتا رہا۔ اُس کے ماتھے پر اُلجھن کی سلوٹیں پڑی تھیں۔ فارقوار کی بات ختم ہونے پر اُس نے جواب نہیں دیا۔ سائنس دان نے، جو اِس تمام وقفے کے دوران میں بڑی سی کُرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کافی کی چسکیاں لیتا اور مشکوک خُوش خلقی سے مُسکراتا رہا تھا، گفتگو میں حصہ لیا اور ایک بار پھر ادویات کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے سائنس کی ترقی کے بارے میں وضاحت کی۔ اُس نے گِڈیون کو ایک تحفہ بھی پیش کیا۔

اِس مزید وضاحت کے بعد خاموشی چھا گئی اور پھر گِڈیون نے لاپروائی سے بتایا کہ اُسے وہ بوٹی یاد نہیں ہے۔ حتّٰی کہ جب اُس نے فارقوار کی طرف بھی، جس سے وہ عام طور پر پُرانے دوستوں کا سا روّیہ رکھتا تھا، دیکھا تو اُس کے چہرے سے بیزاری اور خفگی عیاں تھی۔ اُنھیں اب یہ بھی محسوس ہونے لگی اور اِس احساس نے گِڈیون کے شکایتی روّیے سے پیدا ہونے والے اُس احساس کو ختم کر دیا کہ زندگی میں اُن سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اُنھیں محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک نامعقول شخص ہے۔ لیکن اُسی لمحے اُنھیں یہ بھی ادراک ہوا کہ وہ جھکے گا نہیں۔ طلسماتی دوا جہاں ہے وہیں نادریافت اور غیر مفید ہی رہے گی، سوائے اُن چھوٹے بکھرے ہوئے افریقیوں کے جنھیں اُس کا علم ہے اور اُن مقامیوں کے جو پھٹی پُرانی قمیصوں اور چیتھڑے لگے پچھوں میں بلدیہ کے گڑھے کھودتے ہیں لیکن وہ علاج کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ پیدائشی معالج ہیں کیوں کہ وہ اُن بڑے بوڑھے عطائیوں کے بھتیجے، بھانجے اور بیٹے ہیں، جن کے بھدّے نقاب، ہڈّیوں کے ٹکڑے اور جادو کی جاہلانہ املاک حقیقی طاقت اور دانش کی ظاہری علامتیں ہیں۔

فارقوار گھر سے باغ اور مویشیوں کے باڑے سے مکئی کے کھیت کی طرف جاتے ہوئے، اُس پودے کے قریب سے، دِن میں پچاس بار گزرتے ہوں گے لیکن وہ اُسے کبھی نہیں پہچان سکتے تھے۔

تاہم اُنھوں نے منانے اور دلائل دینے کا سلسلہ بھرپور جوش اور جذبے سے جاری رکھا اور گِڈیون ہر بار بیان بدلتا رہا کہ اُسے یاد نہیں یا ایسی کوئی بوٹی نہیں ہے یا یہ کہ اب اُس کا موسم نہیں ہے یا وہ کوئی بوٹی نہیں تھی بل کہ اُس کے اپنے لعاب سے ٹیڈی کی آنکھیں ٹھیک ہوئی ہیں۔ اُس نے یہ تمام باتیں ایک کے بعد ایک یہ خیال رکھے بغیر کہیں کہ اُن میں تضاد ہے۔ وہ گستاخ اور ہٹ دھرم تھا۔ اگرچہ وہ ان کے سامنے نظریں جھکائے ہوئے بیٹھا ہوا تھا لیکن اب وہ فارقوار خاندان کے پُرانے، شریف اور محبت کرنے والے ملازم کے بجائے، اپنے ہاتھوں سے اپنا باورچیوں والا ایپرن مروڑتا اور اپنے ذہن میں آنے والے پہلے احمقانہ انکار پر اَڑا ہوا، ایک جاہل اور غیر اخلاقی حد تک ضدی اجنبی افریقی لگ رہا تھا۔

اچانک ہی اُس نے ہار مان لی۔ اُس نے اپنا سر اُٹھایا، حصار بنائے گوروں کو دیر تک خالی خالی غصیلی نظروں سے گھورا، جو اُسے چاروں سے گھیرے ہوئے گِدھ لگ رہے تھے اور بولا۔ ''میں تمھیں وہ بوٹی دِکھادوں گا۔''

وہ سب ڈیرے سے ایک قطار کی صورت چارے والے کھیت کی پگڈنڈی کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ وہ چندھیا دینے والے دسمبر کی ایک سہ پہر تھی اور آسمان حبس زدہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ سر پر سورج کانسی کے تھال کی طرح گھوم رہا تھا۔ کھیتوں پر دھوپ چمک اور پیروں تلے زمین جھلس

رہی تھی۔ دُھول بھری ہَوا سے ریت کے موٹے اور گرم ریزے اُن کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ ایک خوف ناک دِن تھا جو صرف برآمدے میں تکیوں سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے مشروبات پینے کے لیے مناسب تھا اور جہاں عام حالات میں اُنھیں اُس وقت ہونا چاہیے تھا۔

بار بار یہ یاد کرتے ہوئے کہ سانپ کے زہر تھُو کنے والے دن، بُوٹی لانے میں دس منٹ لگے تھے، کوئی پُوچھتا ''کیا زیادہ دُور نہیں آ گئے، گِڈیون؟'' اور گِڈیون اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے تلخی بھری شائستگی سے جواب دیتا۔ ''میں بُوٹی ڈھونڈ رہا ہوں، جناب۔'' بلاشبہ اُس نے کئی بار راستے کے کناروں پر جھک کر اپنے ہاتھ سے گھاس میں بےتوجہی سے اہانت آمیز انداز میں ٹٹولا۔ اُس بھیجا پگھلا ڈالنے والی دھوپ میں وہ اُنھیں اپنے ساتھ لیے دو گھنٹوں تک نامعلوم راستوں پر پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے بدن پر نیچے تک ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا اور سر درد کرنے لگے۔ وہ سب چُپ چاپ تھے۔ فارقوار اس لیے کہ وہ طیش میں تھے اور سائنس دان اِس لیے کہ وہ ایک بار پھر سچا ثابت ہو رہا تھا کہ ایسا کوئی پودا نہیں ہے۔ اُس کی خاموشی عیارانہ تھی۔

آخرِش، گھر سے چھے میل دُور، گِڈیون نے اچانک فیصلہ کیا کہ اُنھیں بہت سزا مل چکی ہے یا شاید اُس لمحے اُس کا غصہ کافور ہو گیا تھا۔ اُس نے بلا تردد سرسری نظر ڈالتے ہوئے گھاس سے مٹھی بھر نیلے پھُول توڑے۔ وہ پھُول جو اُن راستوں پر جا بہ جا بہ کثرت اُگے ہوئے تھے، جن پر وہ چل کر آئے تھے۔

اُس نے سائنس دان کی طرف دیکھے بغیر اُنھیں اُسے تھما دیا اور خُود گھر جانے والے راستے پر ہولیا کہ اگر وہ چاہیں تو اُس کے پیچھے چلے آئیں۔

جب وہ گھر لوٹے تو سائنس دان گِڈیون کا شکریہ ادا کرنے باورچی خانے میں گیا۔ اگرچہ اُس کی آنکھوں میں عجیب پن اُترا ہوا تھا لیکن وہ بہت شائستہ ہو رہا تھا۔ گِڈیون وہاں موجود نہیں تھا۔ بےتوجہی سے پھُول اپنی کار کی عقبی نشست پر پھینک کر وہ ممتاز ملاقاتی اپنی لیبارٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔

گِڈیون رات کا کھانا تیار کرنے کے لیے بروقت باورچی خانے میں پہنچ گیا لیکن وہ آزردہ تھا۔ اُس نے فارقوار سے ایک رُوٹھے ہوئے نوکر کے مانند بات چیت کی۔ بہت دِنوں بعد جا کر اُن کی آپس میں صلح ہو سکی۔

فارقوار خاندان نے اپنے مزدوروں سے بُوٹی کے بارے میں پُوچھ گچھ کی۔ بعض اوقات وہ بےاعتبار نگاہوں سے جواب دیتے۔ بعض اوقات مقامی لوگ کہتے: ''ہمیں نہیں پتا۔ ہم نے ایسی بُوٹی کے بارے میں کبھی نہیں سُنا۔'' اُن کے پاس بہت عرصے سے موجود مویشی چرانے والے ایک لڑکے

نے، جسے اُن پر کچھ اعتبار آ گیا تھا، بتایا۔ "اپنے باورچی کے لڑکے سے پُوچھیں۔ اب تو آپ کا اپنا ڈاکٹر ہے۔ وہ ایک معروف طبیب کا بیٹا ہے جو یہاں رہا کرتا تھا اور ایسی کوئی بیماری نہیں، جس کا وہ علاج نہیں کر سکتا۔" پھر اُس نے شائستگی سے اضافہ کیا۔ "بلاشبہ، ہم جانتے ہیں کہ وہ گوروں کے ڈاکٹر جتنا اچھا ڈاکٹر نہیں لیکن وہ ہمارے لیے اچھا ہے۔"

جب کچھ عرصے کے بعد فارقوار خاندان اور گِڈیون کے بیچ تلخی جاتی رہی تو وہ مذاق کرنے لگے: "گِڈیون، تم ہمیں سانپ والی بوٹی دِکھانے کب چل رہے ہو؟" اور وہ قہقہہ لگا کر اپنا سر نفی میں بلا کر قدرے مضطرب ہو کر کہتا: "لیکن وہ تو میں دِکھا چکا ہوں، بیگم صاحبہ۔ کیا آپ بھول گئیں؟"

بہت بعد میں جب ٹیڈی سکول میں پڑھنے لگا تھا، وہ باورچی خانے میں آ کر کہتا: "اے بُوڑھے بدمعاش، گِڈیون! تمھیں وہ وقت یاد ہے جب تم ہمیں بلاوجہ گھاس کے میدان میں میلوں تک پھراتے رہے تھے؟ میرے والد مجھے کتنی دُور اُٹھا کر لے گئے تھے!"

گِڈیون خُوش خلقی سے ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا۔ بہت دیر تک ہنسنے کے بعد وہ اچانک سیدھا کھڑا ہو کر اپنی بُوڑھی آنکھیں صاف کرتا اور افسردگی سے ٹیڈی کی طرف دیکھتا جو باورچی خانے میں ایک طرف کھڑا شریر انداز میں ہنس رہا ہوتا۔ "اے ننھے سنہرے سر والے، تم کتنے بڑے ہو گئے ہو! جلد ہی تم اَور بڑے ہو کر اپنے کھیت کے مالک بن جاؤ گے......!"

vvvv

سُرنگ سَری
(Through the Tunnel)

تعطیلات کی پہلی صبح ساحل کی طرف جاتے ہوئے نوجوان انگریز لڑکے نے راستے کے موڑ پر ٹھہر کر پہلے وحشی اور پتھریلی کھاڑی کی سمت دیکھا اور پھر پُرہجوم ساحل کی طرف، جس سے وہ گزشتہ کئی برسوں سے خوب واقف تھا۔ اُس کی ماں اپنے ایک ہاتھ میں چمکیلی تنیوں والا ایک بیگ تھامے اُس کے آگے چل رہی تھی۔ ڈھیلے انداز میں جھولتا ہوا اُس کا دُوسرا بازو، دُھوپ میں خوب سپید دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکے نے اُس سفید عریاں بازو کو دیکھا اور اپنی خفا نگاہیں، پہلے کھاڑی کی طرف پھیریں اور پھر ماں کی طرف۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کے ساتھ نہیں تو وہ گھومی۔ ''اوہ جیری! تم وہاں ہو۔'' وہ بولی۔ وہ ناراض دِکھائی دے رہی تھی، پھر وہ مُسکرائی۔ ''کیوں پیارے، تم میرے ساتھ نہیں آرہے؟'' کیا تم......؟'' اُس نے تیوریاں چڑھائیں۔ وہ اُس کی، اُن تفریحات پر پریشان ہو رہی تھی، جنھیں وہ اپنے اندر پال رہا تھا لیکن وہ اپنی مصروفیات یا حاطۂ ادراک میں نہ آنے کے سبب، اُن کی طرف سے سبب بے نیاز تھی۔ وہ اُس مشوش اور معذرت خواہانہ مُسکراہٹ سے آشنا تھا۔ شرمندگی نے اُسے ماں کے پیچھے دوڑنے پر مجبور کر دیا۔ دوڑتے ہوئے اُس نے سر گھما کر جنگلی گھاس کی طرف دیکھا اور محفوظ ساحل پر کھیلتے ہوئے، وہ دِن بھر اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلے روز حسبِ معمول بیراکی اور غسلِ آفتابی کے سمے اُس کی ماں نے کہا۔ ''جیری، کیا تم روز روز اِس ساحل پر آکر اُکتا گئے ہو؟ تم کہیں اور جانا چاہو گے؟''

''اوہ نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ اِس نے شرمندگی کا ناشناس احساس لیے ہوئے، ماں کی طرف دیکھا...... دلیری جیسا ایک احساس۔ لیکن اُس کے ہمراہ چلتے ہوئے وہ بے اختیار بول اُٹھا۔ ''میں اُن چٹانوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اُس نے اُس کی بات پر توجہ دی۔ وہ ایک ویران جگہ تھی اور وہاں کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا لیکن اُس نے کہا۔ ''بے شک جیری۔ تمھارے پاس جب بھی وقت ہو اُس وسیع ساحل پر یا اگر چاہو تو سیدھے بنگلے پر چلے جایا کرو۔'' وہ چلنے لگی تو اُس کا عریاں بازو، جو گزشتہ روز کی دھوپ کے باعث ہلکا سا سرخ پڑا ہوا تھا، جھولنے لگا۔ اُسے، اُس کا تنہا جانا، ناقابلِ برداشت لگا اور وہ بمشکل اُس کے پیچھے دوڑا

لیکن اُس تک نہیں پہنچ پایا۔

وہ سوچ رہی تھی: اب وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ میرے بغیر بھی محفوظ ہے۔ کیا میں اُسے بہت قریب رکھ رہی ہوں؟ اُسے یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اُسے میرے ہی ساتھ رہنا چاہیے۔ مجھے احتیاط کرنا ہوگی۔ وہ اس کا گیارہ سالہ اکلوتا بچہ تھا وہ خود بیوہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نہ تو حد سے زیادہ اس پر واری صدقے جائے اور نہ ہی اس سے زیادہ لاپروائی برتے۔ وہ پریشانی جھکتی ہوئی اپنے ساحل کی طرف چل گئی۔

جیری نے جب دیکھا کہ اُس کی ماں اپنے ساحل پر پہنچ گئی ہے تو اُس نے کھاڑی کی ڈھلوانی اُترائی اُترنا شروع کردی۔ وہ جس جگہ تھا وہاں پیالہ نما اونچی اونچی سرخی مائل بھوری چٹانیں تھیں، جن کے سروں پر سفیدی لیے نیلگوں سبز بہاؤ تھا۔ وہ نیچے اُترا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں پانی سے بھری سخت اور نوکیلی چٹانوں کی نالیاں بنی ہوئی ہیں، جن میں تازہ اور اُچھلتے ہوئے پانی کی سطح پر جامنی اور گہرے نیلے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ آخر میں اُسے چند گز اُور نیچے رگڑ کھاتے اور پھسلتے ہوئے سفید جھاگ کا ایک سرا اُور سفید ریت پر پانی کی ہلکی اور چمک دار حرکت دکھائی دی، جس سے پرے پانی جامد اور گہرا نیلا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا سیدھا پانی میں گیا اور تیرنے لگا۔ وہ ایک اچھا پیراک تھا۔ وہ تیزی سے چمکتی ہوئی ریت کی طرف اور وسطی حصے میں گیا جہاں چٹانیں سطحِ آب کے تلے بدرنگ عفریتوں کے مانند پڑی تھیں اور پھر وہ اصل سمندر میں پہنچ گیا..... گرم سمندر جس کی گہرائی سے آنے والی ناہموار لہروں نے اُس کی ٹانگیں شل کردیں۔

جب وہ بہت دُور نکل گیا تو وہ نہ صرف اپنے عقب میں موجود ایک چھوٹی سی کھاڑی کو دیکھ سکتا تھا بلکہ اپنے اور وسیع ساحل کے بیچ والی چٹان کو بھی۔ اس نے سطح پر تیرتے ہوئے اپنی ماں کو تلاشنے کے لیے نظریں دوڑائیں۔ وہ وہاں ایک چھتری کے نیچے ایک چھوٹے سے زرد ڈھیر کے مانند موجود تھی جو سنگترے کے چھلکے جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے وہاں پا کر وہ مطمئن ہو کے واپس ساحل کی طرف تیرنے لگا۔ لیکن وہ بالکل تنہا تھی۔

کھاڑی کے ایک طرف زمین کے چھوٹے سے مسطح حصے سے پرے چٹانیں بکھری ہوئی تھیں جن پر لڑکے اپنے لباس اتار کر رکھ رہے تھے۔ وہ الف ننگے دوڑتے ہوئے چٹانوں سے اُترے۔ انگریز لڑکا تیرتا ہوا اُن کی طرف گیا لیکن اُس نے خود کو ان سے قدرے فاصلے پر رکھا۔ وہ اُسی ساحلی علاقے کے تھے۔ اُن سب کے رنگ یکساں گہرے بھورے تھے اور وہ ناقابلِ فہم زبان بول رہے تھے۔ اُس کے اندر شدید خواہش ابھری کہ وہ بھی اُن میں سے ہوتا۔ جب وہ تیرتے ہوئے ان کے قریب پہنچا تو

اُنھوں نے پیچھے مڑ کر اُسے آنکھیں سکیڑتے ہوئے چوکنا نظروں سے دیکھا۔ پھر اُن میں سے ایک نے مُسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اتنا بھی بہت تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیر کر اُن کے قریب موجود ایک چٹان پر پہنچ گیا اور مایوسی سے ہیجان بھرے انداز میں مُسکرایا۔ اُنھوں نے اُسے بخوشی خوش آمدید کہا اور پھر جیسے ہی اُس کے اوسان بحال ہوئے وہ نا قابلِ فہم انداز میں مُسکرایا جس سے وہ سمجھ گئے کہ وہ اپنے ساحل سے بچھڑا ہوا اجنبی ہے اور انھوں نے اُس سے اپنی توجہ ہٹالی۔ لیکن وہ پھر بھی خوش تھا کہ وہ اُن کے ہمراہ ہے۔

اُنھوں نے ایک بلند مقام سے کھردری اور نوکیلی چٹانوں کے بیچ بار بار پہلے سمندر کے کنویں میں چھلانگیں لگائیں۔ غوطہ لگا کر وہ اُبھرتے، اِدھر اُدھر تیرتے اور دوبارہ چھلانگ لگانے کے لیے اوپر ٹھہر کر اپنی باری کا انتظار کرتے اور دوبارہ غوطہ لگاتے۔ وہ بڑے لڑکے تھے...... جیری کے لیے مرد کے برابر۔ اُس نے چھلانگ لگائی تو وہ اُسے دیکھتے رہے اور جب وہ اپنی جگہ پانے کے لیے اِدھر اُدھر تیرا تو انھوں نے اُسے جگہ دی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُسے قبول کرلیا گیا ہے۔ اُس نے اپنے آپ پر فخر کرتے ہوئے احتیاط سے دوبارہ غوطہ لگایا۔

کچھ ہی دیر بعد ان میں سے سب سے بڑے لڑکے نے پانی میں چھلانگ لگائی اور واپس نہیں اُبھرا۔ دُوسرے لڑکے کھڑے دیکھتے رہے۔ جیری چمک دار بھورے سر کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے کے بعد تنبیہی انداز میں پُکارا۔ انھوں نے کاہلی سے اُس کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں پانی کی طرف پھیرلیں۔ کافی دیر کے بعد لڑکا اپنے پھیپھڑوں میں بھری ہَوا گہری سانسوں سے خارج کرتا اور فاتحانہ انداز میں چیختا ہوا ایک بڑی سیاہ چٹان کی دُوسری سمت سے اُبھرا۔ فوراً ہی اُن میں سے ایک اَور کُود گیا۔ لمحہ بھر کے لیے فضا لڑکوں کی کلکاریوں سے بھری بھری لگتی اور پھر اگلے ہی لمحے خالی خالی سی۔ تاہم کثیف نیلے پانی میں گہرے رنگ کی شکلیں حرکت کرتی اور چلتی دکھائی دیتیں۔

جیری کُودا، پانی کی تہہ میں پیراکی کرنے والوں کے غول کے قریب سے گزرا، ایک بہت بڑی سیاہ دیوار کو اپنے سامنے دیکھا، اُس نے اُسے چھوا اور فوراً ہی اُوپر کی طرف اُٹھ گیا جہاں وہ دیوار کے پار ایک کم بلند رُکاوٹ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے اپنے نیچے کوئی نہیں دکھائی دیا۔ تہہ میں پیراکی کرنے والی مدہم شبیہیں غائب ہو چکی تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے لڑکے چٹان کی پرلی طرف سے اُبھرے تو وہ سمجھ گیا کہ وہ دیوار میں موجود خلا یا کسی سوراخ سے گزر کر گئے ہیں۔ اُس نے دوبارہ ڈبکی لگائی لیکن وہ آنکھوں میں چبھنے والے نمکین پانی میں سپاٹ دیوار کے سوا کچھ نہیں دیکھ پایا۔ جب وہ سطحِ آب پر آیا تو تمام لڑکے کُودنے والی چٹان پر موجود دوبارہ پھر وہی کارنامہ سرانجام دینے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اب وہ ناکامی کا دُکھ لیے انگریزی میں پکار اُٹھا: ''مجھے دیکھو، دیکھو!'' اور ایک احمق کُتّے کے مانند پانی اُچھالنے اور پاؤں مارنے لگا۔

اُنھوں نے ناراضی سے ماتھے پر بَل ڈال کے نیچے دیکھا۔ وہ چڑھی ہوئی تیوریاں پہچانتا تھا۔ ناکامی کے لمحات میں جب اُس کی احمقانہ حرکات اُس کی ماں کی توجہ کا باعث بنتیں تو وہ اُسے ایسی ہی ناراضی اور پریشان کر ڈالنے والے استفہام سے نوازتی تھی۔ اپنی بے حد خجالت اور چہرے پر کلنک کے داغ کی طرح چپکی کھسیانی ہنسی لیے، جسے وہ مٹانے سے قاصر تھا، اُس نے سر اُٹھا کر چٹان پر کھڑے بھورے لڑکوں کے گروہ کو دیکھا اور اُنگلیاں اپنے کانوں کے اردگرد گھماتے ہوئے چلّایا: ''ہیلو: شکریہ۔ خدا حافظ۔ جناب، جناب!''

اُس کے مُنھ میں پانی بھر گیا، وہ کھانسا، ڈوبا اور پھر اُبھر آیا۔ چٹان جو پہلے لڑکوں کے وزن سے دبی محسوس ہو رہی تھی لگتا تھا جیسے اب اُن کا وزن ہٹ جانے سے پانی سے اُوپر اُٹھ آئی ہو۔ اب وہ اُس کے نزدیک سے اُڑتے ہوئے پانی میں گو در ہے تھے اور فضا اُن کے گرتے ہوئے بدنوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر تپتی دُھوپ میں چٹان خالی رہ گئی۔ وہ شمار کرنے لگا: ایک، دو، تین ......

پچاس تک پہنچتے پہنچتے وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ وہ تمام کے تمام نیچے پانی میں بنے غاروں میں ڈوب رہے ہوں گے! سو پہنچ کر اُس نے قرب و جوار کی خالی پہاڑیوں کو تکنا شروع کر دیا اور کسی کو مدد کے لیے پکارنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ تیز تیز گننے لگا تا کہ وہ جلدی سے سطح پر آ جائیں ..... صبح کے خالی پن میں شمار کرنے سے زیادہ جو خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہونا ہے ہو جائے۔ پھر ایک سو ساٹھ پر پہنچ کر چٹان کی دُوسری سمت موجود پانی؛ بھوری ڈیل مچھلیوں جیسے لڑکوں سے بھر گیا۔ وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر ساحل کی طرف تیرنے لگے۔

اپنے چڈوں میں خارش بھری گرمی محسوس کرتے ہوئے، وہ واپس چھلانگ لگانے والی چٹان پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکے اپنے اپنے کپڑے اُٹھا کر ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دُوسری خلیج کی طرف جانے لگے۔ وہ اُس سے جان چھڑا رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار رَو پڑا۔ وہاں اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ اکیلا روتا رہا۔

اُسے لگا کہ خاصا وقت بیت گیا ہے اور وہ اُس طرف تیرنے لگا جہاں سے وہ اپنی ماں کو دیکھ سکتا تھا۔ ہاں، وہ اب بھی وہاں موجود تھی، ایک سنگتری چھتری تلے ایک پیلا ڈھیر۔ وہ بڑی چٹان کی طرف تیرا، اُوپر چڑھا اور نیلے پانی میں تر نگی اور خطرناک گول چٹان کے بیچ گو د گیا۔ وہ اتنا نیچے اُترا کہ اُس نے دوبارہ چٹانی دیوار کو چھو لیا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں بھرا ہوا نمک اِس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ سطح پر آیا، ساحل کی سمت تیرا اور بنگلے پر جا کر اپنی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی وہ پٹیوں والا بیگ جھلاتی، اپنا گلابی اور عریاں بازوں ایک طرف ہلاتی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آئی۔ ''مجھے

پیرا کی والا چشمہ چاہیے۔'' اُس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے ضد بھرے انداز میں فرمائش کی۔

اُس نے سرسری انداز میں بولتے ہوئے، اُس کی طرف پُرسکون اور استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ''خوب، ضرور پیارے۔'' ''لیکن ابھی! ابھی! ابھی!'' وہ کسی اَور وقت نہیں بلکہ..... فوراً ہی، اُسی لمحے چشمہ لینا چاہتا تھا۔ اُس نے تب تک اصرار جاری رکھا جب تک کہ وہ اُس کے ساتھ چشمہ خریدنے چل نہیں دی۔ جیسے ہی اس نے چشمہ خریدا، اُس نے اُسے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے یوں چھینا جیسے وہ اُسے خود اپنے لیے رکھنا چاہ رہی ہو اور خلیج کو جانے والے ڈھلوانی راستے پر بھاگتا چلا گیا۔

جیری بڑی رکاوٹی چٹان کے گرد تیرنے لگا۔ اُس نے چشمہ درست کیا اور غوطہ لگایا۔ پانی کے دباؤ نے ربڑ کے خلا کو توڑ دیا جس سے چشمہ ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے سطحِ آب سے نیچے چٹان کی جڑ تک تیرنا ہوگا۔ اُس نے سختی اور مضبوطی سے چشمہ کو کس کر اپنے پھیپھڑوں میں ہَوا بھری اور منہ نیچے پانی کی جانب کیا۔ اب وہ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُس کی آنکھیں اَور طرح کی ہو گئی ہیں..... مچھلی جیسی جو اُسے ہر شے واضح، لطیف اور رَوشن پانی کی لہریں دکھا رہی تھیں۔

اُس کے چھے سات فٹ نیچے چمک دار سفید ریت کا ایک مکمل صاف ستھرا فرش تھا جس سے مضبوط بلبلے اور سخت لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ وہاں لکڑی کی اور لمبی گول گیلیوں یا سلیٹ کے مانند دو، سرمئی چیزیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ وہ مچھلیاں تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک دُوسرے کے منہ سے منہ جوڑے بےحس و حرکت سیدھی کھڑی ہیں۔ پھر اُنھوں نے اچانک آگے کی سمت حرکت کی اور اپنے رُخ بدلے اور پھر دوبارہ گھومیں۔ وہ ایک طرح کا رقصِ آب تھا۔ اُن سے چند انچ اُوپر پانی یوں جگمگا رہا تھا جیسے اُس میں ستارے گر رہے ہوں۔ پھر مچھلیاں..... ننھی ننھی مچھلیوں کی نوع بہ نوع قسمیں، محض ناخن جتنی بڑی..... پانی میں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اُسے اُن کے بےشمار ننھے ننھے لمس اپنی ٹانگوں اور بازوؤں پر محسوس ہوئے۔ اُسے لگا جیسے وہ چاندی کے مہین ٹکڑوں میں تیر رہا ہو۔ عظیم الجثہ چٹان؛ جس میں سے بڑے لڑکے تیر کے پار جاتے تھے، سفید ریت پر تن کر کھڑی تھی اور اُس پر ہلکی ہلکی آبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ وہ اُس کی جڑ تک گیا لیکن اُسے، اُس میں کوئی خلا نظر نہیں آیا۔

وہ بار بار اُوپر جاتا، اپنے سینے میں ہَوا بھرتا اور پانی میں اُترتا رہا۔ بار بار اُس نے چٹان کی سطح کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر اُس کا لمس محسوس کیا اور اُس میں داخلے کی جگہ کی تلاش میں مایوسانہ انداز میں اُس سے تقریباً لپٹ گیا۔ پھر ایک مرتبہ جب وہ سیاہ دیوار سے چمٹا ہوا تھا تو اُس کے گھٹنے اُٹھے، اُس نے اپنے پیروں کو آگے کی طرف دھکیلا تو راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ اُسے سوراخ مل گیا تھا۔

وہ سطح تک پہنچا اور راستے کی رکاوٹ چٹان کے اردگرد پھیلے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور پیروں سے ہٹایا یہاں تک کہ اُسے ایک بڑی کھوہ مل گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو بازوؤں کے بَل چٹان کے ساتھ

گرا دیا۔ وہ وزنی ہو کر سیدھا ریتلے فرش پر گرا۔ اُس نے مضبوطی سے پتھر سے چمٹ کر اُس اندھیرے مقام میں دیکھا جہاں اُس کے پاؤں داخل ہوئے تھے۔ وہ سوراخ میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ناہموار اور اندھیرا خلا تھا جس میں دُور تک نظر نہیں آتا تھا۔ اُس نے چٹان سے ہٹا کر اپنے ہاتھ کھوہ کے کناروں پر رکھے اور خود کو دھکیل کر اُس میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

اُس کا سر اندر داخل ہو گیا لیکن کندھے پھنس گئے جنھیں اُس نے ایک طرف گھمایا تو وہ کمر تک کھوہ کے اندر چلا گیا۔ اُسے آگے کچھ دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ کوئی نرم اور چکنی شے اُس کے مُنھ سے ٹکرائی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ سرمئی چٹان کے ساتھ ساتھ گہری کائی حرکت کر رہی تھی۔ اُس کے اندر خوف بھر گیا۔ اُسے ہزار پا اور چمٹ جانے والی آبی گھاس کا خیال آیا۔ اُس نے اپنے آپ کو واپس باہر کی طرف دھکیلا اور پیچھے ہٹتے ہوئے سرنگ کے منھ میں پتلی اور لمبی آبی گھاس کو بہتے دیکھا۔ اُس نے اپنے نیچے پانی کے نیلے کنویں پر نظر ڈالی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنا راستہ اُسی غار یا کھوہ یا سرنگ میں ڈھونڈ کر پار جا سکے گا۔

اُس نے سوچا کہ سب سے پہلے اُسے سانس پر قابو پانا ہوگا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک اور بڑا پتھر تھام کر پانی میں اتر گیا تا کہ وہ بلا تگ و دو سمندر کی تہہ میں پڑا رہ سکے۔ اُس نے شمار کیا: ایک، دو، تین۔ وہ مسلسل گنتی کرتا گیا۔ وہ اپنے سینے میں خون کی روانی کی آواز سن سکتا تھا۔ اکیاون، باون...... اُس کا سینہ دُکھنے لگا تھا۔ اُس نے پتھر کو چھوڑا اور اُوپر فضا میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ سُورج نیچے آ گیا ہے۔ وہ کوٹھی کی طرف بھاگا اور ماں کو کھانا کھاتے پایا۔ اُس نے صرف اتنا کہا۔ ''تم نے لطف اٹھایا؟'' اور اُس نے جواب دیا۔ ''جی۔''

شب بھر لڑکا چٹان میں پانی سے بھری غار کے خواب دیکھتا رہا اور جیسے ہی ناشتہ ختم ہوا وہ ساحل پر چلا گیا۔ اُس رات اُس کی ناک سے بری طرح خون بہہ نکلا۔ وہ سانس پر قابو پانے کے لیے گھنٹوں زیرِ آب رہا تھا اور اب اُسے کمزوری اور چکر محسوس ہو رہے تھے۔ اُس کی ماں نے کہا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی کسی کام میں زیادتی نہ کرتی۔''

اُس روز اور اُس سے اگلے روز جیری پھیپھڑوں کی مشق کرتا رہا جیسے ہر شے، اُس کی تمام زندگی اور اُس کی زندگی موت اُسی پر منحصر ہو۔ اُس شب پھر اُس کی ناک سے خون بہنے لگا تو اُس کی ماں نے ہدایت کی اگلے روز وہ اُس کے ساتھ رہے گا۔ یہ چیز اُس کے لیے نہایت اذیت ناک تھی۔ اِس کا مطلب، اُس کی محتاط خود تربیتی کے ایک دن کے زیاں کے مترادف تھا لیکن وہ اُس روز اُس دُوسرے ساحل پر اپنی ماں کے ہمراہ رہا جو اَب اُسے چھوٹے بچوں کا ساحل لگتا تھا جہاں اُس کی ماں بحفاظت لیٹی دھوپ سینک سکتی تھی۔ اگلے روز اُس نے اپنے ساحل پر جانے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ اِس سے قبل کہ اُس کی ماں معاملے کی نزاکت کو سمجھتی وہ وہاں سے چلا گیا۔ اُسے ادراک ہوا کہ ایک دن کے آرام

سے اُس کے شمار میں دس تک کا اضافہ ہوگیا ہے۔ بڑے لڑکوں نے وہ فاصلہ اُس کے ایک سو ساٹھ تک گننے کے دوران میں عبور کیا تھا۔ وہ اپنے خوف کے باعث تیزی سے گن رہا تھا۔ غالباً اب اگر وہ کوشش کرتا تو اُس طویل سرنگ کو عبور کر سکتا تھا لیکن وہ ابھی یہ کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ احتیاط، طفلانہ اصرار اور بے صبری کے سرکش گھوڑے کو لگام دینے نے، اُسے انتظار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اِس دوران میں وہ زیرِ آب سفید ریت پر اپنے ہمراہ اوپر فضا سے لائے ہوئے پتھروں کو اِدھر اُدھر بکھیرتے ہوئے لیٹا سرنگ کے دہانے کا جائزہ لیتا رہا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، اُسے اُس کی ہر نوک دار اور ناہموار جگہ کے بارے میں علم ہوگیا۔ وہ ویسی ہی نوکیلی تھی جیسی اُس کے کندھوں نے پہلے محسوس کی تھی۔

جب اُس کی ماں پاس نہ ہوتی تو وہ گھڑیال کے پاس بیٹھ کر اپنے سانس پر قابو کے وقت کی پڑتال کرتا۔ اُس کی کارکردگی غیر معمولی تھی کہ وہ بلا تکلیف دو منٹ تک سانس روک سکتا تھا۔ ''دو منٹ'' کے الفاظ کی تصدیق گھڑیال نے کی جس نے اُس کے نزدیک انتہائی اہم مہم جوئی کو اُس کے قریب کر دیا تھا۔

ایک صبح اُس کی ماں نے سرسری انداز میں کہا کہ اگلے دو چار روز میں اُنھیں گھر جانا ہوگا۔ رَوانگی سے ایک روز قبل وہ یہ کام سرانجام دے گا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ اُسے یہ کام کرنا ہوگا خواہ یہ اُس کی جان ہی کیوں نہ لے لے۔ لیکن روانہ ہونے سے دو دن پہلے......

فتح کا ایک دن آیا جب اس کی گنتی پندرہ زیادہ ہوگئی...... اُس کی ناک سے بے تحاشا خون بہا کہ اُسے چکر آنے لگے اور وہ مُردنی سے آبی گھاس کی طرح بڑی چٹان پر پڑا گاڑھے سرخ خون کو چٹان پر بہتا اور دھیرے دھیرے سمندر میں گرتا دیکھتا رہا۔ وہ ہراساں ہوگیا۔ اگر اُسے سرنگ میں چکر آ گیا تو؟ اگر وہ وہاں مر گیا یا پھنس گیا تو؟ اگر...... تیز دھوپ کی گرمی اُس کے دماغ کو چڑھ گئی تو وہ تقریباً مر ہی جائے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ گھر جا کر ٹِک کر بیٹھ جائے اور اگلے موسم گرما میں جب وہ ایک سال اور بڑا ہو جائے گا تب شاید وہ سُرنگ عبور کر سکے۔

لیکن فیصلہ کر لینے کے بعد بھی، یا اُس کے خیال میں اُس نے فیصلہ کر لیا تھا، وہ وہیں چٹان پر بیٹھا پانی کو تکتا رہا۔ اُسے علم تھا کہ اب اُس کی ناک سے خون بہنا بند ہوگیا ہے لیکن اُس کے سر میں اب بھی درد اور اُکھاڑ پچھاڑ ہے...... یہی وہ وقت ہے جب وہ کوشش کر سکتا ہے۔ اگر اُس نے اب یہ نہیں کیا تو کبھی نہیں کر سکے گا۔ وہ خوف سے کپکپا رہا تھا کہ وہ نہیں جائے گا اور پانی میں چٹان تلے اُس سرنگ کی طوالت کی دہشت سے کانپ رہا تھا۔ پانی سے باہر دھوپ میں بھی وہ رُکاوٹی چٹان بہت چوڑی اور بہت بھاری دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے جہاں جانا تھا وہاں ٹنوں وزنی چٹان زمین میں دھنسی تھی۔ اگر وہ وہاں مر گیا تو وہ وہیں تب تک پڑا رہے گا...... شاید اگلے سال تک...... جب وہی لڑکے اُس میں تیریں

گےاور راستہ بند پائیں گے۔

اُس نے اپنا چشمہ چڑھایا، اُسے مضبوط کیا اور خلا کا جائزہ لیا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے سب سے بڑے پتھر کا انتخاب کیا اور چٹان کے کنارے سے سرک کر ٹھنڈے اور چاروں طرف پھیلے پانی میں آدھا اُتر گیا۔ اُس کا آدھا بدن تپتے سورج میں تھا۔ اُس نے ایک بار خالی آسمان کو دیکھا، ایک بار، دوبارا پنے پھیپھڑوں میں ہَوا بھری اور پھر پتھر کے ہمراہ تیزی سے تہہ میں جانے کے لیے پانی میں غوطہ لگا دیا۔ نیچے جاتے ہوئے اُس نے شمار کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے کھوہ کے کناروں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنے آپ کو اُس میں داخل کر دیا۔ کندھوں کو حشرات کے مانند اطراف میں ہلکی حرکت دیتے ہوے، اُسے یاد آیا کہ اُسے یُوں ہی حرکت دینا چاہیے تھی اور اپنے آپ کو پیر مارتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

جلد ہی وہ، اندر ایک شفاف مقام پر پہنچ گیا۔ وہ پتھروں سے گھری ایک چھوٹی سی کھوہ میں تھا جو پیلگوں خاکستری پانی سے بھری تھی۔ پانی اُسے کھوہ کی چھت کی طرف دھکیل رہا تھا۔ چھت نوکیلی تھی اور اس کی کمر دُکھنے لگی۔ اُس نے ہاتھوں کے ذریعے اپنے آپ کو کھینچا...... تیز، تیز ...... اور اپنی ٹانگوں کو لیور کی طرح استعمال کرنے لگا۔ اُس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا تو تیز درد سے چکرا گیا۔ پچاس، اکیاون، باون ...... وہ اندھیرے میں تھا اور پانی چٹان کے وزن سے اُسے دبا رہا تھا۔ اکہتر، بہتر ...... اُس کے پھیپھڑوں میں کوئی کھنچاؤ نہیں تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ ایک تیرتا ہوا غبارہ ہو۔ اُس کا سینہ نہایت ہلکا پھلکا اور آرام دہ تھا لیکن اُس کے سر میں اب بھی اُچھل کُود ہو رہی تھی۔

وہ مسلسل تیکھی چھت سے دب رہا تھا جو پھسلواں اور نوکیلی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ایک بار پھر ہزار پا کا خیال آیا اور سوچنے لگا کہ اگر سرنگ آبی گھاس سے بھر جائے تو وہ اُسے جکڑ لے گی۔ وہ خوف زدگی کے عالم میں بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور سر جھکا کر تیرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ پیر آزادانہ حرکت کر رہے تھے جیسے وہ کھلے پانی میں ہو۔ کھوہ کشادہ ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ اُسے تیزی سے تیرنا چاہیے اور وہ اپنے سر میں ہونے والے دھماکے سے ڈر گیا کہ اگر سرنگ تنگ ہو گئی تو ......!

ایک سو، ایک سو ایک ...... پانی کا رنگ ہلکا پڑ گیا۔ اُس کے اندر فتح کا جوش بھر گیا۔ اُس نے کہا: ایک سو پندرہ اور پھر بہت دیر بعد: ایک سو پندرہ۔ اُس کے اردگرد پانی ہیرے کے مانند صاف شفاف تھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ اُس کے سر پر چٹان میں ایک شگاف ہے جس سے آتی دھوپ اندھیری چٹان کو روشن کر رہی ہے اور آگے ایک پچھلی اور اندھیرا ہے۔

وہ اپنے کام کے انجام کے قریب تھا۔ اُس نے اُوپر شگاف کی سمت دیکھا جو پانی کے بجائے ہَوا سے بھرا ہوا لگ رہا تھا، جس میں وہ اپنا منھ داخل کر کے سانس لے سکتا تھا۔ ایک سو پندرہ، اُس نے

اپنے آپ کو اپنے ذہن میں کہتے سنا......لیکن یہ اُس نے بہت دیر بعد کہا تھا۔ اُسے اپنے آگے اندھیرے میں جانا ہوگا ورنہ وہ ڈوب جائے گا۔ اُس کا سر وزنی ہو رہا تھا اور پھیپھڑے پھٹنے کو تھے۔ ایک سو پندرہ، ایک سو پندرہ اُس کے دماغ میں گونجتا رہا اور اُس نے اندھیرے میں ناتوانی سے چٹان پکڑ کر اپنے آپ کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے دھوپ سے روشن مختصر سی جگہ اپنے پیچھے چھوڑ دی۔ جلد ہی اُس پر نیم غشی طاری ہوگئی۔ وہ نیم غشی کے عالم میں جدّ وجہد کرتا رہا۔ بہت زیادہ تیزی سے بڑھتے ہوا درد اُس کے سارے سر میں بھر گیا۔ پھر اندھیرے میں سبز روشنی کا دھارا نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھوں نے کسی شے کو محسوس کرتے ہوئے آگے سمت کی حرکت کی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اُس کے پیروں نے پیچھے کی سمت ٹھوکریں لگا کر اُسے کھلے سمندر میں دھکیل دیا۔

وہ سطحِ آب کی جانب تیرا اور اُس کا چہرہ فضا میں بلند ہوا۔ وہ مچھلی کے مانند تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ اب نیچے پانی میں گر کر ڈوب جائے گا کہ اب وہ عقب میں چند قدم پر واقع چٹان تک تیرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ پھر اُس نے چٹان کو پکڑتے ہوئے اپنے آپ کو کھینچ اُس کے اوپر لاد دیا۔ وہ اوندھے منہ لیٹ کر گہرے سانس لینے لگا۔ اُسے سرخ رگوں اور جمے ہوئے خون کے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کی آنکھیں شدید زخمی ہوگئی ہوں گی اور ان میں خون بھرا ہوگا۔ اُس نے چشمے کو توڑ کر پھینکا تو خون کی دھار سمندر میں گری۔ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا جس نے چشمے کو بھر دیا تھا۔ اُس نے ٹھنڈے اور نمکین سمندر سے چلّو بھر پانی لے کر اپنے منھ پر مارا تو اُسے کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ اُس کے منھ نے جو ذائقہ لیا ہے وہ خون کا ہے یا نمکین پانی کا۔ کچھ دیر بعد اُس کا دل تھم گیا اور نگاہیں صاف ہوگئیں تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ وہ آدھ میل کے فاصلے پر مقامی لڑکوں کو غوطے لگاتے اور کھیلتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ ان کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر جا کر بستر پر پڑنے کے سوا کچھ نہیں چاہتا تھا۔

جلد ہی وہ تیرتا ہوا ساحل کی طرف گیا اور دھیرے دھیرے اوپر چڑھ کر بنگلے کو جانے والے راستے پر ہولیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بستر پر گرایا اور سوگیا۔ اُس کی آنکھ بیرونی راستے پر قدموں کی آواز سے کھلی۔ اُس کی ماں واپس آرہی تھی۔ وہ یہ سوچتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگا کہ وہ اُس کے چہرے پر خون کے داغ یا آنسوں کے نشان نہ دیکھ لے۔ وہ غسل خانے سے باہر آکر اُس سے ملا تو وہ بنگلے میں مسکراتی ہوئی داخل ہو رہی تھی اور اُس کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

"اچھی صبح گزری؟" اُس نے اپنا سر ایک لمحے کے لیے اُس کے گرم بھورے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ، ہاں۔ شکریہ۔" وہ بولا۔

''تم کچھ پیلے نظر آ رہے ہو۔'' پھر تیکھے اور پریشان لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم نے اپنا سر کیسے پھوڑا؟''

''اوہ، یہ ٹکرا گیا تھا'' اُس نے اُسے بتایا۔

اُس نے اُسے قریب سے دیکھا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں گِید دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی۔ پھر وہ اپنے آپ سے بولی۔ ''اوہ، بلاوجہ پریشان مت ہو! کچھ نہیں ہوگا۔ وہ مچھلی کے مانند تیر سکتا ہے۔''

وہ اکٹھے دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

''ممی۔'' وہ بولا۔ ''میں پانی میں کم ازکم دو تین منٹ ٹھہر سکتا ہوں۔'' یہ بات اُس کے منھ سے بے ساختہ نکلی تھی۔

''واقعی، پیارے؟'' اُس نے کہا۔ ''خوب، میں کسی کام میں زیادتی نہیں کرتی۔ میرا نہیں خیال کہ آج تم اور بھی پیرا کی کرو۔'' وہ ارادوں کی جنگ کے لیے تیار تھی لیکن جیری نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔ اب ساحل پر جانے کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

VVVV

جے ایم جی لی کلیز یو
(J. M. G. Le Clezio)

۲۰۰۸ء کے ادب کے نوبیل انعام کے لیے لی کلیز یو کے نام کا اعلان کرتے ہوئے سویڈش اکیڈمی نے مؤقف اختیار کیا: ''وہ نئی مہاجرتوں، شعری مہم جوئی اور حسیاتی وجد آفرینی کے تصنیف کار اور تہذیب سے دُور اور نچلی سطح پر واقع انسانیت کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔''

پُورا نام جین میری گُستاف لی کلیز یو ۱۳-اپریل ۱۹۴۰ء کو جنگِ عظیم دوم کے دوران فرانس میں اپنی ماں کے آبائی شہر نائس میں پیدا ہوئے۔ لیکن ددھیالی اجداد کا تعلق موریشس سے تھا جو فرانس کے بعد ۱۸۱۰ء سے برطانیہ کے زیرِ تسلط تھا۔ اُنھوں نے چالیس سے زائد کتب تحریر کیں جن میں سے پہلی دو کتابیں صرف آٹھ برس کی عمر میں لکھیں جو اُن کے نائیجیریا کے ایک ماہ پر محیط بحری سفر اور نائیجیریا میں قیام کی یادوں پر مبنی ہیں۔ اس سفر نے لی کلیز یو پر دُور رس اثرات مرتب کیے اور اسی دوران اُنھوں نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز ''آنے والی کتب'' کی فہرست کے ساتھ بہ یک وقت ''Un Long Voyage'' اور ''Oradi'' لکھ کر کیا۔ محض تئیس برس کی عمر میں پہلے ناول ''The Interogation'' پر سال ۱۹۶۳ء کا Prix Renaudot انعام حاصل کیا اور اس انعام کے لیے مرتب ہونے والی مختصر فہرست میں شامل ہو کر معروف ادیبوں کی صف میں آ کھڑے ہوئے۔ لی کلیز یو کو نوجوانی ہی میں پہلے ناول سے پذیرائی ملنے کا سبب اُس نوجوان لکھاری کا زبان کو روزمرہ استعمال سے اُٹھا کر اعلیٰ مسند پر بٹھاتے ہوئے اُس میں اصلی اور حقیقی رُوح پھونکنا تھا۔

لی کلیز یو اس دنیائے ہست و بود میں آئے تو اُن کے والد برطانوی فوج کے ہم راہ نائیجیریا میں بطور ڈاکٹر فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اُن کے فرانسیسی النسل والد برطانوی تسلط کے موریشس کے باسی تھے۔ لی کلیز یو کے دادا فرانکوائس ایگزس نے ۱۷۹۸ء میں برٹینی کے جنوبی ساحلی شہر موربیہان سے فرانس آ کر موریشس کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ لی کلیز یو موریشس میں چند ماہ سے زائد قیام پذیر نہیں رہے لیکن اُن کا کہنا ہے کہ وہ خُود کو فرانسیسی موریشسی دونوں سمجھتے ہیں اور موریشس اُن کا ''چھوٹا وطن'' ہے۔ اُن کی پرورش ۱۹۴۸ء تک نائس کے قریبی گاؤں روکیوبیلیئر میں ہوئی۔ اسی برس جب وہ آٹھ برس کے تھے تو اُنھوں نے، اُن کی والدہ اور بھائی نے باپ کے پاس جانے کے لیے بحری سفر اختیار کیا۔ لی کلیز یو کا ناول ''Ontisha'' جزوی خُود نوشت ہے۔ اسی طرح ۲۰۰۴ء میں بھی اُنھوں نے نائیجیریا میں اپنے بچپن اور والدین کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کیا ہے۔

اُن کی پرورش بہ یک وقت دو زبانوں کے ساتھ ہوئی: فرانسیسی اور انگریزی۔ ۱۹۵۰ء میں اُن کا خاندان واپس نائس آ گیا۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُنھوں نے ۵۹-۱۹۵۸ء میں برسٹل یونیورسٹی سے انگریزی پڑھی اور ۱۹۶۳ء میں انڈر گریجوایٹ کی ڈگری نائس کے انسٹی ٹیوٹ ڈی ایتوڈیس لٹیریس سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۶۴ء میں ماسٹر ڈگری مقالہ ''Henri Michaux'' لکھ کر یونیورسٹی آف آئیکس این پروانس سے حاصل کی۔ ۱۹۸۳ء میں یونیورسٹی آف پیرپگنان سے ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ میکسیکو پر بیرونی تسلط تاریخ کے عنوان سے لکھا۔ مقالہ ایک فرانسیسی جریدے میں قسط وار شائع ہونے کے بعد ۱۹۸۵ء میں ہسپانوی میں ترجمہ ہوا۔ لی کلیزیو نے بنگاک، میکسیکو سٹی، بوسٹن، آسٹن اور البکرک جامعات میں بطور معلّم خدمات سرانجام دیں۔ اُنھوں نے جنوبی کوریا کے بھی متعدد دورے کیے اور ۲۰۰۷ء میں سیول میں یوہا (Ewha) یونیورسٹی میں فرانسیسی ادب پڑھایا۔ لندن اور برسٹل میں کئی برس کے قیام کے بعد اُنھوں نے بحیثیت اُستاذ امریکا کا رُخ کیا۔ لی کلیزیو کی تحریر کردہ چالیس سے زائد کتب میں ناول، افسانوی مجموعے، سفرنامے، قدیم امریکی اسطورہ پر تراجم کی دو کتب اور بچوں کے ادب پر کتابیں شامل ہیں۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۵ء تک لی کلیزیو نے مجنونیت، زبان اور اُسلوب کو اپنے موضوعات میں پیشِ نظر رکھا۔ پھر اپنے آپ کو عام تجربات کے لیے وقف کیا۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد اُن کا اُسلوب یکایک تبدیل ہو گیا۔ تجربات کو ترک کیا اور اُن کے ناولوں اور سفرناموں کا مزاج کم متشدد ہو گیا جنھیں وہ بچپن سے برتتے چلے آ رہے تھے اور جو لوگوں میں خاصا مقبول تھا۔ آغاز میں لی کلیزیو نے ماحول کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جن میں ۱۹۶۹ء کا ''Terra Amata''، ۱۹۷۱ء کا ''The Book of Flights''، ۱۹۷۳ء کا ''The Giants'' شامل ہیں۔ لیکن جس ناول نے یکسانیت کو توڑتے ہوئے اُنھیں بامِ عروج پر پہنچایا وہ ہے: ۱۹۸۰ء کا ناول ''Desert''۔ جسے ۱۹۹۴ء میں اکادمی ادبیات فرانس کا نیا نیا شروع ہونے والا انعام گرانڈ پرکس پال ماراند نامی پہلا انعام ملا۔ اِس ناول میں اُنھوں نے شمالی افریقا کے صحرا کے عظیم لوگوں کے تذکروں کے ساتھ ساتھ غیر قانونی مہاجرین کو بھی یورپ کی نظر سے دیکھا۔ ناول کا مرکزی کردار ایک الجیروی مزدور لگتا ہے جو یورپی معاشرے کی خُوب صُورتی اور بدصُورتی کا مثالی متضاد نکتہ ہے۔ لی کلیزیو کے دیگر اہم ناولوں میں ''The Prospector''، ''Wandering Star''، Revolutions وغیرہم شامل ہیں۔ ایک فرانسیسی جریدے لیرے (Lire) کے سروے کے مطابق تیرہ فیصدی قارئین نے اُنھیں فرانسیسی زبان کا بہترین حیات (ہم عصر) مصنف قرار دیا۔ لی کلیزیو نے اپنے کہانیوں کے مجموعوں ''Fever'' اور ''The Flood'' میں اُن انسانی المیوں کو احسن طور پر بیان کیا ہے جو بڑے مغربی شہروں میں مصائب و آلام کا سبب بنتے ہیں۔

میکسیکو اور مشرقی امریکا میں اُن کے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء کا چار سالہ قیام نے اُن پر گہرے اور نتیجہ خیز اثرات مرتب کیے اور وہ بڑے شہروں کو الوداع کہہ کر انڈینوں کے ساتھ تعلقات کی نئی حقیقتوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اُن کی ملاقات مورو کون جیمیا نامی خاتون سے ہوئی جس سے اُنھوں نے ۱۹۷۵ء میں

شادی کرلی۔ اُسی برس (۱۹۷۵ء میں) وہ سینٹرل امریکا کے تجربات کو ضبطِ تحریر میں لائے اور انڈین روایات کے اہم کاموں کے تراجم شروع کر دیے۔ یوں لی کلیز یو بچپن ہی سے متواتر لکھتے رہے اور اُن کی آخری تصنیف ''Ballaciner'' ۲۰۰۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ حال ہی میں اُنھوں نے ایک فلم ''Ritounelle'' بنائی ہے۔ نوبیل انعام کے علاوہ لی کلیز یو کو ملنے والے اعزازات کی ایک طویل فہرست ہے۔

اپنے نوبیل خطبے کا عنوان ''In the Forest of Paradoxes'' اُنھوں نے سٹگ ڈیگرمین سے مستعار لیا ہے جن کے وہ بے حد مداح ہیں اور اپنے نوبیل اعزاز کو ایک وحشی عورت ایلو را کے ساتھ دُنیا بھر کے معروف لکھاریوں کے نام شمار کرتے ہوئے اُنھیں معنون کیا ہے جن میں ''آگ کا دریا'' کی مصنفہ قرۃ العین حیدر بھی شامل ہیں۔ لی کلیز یو کے فن و فکر اور اُسلوب پر روشنی ڈالتی نوبیل خطبے کی چیدہ چیدہ باتیں:

''ہم کیوں لکھتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اِس سادہ سوال کا ہر کسی کا اپنا جواب ہے۔ کوئی اپنے اظہار کے لیے، کوئی اپنے ماحول تو کوئی اپنے ذاتی حالات کے پیشِ نظر۔ اگر میں اُن حالات کا جائزہ لوں جنھوں نے مجھے لکھنے کی تحریک دی تو یہ محض میری اُمنگ نہیں درستی کی تمنا بھی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ اِس کا آغاز جنگ کے سبب ہوا۔ ......نہیں، میرے نزدیک جنگ عام آدمی کا تجربہ ہے، بالخصوص سب سے پہلے اور سب سے اہم ننھے بچوں کا۔ مجھے جنگ کبھی تاریخی واقعہ نہیں لگی۔ ہم فاقہ زدہ، سراسیمہ اور سردی کے مارے ہوئے تھے ......مجھے یاد ہے کہ جنگ کے بعد ہم تہی دست تھے، خاص طور پر کتابوں اور لکھنے پڑھنے کی چیزوں سے۔ روشنائی اور کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ایک بڑھئی کی سُرخ اور نیلی پنسلوں سے ناپختہ تصویریں بنائیں اور راشن بُک کی پشت پر لکھا۔ ......بچوں کی کتابوں کی عدم دستیابی کی بنا پر اپنے دادا کی لغات پڑھیں۔ جو مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔ جن سے میں نے دُنیا بھر کے الفاظ سیکھے اور ناآشنا لفظوں کی فہرستوں، توجیہات اور نقشوں میں اُلجھا۔ ......بچوں کو میدانوں میں کم ہی کھیلنے دیا جاتا تھا کیوں کہ میدانوں اور باغوں میں بارودی سُرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ ...... اِن حالات میں راہِ فرار اختیار کرنے پر غور کرنا سہل ہے۔۔ پس، میں خواب دیکھنے اور پھر اُن خوابوں کو ضبطِ تحریر میں لانے لگا۔ طرّہ یہ کہ میری نانی میں کہانیاں کہنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی اور وہ طویل سہ پہروں کو ہمیں کہانیاں سُنانے بیٹھ جاتیں۔ ......کتابیں میری زندگی میں بہت بعد میں داخل ہوئیں۔ جب میرے والد کی وراثت تقسیم ہوئی تو اُن کے کئی کتب خانے تھے۔ ......مجھے فوراً ہی اِس سچائی کا ادراک ہو گیا کہ جا ئیداد یا بینک کے کھاتے سے کتابیں زیادہ قیمتی خزانہ ہیں۔ اُن ضخیم کتابوں سے، جن میں اکثر عہدِ عتیق اور کار بند علم پر مبنی تھیں، میں نے دُنیا کے عظیم ادب کو سمجھا۔ ......لیکن جن کتب نے مجھے متاثر کیا وہ سفری شاعری اور کہانیاں تھیں یا پھر ......سفرنامے۔ ......اُن کتابوں نے مجھے ذوقِ مہم جوئی عطا اور میرے اندر دُنیا کی وسعت کا احساس پیدا کیا، مجھ پر علم کی بجائے جبلت اور احساسات کا در کھولنے کا واسطہ بنیں۔ ......''لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کے تضادات کا جنگل''، سٹگ ڈیگرمین اسے یہی کہہ کر پکارتا ہے، درست طور پر تصانیف کی سلطنت ہے، ایسا مقام جہاں سے فن کار راہِ فرار اختیار نہیں کرتا بل کہ ڈٹ کر جزئیات کا جائزہ لیتا، راستہ تلاشتا ہے۔ ......لغوی اور اصطلاحی مفاہیم

میں تضادات کوئی نئی چیز نہیں۔فرانسیسی زبان کے عظیم تصنیف کار فرانکو اس رابیلیاس نے مرصع و بلیغ دانش وروں کی جماعت کے خلاف سوربون میں عام زبان سے الفاظ چُن کر اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔......چوں کہ فن کار متنوع روّیوں کا مشاہدہ کرتا ہے جنھیں شبہات سے پاک کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اُس کی بغاوت، ردّ و قدح اور توہین سرحد کے ایک سمت رہتی ہیں، زبان کی قوت کی سمت۔......پھر کیوں لکھا جائے؟ کچھ عرصے سے لکھاریوں کا یہ یقین ختم ہو گیا کہ وہ دُنیا میں کوئی تبدیلی لاسکتے ہیں، وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں سے کوئی بہتر مثال قائم کر سکتے ہیں کہ زندگی کیسے بسر کی جائے۔......دو وجوہات کی بنا پر ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔اوّلاً ادب زبان کے لیے بنا ہے۔الفاظ ابتدائی حسیات کو واضح کرتے ہیں اور مختصر کہانی اور ناول کے لیے الفاظ اسی نظریے کے تحت وجود پاتے ہیں۔یونانی زبان کے فعل (verb) پوئی اِن (poiein) کے مطابق نئے الفاظ تخلیق پاتے ہیں۔ادیب، شاعر اور ناول نگار سب خالق ہیں۔اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ زبان تخلیق کرتے ہیں بل کہ اس کا مطلب ہے کہ وہ زبان کا برتاؤ حسن، خیالات اور تصورات کی تخلیق کے لیے کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بغیر ہمارا گزارا نہیں۔انسانی تاریخ میں زبان کی ایجاد غیر معمولی ہے جو تمام ایجادات سے قبل ہوئی اور اس ایجاد نے ہمیں اس اہل کیا کہ ہم ہر شے بانٹ سکیں۔زبان کے بغیر سائنس ہوتی نہ ٹیکنالوجی، قانون نہ فن اور نہ ہی محبت۔......ایک طرح سے لکھاری زبان کے سرپرست ہیں۔جب وہ اپنے ناول، شاعری، ڈرامے لکھتے ہیں تو دراصل زبان کو زندہ رکھتے ہیں۔وہ صرف الفاظ برتتے نہیں بل کہ زبان کی خدمت کرتے ہیں۔اُسے عظیم سماجی رتبہ دیتے ہیں، اُس کی تکمیل کرتے ہیں، اُس کی ہیئت بدلتے ہیں۔اسی لیے زبان اُن کے دم سے زندہ ہے۔زبان اپنے عہد کی تمام سماجی و معاشی تبدیلیوں کے لیے ہوتی ہے۔......اب میں ادب کی ضرورت کی دُوسری وجہ کی طرف آؤں گا اور اس کے لیے میں کتابیں چھاپنے کے نفیس کام پر زور دوں گا۔......جب ہم اپنی دُنیا کی کتابوں میں اسطورہ کی بات کرتے ہیں تو اُسے دُور از کار، زمان و مکان سے ماورا شے سمجھتے ہیں۔میرا بھی یہی خیال تھا۔لیکن ایک وحشی عورت ایلورا سے ملاقات سے میرا یہ مبالغہ ختم ہو گیا۔وہ خود، اُس کا بدن، اُس کی حرکات و سکنات اور اُس کی کہانیاں سب کچھ اسطورہ تھیں۔......تو مجھے یقین ہو گیا کہ ادب موجود رہتا ہے خواہ بات چیت میں اس کی دھجیاں اُڑا دی جائیں، خواہ ادیب دُنیا میں تبدیلی لانے کے اہل نہ ہوں۔......آج کل گلوبلائزیشن کا بہت تذکرہ ہے۔......کیا ہم ایسے عمل سے نہیں گزر رہے کہ اُن طبقات کے درمیان حدِ فاصل قائم کر رہے ہیں جن کی رسائی لفظوں کی ترسیل اور علم تک ہے اور جو اس رسائی سے محروم ہیں۔عظیم قومیں، عظیم تہذیبیں اسی نا سمجھی کی بنا پر صفحۂ ہستی سے مٹی ہیں۔......اور اب، اس عہد میں ادب شناخت کا وسیلہ بن چکا ہے، اپنے حقوق جتانے، اپنی بات بتانے، ترسیل کرنے اور دُنیا بھر میں سُنانے کا۔......یہ درست ہے کہ کینیڈا کے انتہائی شمال میں بیٹھا ایک شخص اپنی شنوائی چاہتا ہے تو یہ ناانصافی ہے کہ وہ اپنے فاتحوں کی زبان میں لکھے—فرانسیسی یا پھر انگریزی میں—......اُس کی شنوائی دُنیا بھر میں ویسے ہی ہو جیسے میڈیا پر مطلق العنان حکمرانوں کی مانند چھائی پانچ یا چھے زبانوں کی ہوتی ہے۔......یہاں میں خاص طور پر پبلشروں سے کہنا چاہوں گا—بے شمار

ممالک میں کتابوں تک رسائی تا حال نہایت مشکل ہے۔ موریشس میں ایک ناول یا شاعری کے مجموعے کی قیمت ایک گھر کے ماہانہ خرچ کے برابر ہے۔ افریقا، جنوب مشرقی ایشیا، میکسیکو اور بحرِ جنوبی کے جزائر میں تو کتابوں کی خریداری ناقابلِ رسائی عیاشی ہے۔ ...... اگر یہی حال رہا تو نام نہاد اقلیتی زبانیں -- جو بظاہر اکثریتی ہیں -- ادب کو اُس مقام پر لے آئیں گی جہاں وہ محدود علم بن کر رہ جائے گا۔ ...... جلال الدین رومی میں ایسی شے ہے جو شاعری میں تحرک پیدا کرتی ہے۔ ...... محض زبان ہی میں سادگی اور سچائی جیسی چیزیں موجود ہیں۔ دِل کشی اور بعض اوقات عیاری، ہَوا اور رقص، خاموشی کا طویل طلسم۔ ...... میں ایک شب ڈارٖین کے جنگل میں دریائے ٹیورا کے کنارے ایک نامعلوم بچے سے ملا۔ رات کے اندھیرے میں وہ مٹی کے تیل کے دیے کی روشنی میں گھڑا ہوکر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ایک کتاب پڑھنے اور لکھنے میں منہمک تھا۔ وہ مجھے اُس بچے کا بھائی لگا ...... جو جنگ کے فوراً بعد کے تاریک ایام میں بڑھئی کی پنسل سے راشن بُک پر لکھنے کی سعی کرتا تھا۔ بچہ انسانی تاریخ کو دوفوری نوعیت کے کام پُورے کرنے کی یاد دلاتا ہے۔ بُھوک کا انخلا اور جہالت کا خاتمہ۔ ...... علم کا پھیلاؤ اور بُھوک کا خاتمہ آپس میں جڑے ہوئے ہیں، لازم وملزوم ہیں۔ ...... بلا شبہ دونوں ہی ہمیں عمل پر مجبور کرتے ہیں۔ ...... دُنیا کا کوئی بچہ بُھوکا رہے نہ بے علم چھوڑا جائے۔ آج کا بچہ ہمارا مستقبل ہے۔ عظیم یونانی فلسفی ہیراکلیٹس کے الفاظ میں: طویل عرصے کے بعد بادشاہت بچے کی ملک ہوتی ہے۔''

VVVV

ہَوئے، مچّھی اَو! ا

(Pawana)

یہ آغاز کی، بہت آغاز کی بات ہے جب سمندر پر سوائے دھوپ اور پکھیروؤں کے کوئی شے نہیں ہوتی تھی۔ بچپن ہی سے میں نے وہاں جانے کا خواب دیکھا تھا، اُس جگہ جہاں سب کچھ شروع ہوتا ہے اور سب کچھ ختم۔ لوگ اُس کا ذکر کسی اسرار، کسی خزانے کے مانند کرتے تھے۔ نان ٹکٹ میں تمام لوگ اُس کا تذکرہ کرتے اور اُس کا ذکر کرتے ہوئے مدہوشی کی کیفیت میں لگتے تھے۔ وہ کہتے کہ کیلی فورنیا میں سمندر میں ایک ایسا مقام ہے جہاں وہیل مچھلیاں بوتلیں جنم دینے اور بوڑھی مچھلیاں قربِ مرگ میں جاتی ہیں۔ سمندر میں اُس مقام پر ایک خلا، ایک وسیع و عریض خلا، ہے جہاں نوجوان مچھلیاں اپنی عمر رسیدہ ماؤں کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتی ہیں اور مچھلے اور کالے اور شارکوں سے حفاظت کے لیے ایک دفاعی حصار تشکیل دیتے ہیں۔ بَروں تلے سمندر میں ہلچل مچتی ہے، آسمان گلکھروں کی بوچھاڑ سے کُہر آلود ہو جاتا ہے اور پنچھیوں کی چرچراہٹ لوہا کوٹنے کی آواز کے مانند تیکھی اور بلند ہوتی ہے۔

وہ یہی بیان کرتے تھے۔ وہ اُس مقام کی کہانیاں یُوں بیان کرتے تھے گویا اُنھوں نے بہ چشمِ خود دیکھا ہوا اور میں نان ٹکٹ کی گودیوں پر اُن کی باتیں سنتا اور مجھے بھی لگتا جیسے میں خود بھی وہاں موجود رہا ہوں۔

اور اب وہ سب غائب ہو گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ، اگر چہ یہ خواب میری زندگی کا محور ہے، دُنیا کی ہر خوب صورت اور نئی شے کا وجود ختم ہو گیا ہے اور وہ تباہ و برباد ہو گئی ہے۔ میں کبھی نان ٹکٹ نہیں لوٹا۔ کیا اب بھی اُس خواب کی یادیں باقی ہیں۔

بحری جہازوں کی بڑی بڑی قطاریں، بلند و بالا بُرج جن سے سمندر پر نظر رکھی جا سکتی ہے، جہازوں کے پہلوؤں سے بندھی تیار چھوٹی کشتیاں، تیر، مچھلی کے شکار والے بھالے اور اپنے کام کے لیے کشتیوں کے تیار آنکڑے۔

اور سمندر خُوں رنگ اور پکھیروؤں سے بھرے آسمان تلے سیاہ۔ نان ٹکٹ کی میری سب سے دُھندلی یاد کہ سمندر میں خُون کی بو ہے۔ سرما کے اختتام پر، جب دُنیا کے دُوسرے سرے سے مچھلیاں اپنے گرانڈیل بدنوں کو گھسیٹتی ہوئی لوٹنے لگتی ہیں، بندرگاہ ابھی تک سُرمئی ہے۔ تب، گودیوں پر،

کلہاڑوں اور آریوں سے کٹائی، گودیوں کے نشیبوں میں بہتی خُون کی ندیاں اور گہرائیوں سے اُٹھتی شدید اور چبھنے والی بَدبو۔

جب میں آٹھ برس کا تھا تو گلتی سڑتی لاشوں کے بیچ گھوم رہا تھا۔ سمندری بگلے دیوہیکل جسموں میں قیام پذیر تھے اور وہ اُن میں سے جلد اور کُرکُری ہڈی کی پتلی تہوں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے یکا یک اُڑان بھرتے تھے۔ رات پڑتے ہی چُوہوں کی فوج لاشوں پر حملہ آور ہو جاتی کہ وہ غاروں والے پہاڑوں جیسی دِکھنے لگتیں۔

میرے چچا سیموئل مچھلیوں کے حصّے بخرے کرنے کا کام کرتے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مجھے سب سے پہلے گرانڈیل مچھلیاں دِکھائیں، جن کے بڑے بڑے جبڑے اور جلد کی تہوں میں دبے حلقوں میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ اُن کی پتلیاں نیلی تھیں۔ میں نے لہو اور آنتوں رَودوں کے تعفّن میں سہمگیں سانس بھرا اور اُن کے کبھی زندہ ہونے کا تصوّر کیا کہ وہ لہروں پر اُچھل کُود رہی ہیں، پانی کے ریلے اُن کے سروں سے ٹکرا رہے ہیں، اُن کے پتواروں اور دُموں کی حرکت قوی ہے۔ چچا سیموئل نے مجھے بحرِ منجمد شمالی کی وہیل مچھلی اور پروں والی وہیل، سپرم وہیل اور کوزہ پشت وہیل میں فرق سمجھایا۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُن کے پانی اُچھالنے کا انداز دیکھ کر کیسے اُن کے بارے میں پتا چلایا جا سکتا ہے۔ بحرِ منجمد شمالی کی وہیل دوبار پانی کی بوچھاڑ پھینکتی ہے جب کہ نیلے پتواروں والی ایک مرتبہ جو یُوں اُٹھتی ہے گویا بھاپ سے بنا ہوا درخت ہو۔ میں نے یہ سب چیزیں نان ٹُکٹ کی گودی میں کچھیروؤں کی مُرداروں کو کھانے کے دوران میں چیخ پُکار، نعشوں پر پڑنے والے کلہاڑے کی بھدّی ضربوں کو سنتے اور کڑاھوں میں اُبلتی چربی کی مہک سانس کے ساتھ اندر اُتارتے ہوئے سیکھیں۔ میں نے پہلی دفعہ گودی ہی میں اَورکا مچھلی دیکھی جو بہت بڑی اور سیاہ تھی اور وہ شارک بھی، جس کا، اُس نے پیٹ پھاڑ ڈالا تھا۔

اب، بہت برسوں کے بعد، یہی یادیں ہیں جو یہاں اَین سینادا کی خلیج ہُکائینڈا میں پلٹ پلٹ کر آتی ہیں۔ میں سمندر کی آواز سُنتا ہوں، ہَوا کی چمکائی ہوئی چٹانوں کا نظارا دیکھتا ہوں، ساحل جو بے حد نرم ہے، آسمان اور مجھے سب سے پہلا خیال آتا ہے کہ یہ نان ٹُکٹ کا جزیرہ ہے، یہ خاکستری اور وحشی سمندر جو انسانوں کو بھی وحشیوں میں بدل سکتا ہے۔ شاید، میں نے خُود بھی ہر وقت اُڑتے اور دیوہیکل مُردوں کے گرد چلاتے رہنے والے اُن ظالم پنچھیوں کے مانند جنم لیا تھا، وہ حملہ آور پنچھی جو نان ٹُکٹ کے شکاریوں کے تعاقب میں رہتے تھے۔ اب سب کچھ ختم ہو کر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بیداری مکمل ہو گئی۔ اب لہو سمندر کو سیاہ نہیں کرتا، ساحلی کھاڑیاں خالی پڑی ہیں۔ عظیم کھاڑیاں ہَوا سے کانپتی ہیں کہ وہ ایسے کبھی نہیں کانپی تھیں گویا مچھیروں کی بیڑیاں اپنے شکاروں کے ساتھ ہی مرگئی ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں دس برس کا تھا تو میں نے اور نان ٹکٹ کے دُوسرے لڑکوں نے بُوڑھے جان ناٹِک سے اُس کی بیڑی اُدھار لی اور کھاڑی میں جا نکلے تھے۔ کھاڑی کے آخر تک۔ واکوئینیٹ کے گاؤں تک جہاں زمین کی پٹی اتنی تنگ ہے کہ دُوسری سمت سے سمندر کی غرّاہٹیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ہم زمین پر اُترے اور ٹیلوں میں بھاگتے ہوئے سمندر کے روبرو جا ہوئے۔ وہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا۔ مجھے خُوب یاد ہے کہ جُون کا مہینا تھا اور ہم افق پر مچھیروں کی بیڑیوں کو لوٹتا دیکھ رہے تھے۔آسمان صاف تھا اور سمندر ٹیڑھا ہو کر اپنی جھاگیلی لہروں سے ہماری سمت آرہا تھا۔ہم وہاں اتنی زیادہ دیر کھڑے رہے کہ سمندر اور اُس کی ہَوا سے ہماری آنکھیں جلنے لگیں۔پھر ہم اپنی سزا کی آس لیے نان ٹکٹ لوٹ آئے۔آج لگتا ہے کہ ایک بھی دھڑکن مجھے اُس لمحے سے جُدا نہیں کرتی جب میں نے ساحل سے اُس کشتی کو دیکھنے کی سعیِ لا حاصل کی تھی جو اپنے ایک سمت شکار کی ہوئی بندھی مچھلیاں لیے پنچھیوں کے غول میں گھری ہوئی تھی۔

بعد میں ہم اکثر بُوڑھے ناٹِک سے ملنے گودی کے راستے گئے۔اُس نے ہمیں اُس زمانے کے بارے میں بتایا جب جزیرے پر صرف انڈین ہُوا کرتے تھے جو وہ اپنی بیڑوں کے سامنے والے حصّوں پر بھالے تھامے مچھلیاں شکار کرتے تھے۔اُس زمانے میں اِس قدر کثیر تعداد میں مچھلیاں اپنے اُوپر تیز فوارے چھوڑتیں، نان ٹکٹ اور کیپ کوڈ کا وسطی آبنائے عبور کیا کرتی تھیں کہ اُن سے سمندر میں گہرا سایہ بن جاتا تھا۔ جب اُن میں سے کسی کی نظریں اچانک مچھلیوں کے کسی جھنڈ پر پڑتی تھیں تو وہ جس طرح چلّا تا تھا بُوڑھے نے ہمیں اُس کی نقل اُتار کر دِکھائی: ''ہوئے، پُھّھی اوا!'' ماضی کے اُس زمانے میں ماہی گیری کرنے والے تمام لوگ نان ٹکٹ کے انڈین تھے جو سب ناٹِک زبان بولتے تھے۔ پھر وہ سب ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔کوئی بیماری سے تو کوئی کثرتِ شراب نوشی سے یا پھر بیڈفورڈ اور بوسٹن کے شبینہ کلبوں کے دنگے فسادوں میں۔ برف سے مچھلیاں نکالتے ہوئے یا سمندر میں گرانڈیل مچھلیوں کا پیچھا کرتے ہوئے مارے گئے یا پھر تپ دِق سے ہسپتالوں میں مر گئے۔بُوڑھا جان ناٹِک ہی فردِ واحد تھا جسے یہ سب یاد تھا۔ جب ہماری باتیں ختم ہوئیں تو وہ دِیوار سے ٹیک لگائے بے حس و حرکت بیٹھا بیکار پڑی کشتیوں کے جھولتے مستولوں کو دیکھنے لگا۔اُس کا چہرہ تیرہ و تار اور جھرّیوں سے اَٹا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے دو دَرزیں، جن میں انہماک کی کوئی رمق نہیں تھی۔وہ خاموشی سے اپنے میلے کچیلے کمبل میں لپٹا بیٹھا رہا۔اُس کے سفید بال کوئیکر ہَیٹ تلے اُلجھے ہوئے تھے۔ایک روز اُس نے ہمیں دِکھایا کہ مچھلی کو نیزہ کیسے مارا جاتا ہے۔وہ ایک لمبی سلاخ ہلاتا ہوا، اپنے بجرے کے عرشے پر پنجوں کے بَل اُٹھا تو پاس سے گُزرتے ہوئے مچھیروں نے اُس سے مذاق کیا کیوں کہ وہ نابینا تھا۔لیکن تبھی میں نے تخیل میں ایک قوی ہیکل شے کے بدن کو پانی کی گہرائیوں میں جاتے اور خُون کے فوارے

چھوڑتے دیکھا جن سے سمندر لال ہو رہا تھا۔

بلا مبالغہ یہ خُون ہی ہے، جسے میں یہاں اَین سینیڈا کے سمندر میں دیکھتا ہوں۔ پُنٹا بنڈا میں بحری قزاقوں کے اب بھی چھوٹے چھوٹے گھر موجود ہیں۔ اُن کی ایک ایک دیوار خشک پتھروں سے بنی ہوئی ہے، جن پر پام کی ٹہنیاں رکھی جاتی تھیں۔ کچھ گھروں کو وہیل مچھلیوں کی بڑی بڑی پسلیوں سے مضبوط کیا گیا ہے اور ہَوا کے چمکائے ہوئے لمبے لمبے سفید پتے دُھوپ میں لشکتے ہیں۔ پتوں اور پتھروں کے بیچ سے گُزرتی ہَوا ایک تجسس آمیز موسیقی پیدا کرتی ہے، جو نہایت دِھیمے بَین اور نوحے جیسی ہوتی ہے۔ بہت عرصہ پہلے...... بہت طویل عرصہ پہلے......انسان نے سمندر کو جیسا پایا تھا جب وہ پہلی مرتبہ اِس دُنیا میں آیا تھا۔ اب نئی صدی کے آغاز پر پیرانہ سالی تک کے مانند میں بھی ایک پیر مرد ہوں لیکن لیونور صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ سوائے خلیج سان فرانسسکو کی ریتلی مٹی پر، اُس کے شکستہ لاشے کے، اُس کا کچھ نہیں بچا۔ وہ اُس کے جثے سے لُوٹی جا سکنے والی ہر شے لُوٹ کر لے جا چکے ہیں: اُس کے بادبان، عرشے کے تختے، دھڑ میں لگے تانبے کے ٹکڑے، اُس کے تمام کل پُرزے، یہاں تک کہ اُس کا سمندر بھی۔ بدبخت لٹیرے ظالم پنچھیوں کی طرح جھپٹے اور ہَوا کے مقابل صرف اُس کا ڈھانچا ہی چھوڑا جس طرح کیلی فورنیا اور میکسیکو کے ساحلوں پر عظیم الجثہ مچھلیوں کے ڈھانچے پڑے ہوتے ہیں — رنگ دار، مضبوط اور خُوب صُورت نہیں بلکہ سیاہ اور سمندر کے زنگ آلود کیے ہوئے، جن پر خودرو نبات اور حشرات کی تہیں جمی ہیں۔

یہ ایک بُوڑھے قزاق کا گھر ہے جسے میں نے پناہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ جب سمندری ہَوا چلتی ہے تو ساحلی چٹانوں پر جھاگ آ کر اٹک جاتی ہے اور ڈھیر سے ڈھیر سے ساحل رُوئی جیسے بادل میں گُم ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے مچھلیوں کی ہڈیوں کے علاوہ کچھ دِکھائی اور دھاڑتی ہوئی ہَوا کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہر طرف ٹیلوں جیسے بڑے بڑے جبڑے ریت سے اُبھر آتے ہیں اور ریڑھ کی ہڈیوں کی قطاریں یُوں لگتی ہیں جیسے زمین میں یکلخت تبدیلی سے پتھروں کی باڑھیں وجود میں آ گئی ہوں۔

سرما میں سمندر دھات کے مانند ہموار رہتا ہے۔ جب میں کپتان چارلس میلوِلے سکیمون کی قیادت میں لیونور پر سوار ہوا تو اٹھارہ برس کا تھا۔ مجھے وہ راستہ اب بھی یاد ہے، جس سے ہم سان فرانسسکو سے جنوب کی سمت روانہ ہوئے تھے اور وہ دِن بھی جب ہم باجا کیلی فورنیا میں پُنٹا بنڈا پہنچے تھے۔ اُس وقت یہ آج جتنا ویران، ہڈیوں اور تباہ چیزوں سے اَٹا ہوا مقام نہیں تھا۔ یہ قزاقوں کا حقیقی شہر تھا جہاں خلیج اینی سینیڈا میں ہمہ نوع جہاز دِکھائی دیتے تھے اور اُن کے گرد دائروں میں منڈلاتے پکھیروؤں کی ڈاریں اُن کی روانگی کی منتظر ہوتی تھیں۔ آبنائے میں وہی سرگرمی نظر آتی تھی جو میں اپنے تمام بچپن کے دوران میں ایسٹ کوسٹ، بیڈفورڈ اور نان ٹکٹ میں دیکھتا آیا تھا۔

تیل اور قیر گرم کرنے کے لیے آگ دھکائی اور تانبے سے پیپوں کی مرمت کی جاتی تھی۔ بڑھئیوں اور لوہاروں کی دُکانیں تھیں۔ بجرے نے ہمیں ساحل پر چھوڑا۔ میں تپتے سُورج میں ریت پر چلتا ہوا آیا۔ جب بھی کوئی گاؤں کی سمت جاتا تو قزاقوں کی پکاروں پر اپنے آپ کو بہرہ بنا لیتا تھا۔ دُنیا کے کونے کونے سے جہاز راں آتے تھے اور غیر معمولی زبانیں سننے کو ملتی تھیں — پُرتگالی، رُوسی، چینی۔ جزائر کیناری سے آنے والے لوگ موٹے اور کالے بجنگ، ناروے کے قریب قریب سفید بالوں والے جن کی بھنویں اور داڑھیاں نمک سے بدرنگ ہوئی ہوتی تھیں۔ بحرِ اوقیانوس کی دُوسری جانب سے آنے والے کانکا جن کے چہروں پر نقش ونگار گُودے ہوتے تھے اور وہ موتیوں والے بُندے پہنتے تھے۔ جنوبی امریکا کے پُرتگالی انڈین جو جسیم، اپنے آپ میں مگن اور لیے دیے رہنے والے، جزائر ہوائی، الاسکا اور ایکور سے مچھلی کے شکار والے نیزے چلانے کے ماہر۔ پُخاہُنڈا میں ہر شخص کو یقین تھا کہ سرمئی اور پروں والی قطب شمالی کی مچھلیاں میکسیکو کے گرم سمندر میں بچّے سینے آتی ہیں۔

اب میں اِس سنسان ساحل پر پھرتا ہوں اور یاد کرتا ہوں کہ کسی زمانے میں کیسا تھا۔ لگتا ہے گویا قزاقوں کے شہر، گرم پانی کے حمام بنانے اور پیپے بنانے اور اُن کی مرمت کرنے والوں کا شور وغوغا اور جہاز رانوں کی دُوسرے جہاز رانوں کو خوش آمدید پکاریں سن رہا ہوں۔ مجھے آرا سیلی یاد آتی ہے۔

وہ مجھے پہلی بار دریا کے کنارے ملی تھی جہاں طوائفوں نے پام کے پتوں کی اپنی کُٹیائیں ڈال رکھی تھیں۔ میں نے ایک لڑکی کے ہنسنے کی آواز سنی اور بہتے دریا کی مخالف سمت اُس گھر کی جانب چلنے لگا جو نرسلوں اور پام کے پتوں سے بنا ہوا تھا۔ اب میں اُس دریا کا مُنھ بے بسی سے تکتا رہتا ہوں۔ میں اُس مقام کی طرف جاتا ہوں جدھر سمندر بہتا ہے۔ میرے ننگے پیر کیچڑ میں دھنستے ہیں اور کیکڑوں کی فوج میرے آگے آگے دوڑتی ہے۔ وہاں میرے سوا کسی کے قدموں کے نشان نہیں ہوتے۔ دوشیزہ کا گھر کہاں تھا؟ مجھے اب وہ جگہ یاد نہیں۔ بہت عرصے پہلے زور کی آندھی تمام نشانات مٹا کر اپنے پیچھے صرف جسیم مردہ جانوروں کی ہڈّیاں چھوڑ گئی تھی۔

دریا بھی بدل چکا ہے۔ اب اُس کا پاٹ کم چوڑا اور بہاؤ کم زور ہے، انتہائی غلیظ ریت میں سست رَوی سے بہتے ہوئے پانی کے مانند۔ اِسی طرح ہَوا اور دھوپ نے پہاڑیوں کا پانی بھی سُکھا دیا ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ اِس میں ہَوا کا کوئی قصور نہیں۔ موت تو انسانوں کی اپنی لائی ہوئی ہے۔ شاید یہ موت ہی تھی جس سے آرا سیلی اپنے آخری دم تک بھاگتی ہوئی ایمیلیو چلی گئی تھی۔ لوگوں نے پُھول دار جھاڑیاں، بلوط، خاردار جھاڑیاں، زیرِ زمین ہونے والی سبزیاں اور اناناس جلا کر خاکستر کر دیے تھے کہ ہر سمت چھینکوں والے دھویں کے بادل پھیل گئے تھے اور قیر کو تپا دیا تھا کہ ہر جان دار شے جل کر کوئلے میں بدل گئی تھی۔

میں ویران ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا روشنی دیکھ کر ہکا بکا رہ جاتا ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اب بھی اُس آتش فشانی آگ کو دیکھا اور اُس کے دھویں کو سونگھ سکتا ہوں۔ پورے ساحل کے ساتھ ساتھ قزاقوں کی آگ آسمان سیاہ کر ڈالنے، آنکھوں اور ناک میں سوزش پیدا کرنے، گہری بدبو پھیلانے، تیل گرم کرنے، چربی اور قیر اُبالنے والا گہرا سرمئی دھواں پیدا کرتی تھی۔ زندگی دھواں بن گئی تھی۔

پانی اب نہیں بہتا۔ تنگ پاٹ والی جگہوں پر دریا گُم ہو کر تالاب بن جاتا ہے جہاں مچھر رقص کرتے ہیں، گرگٹ اور کیچوے پھرتے ہیں۔ جب میں وہاں پہنچتا ہوں تو بگلے غصے سے چلّاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔ یہ پُلایَنڈا کے آخری باسی ہیں۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے پہلی بار آراسیلی کو دیکھا تھا۔ وہ دریا کنارے نرسلوں سے بنی ایک کُٹی میں دُوسری دوشیزاؤں کے ہم راہ رہتی تھی۔ وہاں ایک بڑی سی چٹان اور صاف پانی کا تالاب تھا۔ اُنھوں نے اُس مقام کو اس لیے اپنا مسکن بنایا تھا کہ کسبیوں کے بارے میں مقولہ ہے کہ اُنھیں ہر وقت پانی کی ضرورت رہتی ہے۔ قزاق اِس کی یہی وضاحت کرتے تھے۔ جب لیونور خلیج میں داخل ہوا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیسے پہنچی تھیں۔ شاید وہ جنوب سے آئی تھیں، یا مانزانیلو سے یا مازاتلان سے۔ یا پھر شاید اُن کی آمد زمینی راستے سے پیدل جنوب سے یا سان ڈیاگو یا مونٹیریری سے اُترنے والے خچروں کی قطار کے ہمراہ ہوئی تھی۔ اُن کے ساتھ ایمیلیو نامی ایک شخص تھا۔ وہ خچروں کی دیکھ بھال، خوراک اور شراب کا بندوبست کرتا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور سانولا تھا۔ اُس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ہسپانوی ہے۔ وہ جھگڑوں کو نپٹاتا تھا۔ تمام دوشیزائیں میکسیکو کی تھیں، حتّٰی کہ سُرخ رنگے ہوئے بالوں والی بھی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ آراسیلی کو دیکھا تو مجھے اندازہ تک نہیں ہوا کہ وہ بھی اُن دوشیزاؤں میں سے ایک ہے۔ وہ اتنی کم سن اور دبلی پتلی تھی کہ بچّی لگتی تھی۔ وہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے اور پیروں سے ننگی تھی۔ اُس کے انڈینوں جیسے بال سیاہ اور سختی سے گندھے ہوئے تھے۔ وہ اُن کی خادمہ تھی، اُن کی غلام۔

اُس جگہ، دریا میں، میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ طلوعِ آفتاب سے پہلے کا وقت تھا اور وہ پانی اور لکڑیاں لینے آئی تھی۔ مجھے صبح سویرے دریا پر جانا اچھا لگتا تھا: نرسلوں میں پنچھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہوتے تھے؛ بٹیریاں، سیاہ رنگ لمبی لمبی گردنوں والے بگلے، سفید پروں والے بگلے، چھوٹے چاندی جیسے پنچھی جو پروں کی بلند پھڑ پھڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے اُڑ جاتے۔ وہیں آراسیلی آتی تھی۔ میں نرسلوں میں چھپ کر اُسے دریا کے پانی سے نہاتے ہوئے دیکھتا۔ اُس کا بدن بید کے مانند چھریرا اور لوچ دار تھا۔ صبح کے دھندلکے میں اُس کی جلد قریب قریب کالی دِکھائی دیتی تھی۔ اُس کا تالاب میں پیرا کی کا

انداز عجیب تھا۔ وہ اپنے اُوپر پانی اُچھالتی اور مکمل طور پر غائب ہو جاتی، پھر اُوپر آ کر تیرنے لگتی۔ اُس کا مُنھ پانی سے بس اتنا ہی باہر نکلتا کہ وہ لمبا سانس لے سکے اور ایک بار پھر غائب ہو جاتی۔ وہ سیاہ رنگ لمبی لمبی گردنوں والے بگلوں اور مچھلیوں کو مچھلی کا نٹے کے بغیر ہی پکڑ لیتی تھی۔ میں بے حس و حرکت پڑا تھرتھراتے پانی کو دیکھتا رہتا کہ سُورج نکل آتا اور کرنیں اُس کے بدن، کندھوں، پیٹ اور سینے پر پڑنے لگتیں۔ اُس کے اُلجھے ہوئے سیاہ بال اُس کی کمر اور کندھوں سے لپٹے ہوئے ہوتے۔ وہ زمین پر بیٹھ جاتی، اپنی پکڑی ہوئی چیزیں بالٹی میں ڈالتی اور سر کو اِدھر اُدھر مارتے ہوئے کچھ دیر اپنے بال سُکھاتی رہتی۔ میں نے اُس جیسی عورت کبھی نہیں دیکھی۔

میں اُسے دیکھنے نزوں کی کٹیا کے چکر تو کاٹتا لیکن کبھی اُس تک رسائی کا حوصلہ نہیں کر پایا۔ رات ہونے پر قزاق شراب اور تمباکونوشی کے لیے چلے آتے۔ دوشیزائیں کٹیوں میں بند رہتیں۔ کبھی کبھار مجھے خیال آتا کہ میں اُسے آگ کی روشنی میں رات بھر بندھے ہوئے بالوں کے ساتھ شب خوابی کے خاکستری لباس میں دیکھوں۔ دوشیزائیں اُسے پکارتیں۔ اُس کا نام لے کر اُن کی خدمت کرنے کو کہتیں اور اس طرح مجھے پتا چلا کہ اُس کا آرا سیلی ہے۔

لیئور کے مانجھی دُوسری دوشیزاؤں سے تو باتیں کرتے لیکن اُنھوں نے اُس سے کبھی نہیں کی۔ میں اندھیرے میں چھپا گٹی کو تکتا، اُس انڈین کی ایک جھلک دیکھنے کی سعی میں لگا رہتا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ دُوسرے مانجھیوں کی طرح کروں، شراب پیوں اور اندر جا کر دوشیزاؤں کے قہقہے سنوں لیکن میں خوف زدہ تھا۔ ایک روز میکسیکو کے والڈیس نامی ایک مانجھی نے مجھے اُس کے متعلق بتایا۔ اُس نے مجھے ایمیلیو کے بارے میں بتایا کہ اُس ہسپانوی نے اُس انڈین کو خریدا تھا۔ اُسے سونورا میں فوج نے قیدی بنالیا تھا اور ایمیلیو نے اُسے اُن دوشیزاؤں کی گول پنے کے لیے خریدا تھا۔ وہ اُن کے لیے پانی لاتی تھی اور اُن کے کپڑے دھوتی تھی۔ وہ سیری (Seri) تھی اور اُسے کوئی اُور زبان نہیں آتی تھی۔ وہ اُن لوگوں کے ساتھ کیوں رہ رہی تھی؟ وہ بھاگی کیوں نہیں؟ کئی بار اُس نے اُڑان بھری اور ہر ایمیلیو نے اُس کا پیچھا کیا۔ اُس نے اُسے کوڑوں سے پیٹا اور اَدھ موئی ہو گئی۔ لیکن انڈین نے بھاگنا نہیں چھوڑا۔ وہ ایمیلیو سے نفرت کرتی تھی اور اگر اُس کا بس چلتا تو اُسے جان سے مار ڈالتی۔ وہ اُس کی رکھیل تھی۔ اُسی نے اُس کا نام آرا سیلی رکھا تھا۔ یہ کہانی سننے کے بعد میں طلوعِ صبح سے قبل ہر روز دریا پر جا کر اُسے غسل کرتے دیکھنے لگا۔ تب مجھے اِس کا پتا نہیں تھا لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔ اپنے لمبے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے وقتاً فوقتاً وہ اپنا مُنھ میری سمت پھیرتی جیسے مجھے نرسلوں کے بیچ دیکھ رہی ہو اور اُس کی ٹکٹکی مجھ پر کپکپی طاری کر دیتی۔

میں اُس ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں جہاں کبھی دریا بہتا تھا۔ اب اُس جگہ، جہاں کبھی

آرا سیلی غسل لیا کرتی تھی، بڑسل ہیں نہ پنچھی۔ وہاں اب صرف سیاہ مٹی کی ایک بڑی سی دلدل ہے، جس پرشورے کی تہہ جمی ہے۔ وہ خشک پہاڑیاں، جن میں وہ کبھی قید سے بھاگی تھی، اب بھی اُسی طرح ہیں۔ یُوں لگتا ہے جیسے میں اب بھی ماہچھیوں کی چیخ پکار اور ایمیلو کے گھوڑوں کے رکابوں کی کھنکھناہٹ سن سکتا ہوں۔ دھند لکے کے وقت میں سمندر کے سامنے ساحل پر کھڑا رہتا ہوں جیسے مجھے اُن کے لوٹ آنے کی آس ہو۔ کبھی کبھی پُنٹا بُنڈا کی چٹانوں پر آئی جھاگ میں کھڑا ہوتا ہوں جیسے میں آتے ہوئے جہاز کا دھبا دیکھ سکتا ہوں۔ وہ سب کھاڑی کی طرف رواں ہیں اور پکھیروؤں میں گھرا مچھلیوں کا آہستہ آہستہ چلتا ہوا سایہ۔

چارلس میلوِئے سکیمون

میں، چارلس میلوِئے سکیمون ۱۹۱۱ء کے اِس برس میں اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہوں اور مجھے جنوری ۱۸۵۶ء کا پہلا دِن یاد آرہا ہے جب لیونورجنوب کی سمت پُنٹا بُنڈا کو رَوانہ ہوا تھا۔ میں اپنے عملے کو اِس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن میرے چوتھے ساتھی تھامس نے کارڈ رُوم میں نائب کپتان رائیز کے ساتھ میری ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ ہم اُس خفیہ راستے کے بارے میں بات کر رہے تھے جو سرمئی مچھلیوں کی پناہ گاہ تھا اور جہاں مادائیں اپنی پُونگوں کو جنمنے جاتی تھیں۔ رائیز اُس راستے کے وجود کے بارے میں مشتبہ تھا۔ اُس کے مطابق ایسا مقام محض اُن لوگوں کے تخیل کی کارستانی ہے جو ہاتھیوں کے قبرستانوں اور ایمازون کے ہروقت برسات والے جنگلوں جیسی کہانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

اِس طرح خبر پھیل گئی اور عملے کو ایک طرح سے بخار چڑھ گیا۔ یہ عیاں ہوگیا کہ ہم جنوب میں اُس خفیہ مقام، اُس پوشیدہ پناہ گاہ کی تلاش میں جا رہے ہیں جہاں قطب شمالی کی مچھلیوں کے غول آتے ہیں۔ کئی روز تک لیونور باجا کیلی فورنیا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تاکہ ہم ساحلی پٹی کی سفیدی کو نظر میں رکھ سکیں۔ اُن پانیوں میں کوئی مچھلی نہیں تھی اور عملے کے لوگ بار بار کہہ رہے تھے کہ ہمیں اینسیناڈا کے پانیوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے کیوں کہ ایسا کرنے سے ہم اُس برس کی موسمی مچھلیوں کو کھونے کا خطرہ مول رہے ہیں۔ بعض اوقات درمیانے حجم کی ایک آدھ مچھلی دکھائی دے جاتی لیکن لیونور نے رُخ تبدیل کیے بغیر جنوب کی جانب سفر جاری رکھا۔

اتوار کی صبح پوربی ہَوا شروع ہوگئی۔ میں عرشے پر تھا کیوں کہ وہ سب سے گرم حصہ تھا۔ یُوں کہ میں گزشتہ شب سو نہیں پایا تھا اِس لیے تھکا ہوا تھا۔ سمندر پُرسکون تھا اور قریب قریب سمجھ میں نہ آنے والی ہَوا میں سفر جاری تھا۔ میں ایک رسّی پکڑ کر جھکا اور میں نے ایک چھوٹی دُوربین سے ساحل کا جائزہ لیا۔ عرشے کا عملہ محنت سے اپنا کام کرتے ہوئے برش اور کالی صابن سے رگڑ رگڑ کر پانی کی پھواریں مارتے ہوئے عرشہ دھو رہا تھا۔ اُن میں سے ایک، جو ابھی بچہ تھا، سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے

اُس پر دھیان نہیں دیا۔ میں دِن میں خواب دیکھنے میں کھویا ہوا یا شاید کسی ایسے خیال میں گُم تھا جو مجھے بہا کر آس پاس کی ہر چیز سے دُور لے گیا تھا۔

اب بھی اندھیرے میں ڈُوبا ہوا ساحل صاف شفاف آسمان کے مقابل غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ سمندر بوجھل اور اُفقی ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ پُکھا بُنڈا سے ہماری روانگی سے لیونور کے تعاقب میں آنے والے سمندری بگلوں کی ڈار بھی غائب ہو گئی تھی۔ بوجھل اور کاہل سمندر میں جہاز اپنی ہی مشینوں کی گُونج میں دِھیرے دِھیرے رینگ رہا تھا۔ میں ساحل کی پٹّی کا تعاقب کرتے ہوئے اُسے متواتر کھوجتا رہا۔ لیکن مجھے گہرے رنگ کی پٹّی اور روزکینو صحرا کے ٹُوٹے پُھوٹے پہاڑوں کے سوا کچھ دِکھائی نہیں دیا۔ جب سُورج طلوع ہوا تو زیادہ چٹانیں نمودار ہو گئیں اور پہاڑوں کی عریانی زیادہ حریف بن کر سامنے آئی۔

اب لڑکا میرے قریب کھڑا الڑکا سمندر کو دیکھ رہا ہے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

اُس نے اپنے نام کا پہلا حصہ بتایا۔ سادہ لوح عرشے کے عملے والے کے نزدیک نام کا دُوسرا حِصہ اہمیّت نہیں رکھتا۔ صرف نام کا پہلا حصہ اور وطن۔''

''نان ٹکٹ کا جان۔''

''تم جزیرہ نان ٹکٹ کے ہو؟''

میں نے اُس کا بغور جائزہ لیا۔ پھر میں ساحل کی طرف مڑا۔ ''نقشے ہمیں کچھ نہیں بتاتے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ راستہ اب زیادہ دُور نہیں ہے۔ اُسے اُس طرف ہونا چاہیے۔'' میں نے جنوب مشرق میں پہاڑی سلسلے کی سمت اشارہ کیا۔ چوٹیوں پر چمکتا سُورج اُنھیں روشن کیے ہوئے تھا۔

لڑکے نے مُتحیر نظروں سے دیکھا۔ ''وہ نمک کی کانیں ہیں۔'' میں نے یُوں وضاحت کی گویا اُس نے سوال کیا ہو۔ ''یہ روزکینو ہے۔ ہمیں دُور دُور تک کوئی چیز دِکھائی نہیں دے رہی۔ تو تم جزیرے سے آئے ہو؟''

''جی جناب۔''

''وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے۔ کیا یہ تمھارا پہلا کام ہے؟''

''جی جناب۔ میرا نان ٹکٹ کمپنی سے معاہدہ ہوا ہے۔''

''تم یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''میں نے سنا تھا کہ کمپنی بحرِ قطب شمالی کو جا رہی ہے۔''

لڑکے کا چہرہ دمک رہا تھا۔ معلوم نہیں میں نے کیوں کہا۔ ''میں سونے کی تلاش میں نکلا تھا جو مجھے نہیں ملا۔ پس میں نے یہ جہاز کرائے پر لے لیا۔ کیا تمھیں معلوم ہے سرمئی مچھلیاں کہاں مل سکتی ہیں تاکہ ہم بے حد دولت مند ہو جائیں۔''

لڑکے کی آنکھیں عجب انداز میں چمکیں۔ لیکن میں نے اُس کے تأثرات کو غلط لیا۔ ''نہایت دولت مند۔ اگر تمھیں اُس مقام کے راستے کا پتا ہے تو مجھے فوراً بتاؤ۔ سب سے پہلے راستہ بتانے والے کے لیے انعام مقرر ہے۔''

میں ساحل کا جائزہ لینے کے لیے بجرے کے عقبی حصے کی جانب مڑا۔ اب تمام عملہ عرشے پر تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ ہم نے پُھابُنڈا کیوں چھوڑا اور صحرائی ساحل کے ساتھ ساتھ ہم جنوب کی سمت کیوں جا رہے ہیں۔ ہم سرمئی مچھلیوں کا ازلی اَسرار دریافت کرنے والے نقیب بننے جا رہے تھے۔ وہ مقام جہاں مادہ مچھلیاں اپنی پُونگوں کو جنم دینے آتی ہیں۔ ہم خُوب امیر کبیر ہو کر لوٹیں گے۔ اِتنے کہ وہ ہماری آخری مہم بھی ہو سکتی ہے۔ سو، اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک ایسے راز کے مانند تھا جس کے متعلق ہمیں بات کرنے سے روک دیا گیا تھا تاکہ ہماری خُوش بختی خطرے میں نہ پڑے۔

۹ جنوری، وزکینو پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ۔

شام تک لیونور ساحل پر پہنچ گیا۔ آہستہ آہستہ ایک آبی گُزرگاہ نمودار ہوئی، جس میں داخلے کا راستہ، ایک جزیرے کے حصار میں تھا۔ اُس سہ پہر ہم پیچھے سے آنے والی ہَوا کے دھکے پر اُس گُزرگاہ سے گُزر رہے تھے کہ مچھلیوں کی موجودگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جہاز کے عقبی حصے پر چڑھ کر میں نے جزیرہ سیڈریس کے ساحل سے اندر، سمندر میں اپنے عین آگے، مچھلیوں کا غول دیکھا۔ افق پر چمکتے سُورج کی کرنوں میں اِتنے فاصلے سے پروں والی اور سرمئی مچھلیوں کے بارے میں الگ الگ بتانا ممکن نہیں تھا۔ لیونور غول کی جانب رواں دواں رہا اور میں جلد ہی پنکھے جیسا ایک فوارہ دیکھنے کے قابل ہو گیا جو سرمئی مچھلیوں کی خصوصیت ہے۔ غول بیس کے قریب مچھلیوں کا تھا جن میں کچھ بڑی جسامتوں والے نر (ساٹھ فٹ سے زیادہ بڑے) تھے۔ جُوں جُوں لیونور اُن کے قریب ہوتا گیا مچھلیاں بے قرار ہوتی چلی گئیں۔ جب ہم اِتنے قریب پہنچ گئے کہ اُن کا شکار کر سکتے تو غول، دو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر، جہاز کے دائیں بائیں، دونوں اطراف پھیل گیا اور ساحل کی جانب دوڑنے لگا۔

عملے میں کافی مایوسی پھیل گئی۔ ہر ایک کے مُنھ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ لیونور پُھابُنڈا سے نکلنے سے ایک ہفتے سے زائد عرصے کے بعد ہمیں مچھلیوں کا وہ پہلا جتھا ملا تھا۔ پھر وہاں کوئی اَور شکاری جہاز بھی نہیں تھا کہ جس سے حصہ بٹانا پڑتا۔ میرا خیال تھا کہ جنوب کی سمت مزید سفر جاری رکھا جائے اور اچانک چل اُٹھنے والی ہَوا کا فائدہ اُٹھایا جائے۔ لیکن رائیز نے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ

کیلی فورنیا کو جزیرہ سیڈ ریس سے جدا کرنے والا سیدھا ساحل غیر یقینی ہے: نقشے حتمی نہیں ہیں اور اُن میں سے کئی تو صدی کے آغاز میں ترتیب دیے گئے تھے جو درست نہیں ہیں۔ رات ڈھلنے پر مُہم جوئی خطرناک ہوگی۔ اِن تمام وجوہات اور عملے کے جواب دیتے ہوئے تحمل کے پیشِ نظر میں نے واپس مڑنے اور لوٹ کر خلیج کے آخری سرے پر پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے دُوربین سے وہ درّہ دیکھا جو ریت کی ایک دیوار کے عقب میں پوشیدہ تھا۔ خلیج وسیع ہوگئی اور ساحل اِتنا نیچا کہ سمندر میں ڈوبا ہوا لگتا تھا جھٹپٹے کی مدہم روشنی میں لیونور قریب ہوا تو اُس کے بادبان ہَوا سے جھکے ہوئے اور دِھیمی روشنی میں ٹمٹمارہے تھے۔ خلیج کے آخری حصے میں سمندر پُرسکون اور آئینے کی طرح ہموار تھا اور اُس کی آواز سے کھوہوں کی موجودگی کا اشارہ ملتا تھا۔ ڈولفنیں جہاز کے سامنے سے قطار میں گزر رہی تھیں اور چند گز کی گہرائی میں وہیل مچھلیوں کے سائے دِکھائی دے رہے تھے۔

وہ تلملا کر سطحِ آب پر آئیں تو ہمارے اِتنے قریب تھیں کہ ہم اُن کی پھواروں کا مینڈکوں جیسا شور سُن سکتے تھے اور شکار سے آگاہ، مچھیرے پہلے ہی، اُن کے سانسوں کی گھناؤنی بو پا چکے تھے۔

رات پڑنے لگی تھی۔ سُورج افق تلے غائب ہو رہا تھا۔ اُسے دُھند نگلتی جا رہی تھی۔ میں آواز کی سمت بڑھتا رہا۔ تقریباً پینتیس فٹ کے بعد میں نے وہیں لنگر ڈال دینے کا حکم دیا، جس جگہ ہم کھاڑی کے داخلے پر تھے؛ چپّو تھم گئے۔ میں نے کھاڑی میں راستے کی تلاش کے لیے ایک کشتی سمندر میں اُتارنے کا حکم دیا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہم انتظار کریں لیکن اپنی منزل کے، اِس قدر قریب پہنچ کر ہمارا صبر جواب دے گیا تھا کہ ہمارے لیے صبح کا انتظار کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے رائیز کو لیونور کا نگران مقرر کیا اور ایک درجن ڈونگیوں کے ساتھ ساحل کا رُخ کیا۔

اندھیرے میں ڈوبے اُس آبنائے میں کوئی تو ہلچل؛ بل کہ شرانگیزی تھی۔ ساحل کا سُونا پن، تانبے کے پہاڑوں کی ناہمواریاں، نمک کی کانوں کی سفیدی اور کھاڑی کے مُنہ پر گہرے رنگ کا پانی؛ اِس قسم کا جزیرہ ہے یا سفید ریتلی پٹی؛ اِن سب کی موجودگی کسی نرالی دُنیا کا راستہ دِکھائی دے رہی تھی۔ بہت سی کہانیاں دماغ میں گُونجنے لگیں؛ خاص کر وہ کہانی جس میں سُرمئی مچھلیوں نے کشتیوں پر حملہ آور ہو کر اپنے پہاڑنما جسموں سے اُنھیں کچل، اپنی دُموں سے پانی اِتنے زور زور سے اُچھالا تھا کہ کوئی انسان زندہ نہیں بچ پایا۔ رات کا بے اندھیرا ہمیں کھاڑی میں لے گیا اور ہم ساحل پر جا پہنچے۔ ہم نے عارضی کیمپ لگایا اور اپنی دریافت جاری رکھنے کے لیے صبح کی پہلی کرن کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات میں کبھی نہیں بُھول سکتا۔ ہم یہ جانے بغیر کہ ہم کہاں ہیں، ساحل پر سوئے۔ ہمیں لیونور کی روشنیاں تک دِکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سب ریت پر پسر گئے کیوں کہ ہلکی سی ہَوا چل رہی تھی

اور موسم معتدل تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن اُن کی آوازوں کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ وہ ساحلی ریت پر صرف ستاروں کی ہلکی ہلکی دمکتی روشنی میں ساحل پر آکر دم توڑتی لہروں کی آوازوں کو سنتے ہوئے دِھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ہمیں آبنائے سے عجیب و غریب غُل سنائی دیتا۔ اُن کے بڑے بڑے جسموں سے بہتے ہوئے پانی کا شور اور اُن کی سانسوں کی خاص مہک۔ نیز ے والے اُٹھے کھڑے ہوئے کہ ساحل کے ساتھ ساتھ اُن کی سانسوں کے شور کا تعاقب کر کے اُن کی کھوج لگائیں۔

رات گئے چاند نکلا تو سمندر نمودار ہو گیا۔ کھاڑی کا پُرسکون پانی بالکل بھی مرتعش نہیں تھا اور مچھلیوں سے خالی پڑا تھا۔ پھر میں اپنے کوٹ میں لپٹ کر بازوؤں پر سر رکھ کے سو گیا۔ ہوا سیٹیاں بجاتی اور چاند دھیرے دھیرے کھاڑی پر بلند ہوتا رہا۔ میں نے خواب میں وہ دیکھا جسے میں اب تک نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں جس بھید کو پانے کے قریب تھا، میں نے اُس کا خواب دیکھا۔

طلوعِ صبح سے قبل ہی ہم سب اکٹھے جاگ اُٹھے۔ شاید انڈین اپنی زبان میں چیخا تھا: ''ہوئے مچھی، اوا!'' جس کی ہم سب آس لگائے ہوئے تھے۔ وہ ساحل پر، کشتی کے پاس اپنے بھالے پر جھکا ہوا کھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے سرمئی پانی اُبھر آیا جو آہستہ آہستہ پھسلتے ہوئے سیاہ دھبّوں سے ڈھپا ہوا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یقیناً کسی کو بھی اعتبار نہیں تھا کہ آیا وہ خواب ہے یا حقیقت۔ وہاں میں وہ دیکھ رہا تھا، جس کا میں سب سے زیادہ شائق تھا۔ جس کے متعلق ایک بار نان ٹکٹ کے ملاحوں نے کہا تھا کہ سرما میں سمندر پروں والی اور قطبِ شمالی کی وہیل مچھلیوں سے بھر جاتا ہے تو اِتنی زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں کہ اُن کا موازنہ میدانی علاقوں کے جانوروں کے غولوں سے کیا جا سکتا ہے۔

رُودبار میں سرمئی مچھلیاں دِھیمے دِھیمے تیر رہی تھیں اور اُن کے سیاہ پشتوں پر جھاگ ہلکورے کھا رہی تھی۔ اُن کی دُموں کے پانے کو دھکیلنے اور گلپھڑوں سے چاروں سمت پھواریں چھینکنے کی سُنائی دینے والی بھاری آوازیں آبنائے کے سکوت میں گُونج رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سبھی پانی کے پاس آکر دیکھنے لگے۔ جلد ہی چیخ پُکار پھوٹ پڑی، وحشیانہ اور جوشیلی چیخ پُکار؛ میں نے کشتی پانی میں اُتارنے کا حکم دیا۔ مد مچھلیوں کو رُودبار کی بلندی کی طرف دھکیل دے رہا تھا، جہاں سے وہ کھاڑی کے کھارے پانی میں داخل ہو جاتیں۔ وہ اتنی زیادہ تعداد میں تھیں کہ کئی جگہوں پر تو ایک دُوسرے کے اُوپر لڑھک رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ پیڈل مارتے ہوئے، کشتی مچھلیوں کے پیچھے پیچھے اُن کے متعینہ راستے پر، اُن قوی ہیکلوں سے ٹکرا کر، اُلٹنے سے بچنے کے لیے پانی کی تہہ میں موجود کھوہوں کے بالکل ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ سمندر نے اُس ساری ریتلی پٹی کو ڈھانپ لیا تھا، جس پر ہم سوئے ہوئے تھے۔ ہزار ہا

کچھیروؤں نے آسمان سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ اُن کے تعاقب میں تھے جیسے جانتے ہوں کہ کیا ہونے والا ہے۔

۱۰ جنوری کی صبح، چھے بجے ہم کھاڑی کے پانیوں میں داخل ہوئے۔ وہ اتنی حسین تھی، جتنی میں نے تصور کی تھی، وسیع وعریض، زردہ، ریتلی پٹی کے دُور کے کناروں اور جزیرہ ہائے نما پر آسمان سے ملتی۔ تاحدِ نگاہ، گویا سمندر میں سر اُٹھائے، سُرخ صَوان کے پہاڑ، دھوپ میں اپنی ناقابلِ بیان سختی لیے چمک رہے تھے لیکن وہاں کا پانی؛ پُرسکون اور آئینے جیسا پانی، جی کو متلاتا تھا۔ جہاں سے کُھم شُھم سیاہ اجسام سینکڑوں مل کہ شاید ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے گُور رہے تھے۔ کشتی کے اگلے حصے میں انڈین نیزہ باز کے ہم راہ، یہ سب خاموشی سے دیکھتے ہوئے، مجھے اچانک لگا جیسے: میں ایک گُم شدہ دُنیا میں داخل ہو گیا ہوں، جو بےشمار قرنوں سے ہماری دُنیا سے کٹی ہوئی ہے۔ ریتلی پٹی کے درمیان رَودبار رہے ہوتے ہوئے مچھلیاں، پُرشکوہ انداز میں کھاڑی میں پھسل رہی تھیں۔ جن میں کچھ مادہ مچھلیاں بھی تھیں جو اپنی پُوٹلیں جنم چکی تھیں اور اب اُنھیں سطحِ آب پر، لاکر پہلا سانس دِلوا رہی تھیں۔ باقی بہت بڑی تعداد میں اپنے پیٹوں کو دھوپ لگواتی ہوئیں، جنم کے لمحے کی منتظر تھیں۔ اُن سے کچھ فاصلے پر پھیلے گروہ کی صُورت میں جمع ہو کر، اپنے بڑے بڑے جثّوں کی سیاہ دیوار کا حصار بنائے ہوئے تھے۔

مجھے نہیں پتا کہ ہم نے اُس منظر کا سحر، کیسےتو ڑکر، خُود کو آزاد کیا لیکن اچانک، میرے حکم پر، خاموش شکاری شروع ہو گئے۔ کشتی؛ گروہ کی طرف بڑھی۔ انڈین نیزہ باز، اپنی بھری ہوئی بندوق تھامے عرشے کے اُوپر کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے عرشے کا عملہ، بھاگ اُٹھنے کے لیے، ہر طرح سے تیار تھا۔ کشتی کھاڑی کے پُرسکون پانی میں، قریب قریب شور پیدا کیے اور اُنھیں جگائے بغیر، آگے بڑھی۔ دِن کی روشنی کے باوجود، پانی میں گہرائی تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ پانی کا دُودھیا رنگ، آسمان کے رنگ کی ملاوٹ سے چکرا دینے والا تھا؛ ہم سب پیش آمدہ حالات پر محتاط تھے۔

بجرے کے پہلو کے پاس سے چند گز نیچے ایک سایہ گُورا اور تہہِ آب چلنے والا ایک سیاہ بادل یکا یک اُٹھا تو فضا میں ایک ستواں پہاڑ بن گیا، جس سے قطروں کی پھوار گر رہی تھی اور دھاڑتا ہوا پانی واپس پانی میں جا گرا، جس سے ایک سیکنڈ کے لیے تو ہمارے ہاتھ پاؤں پُھول گئے۔ انڈین پہلے ہی ٹرائیگر کھینچ چکا تھا۔ نیزہ دھچکے سے سیدھا نکلا، جس نے کشتی کو روک دیا جب کہ رَسّی سیٹی بجاتے ہوئے کھلی۔ جب سرمئی مچھلی، جو ایک مادہ تھی، ہمارے یہ دیکھنے سے قبل ہی پانی میں ڈُبکی لگا گئی کہ ہم نے اُسے نیزے سے نشانہ بنا لیا تھا یا نہیں تو فتح کا نعرہ بلند ہوا۔ لیکن بڑے جثّے نے نیچے جانے سے پہلے ایک بھاری سانس خارج کی، جسے بُھلایا نہیں جا سکتا۔ رَسّی گولی کے مانند، ناقابلِ یقین تیز رفتاری سے، کھلی کہ اُس نے، کشتی کے کنارے لگی رَوکیں تک توڑ ڈالیں۔ عرشے کے عملے نے لکڑی پر فاف پانی

ڈالا تا کہ وہ رگڑ سے آگ نہ پکڑ لے۔ اگلے ہی لمحے وَہیل، کھاڑی کی سطح پر، دوبارہ ایک غیر معمولی جست سے اُبھری کہ ہم سب دہل گئے۔ آسمان کے مقابل، اُس کی خُوب صُورتی اور جسمانی طاقت دِیدنی تھی۔ وہ کچھ دیر فضا میں ساکت رہی اور پھر واپس جھاگ میں گر کر ہولے ہولے تیرنے لگی۔ ہم نے اُس کے مُنھ میں خُون دیکھا، جس نے اُس کے فوارے کو بھی لہولہان کر رکھا تھا۔ کشتی چپکے سے وَہیل کے قریب گئی۔ آخری لمحے میں، جب پانی کے ہلکورے سے اشارہ ملا کہ وہ دوبارہ حرکت میں آنے والی ہے تو انڈین نے دُوسرا نیزہ چھوڑ دیا، جو مچھلی کے بدن میں پَر کے جوڑ کے اُوپر پسلیوں کے بیچ عین دِل میں گہرائی تک کھب گیا۔ یک لخت، اُس کے گلپھڑوں سے خُون کا بے حد سُرخ رنگ فوارہ چھوٹ کر آسمان کی طرف بلند ہوا اور ہمارے سروں اور سمندر پر بارش کے مانند برس گیا۔ بڑا سا جسم اَکڑا اور پھر سطح پر ساکت ہو گیا۔ اُس نے پلٹا کھایا تو نیزہ لگنے والا مقام دِکھائی دینے اور کھاڑی میں لہو کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اشتیاق کے سبب سبھی گنگ ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے چُپ چاپ اُس کے سر پر آنکڑا پھنسا کر کشتی کے ساتھ باندھا اور کشتی وَہیل کو کھینچتی ہوئی لیونور کی جانب کھاڑی کے دہانے کی طرف بڑھنے لگی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو تحسین کے نعروں سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ عملے کے افراد مچھلی کے گلپھڑوں اور مُنھ سے زنجیریں گزار کر اُسے احتیاط سے جہاز کے پہلو سے باندھنے لگے۔ بلند مَد کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے دس مچھلیاں شکار کر لیں۔ وہ اِتنی زیادہ تھیں کہ لیونور، اُنھیں نہیں لے جا سکتا تھا۔ ہم نے دیوہیکل مچھلیاں وہیں چھوڑیں اور واپس شمال کو قزاقوں کی آماجگاہ کی سمت مڑ آئے۔

نان ٹکٹ کا جان

تین برس بعد میں دوبارہ کھاڑی کو گیا۔ اب میں لیونور پر نہیں رہا تھا بل کہ نان ٹکٹ کمپنی کے وَہیل مچھلیوں کے ایک شکاری جہاز سَیگ ہاربر پر تھا۔ میں دوبارہ کبھی کپتان چارلس مَیلوِلے سکیمون سے نہیں ملا۔ لیکن جب میں کھاڑی میں لوٹا، جس کا تمام کمپنیوں نے یہی نام رکھ دیا تھا تو مجھ پر ایک بار ایسی دہشت طاری ہوئی، جسے میں کبھی نہیں بُھلا سکتا۔ وہ جگہ، جو کبھی بے حد خُوب صُورت ہوا کرتی تھی جس طرح انسان کی تخلیق سے قبل آغاز میں دُنیا حسین ہوتی تھی، ایک قتل گاہ بن چکی تھی۔ کھاڑی میں داخل ہونے کا راستہ جہازوں نے بند کر رکھا تھا۔ اُس حصار میں سرمئی مچھلیاں اپنے سامنے اپنی پونگوں کو دھکیلتی باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈتی چکراتی پھرتی تھیں۔ جب وہ بجروں کے سامنے نمودار ہوتیں تو بندوقوں سے دھماکے دار نیزے داغے جاتے اور کھاڑی میں جسیم مچھلی کا لہو پھیل کر ساحلوں کو داغ دار کرنے لگتا۔ چُوہوں جیسے بدمست بکھیرو مچھلیوں کے اُوپر منڈلانے لگتے۔ شارکوں کے جتھوں نے کھاڑی کا رُخ کر لیا تھا۔ وہ زخمی وَہیلوں پر حملہ آور ہو جاتے اور بندوق برداروں اور ملاحوں کی کوششوں کے باوجود جہاز کے پہلوؤں سے بندھے شکاروں کو چیر پھاڑ ڈالتے۔ ہر طرف، ناقابلِ رسائی ریتلی پٹیوں پر مچھلیوں کی

لاشیں، گوشت اور ہڈیوں کے ٹکڑے اور آسمان کی سمت اُن کی اُٹھی ہوئی تھوتھنیاں پڑی ہوتیں۔ بندوقیں ہر وقت گولیاں برساتی رہتیں، نیزے اُن کے جسموں کو چھلنی کرتے رہتے اور گلپھڑوں سے خون کے فوارے چھوٹتے رہتے۔ غیر انسانی آوازیں گونجتی رہتیں۔ کوئی پکارتا نہ بولتا۔ وہاں مچھلیوں کے بدنوں پر گولیوں کی بوچھاڑوں، مچھیروؤں کی تیکھی چیخوں اور دم توڑتے بے زبانوں کی بوجھل سانسوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بعض دفعہ دو جہاز ایک ہی مچھلی کو مار گراتے تو اُن کے عملے کے افراد اونچی آواز لیکن سخت لہجوں میں دھمکیاں دیتے ہوئے ایک دُوسرے کو قائل کرنے لگتے۔ دُور کھڑا سورج؛ صحرائی پہاڑوں، نمک کی کانوں اور گاڑھے پانی پر چمکتا رہتا۔

اب وہ کوئی راز نہیں رہا تھا۔ اِس سب نے مجھے دہشت زدہ کر دیا اسی لیے میں نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی وہاں نہیں آؤں گا اور میں آخری بار آیا ہوں۔ کہتے ہیں کہ کھاڑی کی دریافت کے اگلے برس ایک سو جہاز وہیلوں کی پناہ گاہ کی سرحد پر آئے اور اُنھوں نے بچے جننے والی مچھلیوں کے پیچھے اپنی کشتیاں بھیجیں۔ قتلِ عام ایک ماہ تک دِن رات جاری رہتا؛ دُنیا کے کونے کونے سے جہاز آتے؛ رات کے وقت کھاڑی کے ساحل اور ریتلی پٹیوں پر آگ روشن کر دی جاتی؛ کھاڑی کے داخلے پر ایک چھوٹی پہاڑی کے سرے پر ایک جیٹی تعمیر کر دی گئی تھی، جہاں قبل ازیں ہم سرمئی مچھلیوں کی سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے سوئے تھے۔ اب وہاں ہر طرف لوگوں کا شور، چیخنا اور چلانا تھا، رنگ برنگی بولیاں اور شکار کی خاموشی کے بعد مچھیروؤں کا غراتا ہوا شور شرابا تھا۔

دِن نکلتے ہی قتلِ عام شروع ہو کر دوپہر تک جاری رہتا۔ کھاڑی سے چپو کشتیاں مچھلیوں کو کھینچتی ہوئیں جہازوں کو لوٹتیں۔ اب وہ دُنیا کے آغاز سے دریافت تک رہنے والا کوئی خفیہ اور بے نام مقام نہیں رہا تھا۔ کھاڑی کے ہر کونے، ہر خلیج، ہر ریتلی پٹی کا اپنا ایک نام تھا: شکار گاہ، گوبر جھیل، مچھلی تالاب، ہیکل کھاڑی، نئی بندرگاہ، نمک کی کانیں۔ انسانوں نے تمام کھاڑی پر اپنا حق قائم کر لیا تھا۔ نمک کی کانوں کے مزدوروں اور پانی کے تاجروں کی ابتدائی مڑھیاں بن چکی تھیں۔ جس جگہ دوشیزائیں اپنا آپ قزاقوں کو بیچتی تھیں، وہاں خزوں کی کٹیائیں بنی ہوئی تھیں۔

اب کئی برسوں کے بعد بھی، میں اُس ویران ساحل پر آرا سیلی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں دریا کی خشک شاخ کے پیٹ میں اُس مقام کو تلاشتا ہوں، جہاں میں نے پہلی بار مچھیروؤں کے بیچ نرسلوں میں چھپ کر، صبح سویرے، اُسے نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس جگہ کو بھی ڈھونڈتا ہوں جہاں اُس نے پہلی مرتبہ مجھ سے بات کی تھی۔ یہ اِس قدر پُرانا قصہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم آیا وہ واقعی حقیقت تھی یا میں نے خواب دیکھا تھا۔ میں اُس کی جلد کا رنگ نہیں بھولا اور نہ ہی اُس کی آنکھوں کی وحشی چمک۔ صبح سویرے ہم وہاں سیلی ریت پر پسرے پڑے تھے۔ میں نے اُس کے بدن کو چھوا تو تپش اور جذبات سے

مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اُس نے مجھ سے ایک عجیب زبان میں باتیں کی، جو سخت لیکن لے بھری تھیں اور مجھے وہ صحرائی پہاڑیاں دکھائیں، جہاں سے وہ آئی تھی۔ میں اُس کی ایک نہیں سمجھا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ اُس نے کیوں میرا انتخاب کر کے اپنا آپ میرے سپرد کیا تھا۔ وہ نہایت جنونی اور وحشی تھی لیکن ساتھ ہی نہایت ڈرپوک بھی کہ سائے تک سے ڈر جاتی تھی۔ جب سُورج طلوع ہوا تو وہ نرسلوں سے نکل کر واپس اپنی جائے سکونت والی گلی میں چلی گئی، جہاں ایمیلیو اور دُوسری دوشیزائیں سوئے ہوئے تھے۔ اُس کی جلد، کمر پر جھولتے سیاہ بال، چمکتی آنکھیں، اُس کی آواز اور سانسوں کی یاد لیے، میں اُس کی تلاش میں ہوں۔

ایک روز وہ نہیں آئی۔ میکسیکو والے والڈیس نے مجھے بتایا کہ وہ بھاگ گئی ہے۔ ایمیلیو نے اُسے مارا پیٹا اور وہ نکل گئی۔ میں دریا کی مخالف سمت، صحرائی پہاڑیوں کی طرف گیا۔ میں نے دلدل اور نرؤں میں اُس کے قدموں کے نشان کھوجے؛ پھر میں نے ایمیلیو کو گھوڑے پر سوار دیکھا، وہ پہاڑوں کی جانب گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک شکاری لگ رہا تھا۔ جب وہ آرا سیلی کی لاش لائے تو میں اپنی رہائش گاہ پر تھا، اُن لوگوں نے اُسے مَیس کوائٹ (mesquite: شمالی امریکا کا ایک پھل دار پیڑ) کے جنگل سے پکڑ لیا تھا، اُنھوں نے اُسے دریا کے قریب ریت پر ڈال دیا۔ کسبیاں آئیں، اُسے نفرین بھری نگاہوں سے دیکھا اور اُس پر لعنتیں ڈالیں۔ مرد ایک بھی لفظ بولے بغیر کچھ فاصلے پر کھڑے رہے، پھر اُن میں سے کچھ لوگوں نے ٹھیک اُسی جگہ پر، جہاں وہ دریا کے کنارے ریت اور پتھروں پر پڑی تھی، ایک قبر کھودی۔ قبر ایک سوراخ سے زیادہ بڑی نہیں تھی، جس میں اُنھوں نے آرا سیلی کی نعش کو ٹھونس دیا۔ ایک آدمی نے اُسے ٹانگوں سے پکڑا اور دُوسرے نے بازوؤں سے؛ اُنھوں نے اُسے ایک جھولا دیا اور سوراخ میں پھینک دیا۔ قبر اس قدر تنگ تھی کہ اُس کے بازو، قبر کے کنارے کے پتھروں پر پڑے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یُوں لگتا تھا گویا وہ غائب نہیں ہونا چاہتی۔ میں نے قریب جانے کی ہمت نہیں کی۔ میں اُس کی دھول سے اَٹی سرمئی جلد، بند آنکھیں اور خُوب صُورت بال دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ ماجھیوں نے پھاوڑوں سے اُس پر مٹی ڈالی۔ پھر اُس پر بڑے بڑے پتھر رکھ دیے۔ چُوں کہ وہ ایک انڈین تھی اِس لیے اُس کے لیے فاتحہ ہوا نہ درود؛ اور نہ ہی اُس مقام کو نشان زد کیا گیا کہ اُسے کہاں دفن کیا گیا ہے۔ لیکن میں وہ جگہ نہیں بُھولا۔ اِسی لیے میں یہاں آتا ہوں، قبر دیکھنے، ایک بار پھر اُسے شناخت کرنے۔ دریا سُوکھ چکا ہے، مَیس کوائٹ کا جنگل جلایا جا چکا ہے لیکن میں ٹھیک وہی مقام پہچان سکتا ہوں، جہاں آرا سیلی اُس سُرخ زمین میں دفن ہے اور جہاں سے پتھر کبھی نہیں ہٹے۔

بعد میں دوشیزائیں وہاں سے چلی گئیں کیوں کہ اُن کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُسی برس ایمیلیو سان فرانسسکو میں گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے

کہ اُسے سونا مل گیا تھا اور وہ امیر کبیر ہو گیا تھا۔ اُسی برس نان ٹکٹ کمپنی نے اپنے معاملات سان فرانسسکو سے چلانا شروع کر دیے اور قزاقوں نے پُچانبڈا میں ٹھہرنا بند کر دیا تھا۔ وہاں آگ جلانے تک کے لیے لکڑیاں نہیں بچی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دریا نے بھی وہاں سے بہنا بند کر دیا تھا۔

بہت عرصہ پہلے وہ ایک اور ہی دُنیا ہوا کرتی تھی۔ اب تو لیونور کا وجود بھی نہیں رہا۔ وہ آبنائے سان فرانسسکو کی ایک ساحلی ریتلی پٹی پر ڈھانچہ بنا پڑا ہے۔ اور پتا نہیں کپتان سکیمون، نائب کپتان رائیز، ناچنگ کے نیزہ باز، ہوائی اور کانک کے مانجھیوں، میکسیکو کے والڈیس اور اُن دُوسرے سب لوگوں کا، جو پہلی بار میرے ساتھ اُس کھاڑی میں داخل ہوئے تھے، کیا بنا؟

میں سردیوں کی ہلکی ہوا میں ساحل پر آوارہ پھرتا ہوں۔ مجھے بانسوں کی سیٹیاں، ہڈیوں کے کڑکنے اور پُرانی مرحیوں کی شاخوں کی آوازیں آتی ہیں۔ میں کانپ اُٹھتا ہوں کیوں کہ سیٹی جو غیر مرئی دریا سے آتی ہے آرا سیلی کی آواز جیسی ہے۔

نئی صدی کا آغاز ہو گیا ہے۔ کوئی بھی چیز اب پہلے جیسے نہیں رہے گی۔ دُنیا اپنی اصل کی جانب نہیں پلٹے گی۔ کھاڑی اب وہ مقام نہیں رہا جہاں کبھی زندگی جنم لیتی تھی۔ وہ خُون کی گاڑھی اور بدبودار جھیل بن چکی ہے۔ میں اُس کے ساحلوں پر کٹیاؤں کے کھنڈروں میں بھٹکتا ہوں۔ شاید میں بھی اپنی جوانی کے ایام والے بوڑھے جان نانک جیسا ہو گیا ہوں۔ جو کھاڑی کے سرمئی پانی کے سامنے اُسے دکھائی نہ دینے والی پُرانی ہڈیوں کے ڈھانچوں کے بیچ بھٹکتا رہتا تھا۔ کیا کسی روز کوئی بچہ شاخوں اور ہڈیوں کے تڑخنے کی غم ناک آواز سُنے گا؟ کبھی کبھار جہاز ساحل سے دُور گزرتے ہیں، میں اُن کے بلند مستولوں، دھواں اُگلتی چمنیوں کو دیکھتا ہوں۔ وہ آبنائے عبور کر کے جنوب کی سمت جاتے ہیں۔ وہ مزید بھیدوں اور مزید شکار کی کھوج میں ہیں۔ پھر سمندر ایک بار پھر بلا اشارے کنائے کے پُرسکوت ہو جاتا ہے۔ کوئی کس طرح یہ بُھولے تا کہ دُنیا آغازِ نو کر سکے؟ مجھے ہر جگہ آرا سیلی کی قبر دکھائی دیتی ہے۔ ہر طرف وہی پتھر ہیں اور وہی تڑخی ہوئی زمین۔ دُور کہیں، کیپ شہر سے پرے نیا شہر ہے۔ غور سے سننے پر شاید میں ہوا کے جھونکوں پر آتی موسیقی، قہقہوں اور بچوں کی کلکاریاں سُن سکتا ہوں۔

چارلس میلوِلے سکیمون

میں، چارلس میلوِلے سکیمون، جان ڈِکس کا کمانڈر، میں نے وہ داستان رقم کی تھی، وہ اسرار دریافت کیا تھا۔ میں ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اُس انجانے ساحل، اُس کھوکھلے، ننھے جزیرے اور آبنائے کا وہ راستہ دریافت کیا تھا جہاں کھاڑی کے نرم پانی کے مدوجزر پر تلیّیں جنم دینے والی مچھلیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ میں نے وہ داستان ایک خوابِ عتیق کے مانند یُوں رقم کی تھی کہ جیسے وہ بجلی کی ایک ہی چمک میں یکا یک حقیقت بن گئی ہو۔ جو لوگ میرے ہم راہ تھے، مجھے اُن میں سے ایک بھی نہیں

بُھولا — نہ رائیز، نہ ان ٹکٹ کا تیز دہاز، نہ وہ نوجوان لڑکا جو پہلی بار شکار کھیل رہا تھا اور مجھے یُوں دیکھتا تھا گویا میں کوئی ممنوعہ الوہی عتاب والا کام کر رہا ہوں۔ مجھے اُن میں سے ایک ایک شخص یاد ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں حلفیہ کہتا ہوں کہ ایسے کام زندگی میں دو مرتبہ نہیں کیے جا سکتے۔ آمین۔

صبح سویرے کھاڑی میں داخل ہوتے ہی، ہم نے کشتی کو لاتعداد مچھلیوں کے درمیان پایا جو اپنی پونگوں کو جنم دینے کے لیے دوہری ہوئی جا رہی تھیں اور پھر اُن پونگوں کو زندگی کا پہلا سانس دِلانے کے لیے سطحِ آب پر لا رہی تھیں۔ پھر ہماری کشتی بے شور زرد پانی کو کاٹتے ہوئے گُزری جس کی ہم رکاب موت تھی۔ بعد میں ہمارے ہر طرف پھیپھڑوں کا کان پڑی آواز سُنائی نہ دینے والا شور اور کھاڑی کے پانی میں مچھلیوں کے، جو صبح کی روشنی میں پانی کے رنگ کو سیاہی مائل کر رہی تھیں، خُون کی ملاوٹ۔

کشتی نے پانی کو چیرا اور انڈین کی بندوق نے نیزہ چھوڑا جو وہیل کے پہلو میں جا کر لگا اور اُس کے جسم سے خُون کا فوارہ چھُوٹ پڑا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس رُوح ہی نہیں تھی، ہم دُنیا کے حسن سے آگاہ ہی نہیں تھے۔ ہمیں لہو کی مہک نے، فواروں کے ساتھ جاتی زندگیوں کی آہ و بکا نے، مدہوش کر دیا تھا۔ اب مجھے اُن لوگوں کی نظریں یاد آتی ہیں۔ اِسے میں اُس وقت کیوں نہیں دیکھ پایا تھا؟ اُن کی نگاہوں میں سرخوشی اور بے رحمی تھی۔ کچھ لہولہان مچھلیاں کشتی کو کھینچ کر پانی کی پنہائیوں میں لے جا سکتی تھیں اور اُن سے بچنے کے لیے اُن کی قطار کو کلھاڑوں سے کاٹ کر ہی ساحلی پٹی تک پہنچنا ممکن تھا۔ جہاں وہ مچھلیاں دم توڑ گئیں اور اُن کی لاشیں سمندری الابلا کے مانند گلنے سڑنے لگیں۔

مجھے اُس بچّے کی نظریں یاد آتی ہیں جو ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے مجھے ایک سوال سے ستائے رکھا جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ سوال کیا تھا۔ اُس نے دریافت کیا تھا کہ کوئی اُسے کیسے مار سکتا ہے، جس سے وہ محبت کرتا ہے؟

اگرچہ ہم پہلے لوگ تھے لیکن اگر ہم وہاں نہ جاتے تو دُوسرے کبھی نہ کبھی تو اُس بہشت کا راستہ پا لیتے، کھاڑی کو، جہاں سے مچھلیاں دُنیا میں جنم لیتی ہیں، جانے والا راستہ۔ کوئی ایسے بھید کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟

روز بروز آبنائے سے کھاڑی میں مچھلی کے شکار کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ وہ دُنیا کے کونے کونے سے ہر سال، پچھلے برس سے زیادہ بڑے جہاز لانے لگے: کیلی فورنیا، چلی، ارجنٹینا، الاسکا، ناروے، رُوس، جاپان۔ کھاڑی کے داخلے پر جہاز ایک فوج کے مانند لگے رہنے لگے تھے۔ وہ زہر میں بجھے بھالے، توپیں، برقی نیزے، اُوپر اُٹھا لینے والی مشینیں، زنجیریں اور کشتی کے آنکڑے لیے ہوئے ہوتے۔ اُن کے چاروں طرف پانی میں فاقوں مرتے سمندری بگلے اور شارکوں کے جھنڈ ہوتے۔ سرما کی صبحوں کو کھاڑی خُون کی ایک جھیل اور چٹانوں کو غسل دیتے سُرخ دریا کا منظر

پیش کرتی ۔ کھاڑی اب راز نہیں رہی تھی بل کہ وہ ایک ایسا پھندہ بن چکی تھی جس کی طرف مچھلیوں کو ہانکا جاتا تھا، ایک ایسا جال جہاں وہ اور اُن کے نوزائیدہ موت پاتے تھے ۔ ہزار ہا اجسام کو بھالے گھونپ کر مارا گیا، جہازوں پر لادا گیا، کشتیوں کے آنکڑوں سے باندھا گیا، ساحلوں پر اُن کی چیر پھاڑ کی گئی اور اُن کا تیل نکالا گیا ۔ گرانڈیل لاشیں ریت پر یا پھر کھاڑی کی گہرائی میں گلتی سڑتی رہتیں ۔ اگر جنوری ۱۹۵۲ء کے اُس خوش بخت دِن میری نگاہ ویران ساحل کے ریتلے جزیرے سے ادھ چھپے اُس درّے پر نہ پڑتی تو کیا زمین کی کوکھ اب بھی وہیں موجود ہوتی؟ کیا دُنیا کے اُس اوّلین آغاز کو اب دوبارہ حاصل کیا جا سکے گا؟ کھاڑی نہایت حسین اور وسیع وعریض تھی، زمین وآسمان کے عین بیچ زمین کے وسط میں سمندر اور ساحل کے درمیان واقع وہ حسین اور وسیع کھاڑی جس میں زندگی جنم لیتی تھی ۔ کھاڑی میں مچھلیاں آزاد تھیں، دیویوں کے مانند کیم شحیم اور بادلوں کی طرح بے حد بڑی بڑی ۔ وہ اُس مقام پر، زمین کے اُس بھید سے دُنیا میں آتی تھیں جہاں سے زندگی کا آغاز ہوا تھا: ابد تک حیاتِ نو کا آغاز جس کا کوئی انت نہیں تھا ۔

لیکن میں، چارلس مَیلوِے سکیمون، نان ٹَکٹ کمپنی کے لیونور کا کمانڈر، میں نے اُس راستے کو دریافت کیا تھا اور اب کوئی بھی شے ویسی نہیں رہے گی جیسے اُس سے قبل تھی ۔ میری توجہ بھید پر تھی ۔ پس میں نے اپنے خوں خوار ساتھیوں کو لیا اور پھر حیات جنم لینا بند ہوگئی ۔ اب سب کچھ لُٹ اور تاخت و تاراج ہوگیا ہے ۔ جس ساحل پر ہم نے پہلی شب بسری کی تھی اور آنے والی دیوہیکل مچھلیوں کی پھنکاریں سُنتے رہے تھے وہاں ہم نے ایک چوبی جیٹی تعمیر کر دی جہاں ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے پہلے مچھلیوں کی نعشیں رکھی جاتی تھیں ۔ نمک چکھنے والوں، پانی کے تاجروں اور لکڑ ہاروں کی کُٹیائیں دِنوں میں بن گئی تھی ۔ زمین کی کوکھ سوکھ کر مُردہ ہوگئی ۔ مزید حیات جنم دینے کی اہل نہ رہی ۔

اب جب میں اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ کشتی کا اگلا حصہ کھاڑی کے زرد پانی کو خاموشی سے چیر رہا تھا، انڈین کے ہاتھوں میں پکڑی بندوق کا رُخ کیم شحیم مچھلیوں کی طرف تھا ۔ مجھے پُرشکوہ جست والی وہ مادہ مچھلی یاد آتی ہے جو ایک لمحے میں قطروں کے بادلوں میں معلّق ہوگئی تھی ۔ پھر وہ نیچے گری اور اپنے نوزائیدہ بونگ کو بھی دھکیل کر موت کے مُنہ میں لے گئی تھی ۔ کوئی کیسے اُسے مار ڈالتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو کشتی میں بچّے کے چہرے نے میرے سامنے رکھا تھا اور اب بھی یہ سوال میرے کانوں میں ہے ۔ پھر جب کشتی کھاڑی کے پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تو ہم اپنے ارادے کی تکمیل میں بے رحم ہو گئے تھے ۔ جب مچھلیوں کو جہاز کی طرف کھینچ کر لے جا رہے تھے تو مجھے بچّے کی آنکھوں کے آنسو یاد آتے ہیں کیوں کہ صرف وہی تھا جسے ادراک ہوا تھا کہ ہم نے بھید کھو دیا ہے ۔

میں اُسے یاد کرتا ہوں کہ کاش وقت کی چال تھام سکوں، کشتی کا آگے بڑھنا روک سکوں اور کاش میں ایک بار پھر اُس راستے کا داخلہ بند کر سکوں۔ میں اِس سب کا خواب بالکل ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے میں نے کبھی اُس راستے کو پانے کا خواب دیکھا تھا۔ پھر زمین کی کوکھ ایک بار پھر ہری ہو جائے گی اور مچھلیاں دُنیا کے نرم پانیوں میں تیر سکیں گی، اُس کھاڑی میں جس کا آخر کار کوئی نام نہیں ہو گا۔

VVVV

۱؎ Awetie Pawana یا صرف Pawana: جب فرانسیسی مچھیرے وہیل مچھلی کو دیکھتے ہیں تو یہ الفاظ پکارتے ہیں۔

۲؎ Orca: سیاہ اور سفید دانتوں والی شکاری وہیل۔

۳؎ مُراد ریڈ انڈین لوگ ہیں جو امریکا کے اصل باشندے تھے۔

۴؎ Kanka: جزیرہ ہَوائی کی نسل کے لوگ۔

ہزاران
(Hazaran)

فرنچ مینی پاز حقیقی معنوں میں قصبہ نہیں تھا کیوں کہ وہاں گھر تھے نہ سڑکیں۔ صرف لکڑی کے پتلے تختوں، قیر لگی پرتوں یا گارے کی مڑھیاں تھیں۔ شاید اُس کا نام اُس میں بسنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کی وجہ سے پڑا تھا جن میں اطالوی، سلوانی[1]، ترک، پُرتگالی، الجیریائی، افریقی، راج مستری، مزدور، کاشت کار سبھی شامل تھے۔ جنھیں نہ کہیں کام ملنے کی توقع ہوتی تھی اور نہ ہی اُنھیں پتا ہوتا تھا کہ آیا وہ وہاں ایک سال ٹھیریں گے یا محض ایک دو روز۔ وہ دریا کے میٹھے پانی کے سمندر کے کھاری پانی سے ملاپ کے مقام کے سرحدی حصار میں دلدلی مقام پر واقع پاز میں آتے اور جہاں جگہ ملتی چند ہی گھنٹوں میں اپنی کٹیا کھڑی کر لیتے۔ چھوڑ کر جانے والے اُنھیں لکڑی کے پُرانے شہتیر فروخت کر جاتے جن میں اِتنے چھید ہوتے کہ آر پار دیکھا جا سکتا۔ چھتوں کے لیے وہ لکڑی کے تختے اور قیر کی تہ والی بڑی بڑی پرتیں برتتے تھے اور اگر اُنھیں خوش قسمتی سے مل جاتیں تو تاروں سے بندھی ہوئی آہنی چادریں یا پھر پتھر۔ سوراخوں کو بھرنے کے لیے وہ پُور[2] استعمال میں لاتے تھے۔

وہیں ایلیا بھی رہتی تھی، پاز کے مغرب میں مارٹن کے گھر کے نزدیک۔ وہ دونوں ایک ہی وقت میں وہاں آئے تھے۔ شروع ہی میں جب وہاں لگ بھگ دس کٹیائیں تھیں، ابھی نرم زمین کے قطعے، گھاس کے میدان اور دلدل کے کنارے نرسل اُگے ہوئے تھے۔ ابھی وہ کھیلنے کھانے کی عمر کی بچی ہی تھی کہ اُس کے ماں باپ چل بسے۔ اُس کی خالہ اُسے اپنے ہم راہ یہاں لے آئی تھی۔ اب چار برسوں میں پاز پھیل چکا تھا۔ دریا اور سمندر کے ملاپ کا بایاں کنارہ سینکڑوں کچھ گلیاروں اور اَن گنت مڑھیوں سے اَٹ گیا تھا۔ ہر ہفتے لدے ہوئے ٹرک نئے گھرانوں کو پاز میں لاتے اور کئی پُرانے باسی چلے جاتے۔ جب ایلیا، دستی نَل سے پانی لینے یا اشترا کی دُکان سے چاول یا ڈبہ بند سارڈین مچھلی خریدنے جاتی تو وہ قیام کے لیے بچ رہنے والی جگہ کے متلاشی نو آمدوں کو دیکھنے ٹھیر جاتی۔ معاملات یا آنے جانے والوں پر نظر رکھنے کے لیے کبھی کبھار پولیس بھی پاز کا پھیرا لگا لیتی تھی۔

ایلیا کو وہ دِن اچھی طرح یاد ہے جس روز مارٹن کی آمد ہوئی تھی۔ جب اُس نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو وہ دُوسروں کی مدد سے ٹرک سے سامان اُتار رہا تھا۔ اگر چہ اُس کا چہرہ اور کپڑے دھول سے اَٹے ہوئے تھے لیکن اُس نے پہلی ہی نظر میں اُس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ وہ عجب وضع قطع کا طویل القامت، دُبلا پتلا شخص تھا جس کا مُنھ چھائیوں سے بھرا ہوا تھا جس سے وہ ملاح دِکھتا تھا۔ وہ ماتھے اور رُخساروں پر جھرّیوں کی وجہ سے بُوڑھا لگتا تھا لیکن اُس کے بال بے حد کالے اور گھنے تھے اور اُس کی آنکھیں شیشوں کے مانند چمکتی تھیں۔ ایلیا کے خیال میں اُس کی آنکھیں پارٗ میں، بل کہ شاید ملک بھر میں، سب سے زیادہ دِلکش تھیں......اور اسی بنا پر اُس کا دھیان اُس کی طرف کھنچ گیا تھا۔

جب وہ پاس سے گُزرا تو وہ ساکت وہ صامت کھڑی رہی۔ وہ یُوں آہستہ رَوی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چل رہا تھا گویا وہ محض سیر کے لیے آیا ہوا اور ایک گھنٹے بعد ٹرک اُسے لینے لوٹ آئے گا۔ لیکن وہ وہاں رہنے لگا۔

مارٹن نے قیام کے لیے پارٗ کا مرکز منتخب نہیں کیا۔ وہ دلدل کے آخری حصّے میں گیا جہاں سے ساحلی گول چپٹے پتھر شروع ہوتے تھے۔ وہاں اُس نے اکیلے ہی اپنی گُٹّی ایسی جگہ بنائی جسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا کیوں کہ وہ مقام نہ صرف سڑک بل کہ تازہ پانی کے دستی نلکوں سے بھی بہت دُور تھا۔ اُس کا گھر حقیقتاً قصبے کا آخری مکان تھا۔

ایلیا کا خیال تھا کہ یہ اِس لحاظ سے بھی دیگر مکانوں سے منفرد ہے کہ مارٹن نے اُسے کسی کی مدد کے بغیر خود تعمیر کیا تھا۔ وہ ایک قوسی کُٹیا تھی، جس میں سوائے ایک اتنے چھوٹے دروازے کے کوئی دَر نہیں تھا کہ خود مارٹن کو بھی جھک کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ دُوسروں ہی کے مانند قیر جمی پرتوں کی چھت بنائی گئی تھی لیکن وہ چھت آنکھ کی پلک کی شکل کی تھی۔ اگر صبح کے جھٹپٹے میں دُور سے مارٹن کے گھر کو دیکھا جاتا تو اُس عجیب وغریب قصبے میں وہ دلدل اور ساحل کے بیچ قلعے کے مینار کے مانند بڑا اور بلند دِکھائی دیتا تھا۔

دراصل اُسے یہ نام ایلیا ہی نے دیا تھا: قلعہ۔ مارٹن کو ناپسند کرنے والے لوگ اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ جیسے اشترا کی دُکان کا سربراہ۔ اور کہتے تھے کہ وہ ایک کُتّا گھر جیسا دِکھائی دیتا ہے لیکن اِس کی وجہ محض اُن کا حسد تھا۔ وہ درحقیقت اِس لیے عجیب تھا کہ مارٹن غریب تھا، قصبے کے ہر شخص سے زیادہ نادار، لیکن اُس بے روزن گھر میں کچھ اسراریت تھی اور کم وبیش ایک ایسا وقار کہ دونوں باہم مل کر خوف اور سمجھ سے بالاتری کو جنم دیتے تھے۔

مارٹن وہاں تنہا اور اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ اُس کے گھر کے چاروں طرف ہمیشہ سکوت طاری رہتا تھا خاص طور پر شام کے وقت، ایک ایسا سکوت جس میں ہر شے زمان و مکان سے ماورا اور غیر حقیقی لگتی تھی۔ جب دھول زدہ وادی اور دلدل پر سُورج لشکارے مار رہا ہوتا تو مارٹن ایک کھانچے پر اپنے دروازے کے سامنے بیٹھ جاتا۔ عام طور پر لوگ وہاں نہیں جاتے تھے جس کی وجہ دہشت زدہ کر ڈالنے والا حقیقی سکوت اور شاید مارٹن کی تنہائی میں دخیل نہ ہونا تھا۔ تاہم صبح یا شام کے وقت وہاں عورتیں لکڑی جمع کرنے یا سکول سے آنے والے بچّوں کی راہ تکنے جاتی تھیں۔ مارٹن کو بچّوں سے بہت پیار تھا اور وہ اُنھیں پُر شفقت انداز میں بلاتا تھا۔ صرف بچّے ہی تھے جن کی طرف دیکھ کر وہ مُسکراتا تھا۔ اُس کی آنکھیں دمکنے اور ایسے آئینوں کی طرح چمکنے لگتیں جن پر روشنی پڑ رہی ہو کہ ویسی روشنی ایلیا نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بچّے بھی اُسے پسند کرتے تھے کیوں کہ وہ اُنھیں کہانیاں سُناتا تھا اور پہلیاں بُوجھتا تھا۔ باقی وقت میں مارٹن کوئی کام نہیں کرتا تھا البتہ وہ گھڑیاں، ریڈیو اور مٹّی کے تیل کے چُولہے ٹھیک کرنے کا کام جانتا تھا۔ وہ یہ کام بلا اُجرت لیے کرتا کیوں کہ اُسے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پس جس روز سے اُس کی آمد ہوئی تھی لوگ اپنے بچّوں کے ہاتھ اُس کے آلوؤں کی رکابیاں، سارڈین مچھلی، چاول، روٹی یا گرما گرم کافی بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھار عورتیں بھی اُس کے لیے کھانا لے جاتیں اور مارٹن محض چند الفاظ میں اُن کا شکریہ ادا کر دیتا۔ جب وہ کھانا ختم کر لیتا تو طشتریاں بچّوں کو لوٹا دیتا۔ اُس کو اُس کے کام کی اِس طرح ادائی کی جاتی تھی۔

ایلیا مارٹن کی کہانیاں سننے اور اُس کی آنکھوں کے رنگ دیکھنے مارٹن کے پاس جاتی تھی۔ وہ دُکان سے ایک ڈبل روٹی لیتی اور سارا پارک عبور کر کے قلعے کو جاتی۔ وہ اُسے اپنے گھر کے سامنے کھانچے پر بیٹھے گیس لیمپ کی مرمت کرتے پاتی اور اُس کے سامنے زمین پر بیٹھ کر اُسے کام کرتا ہوا دیکھنے لگتی۔ جب وہ پہلی بار اُس کے لیے روٹی لائی تھی تو اُس نے نہایت روشن آنکھوں سے اُسے دیکھا اور بولا۔

''ہیلو چاند۔''

''تم نے مجھے چاند کیوں کہا؟'' ایلیا نے پُوچھا۔

مارٹن مُسکرایا اور اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہو گئیں۔

''کیوں کہ مجھے یہ نام پسند ہے۔ کیا میرا تمھیں چاند کہنا اچھا نہیں لگا؟''

''پتا نہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ نام ہے۔''

''یہ ایک خُوب صُورت نام ہے۔'' مارٹن بولا۔ ''جب خُوب سرد راتوں میں آسمان صاف اور

بے حد سیاہ ہوتا ہے تو تم نے کبھی چاند دیکھا ہے؟ وہ مکمل طور پر گول اور دِل آویز ہوتا ہے اور میرا خیال ہے تم اُس جیسی ہو۔''

اور اُس دِن کے بعد سے مارٹن نے ہمیشہ اُسے ''چاند'' یا ''ننھے چاند'' کے نام سے پُکارا۔ اپنے پاس آنے والے ہر بچّے کا اُس نے کوئی نہ کوئی نام رکھا ہوا تھا جو کسی پودے، پھل یا جانور کا نام ہوتا جو بچّوں کو ہنساتا۔ مارٹن نے کبھی اپنے بارے میں کوئی بات کی نہ کسی نے اُس سے استفسار کا حوصلہ کیا۔ درحقیقت یُوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے پارُ میں ہے، دِیگر لوگوں سے بہت پہلے کا، یہاں تک کہ سڑک، پُل اور بندرگاہ کے بننے سے بھی پہلے کا۔ یقیناً اُسے ایسی چیزوں کے بارے میں بھی علم تھا جن کے بارے میں وہاں کے لوگ نہیں جانتے تھے: خُوب صُورت، قدیم چیزیں جنھیں وہ اپنے دماغ میں رکھتا تھا اور اپنی آنکھیں ٹمٹماتا رہتا تھا۔

یہ بات بھی نہایت عجیب تھی کہ مارٹن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ کرسی نہ پلنگ۔ اُس کے گھر میں سونے کے لیے ایک چٹائی اور کھانچے پر دھرا ایک گھڑا تھا۔ ایلیا یہ معاملہ سمجھ نہیں پائی تاہم اُس کا خیال تھا کہ اُسے کسی شے کی خواہش نہیں ہے۔ یہ انوکھا امر تھا کہ اُس کی آنکھوں کی دوامی ہلکی روشنی پانی میں کھڑے ستونوں کی طرح بے حد شفاف اور حسین لگتی کیوں کہ اُس کی گہرائیوں میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔

جُوں ہی ایلیا اپنے کام کاج سے فرصت پاتی وہ اپنی خالہ کے گھر سے اپنے لہنگے میں روٹی ٹھونستی اور مارٹن کے پاس آ بیٹھتی۔ جب وہ کام کر رہا ہوتا تو اُسے اُس کے ہاتھوں کو دیکھنا اچھا لگتا۔ اُس کے دھوپ سے سنولائے، مزدوروں اور راج مستریوں کے مانند ٹُوٹے ناخنوں والے ہاتھ بڑے بڑے لیکن ہلکے پھلکے اور اپنے کام میں ماہر تھے جو چھوٹے چھوٹے سے دھاگوں کو گانٹھ باندھ اور قریب قریب ناقابلِ دِید پیچوں کو گُھما سکتے تھے۔ اُس کے ہاتھ بلا سوچے سمجھے اور بغیر دیکھے کام کرتے رہتے تھے۔ اُس کی نگاہیں یُوں دُور کھوئی ہوئی ہوتیں جیسے وہ کسی اَور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

اُس نے اُس کی طرف دیکھا اور مُسکرایا۔

''تم نے مجھ سے یہ بات کیوں پُوچھی، ننّھے چاند؟ اور تم تم خُود کیا سوچ رہی ہو؟''

ایلیا نے دماغ پر زور ڈال کر سوچا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ جہاں سے تم آئے ہو وہ جگہ خُوب صُورت ہوگی۔''

''تم یہ کس بنا پر سوچ رہی ہو؟''

''کیوں کہ......''

اُسے جواب نہیں سُوجھا اور وہ شرما گئی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' مارٹن بولا۔ ''وہ بہت خُوب صُورت جگہ ہے۔''

''میں بھی یہی سوچتی ہوں کہ یہاں زندگی اُداس ہے۔'' ایلیا نے اضافہ کیا۔

''تم ایسا کیوں کہتی ہو؟ میں تو یہ نہیں سمجھتا۔''

''کیوں کہ یہاں کچھ نہیں ہے۔ یہ غلیظ جگہ ہے اور پانی نل سے لانا پڑتا ہے۔ یہاں مکھیاں اور بچھو ہے ہیں اور ہر شخص غریب ہے۔''

''میں بھی تو غریب ہوں۔'' مارٹن بولا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اُداس ہونے کی یہ کوئی وجہ ہے۔''

ایلیا نے دوبارغور کیا۔

''جہاں سے تم آئے ہو اگر وہ بہت خُوب صُورت جگہ ہے تو تم نے اُسے کیوں چھوڑا؟ تم یہاں کیوں آئے جہاں ہر چیز بے حد...... بے حد غلیظ اور کریہہ ہے۔''

مارٹن نے بغور اُسے دیکھا اور ایلیا نے اُس کی آنکھوں میں اُس روشنی کا کھوج لگایا جس میں وہ اس خُوب صُورتی کو دیکھ سکے جس کا وہ شخص تصور کیے ہوئے ہے: بڑے سے ملک کا گہرا سُنہرا عکس جو اُس کی پتلیوں میں زندہ ہے۔ لیکن مارٹن کی آواز یُوں ملائم تھی گویا وہ کوئی کہانی سُنا رہا ہو۔

''ننھے چاند، اگر تمھیں پتا ہو کہ تمھارے ساتھ والے گھر میں دو روز سے فاقہ ہے تو کیا تم ہنسی خُوشی اپنی پسند کی ہر بہترین چیز کھا سکو گی؟''

ایلیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''اگر تمھیں پتا ہو کہ تمھارے ساتھ والے گھر میں ایک بچہ بلا سبب باندھ کر رکھا گیا ہے جو نہ کچھ سُن اور نہ محسوس کر سکتا ہے تو کیا تم آسمان دیکھ کر، سمندر کا نظارہ کر کے، پھُولوں کی دِید سے یا پرندوں کی چہچہاہٹ سے محظوظ ہو سکتی ہو؟''

''نہیں۔'' ایلیا نے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے میں وہاں جا کر اُس گھر کا دروازہ کھولوں گی تا کہ وہ آزاد ہو سکے۔''

اور جب اُس نے یہ کہا تو اُسے احساس ہوا جیسے اُس نے اپنے سوال کا خُود ہی جواب دے دیا ہے۔ متواتر مُسکراتے ہوئے مارٹن نے اُسے دیکھا اور پھر بے توجگی سے اپنے ہاتھوں کی سمت دیکھے بغیر

اپنے کام جت گیا۔

ایلیا غیر یقینی کیفیت کا شکار تھی۔

''پھر بھی، وہ جگہ نہایت خُوب صُورت ہوگی جہاں تم رہتے تھے۔''

جب اُس نے اپنا کام ختم کر لیا تو اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایلیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اُسے دلدل کے سامنے سنسان جگہ کے آخری مقام پر لے آیا۔

''دیکھو'' وہ بولا۔ اُس نے آسمان، رڑی زمین اور دریا کے سمندر میں گرنے والے مقام کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ، وہ جگہ ہے جہاں سے میں آیا ہوں۔ وہ سب۔''

''وہ سب کی سب؟''

''ہاں، سب۔ ہر وہ جگہ جو تمھیں دِکھائی دے رہی ہے۔''

ایلیا دیر تک ساکت کھڑی ہر نظر آنے والی چیز کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں دُکھنے لگیں۔ اُس نے اپنی پُوری قوت سے دیکھا جیسے بالآخر آسمان اپنے تمام مقامات — قلعے، پھلوں اور پرندوں سے بھرے باغات — کھول کر رکھ دے گا۔ اُسے غش کھانے سے بچنے کے لیے آنکھیں موندنا پڑیں۔

جب وہ مُڑی تو مارٹن جا چکا تھا۔ اُس کا لمبا اور دُبلا پتلا سایہ قصبے کی دُوسری سمت مرَھیوں کی قطار کے بیچ چل رہا تھا۔

اُس روز کے بعد سے ایلیا نے آسمان کو یوں تکنا شروع کر دیا، جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ جب وہ اپنی خالہ کے گھر میں کام کر رہی ہوتی تو بعض اوقات ایک سیکنڈ کے لیے فضا میں دیکھنے کے لیے باہر نکل آتی اور جب واپس اندر جاتی تو اُسے محسوس ہوتا جیسا ب بھی اُس کی آنکھوں اور جسم میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔ نگاہیں چندھیا جانے کی وجہ سے وہ فرنیچر سے ٹکرا بیٹھتی۔

جب دُوسرے بچّوں کو پتا چلا کہ مارٹن کہاں سے آیا ہے تو وہ حیرت سے گنگ رہ گئے۔ پائر کے بہت سے بچّے اپنے سر اُٹھائے اُوپر آسمان کو دیکھتے ہوئے چلنے پھرنے لگے۔ وہ کھمبوں سے ٹکرا جاتے اور لوگ بھونچکا رہ جاتے کہ اُنھیں کیا ہو گیا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کسی طرح کا کوئی نیا کھیل ہے۔

کبھی کبھار مارٹن کھانا کھانا بند کر دیتا اور کسی کو پتا نہیں ہوتا تھا کہ کیوں۔ بچّے اُس کے لیے کھانا لاتے، جو اُن کا ہر صبح کا معمول تھا، اور وہ یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتا۔

''نہیں شکریہ۔ آج نہیں۔''

حتٰی کہ جب ایلیا اپنے لہنگے میں ٹھونسی روٹی لیے آتی تب بھی وہ شفقت سے مُسکراتا اور انکار میں سر ہلا دیتا۔ ایلیا سمجھ نہ پاتی کہ اُس نے انکار کیوں کیا ہے جب کہ گھر میں، زمین اور آسمان پر ہر چیز معمول کے مطابق ہے۔ نیلے فلک پر ایک آدھ بادل کے سوا سُورج چمک رہا ہے اور وقفے وقفے سے جہاز بھی اُتر اور اُڑان بھر رہے ہیں۔ پاڑ کی گلیوں میں بچّے کھیل اور شور مچا رہے ہیں۔ عورتیں اُنھیں نوع بہ نوع بولیوں میں پکار رہی ہیں۔ ایلیا کو کوئی تبدیلی نظر نہ آتی۔ لیکن وہ پھر بھی دُوسرے دو تین بچّوں کے ہم رَاہ مارٹن کے روبرو بیٹھ جاتی اور اُس کے بولنے کی منتظر رہتی۔

مارٹن عام دِنوں جیسا نہ رہتا۔ جن دِنوں وہ کھانا نہ کھاتا اُس کے چہرے پر بُڑھاپے کے آثار دِکھائی دینے لگتے، اُس کی آنکھوں کی چمک اَور ہی طرح کی ہو جاتی جو عجب نوع کی اضطرابی ہوتی۔ مارٹن بچّوں کے سروں کے اُوپر سے ہر طرف دیکھتا رہتا گویا زمین اور دلدل کے پار، دریا کے دُوسرے کنارے اور پہاڑیوں کی دُوسری جانب دیکھ رہا ہو، اتنی دُور کہ جہاں تک پہنچنے کے لیے مہینے درکار ہوں۔

ایسے دنوں میں وہ شاذونادر ہی بولتا اور ایلیا بھی اُس سے کوئی سوال نہ کرتی۔ دُوسرے دِنوں کی طرح لوگ اُس کے پاس مدد کے لیے آتے، اُسے اپنی جرابیں مرمت کرنے یا خط لکھنے کے لیے کہتے۔ لیکن مارٹن اُنھیں صاف جواب دے دیتا۔ وہ اپنا سر نہ میں ہلاتا اور ہونٹ لگ بھگ ہلائے بغیر دِھیمی آواز میں کہتا۔

''آج نہیں، آج نہیں......''

ایلیا نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر چہ اُس کا بدن ساکت و صامت گھر میں چٹائی پر پڑا ہوتا ہے لیکن وہ اُن دِنوں، وہاں نہیں کہیں اَور ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ اپنے وطن چلا جاتا ہو گا جہاں ہر شے خُوب صُورت ہے اور ہر کوئی شہزادہ اور شہزادی ہے، اُس وطن؛ جس کا راستہ اُس نے آسمان کے پار بتایا تھا۔

ایلیا روزانہ روٹی لے کر آتی اور اُس کے لوٹنے کا انتظار کرتی رہتی اور کبھی کبھار اُس کے فاقہ زدہ چہرے کو دیکھ کر، جیسے وہاں روشنی کی جگہ صرف راکھ رہ گئی ہو، سہم اُٹھتی۔ پھر ایک صبح وہ لوٹ آیا۔ بے حد نڈھال؛ وہ بہ مشکل اپنے بستر سے چل کر گھر کے سامنے کُوڑے والی جگہ پر آیا۔ اُس نے ایلیا کو ناتواں اور تکان نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔'' وہ بولا۔ اُس کی آواز میں بھی ناتوانی تھی۔

ایلیا نے روٹی نیچے رکھی اور دوڑتی ہوئی قصبے کے پار سے پانی کی بالٹی بھرنے چلی گئی۔ جب

وہ پُھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لوٹی تو مارٹن نے بالٹی کو مُنہ لگا کر جی بھر کے پانی پیا۔ پھر اُس نے اپنے ہاتھ منہ دھوئے اور دھوپ میں کھانچے پر بیٹھ کر رُوٹی کھانے لگا۔ وہ گھر کے اِرد گرد چند قدم چلا اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ دھوپ نے اُس کے چہرے اور ہاتھوں کو حرارت بخشی اور اُس کی آنکھیں دوبارہ دمکنے لگیں۔

ایلیا اُس کی طرف بےصبری سے دیکھتی رہی۔ اُس نے موقع ملتے ہی پُوچھا۔

''یہ کیسا تھا؟''

اُسے سمجھ نہیں آئی۔

''کیا کیسا تھا؟''

''یہ کیسا تھا؟ تم کہاں گئے تھے؟''

مارٹن نے جواب نہیں دیا۔ شاید اُسے کچھ یاد ہی نہیں تھا جیسے وہ سب خواب میں ہوا ہو۔ اُس نے پہلے کی طرح دوبارہ زندگی گُذارنا اور بولنا چالنا شروع کر دیا۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھنا ورٹُوٹی پُھوٹی اشیا کی مرمت کرنے اور پارٹ کی گلیوں میں گھومنے اور آتے جاتوں سے علیک سلیک کرنے لگا۔

بعد میں ایلیا نے دریافت کیا۔

''بعض اوقات تم کھانا کیوں نہیں کھانا چاہتے؟''

''کیوں کہ میں روزہ رکھتا ہوں۔'' مارٹن بولا۔

ایلیا نے اُس کی بات پر غور کیا۔

''روزے کا کیا مطلب ہے؟''

اور پھر فوراً ہی اضافہ کیا۔ ''کیا یہ سفر کرنے جیسا ہے؟''

مارٹن ہنس پڑا۔

''کتنا اچھا خیال ہے! نہیں، روزہ رکھنا یہ ہے کہ تمھارا کھانے جیسی چیز کو مَن نہ چاہے۔''

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کھانے جیسی چیز کو مَن نہ چاہے؟ ایلیا ششدر رہ گئی۔ کسی نے اِس سے قبل اُس سے ایسی عجیب وغریب بات نہیں کی تھی۔ اُس نے جھجکتے ہوئے سوچا کہ پارٹ کے سارے بچے چاہے وہ بُھوکے نہ ہوں تب بھی سارا دِن کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اُسے اُن کا خیال آیا جنھوں نے ہوائی اڈّے کے قریب والی سپر مارکیٹ میں ڈاکہ ڈالا تھا یا پڑوسی باڑوں سے پھل اور

انڈے چُرا لیے تھے۔

مارٹن نے اُسی لمحے یُوں جواب دیا جیسے اُس نے ایلیا کی سوچ پڑھ لی ہو۔

''کیا کبھی تمھیں بہت پیاس لگی ہے؟''

''ہاں۔'' ایلیا بولی۔

''جب تمھیں واقعی پیاس لگی ہو تو تمھارا کھانا کھانے کو دِل چاہتا ہے؟''

اُس نے نہ میں سر ہلایا۔

''نہیں، ٹھیک نا؟ تمھیں صرف پانی کی طلب ہوتی ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ جیسے تم اُس وقت نَل کا سارا پانی پی جاؤ گی۔ اگر اُس وقت کوئی تمھیں کھانے سے بھری بڑی سی رکابی دے تو تم انکار ہی کرو گی کیوں کہ تمھیں تو پانی کی طلب ہے۔''

مارٹن نے ایک منٹ کے لیے توقف کیا اور مُسکرانے لگا۔

''اور جب تمھیں بُھوک لگی ہو تو تم نہیں چاہو گی کہ کوئی پانی کا گھڑا دے۔ تم کہو گی: نہیں، اب نہیں۔ میں پہلے کھانا چاہتی ہوں، پیٹ بھر کر کھانا اور پھر، اگر گنجائش رہی تو، پانی پیوں گی۔''

''لیکن تم تو کھاتے ہو نہ پیتے!'' ایلیا بلند آواز میں پکار اُٹھی۔

''یہی تو میں تمھیں سمجھانا چاہتا ہوں، ننّھے چاند۔'' مارٹن نے کہا۔

''جب تم روزہ رکھتے ہو تو اِس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمھیں خوراک یا پانی کی طلب نہیں ہے کیوں کہ دراصل تم کچھ اور چاہ رہے ہوتے ہو، کھانے پینے سے زیادہ اہم چیز۔''

''اُس وقت کس قسم کی چاہ ہوتی ہے؟''

''خُدا کی۔'' مارٹن بولا۔

اُس نے بس اِتنا ہی کہا جیسے اِتنا کہنا ہی کافی ہو اور ایلیا نے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مارٹن نے خُدا کا ذکر کیا تھا جس نے ایلیا کو کچھ ڈرا دیا، لیکن حقیقتاً ہراساں نہیں کیا البتہ اُسے اُس سے اچانک دُور کر دیا تھا۔ اُسے پیچھے دھکیل دیا تھا جیسے لکڑی کے تختوں والی کٹیاؤں والے پاڑے کے سارے پھیلاؤ اور دلدل نے اُن کے بیچ آ کر انھیں الگ کر دیا ہو۔

لیکن لگتا تھا مارٹن نے اُس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بس وہ اُٹھا اور اُس نے دلدل کی سمت دیکھا جہاں نرسل جھوم رہے تھے۔ اُس نے ہولے سے ایلیا کے بالوں کو چُھوا اور قصبے کے پار جانے والے راستے پر ہولیا۔ بچّے اُس کے آگے آگے بھاگتے ہوئے اُس کی واپسی کی خوشیاں منا رہے تھے۔

اُس وقت سے مارٹن اپنی تعلیمات کا آغاز کر چکا تھا لیکن سب بے خبر تھے۔ دراصل وہ ایسی تعلیمات نہیں تھیں جیسی پادری یا معلّم دیتا ہے کیوں کہ وہ نہ تو مذہبی تھیں اور نہ مذہبی رسومات کی ادائیگی سے متعلق اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اُس نے کیا سیکھا ہے۔ بچّے زمین پر بیٹھ کر باتیں کرنے، کھیلنے یا کہانیاں سُننے کے لیے پاڑ کے بالکل آخری سرے پر مارٹن کے قلعے پر آنے کے عادی ہو گئے تھے۔ مارٹن کبھی اپنے کھانچے سے نہیں اُٹھتا تھا۔ وہ جس شے کو ٹھیک کر رہا ہوتا، کرتا رہتا: کوئی برتن، پریشر کُکّر کا مجنّر (valve) یا کوئی قفل اور تعلیمات بھی جاری رہتیں۔ اکثر و بیشتر بچّے دوپہر کے کھانے یا سکول کے بعد آتے تھے۔ لیکن بعض اوقات مرد و زن بھی اپنے کام ختم ہو جانے اور شدید گرمی کے باعث نیند نہ لے سکنے پر وہاں آ جاتے۔ بچّے مارٹن کے پاس اُس کے سامنے بیٹھ جاتے اور وہیں ایلیا بھی بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ وہ بے حد شور مچاتے اور دیر تک ٹِک کر نہ بیٹھتے لیکن مارٹن اُنھیں دیکھ کر مسرور ہوتا تھا۔ وہ اُن سے باتیں کرتا، استفسار کرتا کہ اُنھوں نے پاڑ میں یا سمندر کے آس پاس کیا دیکھا۔ کچھ بچّے باتونی ہوتے اور کسی بھی چیز کے بارے میں گھنٹوں بولتے چلے جاتے۔ دیگر چُپ رہتے اور جب مارٹن اُن سے بات کرتا تو اپنے سر بازوؤں میں دے لیتے۔

پھر مارٹن ایک کہانی سُناتا۔ بچّوں کو کہانیاں سُننے کا شوق تھا اور وہ اِسی لیے آتے تھے۔ جب مارٹن کہانی شروع کرتا تو بے حد گستاخ بچّے تک ساکت و صامت ہو کر بیٹھ جاتے۔

مارٹن کو بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ جن میں سے کچھ طویل اور قدرے عجیب تھیں جو کسی انجانے جزیرے پر وقوع پذیر ہوتیں جہاں وہ کبھی گیا ہوگا۔

کچھ بچّوں کی کہانی تھی جو نرسلوں کی بنی ہوئی ایک سپاٹ ڈونگی پر دریا کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور غیر معمولی سلطنتوں، جنگلوں، پہاڑوں اور پُراسرار شہروں سے ہوتے ہوئے سمندر تک جا پہنچے تھے۔ ایک شخص کی کہانی تھی جس نے ایک کنواں کھودا جو اُسے پاتال میں لے گیا جہاں آگ کے بنے ہوئے دیس تھے۔ ایک تاجر کی کہانی تھی جس کا خیال تھا کہ وہ برف بیچ کر اپنی قسمت سنوار سکتا ہے۔ پس وہ تھیلوں میں پہاڑوں سے برف بھر کر لایا لیکن جب وہ میدانی علاقے میں پہنچا تو تھیلوں میں پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک لڑکے کی کہانی تھی جو زمین پر خواب بھیجنے والی خوابوں کی شہزادی کے محل میں گیا۔ ایک جن کی کہانی تھی جو پہاڑ بناتا تھا۔ ایک اَور کہانی ایک ایسے بچّے کی تھی جو ڈولفن مچھلیوں کو سدھاتا تھا۔ کپتان ٹیکم کی کہانی تھی جس نے قطب جنوبی کے بڑے بڑے جھکّی دار ریچھوں اور لمبے لمبے پروں والے پرندے کی جان بچائی تو پرندے نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُسے اُڑنے کا بھید بتایا۔ یہ سب خوب

صُورت کہانیاں تھیں، اتنی خُوب صُورت کہ بعض اوقات نیند بھی نہیں لی جا سکتی تھی۔ مارثن ہاتھوں کے اشارے کرتے ہوئے اُنھیں ٹھیر ٹھیر کر دِھیمے دِھیمے یُوں سُناتا کہ سوالات پُوچھے جا سکتے۔ کہانی سُناتے ہوئے اُس کی اپنی آنکھیں بھی یُوں روشن ہو جاتیں گویا وہ خُود بھی اُس سے حظ اُٹھا رہا ہو۔

مارثن نے ایک کہانی ہزاران کے بارے میں سُنائی جسے بچّوں نے سب سے زیادہ پسند کیا۔ وہ اُسے مکمل طور پر تو نہیں سمجھ پائے لیکن کہانی کا آغاز ہوتے ہی اُن کے سانس تھم گئے۔

''لونگ نام کی ایک لڑکی تھی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اُس کا نام عجیب تھا جو شاید اُسے اُس کے بائیں کان کے قریب لونگ جیسے چھوٹے سے نشان کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ وہ غریب تھی، نہایت ہی غریب کہ اُسے کھانے کو صرف روٹی اور درختوں کے نیچے سے چُنے ہوئے پھل ہی کھانے کو ملتے تھے۔ وہ چٹانوں اور خاردار جھاڑیوں میں گھری چرواہے کی ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ اُس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب اردگرد بسنے والے چھوٹے جانوروں اور چُوہوں نے دیکھا کہ وہ بے حد تنہا ہے تو وہ اُس کے دوست بن گئے۔ وہ اکثر صبح سویرے یا شام کے وقت اُسے ملنے آجاتے اور اُس سے باتیں کرتے تاکہ اُس کا ذہن بٹا رہے۔ وہ اُس کے گرد گھومتے اور اُسے کہانیاں سُناتے کیوں کہ لونگ اُن کی زبان بول لیتی تھی۔ اُن میں رُوزنامی چیونٹی، رُوٹ نام کا گرگٹ، پپٹ نامی چڑیا اور زرد، سُرخ، خاکی اور نیلے یعنی رنگ برنگی تتلیاں شامل تھیں۔ وہیں پر ایک کُپر نام کا ایک چالاک اور ہوشیار بھوزا اور سبز رنگ کا ایک ٹِڈا بھی جو پتّوں پر بیٹھے دھوپ سینکتے رہتے تھے۔ لونگ اُن سے اچھا برتاؤ رکھتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ اُسے پسند کرتے تھے۔ ایک روز لونگ عام دِنوں سے زیادہ افسردہ تھی کیوں کہ اُس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بڑے سے سبز ٹِڈے نے اُسے پُکارا۔ ''کیا تم اپنی زندگی بدلنا چاہتی ہو؟'' اُس نے اُس کی مرضی پُوچھی۔ ''میں اپنی زندگی کیسے بدل سکتی ہوں۔'' لونگ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے اور میں اکیلی ہوں۔'' ''تم چاہو تو بدل سکتی ہو۔'' ٹِڈا بولا۔ ''تمھیں بس اتنا کرنا ہوگا کہ ہزاران کی سرزمین پر چلی جاؤ۔'' ''وہ کون سی جگہ ہے؟'' لونگ نے دریافت کیا۔ ''میں نے اِس کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سُنا۔'' ''وہاں جانے کے لیے تمھیں ہزاران کے دروازے پر کھڑے دربان کے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن پہلے تمھیں بہت ہوشیار، بہت ہی چالاک ہونا پڑے گا۔'' پس لونگ کُپر بھوزے سے ملنے چلی گئی جو ایک گلاب کی شاخ پر بسیرا رکھے ہوئے تھا اور بولی: کُپر، مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا پتا ہونا چاہیے کیوں کہ میں ہزاران جانا چاہتی ہوں۔ طویل عرصے تک بھوزا اور جسیم ٹِڈا اُسے وہ سب سکھاتے رہے جو کچھ اُن کے علم میں تھا۔ اُنھوں نے اُسے پڑھایا کہ موسم کیسا ہوگا یا لوگ وہاں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں یا بخار اور بیماریوں کا علاج کیسے کیا جاتا ہے۔

اُنھوں نے اُسے سکھایا کہ کیسے گرم خطّوں کے لمبے جسموں اور بڑی بڑی آنکھوں والے حشرات سے، جن کے بدن عبادت کرنے والوں کی طرح سجدے کی حالت میں ہوتے ہیں، دریافت کیا جائے کہ بچّے لڑکے ہوں گے یا لڑکیاں کیوں کہ وہ لڑکے کے لیے اپنی مونچھ کے ایک بال کو اُوپر اُٹھا لیتے ہیں اور لڑکی کے لیے اُسے نیچے گرا دیتے ہیں۔ ننھی لونگ نے یہ سب کچھ اور بہت سی دُوسری چیزیں، بھید اور اَسرار سیکھے۔ جب بھوڑے اور گرانڈیل بڈّے نے اپنا سارا علم اُسے سکھا دیا تو ایک روز اُس گاؤں میں ایک آدمی آیا۔ وہ پُرشکوہ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھا اور کوئی شہزادہ یا سرکاری اہلکار لگ رہا تھا۔ وہ گاؤں کے پاس سے یہ پُکارتا ہوا گُزر رہا تھا۔ ''مجھے کسی کی تلاش ہے۔'' لیکن لوگ اُس کی بات نہیں سمجھے۔ پس لونگ اُس کے پاس گئی اور بولی۔ ''جس کی تمھیں تلاش ہے وہ میں ہوں۔ میں ہزاران جانا چاہتی ہوں۔'' وہ شخص کچھ حیران ہوا کیوں کہ ننھی لونگ بہت غریب اور بے علم لگتی تھی۔ ''کیا تمھیں پتا ہے کہ سوالوں کے جواب کیسے دیتے ہیں؟'' اہلکار نے دریافت کیا۔ ''اگر تم جواب نہ دے پائیں تو تم کبھی ہزاران نہیں جا سکو گی۔'' ''میں تمام سوالوں کے جواب دوں گی۔'' لونگ نے کہا لیکن وہ ڈر بھی رہی تھی کیوں کہ اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ تمام سوالوں کے جواب دے پائے گی یا نہیں۔ ''تو تم سے جو سوال پُوچھنے جا رہا ہوں اُن کے جواب دو۔ اگر تمھیں جواب معلوم ہوئے تو تم ہزاران کی شہزادی بن جاؤ گی۔ تین سوال ہیں۔''

مارٹن نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا۔ بچّے منتظر رہے۔

''پہلا سوال یہ ہے۔'' اہلکار بولا۔ ''میں کھانے پر مدعو ہوں۔ میرا باپ مجھے تین انواع کے بہترین خوان دیتے ہیں۔ جس کھانے کو میرا ہاتھ پکڑتا ہے میرا مُنھ اُسے کھا نہیں سکتا۔ جسے میرا ہاتھ پکڑتا ہے اُسے میرا ہاتھ قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ جسے میرا مُنھ پکڑتا ہے اُسے میرا مُنھ تھامے نہیں رکھ سکتا۔'' ننھی لڑکی نے غور کیا اور بولی۔ ''میں سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔'' اہلکار ششدر رہ گیا کیوں کہ آج تک کسی نے اِس سوال کا درست جواب نہیں دیا تھا۔ ''دُوسری بجھارت یہ ہے۔'' اہلکار نے بات جاری رکھی۔ ''میرا باپ مجھے اپنے چار گھروں میں مدعو کرتا ہے۔ پہلا گھر شمال میں ہے اور خستہ حال اور اُداس ہے۔ دُوسرا مشرق میں ہے اور پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ تیسرا جنوب میں ہے اور نہایت خُوب صُورت ہے۔ چوتھا مغرب میں ہے اور جب میں اُس میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ایک تحفہ ملتا ہے جو مجھے اَور غریب کر دیتا ہے۔'' ''میں اِس سوال کا جواب بھی دے سکتی ہوں۔'' لونگ دوبارہ بولی۔ اہلکار دوبارہ حیرت میں غوطہ زن ہو گیا کیوں کہ کوئی اِس سوال کا کبھی جواب نہیں دے پایا تھا۔ ''تیسری پہیلی یہ ہے۔'' اہلکار بولا۔ ''میرے باپ کا چہرہ نہایت وجیہہ ہے لیکن میں پھر بھی اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا نوکر ہر روز اُس کے سامنے رقص کرتا ہے۔ لیکن میری ماں بھی نہایت حسین و جمیل ہے۔ اُس کے بال بے حد سیاہ اور

چہرہ برف کی طرح سپید ہے۔وہ زیورات سے لدی پھندی رہتی ہے اور جب میں سورہا ہوتا ہوں تو مجھے تکتی رہتی ہے۔"لونگ نے ایک بار پھر غور کیا اور بولی کہ وہ ان بجھارتوں کو بُوجھے گی۔"پہلا جواب یہ ہے۔" اُس نے کہا۔"جس کھانے پر مجھے بلایا گیا ہے وہ دُنیا ہے جس میں مَیں پیدا ہوئی ہوں۔تینوں قسموں کے جو کھانے دیے گئے ہیں وہ ہیں زمین، پانی اور ہَوا۔زمین کو میرا ہاتھ پکڑ سکتا ہے لیکن میں اسے کھا نہیں سکتی۔میرا ہاتھ پانی کو تھامتا ہے لیکن اُسے قابو میں رکھ سکتا۔میرا مُنھ ہَوا اندر کھینچتا ہے لیکن مجھے اسے باہر نکالنا پڑتا ہے۔"

مارٹن ایک بار پھر ایک لمحے کے لیے ٹھہرا تو بچّوں نے کچھ مٹّی اپنے ہاتھوں میں لے لی، پانی کو اپنی اُنگلیوں کے بیچ سے گرایا۔اُنھوں نے اپنے آس پاس کی فضا میں سانس لیے۔

"دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے: میرا باپ مجھے جن چار گھروں میں مدعو کرتا ہے وہ سال کے چار موسم ہیں۔شمال کی سمت والا گھر، جو خستہ حال اور اُداس ہے، سرما کا گھر ہے۔شرقی جانب والا، جہاں بہت سے پھُول کھلے ہیں، بہار کا گھر ہے۔جنوب والا، جو بے حد خُوب صُورت ہے، گرما کا گھر ہے۔غربی گھر خزاں کا ہے جس میں داخل ہونے پر مجھے سالِ نو کا تحفہ ملتا ہے جو مجھے اور غریب کر دیتا ہے کیوں کہ میں پہلے سے زیادہ عمر کی اور ناتواں ہو جاتی ہوں۔" اہلکار نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ نوجوان لڑکی کے علم کی وسعت پر متحیّر تھا۔"آخری سوال آسان ہے۔" لونگ نے کہا۔"جسے میرا باپ کہا جا رہا ہے وہ سُورج ہے کہ اُس کی چمک دمک کے سامنے آنکھ نہیں ٹھہر سکتی۔نوکر جو اُس کے سامنے رقص کرتا ہے، میرا سایہ ہے۔جسے میری ماں کہا گیا ہے، رات ہے جس کے بال نہایت کالے ہیں اور چہرہ چاند کی طرح سفید ہے۔اُس کے زیورات ستارے ہیں۔یہی بجھارتوں کے جواب ہیں۔" جب اہلکار نے لونگ کے جواب سُنے تو اُس نے حکم صادر کیا اور ننھی لڑکی کو سرزمینِ ہزاران پر لے جانے کے لیے آسمان کا ہر پنچھی اُتر آیا۔وہ مقام بہت، بہت ہی دُور تھا کہ پنچھی شب و روز پرواز کرتے رہے۔لیکن جب لونگ وہاں پہنچی تو حیرت سے گنگ رہ گئی کیوں کہ ایسے پُر جمال مقام کا اُس نے کبھی خواب میں بھی تصوّر نہیں کیا تھا۔

مارٹن نے ایک مرتبہ پھر لحہ بھر کے لیے توقف کیا تو بچّوں نے بے صبری سے پُوچھا۔"ہزاران کی سرزمین کیسی تھی؟"

"خُوب، ہر چیز بڑی بڑی اور خُوب صُورت۔پھُولوں اور تتلیوں سے بھرے ہوئے باغ۔دریا اتنے شفاف جیسے چاندی کے ہوں۔نوع بہ نوع پھلوں سے لدے اُونچے لمبے درخت۔وہاں پنچھی رہتے تھے، دُنیا بھر کے پنچھی۔وہ ایک شاخ سے اُڑ کر دُوسری پر جا بیٹھتے اور ہر وقت گیت گاتے رہتے۔جب لونگ وہاں پہنچی تو وہ اُس کے گرد جمع ہو گئے اور اُسے خُوش آمدید کہا۔اُنھوں نے رنگ برنگے

پَروں والے لبادے پہنے ہوئے تھے اور لونگ کے سامنے رقص کرنے لگے کیوں کہ اُنھیں اُس جیسی شہزادی مل گئی تھی۔ پھر سیاہ رنگ پرندے آئے، پکھیروؤں کے بادشاہ کا ایلچی اور وہ اُسے ہزاران کے محل میں لے گئے۔ بادشاہ بُلبُل تھا جو اتنا پیارا گاتا تھا کہ اُسے سُننے والے چُپ سادھ لیتے تھے۔ اُس کے بعد لونگ اُس کے محل میں رہنے لگی اور چوں کہ اُسے جانوروں کی بولی آتی تھی سو اُس نے بھی گانا سیکھا تا کہ ہزاران کے بادشاہ کو جواب دے سکے۔ وہ وہاں قیام پذیر رہی اور شاید اب بھی وہیں رہتی ہے۔ جب کبھی اُس کا زمین پر آنے کا مَن چاہتا ہے تو وہ چکا دی (Chikadee: کلغی والا ایک خوب صورت پرندہ) کا رُوپ دھار کر اپنے دوستوں سے ملنے چلی آتی ہے۔ پھر وہ عظیم باغ میں لوٹ کر دوبارہ شہزادی بن جاتی ہے۔''

جب کہانی ختم ہو گئی تو بچے ایک ایک کر کے وہاں سے اُٹھے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مارٹن کے گھر کے سامنے بچّوں کے عقب میں بیٹھی ایلیا بیٹھی رہی۔ وہ تب تک نہیں اُٹھی جب تک مارٹن اپنے قلعے میں جا کر سونے کے لیے نہیں لیٹ گیا۔ وہ پارُ کی گلیوں میں سست رَوی سے چلتی گئی۔ کٹیاؤں میں گیس کے چراغ روشن ہونے لگے تھے اور اب وہ اُداس نہیں تھی۔ وہ اُس روز کے بارے میں سوچ رہی تھی جب سرکاری لباس میں کوئی شخص آئے گا، اِدھر اُدھر دیکھے گا اور کہے گا۔

''میں کسی کی تلاش میں ہوں۔''

اُن ہی دِنوں حکومت فرنچ مَین پارُ میں آدمیوں کو بھیجنے لگی۔ وہ عجب وضع قطع کے لوگ ہوتے جو ہفتے میں ایک دوبار سیاہ رنگ کی کار میں آتے اور قصبے سے ذرا پیچھے سڑک پر ٹھیر جاتے۔ وہ بلا وجہ ہی گلیوں اور گھروں کا درمیانی فاصلہ ماپتے، ڈبّوں میں مٹی، شیشے کی نلیوں میں پانی اور چھوٹے چھوٹے پیلے غباروں میں ہَوا بھرنے جیسے بہت سے کام کرتے۔ زیادہ تر مَردوں سے بے شمار سوالات کرتے کیوں کہ عورتیں اُن کی باتیں سمجھ ہی نہیں پاتیں اور نہ ہی جواب دینے کی زحمت کرتی تھیں۔

جب ایلیا نَل سے پانی بھرنے جاتی تو اُنھیں پاس سے گُزرتا دیکھ کر تھم جاتی البتہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی کی کھوج میں نہیں آ رہے ہیں۔ وہ وہاں کسی کو سرزمینِ ہزاران پر لے جانے کے لیے سوالات پُوچھنے نہیں آتے۔ اُن میں چمڑے کے چھوٹے چھوٹے بریف کیس اُٹھائے سُرمئی سُوٹوں والے متین لوگ، طلبا اور بھاری بھرکم سوئٹر اور جیکٹیں پہنے لڑکے لڑکیاں شامل ہوتے تھے۔ وہ سب سے زیادہ عجیب ہوتے کیوں کہ وہ موسموں یا خاندانوں کے بارے میں سوالات کرتے تھے لیکن کوئی بھی اُن کی ایسی باتوں کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ اُن کے جوابات کو اپنی نوٹ بکوں میں یُوں لکھ لیتے تھے گویا وہ بہت اہم ہوں اور وہ لکڑی کے تختوں والے اُن گھروں کی لاتعداد تصاویر لیتے جیسے اُن میں خاص بات ہو۔ یہاں تک کہ سُورج سے تیز روشنی والے بلبوں میں گھروں کے اندر کی تصاویر بھی لیتے۔

کچھ ہی عرصے میں لوگوں کو سمجھ آنے لگ گئی۔ اُنھیں پتا چل گیا کہ آنے والے وہ سرکاری اہلکار اور طلبا ہر شے۔ قصبے کو بھی اور لوگوں کو بھی۔ کسی اور جگہ لے جانے کے لیے آرہے ہیں۔ سرکار نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب پاڑ کا وجود نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ وہ سڑک کے بہت نزدیک واقع ہے یا پھر شاید عمارتیں اور دفاتر بنانے کے لیے اُس زمین کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ لوگوں کو تب پتا چلا جب اُن میں اشتہار بانٹا گیا جس میں تمام خاندانوں سے کہا گیا تھا کہ اُنھیں وہ جگہ چھوڑنا ہوگی اور مشینیں اور ٹرک اُس آبادی کو گرا دیں گے۔ تب طلبا نے اُنھیں دریا کنارے بسائے جانے والے نئے شہر کی تصاویر دِکھائیں۔ وہ بے حد عجیب وغریب تصویریں تھیں جن میں نئے گھر، اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، بڑے بڑے سپاٹ گھر، جن کی کھڑکیاں بالکل اینٹوں کی سلوں جیسی تھیں۔ ہر گھر کے وسط میں ایک صحن تھا جس میں درخت تھے۔ گلیارے بالکل ریلوے پٹڑی کی طرح سیدھے تھے۔ طلبا جب بھی پاڑ کے مردوزن سے باتیں کرتے تو اُسے "مستقبل کا شہر" قرار دیتے۔ اُن کے اَنگ اَنگ سے مسرت پھوٹ رہی ہوتی، آنکھیں چمک رہی ہوتیں اور وہ ہاتھ لہرا لہرا کر اشارے کررہے ہوتے۔ غالباً اِس کا سبب یہ تھا کہ وہ تصویریں اُنھوں نے بنائی تھیں۔

جب سرکار نے پاڑ کی بربادی اور کسی کو وہاں نہ رہنے دینے کا حتمی فیصلہ کرلیا تو اُنھیں کسی ایسے سرکردہ شخص کی ضرورت محسوس ہوئی جو لوگوں کو رضامند کرے۔ لیکن پاڑ میں کوئی سرکردہ تھا ہی نہیں۔ وہاں لوگوں نے سدا اِس طور زندگی بسر کی تھی کہ اُنھیں کسی سربراہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سرکار نے کسی کے انتخاب کے لیے کھوج لگائی اور اشترا کی دُکان کے مینیجر کو نامزد کر دیا۔ پس سرکاری اہلکار "مستقبل کا شہر" کے بارے میں اکثر گفت وشنید کے لیے اُس کے پاس جاتے اور بعض اوقات اُسے ایک سیاہ رنگ کی کار میں اپنے دفاتر لے جاتے تا کہ وہ کاغذات پر دستخط کردے اور ہر معاملے کو قانونی جواز مل جائے۔ شاید سرکار مارٹن کے پاس اُس کے قلعے میں بھی گئی تھی لیکن کسی نے اُس سے بات نہیں کی کیوں کہ اولاً تو وہ بہت دُور پاڑ کے دُوسرے سرے پر دلدل کے قریب اقامت پذیر تھا اور ثانیاً وہ کسی بھی کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُن لوگوں نے سوچا ہوگا کہ وہ نہایت ضعیف العمر بھی ہے۔

جب مارٹن نے یہ خبریں سُنیں تو اُس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن یہ عیاں تھا کہ وہ اِن حالات پر دِل گیر ہے۔ اُس نے اپنی مَن چاہی جگہ پر اپنا قلعہ تعمیر کیا تھا اور وہ کہیں اَور جا کر رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بالخصوص "مستقبل کا شہر" کے کسی گھر میں، جو اینٹوں کی سلوں کی طرح دِکھائی دیتے تھے۔

پھر اُس نے روزہ رکھ لیا لیکن وہ معمول کے مطابق چند روزہ نہیں تھا۔ وہ دہشت زدہ کر ڈالنے والا، نامختتم روزہ کئی ہفتوں کو محیط تھا۔

ایلیا روزانہ اُس کے گھر کے سامنے اُس کے لیے روٹی اور دُوسرے بچے کھانوں کی طشتریاں لیے اس توقع پر آتے کہ مارٹن اُٹھ بیٹھے گا۔ لیکن وہ اپنی چٹائی پر دروازے کی طرف مُنھ کیے پڑا رہا۔ اُس کا چھائیوں زدہ چہرہ مزید زرد پڑ گیا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں مضطرب کر دینے والی روشنی سے چمکنے لگیں کیوں کہ وہ پلکیں جھپکائے بغیر متواتر دیکھتے رہنے سے تھک کر دکھنے لگی تھیں۔ وہ رات کو بھی نہ سوتا۔ بس زمین پر ساکت پڑا دروازے کی سمت مُنھ کیے رات کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا۔

ایلیا اُس کے پاس بیٹھ جاتی اور ایک بھیگے ہوئے کپڑے سے اس کے چہرے پر جمی پتھر جیسی سخت مٹی، صاف کرتی رہتی۔ دِن بھر میں وہ گھڑے سے محض چند گھونٹ پانی لیتا۔ ایلیا کہتی۔

''کیا تم اب بھی کچھ نہیں کھانا چاہتے؟ میں تمھارے لیے روٹی لائی ہوں۔''

مارٹن مُسکرانے کی کوشش کرتا لیکن لیکن ناتوانی کی وجہ سے مسکرا نہ پاتا، صرف اُس کی آنکھیں مُسکراتیں۔ ایلیا اپنے اندر دُکھ کی لہر کو محسوس کرتی کیوں کہ اُسے لگتا جیسے مارٹن مرنے کے قریب ہے۔

''کیا تم نے اِس لیے کھانا چھوڑا ہے کہ تم اِس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔''

مارٹن جواب نہیں دیا لیکن اُس کی آنکھوں نے اپنی بھرپور دُکھی اور تکان زدہ روشنی سے جواب دیا۔ اُس نے دروازے کے باہر زمین ہزسلوں اور نیلے آسمان کو دیکھا۔

''شاید تم ہمارے ساتھ اُس نئے شہر میں نہیں جانا چاہتے۔ شاید تم واپس اپنے وطن لوٹ جاؤ جہاں کی ہر شے خُوب صُورت ہے اور ہر ایک شہزادہ اور شہزادی ہے۔''

طلبا کا آنا جانا رفتہ رفتہ کم ہو گیا تھا۔ پھر اُنھوں نے آنا یکسر بند کر دیا۔ ایلیا اپنی خالہ کے ہاں کام کرتے یا نل سے پانی بھرنے کے لیے جاتے ہوئے اُنھیں کھوجتی رہی۔ وہ دیکھتی رہی کہ آیا قصبے کی داخلی سڑک پر اُن کی کاریں کھڑیں ہیں یا نہیں۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی مارٹن کے قلعے کو گئی۔

''وہ آج دوبارہ نہیں آئے۔'' اُس نے بولنے کی کوشش کی تو اپنی سانسوں پر قابو نہیں رکھ سکی۔

''وہ اب واپس نہیں آئیں گے! تم نے میری بات سُنی؟ معاملہ ختم ہو گیا، وہ واپس نہیں آئیں گے۔ ہم یہیں رہیں گے!''

اُس کا دِل تیزی سے پھڑ پھڑا رہا تھا کیوں کہ اُس کے خیال میں مارٹن نے روزہ رکھ کر اُنھیں باز رکھا تھا۔

''کیا تمھیں یقین ہے؟'' مارٹن نے استفسار کیا۔ اُس کی نقاہت بھری آواز نکلی اور وہ چٹائی پر تھوڑا سا اُٹھ بیٹھا۔

''وہ تین دِنوں سے یہاں نہیں آئے!''

''تین دِنوں سے؟''

"اب وہ واپس نہیں آئیں گے، مجھے یقین ہے۔" اُس نے روٹی کا ٹکڑا اُس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں، ابھی نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلے میں مُنہ ہاتھ دھولوں۔"

ایلیا کے شانوں کا سہارا لیتے ہوئے، اُس نے باہر کی سمت چند قدم بڑھائے۔ وہ اُسے سہارا دے کر نرسلوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی دریا کی طرف لے گئی۔ مارٹن گھٹنوں کے بَل جھکا اور اُس نے دھیرے دھیرے اپنا مُنہ دھویا۔ پھر اُس نے اپنی داڑھی کو تھپتھپایا اور بالوں میں اُنگلیاں پھیریں۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی جیسے وہ ابھی نیند سے اُٹھا ہو۔ پھر وہ جا کر دھوپ میں اپنے کھاٹ پر بیٹھ گیا اور ایلیا کی لائی ہوئی روٹی کھانے لگا۔ اب بچے بھی ایک ایک کر کے آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ہم راہ کھانا بھی لائے تھے۔ مارٹن نے ہر چیز شکریہ ادا کر کے لے لی۔ جب وہ ٹھیک ٹھاک کھا چکا تو واپس اپنے گھر کے اندر گیا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔

"اب میں سوؤں گا۔" اُس نے کہا۔

لیکن بچے اُس کے دروازے کے سامنے زمین پر بیٹھے اُسے سوتا دیکھتے رہے۔

اُس کے سونے کے دوران ہی کاریں لوٹ آئیں۔ پہلے سُرمئی سُوٹوں اور سیاہ بریف کیسوں والے آئے۔ وہ سیدھے اشتراکی دُکان کے مینیجر کے گھر گئے۔ پھر طلبا کی آمد ہوئی جو پہلے سے تعداد میں زیادہ تھے۔

جب وہ قریب سے گزرے تو گھر کی دیوار سے پشت ٹکائے کھڑی، ایلیا اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں اور وہ تیزی سے نَل کی طرف چلے گئے۔ وہ وہاں جمع ہو گئے۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی کے منتظر ہوں۔ پھر سُرمئی سُوٹوں والے اشتراکی دُکان کے مینیجر کے ہم راہ اُن کی طرف آئے۔ سُرمئی سُوٹوں والوں نے اُس سے کوئی بات کی لیکن اُس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور آخر کار بہ آوازِ بلند اور صاف لہجے میں ایک سرکاری اہلکار نے اعلان کیا۔ اُس نے محض اتنا ہی کہا کہ روانگی اگلے روز صبح آٹھ بجے ہو گی۔ سرکاری ٹرک آ کر ہر شخص کو اُس علاقے میں لے جائیں گے جہاں "مستقبل کا شہر" تعمیر کیا جائے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ طلبا لوگوں کو اُن کا سامان اور فرنیچر ٹرکوں تک پہنچانے میں رضا کارانہ مدد کریں گے۔

جب سُرمئی سُوٹوں اور بھاری جیکٹوں والے طلبا، اپنی کاروں میں روانہ ہو گئے، ایلیا تب بھی ہلنے کی ہمّت نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ مارٹن کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اَب وہ یقیناً موت سے ہم کِنار ہو جائے گا اور دوبارہ کبھی کھانا نہیں کھائے گا۔

پس وہ اپنے آپ کو چھپانے کے لیے دریا کے قریب نرسلوں کے وسط میں، جس قدر دُور تک

جا سکتی تھی، چلی گئی۔ وہ پتھروں پر بیٹھ کر سورج کو ڈوبتا ہوا دیکھنے لگی۔ کل جب سورج عین اسی مقام پر ہو گا تو پائر میں کوئی نہیں بچا ہو گا۔ قصبے میں پھرتے ہوئے بلڈوزر گھروں کو ماچس کی ڈبیاؤں کی طرح روند رہے ہوں گے اور زمین پر سوائے ٹائروں اور آہنی پٹیوں کی لکیروں کے کچھ نہیں ہو گا۔

ایلیا دریا کے کنارے نرسلوں کے وسط میں بہت دیر تک ٹھیری رہی۔ رات اتر آئی تھی: گول اور سفید چاندی جیسی رات۔ لیکن ایلیا اپنی خالہ کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نرسلوں کے بیچ دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگی یہاں تک کہ گھاس کے دلدلی میدان میں پہنچ گئی۔ ذرا سی بلندی پر مارٹن کے ہیکل کی گولائی دیکھتے ہوئے، اُس نے مینڈکوں کے ٹرانے اور دلدلی میدان کے دُوسرے کنارے پانی کے چلنے کی ردھم بھری آواز سنی۔

جب وہ مارٹن کے گھر کے سامنے پہنچی تو اُس نے، اُسے وہاں مجسمہ بنے کھڑے پایا۔ چاندنی اُس کے چہرے پر چمک رہی تھی اور اُس کی آنکھیں دریا کے پانی کی طرح گہری اور روشن تھیں۔ مارٹن گھاس کے دلدلی میدان کے پار دریا کے سمندر سے اتصال کے وسیع مقام کو دیکھ رہا تھا جہاں چمک دار پتھروں والا وسیع میدان نمایاں تھا۔

وہ اُس کی سمت مڑا تو اُس کی آنکھوں میں عجب طاقت بھری ہوئی تھی گویا دراصل وہی روشنی کا منبع ہو۔

''میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' مارٹن سادگی سے بولا۔

''تم یہاں سے جا رہے ہو؟'' ایلیا نے مدہم آواز میں پوچھا۔

''ہاں۔ میں ابھی، اِسی وقت یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔''

اُس نے ستانے کے انداز میں ایلیا کو دیکھا۔

''کیا تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو؟''

ایلیا نے اچانک اپنے سینے اور حلق میں مسرت کے فوارے پھوٹتے محسوس کیے۔ وہ قریب قریب چیختے ہوئے بولی۔

''میرا انتظار کرو! میرا انتظار کرو!''

وہ قصبے کی گلیوں سے دوڑتی اور چلاتے ہوئے تمام دروازے کھٹکھٹاتے چلی گئی۔

''جلدی آؤ! جلدی کرو! ہم ابھی روانہ ہو رہے ہیں!''

بچے اور عورتیں پہلے نکلے کیوں کہ وہ سمجھ چکے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے مرد بھی نکل آئے۔ سڑکوں پر پائر کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ اُنھیں اپنی ہنگامی روشنیوں میں جو کچھ ہاتھ لگا ساتھ لے لیا: بیگ، بکسے اور کھانے پکانے کے برتن۔ بچے شور مچاتے دوڑنے لگے۔

''ہم جا رہے ہیں! ہم جا رہے ہیں!''

جب سب لوگ مارٹن کے گھر کے سامنے پہنچے تو کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا ہر شخص ایک سحر میں مبتلا تھا حتیٰ کہ اشترا کی دُکان کے منیجر کے منھ سے بھی ایک لفظ تک نہیں نکلا۔

مارٹن زسلوں کو جانے والے راستے پر بے حرکت کھڑا تھا۔ پھر وہ منتظر ہجوم سے مخاطب ہوئے بغیر دریا کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ ہجوم نے بھی اُس کی تقلید کی۔ وہ بلا جھجک اور مڑ کر دیکھے بغیر ایک متواتر رفتار سے یوں چل رہا تھا جیسے اُسے اپنی منزل معلوم ہو۔ جب اُس نے دریا کے عبور کیے جا سکنے والے، کم چوڑے پاٹ پر چلنا شروع کیا تو لوگ سمجھ گئے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اُن کا خوف مٹ گیا۔ جُوں ہی مارٹن کم چوڑے پاٹ کے نزدیک پہنچا، سیاہ پانی اُس کے بدن کے گرد چمکنے لگا۔ بچوں کو تھاما ہوا ہجوم دھیرے دھیرے سرد پانی کی سمت بڑھا۔ پھسلواں سطح پر چلتے ہوئے ایلیا کا لباس اُس کے پیٹ اور رانوں سے چپک گیا۔ اُس نے ہجوم کے سامنے چلتے ہوئے سیاہ دریا کی اِس جانب کے دمکتے ہوئے پتھروں والے کنارے سے پرلی سمت والے مخالف کنارے کو دیکھا، جہاں روشنی کی ایک کرن تک نہیں تھی۔

VVVV

---

۱ Slav: سلوانی (Slavonic) زبان بولنے والے، مشرقی یورپ یا ایشیائی رُوس کے باشندے۔

۲ پُور: پھٹے پُرانے کپڑوں کا ڈھیر۔ چیتھڑے۔

ہیرٹا مُلّر

(Herta Muller)

ہیرٹا مُلّر کو ۲۰۰۹ء میں پہلی بار عالمی سطح پر بڑی کامیابی اُن کے ناول *Atemschaukel (The Hunger Angel)* کی جرمن بک پرائز *(Deutscher Buckpreis)* کے لیے نامزدگی اور فرانز وَرفل ہیومن رائٹس ایوارڈ ملنے پر ملی۔ اِسی برس ہیرٹا مُلّر کو دُوسری بڑی کامیابی اُس وقت ملی جب سویڈش اکیڈمی نے اُن کے لیے نوبیل انعام کا اعلان اِن الفاظ کے ساتھ کیا: ''وہ شاعری پر ارتکاز اور جراُت مندانہ نثر سے جلا وطنوں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔'' سویڈش اکیڈمی نے ہیرٹا مُلّر کے اُسلوب اور جرمن زبان کی بطور اقلیتی زبان کے استعمال کو فرانز کافکا سے موازنہ کیا اور اُس پر کافکا کے اثرات کو نُمایاں کیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نوبیل انعام کمیونزم کے خاتمے کی بیسویں سالگرہ پر دیا گیا۔

نوبیل انعام برائے ادب حاصل کرنے والی ہیرٹا مُلّر رومانیہ میں پیدا ہونے والی جرمن ناول نگار، شاعرہ اور مضمون نگار ہیں۔ وہ ۱۷۔ اگست ۱۹۵۳ء کو مغربی رومانیہ کے ضلع تیمس کے جرمن زبان بولے جانے والے قصبے نِتچی ڈورف (جرمن: نِٹزکی ڈورف) کو بانات سوابیائی کیتھولک کسان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ مغربی رومانیہ کے اُس قصبے میں ۱۹۸۰ء تک جرمن زبان بولی جاتی رہی۔ رومانیہ میں اُن کے والدین جرمن اقلیت سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے دادا ایک امیر کبیر کاشت کار اور کاروباری شخص تھے لیکن کمیونسٹ دور میں اُن کی دولت اور جائیداد ضبط ہوئی۔ اُن کے والد کمیونسٹ رومانیہ میں جنگِ عظیم دوم کے دوران وافن ایس ایس *(Wafen SS)* کے لیے کام کرتے اور اپنی روزی ایک ٹرک چلا کر کماتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کی والدہ کو، جب وہ محض ستر ہ برس کی تھیں، جرمن اقلیت کے دیگر ایک لاکھ افراد کے ہمراہ سوویت یونین میں جبری مشقت کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا جہاں سے اُنھیں پانچ برس بعد ۱۹۵۰ء میں رہائی ملی۔

ہیرٹا مُلّر کی مادری زبان جرمن ہے۔ اُنھوں نے رومانیائی زبان سکول میں سیکھی۔ وہ تیمی سوار یونیورسٹی میں جرمن اور رومانیائی ادب کی طالب علم رہی ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اُنھوں نے ایک کارخانے میں بطور مترجم ملازمت کر لی لیکن ۱۹۷۹ء میں اُنھیں نوکری سے برخاست کر دیا گیا کیوں کہ اُنھوں نے کمیونسٹ دور کی خفیہ پولیس سیکوریٹیٹ کا مخبر بننے سے انکار کر دیا تھا۔ ملازمت سے برخاستگی کے بعد اُنھوں نے نجی طور پر کنڈر گارٹن اور جرمن کی تعلیم دے کر حصولِ رزق کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہیر تا مُلر کی پہلی کتاب Niederungen، جس کا انگریزی میں Nadirs کے نام سے ترجمہ ہوا، رومانیہ میں ۱۹۸۲ء میں حکومتی سنسر کے بعد اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب بانات میں جرمن ثقافت کے بارے میں ایک بچے کے تأثرات پر ہے۔ اِس کتاب پر بانات رومانیہ کے سوابیائی قومی پریس کے کچھ لوگوں کی طرف سے ہیر تا مُلر کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا کہ اُنھوں نے دیہی زندگی کی بے رحمانہ عکاسی کی ہے کیوں کہ اُنھوں نے رومانیہ میں آمریت پر شدید تنقید کی تھی۔ پس اُن کے اپنے وطن رومانیہ میں اُن کی تحریروں اور کتب کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی، جب کہ رومانیہ سے باہر اُن کی لکھتوں پر مثبت تأثرات سامنے آئے۔ دو برس جرمنی سے یہی کتاب غیر سنسر شدہ شائع ہوئی۔ اسی برس کہانیوں پر مشتمل اُن کی دُوسری کتاب Druckender Tango in Romania، جو انگریزی میں Oppressive Tango کے عنوان سے ترجمہ ہوئی، بھی شائع ہوئی۔ اِن دونوں کتب میں ہیر تا مُلر نے ایک چھوٹے جرمن گاؤں کی زندگی کا بیانیہ پیش کرتے ہوے وہاں کی بدعنوانی، عدم برداشت اور ظلم و ستم کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

ہیر تا مُلر ایکشنز گروپ بانات کی رُکن بھی رہیں جو جرمن بولنے والے ادیبوں کا گروپ تھا اور نکولائی سیوسیسکو کے دورِ حکومت میں کیے جانے والے سنسر کے خلاف آزادیِ اظہار کا حامی تھا۔ ہیر تا مُلر کی تحریریں بشمول The Land of Green Plums اِن ہی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔

۱۹۸۵ء میں مُلر کو مغربی جرمنی ہجرت کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ بالآخر اجازت ملنے پر اُنھوں نے ۱۹۸۷ء میں اپنے شوہر ناول نگار رچرڈ واگنر کے ہم راہ جرمنی ہجرت کی اور مغربی برلن کو اپنا مسکن بنایا۔ دونوں میاں بیوی اب بھی مغربی برلن میں قیام پذیر ہیں۔ اُنھوں نے جرمنی کی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں، جن میں پیڈربورن، واروک، ہیمبرگ، سوان سی، گینئز وِلے (فلوریڈا)، کیسل، گوٹن جن، نیورن جن اور زیورچ وغیرہ شامل ہیں، لیکچر دیے۔ وہ ۱۹۹۵ء میں Deutsche fur Sprache and Dischtung کی رُکن بنیں اور تا حال اُس کی رُکن ہے۔ مابعد اُنھیں دیگر اعزازی عہدوں سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۹۷ء میں اُنھوں نے پین (PEN) سینٹر کو سابقہ جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک برانچ میں ضم کرنے کی وجہ سے احتجاجاً سینٹر کو چھوڑ دیا۔

اُن کے ناول Der Fuchs war damals der Jager (1992), Herztier Heute war ich mir lieber nicht (1994), The Land of Green Plums (1996) begegnet (1997), اور The Appointment (2001) غلیظ آمریت اور روزمرہ زندگی میں استعماری طاقتوں کے ظلم و ستم کا پول باریکیوں، جزئیات اور نفاست کے ساتھ کھولتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آمریت میں عام آدمی کی زندگی اجیرن کرنے کے لیے کیسے کیسے حربے آزمائے جاتے ہیں۔

ہیر تا مُلر کو ملنے والے اعزازات و انعامات کی ایک طویل فہرست ہے۔ اُنھیں کم و بیش چوبیس انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں اسپیکلے لٹریچر پرائز ۱۹۸۴ء، کرانچ سٹینرلٹریچر پرائز ۱۹۹۱ء، کرٹیسکل

پرائز فار لٹریچر ۱۹۹۳ء، سٹی رائٹر آف فرینکفرٹ۔ برجن۔اینخائم ۱۹۹۵/۹۶ء، لٹریچر پرائز آف گراز ۱۹۹۷ء، لٹریچر پرائز آف کونارڈ۔ایڈینا ور۔سٹفٹنگ ۲۰۰۴ء، برلن لٹریچر پرائز ۲۰۰۵ء، ورتھ پرائز فار یورپین لٹریچر اینڈ والٹر۔ہیزن کلیور لٹریچر پرائز ۲۰۰۶ء و دیگر شامل ہیں۔

ہیرٹا مُلر نے اپنے نوبیل خطبے "ہر لفظ کچھ نہ کچھ شیطانی گھن چکر رکھتا ہے۔" میں 'رومال' کے لفظ کو گہرے استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بہت سے مفاہیم میں استعمال کیا ہے، خاص طور پر آمریت کے تحفے میں دیے ہوئے آنسو پونچھنے کے لیے۔انھوں نے اپنے خطبے میں آمریت کو اپنی لکھتوں اور مصوری (کولاژ) میں اپنا نشانہ بنایا ہے۔اُن کے خطبے کی ادب سے متعلق چیدہ چیدہ باتیں کچھ یوں ہیں۔

"**کیا تمھارے پاس رومال ہے؟**" یہ وہ سوال تھا جو ہر صبح میرے گھر سے نکل کر گلی میں جانے سے پہلے میری ماں مجھ سے کیا کرتی تھیں۔...... میں ایک فیکٹری میں مترجم کا کام کرتی تھی۔ تین برس تک معمول کی زندگی گزرتی رہی۔ پھر جب (آمر کا آلۂ کار نہ بننے پر۔مترجم) مجھ سے میرا دفتر چھین لیا گیا تو زینے پر کھڑی کشش و پنج میں مبتلا تھی۔ میں چند بار سیڑھیاں چڑھی اور اُتری۔ اُس وقت میں یک لخت ہی اپنی ماں کا بچہ بن گئی تھی کیوں کہ **میرے پاس رومال تھا**۔ میں نے دوسری اور تیسری منزل کے درمیانی زینے کے ایک قدمچے پر رومال بچھایا، اُسے اچھی طرح ہموار کیا اور اُس پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی ضخیم لغات گھٹنوں پر رکھ لیں۔...... میری دانش زینے کی دانش تھی اور زینہ میرا دفتر۔...... جہاں بیٹھ کر میں نے لغت سے 'زینہ' کا معنی دیکھا: پہلا قدم 'آغاز کا قدم' ہوتا ہے یا پھر 'آگے بڑھنے سے رُکنے' والا جسے 'ٹھیلے کی تھوتھنی' بھی کہا جا سکتا ہے۔...... جو بولا نہیں جا سکتا لکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ لکھنے کا عمل ایک خاموش عمل ہے۔ دماغ سے ہاتھ تک کی محنت اور رنج سے مُنھ نکل جاتا ہے۔ آمریت کے دوران میں بے تحاشا بولتی تھی۔...... عموماً میری گفتگو کے ہولناک نتائج برآمد ہوتے۔ لیکن لکھنے کا آغاز چُپ چاپ ہوا۔...... جو کچھ ہو رہا تھا اُسے تقریروں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔...... لکھتے ہوئے میں بس تلخ لفظوں کو سوچ کر گوندھ سکتی تھی۔ میں نے زندگی کی تمنا میں موت کے خوف کا سامنا کیا۔ لفظوں کی بُھوکی رہی۔ الفاظ کے گھن چکر کے سوا کوئی شے میری حالت کو سنبھالا نہیں دے سکتی تھی۔ جو مُنھ سے ادا نہیں ہو سکتے تھے لکھے جاتے۔ میں واقعات کی تلاش میں ماری ماری پھرتی، اُنھیں لفظوں میں ڈھالتی۔ یہاں تک کہ کوئی ایسی تخلیق سامنے آ جاتی جس سے میں پہلے آگاہ نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت کے رُوبرو الفاظ کے شیطانی گھن چکر کی خاموش تصویر آ کھڑی ہوتی جو حقیقی پہلوؤں کا لحاظ نہ کرتی اور بے حد اہم کو کوتاہ اور معمولی کو بڑا کر دیتی۔...... میں بچپن میں مویشی چرانے جاتی تھی تو میں اُنھیں (مویشی کے اعضا کو: مراد ہے چیزوں کو۔مترجم) اُن کے نام سے پکارتی تھی مثلاً تھن کو تھن کہہ کر لیکن ہمارا آپس میں رابطہ نہ ہوتا پھر میں نے اُنھیں اپنے نام دے دیے۔...... ہمارا آپس میں بندھن قائم ہو گیا۔ ......الفاظ کی اداسی کو پتا ہے کہ اُس کا اپنا کوئی انتخاب نہیں وہ چھل دے سکتی ہے کیوں کہ اشیا اپنے مادے سے مکر کرتی ہیں، احساسات اپنے اشاروں کنایوں سے گُم راہ کرتے ہیں۔ تلفظ اور اُن کا مفہوم منطقی ہوتا ہے جہاں مادے کا دھوکا اور اشاروں کنایوں کا فریب اکٹھے سامنے آتے ہیں۔ لکھتوں میں یہ اعتبار کا نہیں بلکہ چھل کے ایقان کا معاملہ ہے۔...... دوبارہ سیڑھی کی طرف لوٹتی ہوں۔ وہیں میں نے شودمرکب 'جیسے ڈوب صُورت' لفظ کا معنی بھی دیکھا: سیڑھی کی مانند چڑھتا

ہوا سُود...... لکھتوں میں لفظ دو کام کرتے ہیں: سیڑھی کی مانند اُوپر ہی اُوپر چڑھتے ہیں اور لکھاری سے بہت کچھ چھین لیتے ہیں۔ جتنا لکھا جاتا ہے اُتنا ہی چھنتا جاتا ہے۔ محض وہی تجربہ بچتا ہے جو لکھنے سے رہ جائے۔ صرف الفاظ ہی دریافتیں کرتے ہیں کیوں کہ وہ اُن سے آشنا نہیں ہوتے۔ ...... مجھے لگتا ہے کہ اشیاء اپنی ماہیت سے آگاہ نہیں، کنائے اپنے محسوسات سے نا آشنا ہیں اور لفظ اپنی ادائی والے مُنھ کو نہیں جانتے لیکن ہمیں اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے اشیاء، کنایوں اور الفاظ کی ضرورت ہے۔ ہم جتنے زیادہ الفاظ برتتے ہیں اُتنے ہی زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمیں مُنھ بندی کا اِذن ہو تو ہم اپنا اظہار کنایوں اور اشیاء سے کرتے ہیں جن کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے اور جو ابہام پیدا کرتے ہیں۔ ...... میری خواہش ہے کہ میں اُن سب کے لیے ایک فقرہ کہوں جو روز آمریت کے ہاتھوں بے توقیر ہوتے ہیں۔ ...... اِس فقرے میں 'رومال' کا لفظ ضرور ہو۔ کیا آپ کے پاس رومال ہے؟''

VVVV

لے Swabia: مغربی جرمنی کا جنوب مغربی علاقہ اور سابقہ شاہی ریاست جس میں سیاہ جنگلات پائے جاتے ہیں۔ اِس کا مشرقی حصہ جنوب مغربی باویریا کا ایک انتظامی صوبہ ہے جس کا دارالخلافہ آگس برگ ہے۔ سوابیا کے باشندے کو سوابیائی (Swabian) کہا جاتا ہے۔

جنازے کا خطبہ

(The Funeral Sermon)

ریلوے سٹیشن پر عزیز و اقارب دُھول اُڑاتی ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ ہر قدم پر وہ اپنے اُٹھے ہوئے بازوؤں کو حرکت دیتے اور ہاتھ ہلاتے۔

ریل گاڑی کی کھڑکی کے عقب میں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ شیشہ اُس کی بغل تک اُٹھا ہوا تھا۔ وہ مُرجھائے ہوئے سفید پھولوں کا ایک گُل دستہ اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ اُس کے چہرے پر سختی کا تاثر تھا۔

ایک نوجوان عورت ایک بدصورت بچے کو ریلوے سٹیشن سے باہر لے جا رہی تھی۔ عورت کا کُب نکلا ہوا تھا۔

ریل گاڑی محاذِ جنگ پر جا رہی تھی۔

میں نے ٹیلی ویژن بند کر دیا۔

والد کمرے کے وسط میں تابوت میں پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر اس قدر تصاویر لگی ہوئی تھیں کہ اُنھوں نے دیواروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ایک تصویر میں والد نے کُرسی کو پکڑا ہوا تھا اور اُن کا آدھا جسم کُرسی سے اُوپر تھا۔ اُنھوں نے لباس پہن رکھا تھا اور اُن کی جھکی ہوئی ٹانگیں گوشت کے ستون تھیں۔ اُن کا گنجا سر ناشپاتی جیسا تھا۔

ایک اور تصویر میں والد دُلہا بنے کھڑے تھے۔ اُن کی صرف آدھی چھاتی نظر آ رہی تھی۔ باقی آدھی والدہ کے ہاتھوں میں پکڑے مُرجھائے پھولوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اُن کے سر ایک دُوسرے سے یُوں جُڑے ہوئے تھے کہ اُن کے کانوں کی لَویں تک آپس میں چُھو رہی تھیں۔

ایک دُوسری تصویر میں والد ایک باڑ کے سامنے بھدّے انداز میں تن کر کھڑے تھے۔ اُن کے بُوٹوں کے نیچے برف تھی۔ سفید برف کے پس منظر میں والد کے ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کا ہاتھ سیلوٹ کے لیے اُن کے سر پر اُٹھا ہوا تھا۔ اُن کے کالر پر الفاظ کڑھے ہوئے تھے۔

اُس سے اگلی تصویر میں والد کے کندھے پر ایک بیلچہ تھا۔ اُن کے عقب میں مکئی کا کھیت تھا جس کے پودے آسمان کو چُھوتے نظر آ رہے تھے۔ والد سر پر ایک ہیٹ لیے ہوئے تھے۔ اُن کے ہیٹ

کا سایہ پڑا تھا جس نے اُن کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

اگلی تصویر میں والد ایک ٹرک کے سٹیئرنگ وہیل پر بیٹھے تھے۔ٹرک گائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ والد ہر ہفتے شہر کے مذبح خانے میں گائیں لے کر جاتے تھے۔والد کا چہرہ پتلا تھا اور اُن کے جبڑے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔

تمام تصاویر میں والد کنائے کے وسط میں ساکت تھے۔والد یُوں لگتے تھے جیسے وہ تذبذب کا شکار ہوں کہ اُنھیں کیا کرنا چاہیے لیکن والد ہمیشہ جانتے تھے کہ اُنھیں کیا کرنا ہے۔اِس لیے وہ تمام تصاویر جھوٹی تھیں۔اُن تمام جھوٹی تصاویر،اُن تمام جھوٹے چہروں نے کمرے میں سرد لہر بھر رکھی تھی۔ میں اپنی کُرسی سے اُٹھنا چاہتی تھی لیکن میرا لباس لکڑی سے چپک گیا تھا۔میرا لباس سیاہ تھا جس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔میرے حرکت کرنے پر وہ چرچراتا تھا۔میں اُٹھی اور میں نے والد کے چہرے کو چُھوا۔ وہ کمرے کی دیگر اشیا سے زیادہ سرد تھا۔باہر گرمی تھی۔مکھیاں اُڑتے ہوئے اپنے انڈے نیچے نیچے گرا رہی تھیں۔گاؤں چوڑے کچے راستے کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔راستہ گرم اور بھورا تھا اور اپنی چمک سے آنکھیں جھلساتا تھا۔

قبرستان چٹانی پتھروں سے بنایا گیا تھا۔قبروں پر بڑے بڑے گول پتھر رکھے ہوئے تھے۔

جب میں نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو مجھے پتا چلا کہ میرے جوتوں کے تلوے اُوپر کی طرف مُڑے ہوئے تھے۔تمام وقت میں اپنے جوتوں کے تسموں پر چلتی رہی تھی۔تلوے لمبے اور روزنی ہو کر عقبی سمت مُڑے ہوئے تھے اور اُن کے سرے مُڑ چکے تھے۔

دو پست قامت شخص لڑکھڑاتے ہوئے جنازہ گاڑی سے تابُوت اُتار کر اُسے دو خستہ رسّیوں کی مدد سے قبر میں لے جا رہے تھے۔تابُوت جھول رہا تھا۔اُن کے بازو اور رسّیاں لمبی ہوتی چلی گئیں۔ قبر کو مٹی کے بجائے پانی سے بھر دیا گیا۔''تمھارے باپ نے بے شمار لوگوں کا قتل کیا'' نشے میں دھت لوگوں میں سے ایک بولا۔

میں نے جواب دیا۔''وہ محاذ پر تھے۔ہر پچیس آدمیوں کو ہلاک کرنے پر اُنھیں میڈل ملا۔وہ بہت سے میڈل گھر لائے تھے۔''

''اُس نے چار دُوسرے فوجیوں کے ساتھ مل کر شلجم کے کھیت میں ایک عورت کی عصمت دری کی تھی۔''پست قامت شخص نے کہا۔''تمھارے باپ نے اُس کی رانوں کے بیچ ایک شلجم پھنسا دیا تھا۔جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو اُس کا خُون بہہ رہا تھا۔وہ ایک رُوسی عورت تھی۔بعد میں ہم کئی ہفتوں تک تمام ہتھیاروں کو شلجم کہہ کر پکارتے رہے تھے۔''

نشے میں دھت دُوسرے پست قامت شخص نے بات جاری رکھی۔''سالِ نو کی آمد پر ہم ایک

چھوٹے سے جرمن گاؤں کے اوپیرا میں گئے۔ گلوکارہ کی آواز اُتنی ہی تیکھی تھی جتنی رُوسی عورت کی چیخیں۔ ایک ایک کر کے ہم سب تھیٹر سے اُٹھ آئے۔ تمھارا باپ آخر تک ٹھیرا رہا۔ بعد کے کئی ہفتوں تک وہ تمام گیتوں اور تمام عورتوں کو شلجم کہتا رہا۔''

پست قامت شخص آلوؤں کی تیز شراب پی رہا تھا۔ اُس کا پیٹ گُڑگُڑ کر رہا تھا۔ وہ بولا۔

''میرے پیٹ میں اتنی شراب ہے جتنا قبروں میں زمینی پانی۔''

پھر پست قامت نے تابوت پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا۔

جنازے کا خطبہ دینے والا شخص حضرت عیسٰیؑ کی کھدی ہوئی شبیہہ والی سفید ماربل کی صلیب کے پاس کھڑا تھا۔ وہ میری طرف آیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اُس کے کوٹ کی جیبوں میں تھے۔

خطیب کے بٹن کے سوراخ میں ہاتھ جتنا بڑا گلاب ٹنگا ہوا تھا۔ اُس نے میرے عین قریب آ کر جیب سے ایک ہاتھ نکالا جس کا مُکا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی اُنگلیاں سیدھی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کر نہیں سکتا تھا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھیں نیلی پڑ گئیں۔ وہ بے آواز رونے لگا۔ ''جنگ میں آپ اپنے ہم وطنوں کی تمناؤں کے مطابق نہیں چل سکتے۔'' وہ بولا۔ ''آپ اُنھیں حکم نہیں دے سکتے۔''

پھر خطیب نے تابوت پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا۔

اب ایک موٹا شخص آ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اُس کا سر مرتبان جیسا تھا لیکن اُس کا چہرہ نہیں تھا۔

''تمھارا باپ کئی برسوں تک میری بیوی کے ہمراہ سوتا رہا۔'' اُس نے کہا۔ ''جب میں پیے ہوئے تھا تو اُس نے مجھے بلیک میل کیا اور میری رقم چُرا لی۔'' وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

پھر ایک بدنُما حد تک دُبلی پتلی جھریاں پڑی عورت میری سمت آئی۔ اُس نے زمین پر تھوکا اور مجھے لعن طعن کرنے لگی۔

جنازے کا اجتماع قبر کی مخالف سمت کھڑا تھا۔ میں نے سر جھکا کر اپنے آپ کو دیکھا اور پریشان ہو گئی کیوں کہ وہ میرے پستان دیکھ سکتے تھے۔ میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔

ہر شخص کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن کی نگاہیں بے تاثر تھیں۔ اُن کی پتلیاں اُن کی پلکوں کے نیچے حرکت کر رہی تھیں۔ مردوں نے اپنے کندھوں سے بندوقیں لٹکا رکھی تھیں اور عورتیں اپنی مالائیں چھنکا رہی تھیں۔

خطبہ دینے والا اپنے گلاب کی پتّی توڑ رہا تھا۔ اُس نے ایک لہو رنگ پتّی توڑی اور کھا گیا۔

اُس نے مجھے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب تقریر کی میری باری ہے۔ ہر ایک مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

میرے ذہن میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ میری آنکھیں میرے حلق کے راستے دماغ کی طرف چڑھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے مُنھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی اُنگلیاں کاٹ ڈالیں۔ آپ میرے ہاتھوں کی پشت پر میرے دانتوں کے نشانات دیکھ سکتے تھے۔ میرے دانت گرم تھے۔ میرے مُنھ کے کناروں سے خُون نکل کر میرے کندھوں پر بہنے لگا تھا۔

ہَوا نے میرے لباس سے ایک آستین کو پھاڑ ڈالا۔ وہ فضا میں اُڑنے اور چکرانے لگی۔

ایک شخص ایک بڑے پتھر پر اپنی بندوق ٹیک رہا تھا۔ اُس نے نشانہ لیا اور آستین کو نیچے مار گرایا۔ جب وہ میرے سامنے زمین پر گری تو خُون سے بھری ہوئی تھی۔ جنازے کا اجتماع اُس شخص کے نشانے کی تعریف کرنے لگا۔

میرا بازو عریاں تھا۔ میں نے اُسے خوف سے کپکپاتے محسوس کیا۔

مقرر نے اشارہ کیا۔ داد و تحسین کے نعرے تھم گئے۔

"ہمیں ہمارے معاشرے پر فخر ہے۔ ہماری فتوحات نے ہمیں زوال سے محفوظ رکھا۔ ہم اپنی توہین نہیں ہونے دیں گے۔" وہ بولا۔ "ہم اپنے خلاف کوئی غلط بات برداشت نہیں کریں گے۔ ہمیں ہمارے وطن جرمنی کے نام پر موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے۔"

اُنھوں نے اپنی بندوقیں مجھ پر تان لیں۔ میرے ذہن میں بہرہ کر ڈالنے والا دھماکا گونجا۔

میں گر گئی لیکن زمین تک نہیں پہنچی۔ میں اُن چہروں کے سامنے فضا میں جھولنے لگی۔ میں نے خاموشی سے دروازے کھولے۔

میری والدہ نے تمام کمرے صاف کر دیے تھے۔ جہاں لاش رکھی ہوئی تھی وہاں اب ایک لمبی میز پڑی تھی۔ وہ قصابوں والی میز تھی، جس پر ایک خالی سفید رکابی اور ایک گُل دان دھرا ہوا تھا، جس میں مُرجھائے ہوئے پھولوں کا گُل دستہ رکھا ہوا تھا۔

ماں نے جالی دار سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اُنھوں نے ہاتھ میں ایک بڑا چاقو پکڑا ہوا تھا۔ ماں نے آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر چاقو کے لمبے پھل سے اپنی گھنی سُرمئی چٹیا کاٹ ڈالی۔ وہ چٹیا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر میز کی طرف آئیں اور اُس کے ایک سرے کو رکابی میں رکھ دیا۔

"مجھے اپنی باقی کی ساری عمر سیاہ لباس پہننا ہوگا۔" وہ بولیں۔

اُنھوں نے چٹیا کے ایک سرے کو آگ لگا دی۔ آگ میز کے ایک سرے سے دُوسرے تک پھیل گئی۔ چٹیا بم یا آتش بازی کے فلیتے کے مانند جلنے لگی۔ آگ اُسے چاٹتے ہوئے کھاتی جا رہی تھی۔

"رُوس میں اُنھوں نے میرے بال اُسترے سے صاف کر دیے تھے۔ یہ کم سے کم سزا تھی۔" اُنھوں نے کہا۔ "میں بھوک مرتی لڑکھڑاتی تھی۔ رات کو میں شلجم کے ایک کھیت میں رینگ گئی۔ محافظ

کے پاس بندوق تھی۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو ہلاک کر ڈالتا۔ کھیت سر سرایا تک نہیں۔ رات خاصی گہری ہو گئی تھی اور شلجموں کے پتّے دُھند کے باعث سیاہ پڑ کر مُڑ گئے تھے۔''

میں نے اُس کے بعد ماں کو نہیں دیکھا۔ چھپا جلتی رہی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔

''اُنھوں نے تمھیں قتل کر دیا۔'' ماں بولی۔

کمرے میں اتنا زیادہ دھواں بھر گیا تھا کہ اب ہم ایک دُوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں نے اپنے نزدیک اُن کے قدموں کی چاپ سُنی۔ میں اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر اُنھیں ٹٹول رہی تھی۔

اچانک اُنھوں نے اپنے ہڈّ یلے ہاتھ میرے بالوں میں گھسا دیے۔ اُنھوں نے میرا سر تیزی میں ہلایا۔ میں چیخنے لگی۔

میں نے اچانک اپنی آنکھیں کھولیں۔ کمرہ گھوم رہا تھا۔ میں مُرجھائے ہوئے پھولوں کے ایک گولے پر پڑی تھی اور کمرہ بند تھا۔

پھر میں نے محسوس کیا جیسے اپارٹمنٹ کی عمارت پگھل رہی ہو اور اپنا وجود زمین میں جذب کرتی جا رہی ہو۔

کلاک کا الارم بج اُٹھا۔ ہفتے کی صبح کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔

۷۷۷۷

سوابیائی غسل
(The Swabian Bath)

ہفتے کی شب ہے۔ غسل خانے کے چولہے پر چمکتا ہوا دیگچا رکھا ہے۔ تازہ ہَوا کی آمد و رفت والی کھڑکی سختی سے بند ہے۔ پچھلے ہفتے دو سالہ ننھی ارنی کو اُس سے آنے والی یخ ہَوا سے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ ماں پتلون اُڑسے ننھی ارنی کی پشت مَل رہی ہے۔ ننھی ارنی ہاتھ پاؤں چلا رہی ہے۔ ماں ننھی ارنی کو اُٹھا کر غسل کے ٹب سے باہر نکالتی ہے۔ بچاری بچی کہتی ہے: دادا ابو۔ دادی بولتی ہے: اتنے چھوٹے بچوں کو نہلانا نہیں چاہیے۔ ماں غسل کے ٹب میں چڑھ جاتی ہے۔ پانی ابھی گرم ہے۔ صابن کا جھاگ بنا ہوا ہے۔ ماں رگڑ رگڑ کر اپنی گردن سے سُرمئی مَیل کی بتیاں اُتار رہی ہے۔ ماں کے مَیل کی بتیاں پانی کی سطح پر تیر رہی ہیں۔ ٹب میں پانی کے کناروں پر پیلا دائرہ بن گیا ہے۔ ماں ٹب سے نکل آتی ہے۔ پانی ابھی تک گرم ہے۔ ماں، باپ کو بلاتی ہے۔ باپ غسل کے ٹب میں گھس جاتا ہے۔ پانی گرم ہے۔ صابن کا جھاگ بنا رہی ہے۔ باپ اپنے سینے سے سُرمئی مَیل کی بتیاں کھرچ رہا ہے۔ باپ کے مَیل کی بتیاں ماں کے مَیل کی بتیوں کے ساتھ مل کر پانی پر تیر رہی ہیں۔ پانی اب بھی گرم ہے۔ باپ، دادی کو پکارتا ہے۔ دادی ٹب میں داخل ہو جاتی ہے۔ پانی نیم گرم ہے۔ برف کا جھاگ بن رہا ہے۔ دادی اپنے کندھوں سے سُرمئی مَیل کی بتیاں رگڑ رہی ہے۔ دادی کے مَیل کی بتیاں ماں اور باپ کے مَیل کی بتیوں کے ساتھ تیرنے لگی ہیں۔ ٹب کے کناروں پر سیاہ دائرہ بن گیا ہے۔ دادی ٹب سے باہر نکلتی ہے۔ پانی اب بھی گرم ہے۔ دادی، دادا کو پکارتی ہے۔ دادا غسل کے ٹب میں اُترتا ہے۔ پانی ٹھنڈا ہے۔ صابن جھاگ بنا رہی ہے۔ دادا اپنی کہنیوں سے سُرمئی مَیل کی بتیاں اُتار رہا ہے۔ دادا کے مَیل کی بتیاں ماں، باپ اور دادی کے مَیل کی بتیوں کے ساتھ پانی پر تیرنے لگتی ہیں۔ دادی غسل خانے کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ غسل کے ٹب میں دیکھتی ہے۔ دادا دکھائی نہیں دیتا۔ سیاہ پانی ٹب کے سیاہ کناروں کے اُوپر سے بہہ رہا ہے۔ دادی سوچتی ہے کہ دادا ٹب میں ہوگا۔ دادی مڑ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیتی ہے۔ دادا ٹب سے پانی نالی میں بہا دیتا ہے۔ ماں، باپ، دادی اور دادا کے مَیل کی چھوٹی چھوٹی سُرمئی بتیاں نالی کے گرد چکر کھا رہی ہیں۔

تازہ تازہ غسل لیا ہوا سوابیائی خاندان ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہفتے کی شب کی فلم کا انتظار کر رہا ہے۔

ماریو ورگاس یوسا

(ہسپانوی تلفظ: مارجو برگاس یوسا)

(Mario Vargas Llosa)

۲۰۱۰ء کے لیے نوبیل انعام برائے ادب وصول پانے والے کے نام کا اعلان کرتے ہوئے سویڈش اکیڈمی نے مؤقف اختیار کیا: ''۲۰۱۰ء کا نوبیل انعام ورگاس یوسا کو اُن کی بُنت کاری کے منضبط فن اور فرد کی مزاحمت، بغاوت اور شکست کی مؤثر اور نُمایاں تخلیق کاری پر دیا گیا ہے۔'' نوبیل انعام کے علاوہ اُنھیں دیگر بے شمار معروف اور اہم انعامات و اعزازات حاصل کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنے باقاعدہ ادبی کیریئر کا آغاز ۱۹۵۷ء میں اپنے ابتدائی افسانوں ''قائدین'' اور ''دادا'' سے کیا۔ ماریو ورگاس یوسا نے سترہ سے زائد ناول، افسانوں کے کئی مجموعے اور معتدد غیر افسانوی کتابیں تحریر کی ہیں۔ اُن کے ادبی کیریئر کی سب سے اہم تبدیلی اُن کے اُسلوب اور سوچ کا جدیدیت سے مابعد جدیدیت کی طرف سفر ہے۔

اپنے والدین ارنیسٹو ورگاس مالڈوناڈو اور ڈورا یوسا کی اکلوتی اولاد ماریو ورگاس یوسا کا نام ہسپانوی رواج کے مطابق ہے کہ اصل نام ماریو کے بعد پہلا حصّہ (ورگاس) ددھیالی اور دُوسرا حصّہ (یوسا) ننھیالی خاندانی نام۔ تاہم پُورا نام جارج ماریو پیڈرو ورگاس ہے۔ مستقبل میں نواب (*Marquis*) کے خطاب کا اعزاز پانے والے پہلے فرد ماریو ورگاس یوسا ۲۸- مارچ ۱۹۳۶ء کو پیرو کے صوبائی صدر مقام اریکیوپا میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ماریو کے جنم کے فوراً بعد اُن کے والد نے انکشاف کیا کہ اُن کے ایک جرمن عورت کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اپنے والدین میں طلاق ہونے تک ماریو ورگاس یوسا نے ایک برس کا عرصہ اپنے ننھیال میں بسر کیا۔ پھر وہ اپنی ماں اور اُن کے خاندان کے ہمراہ بولیویا میں کوچابامبا چلے گئے، جہاں اُن کا بچپن گُزرا۔ چُوں کہ اُن کی والدہ اور اُن کا خاندان ماریو کو بتانا نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے والدین میں علیحدگی ہو گئی ہے لہٰذا اُنھیں یقین دِلایا گیا کہ اُن کے والد فوت ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ دوبارہ پیرو لوٹ آئے۔ دس برس کی عمر میں یوسا لیما چلے گئے۔ جہاں پہلی بار اُن کی ملاقات اپنے باپ سے ہوئی تو اُن کے والدین کے تعلقات دوبارہ بحال ہو گئے۔ لیما میں اُنھوں نے ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء ایک کرسچن مڈل سکول، کالجیو لا سیلے سے تعلیم حاصل کی۔ عمر کے چودھویں برس اُنھیں لیما کی ملٹری اکیڈمی بھیج دیا گیا۔ سولہ کے سن میں گریجوایشن کرنے سے

قبل ہی ماریو نے ایک مقامی اخبار میں بطور صحافی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُنھوں نے ملٹری اکیڈمی چھوڑ کر پیرو سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہیں اپنا پہلا تھیٹر ڈراما ''La huida del Inca'' بھی تحریر کیا۔ ۱۹۵۲ء میں امریکیوں کی قدیم ترین جامعہ، جامعہ سان مارکوس میں داخلہ لیا اور قانون اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں ۱۹ برس کی عمر میں دس برس بڑی اپنی ماموں (خالہ) زاد جولیا اُرقوئیدی سے شادی ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں سان مارکوس کی نیشنل یونیورسٹی سے گریجوایشن کے بعد اُنھیں ۱۹۶۰ء میں سپین کی کمپلوٹینس یونیورسٹی، میڈرڈ میں وظیفہ ملا۔ جہاں یوسا نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''گارشیا مارکیز: فیصلے کی کہانی'' تحریر کیا جسے اُنھوں نے ۱۹۷۱ء میں شائع کروایا۔ کتابی ضخامت کا یہ مقالہ جب اشاعت پذیر ہوا تو ورگاس یوسا کی اپنے نوبیل انعام یافتہ دوست مارکیز سے تیس برس سے بول چال بند تھی۔ میڈرڈ کے وظیفے کی معیاد ختم ہونے پر تعلیمی وظیفہ ملنے کی توقع پر فرانس گئے لیکن پیرس پہنچنے پر انکار کا سامنا کرنا پڑا۔ تنگ دستی کے باوجود ماریو اور جولیا نے پیرس ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں ماریو نے بسیار نویسی کا آغاز کیا۔ جولیا کے ساتھ ازدواجی زندگی چند برس اور چل سکی اور بالآخر ۱۹۶۴ء میں طلاق ہو گئی۔ ایک برس بعد ماریو نے اپنی عم زاد پیٹریشیا یوسا سے شادی کر لی۔ دیگر بے شمار لاطینی امریکی مصنفین کی طرح وہ بھی زندگی بھر سیاست میں متحرک رہے۔ بتدریج بائیں بازو کی سیاست سے لبرل ازم یا نیو لبرل ازم کو اپنایا۔ گو شروع اُنھوں نے کیوبا میں فیدرل کاسترو کی انقلابی حکومت کی حمایت کی لیکن بعد میں کیوبا کے آمر اور اُس کے آمرانہ دورِ حکومت سے مایوس ہو گئے۔ ۱۹۹۰ء میں فریڈے ڈیموکریٹکو کے ساتھ اتحاد کر کے پیرو کی صدارت کے انتخاب میں حصہ لیا لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔ اُنھوں نے ۱۹۹۰ء میں میکسیکن ٹیلی ویژن پر ایک جملہ کہا جو بعد کے عشروں میں دُنیا بھر میں زبانِ زدِ عام ہو کر محاورہ بن گیا: ''میکسیکو مکمل آمریت ہے۔''

ماریو ورگاس یوسا بہ یک وقت مصنف، سیاست دان، صحافی اور مضمون نگار ہیں۔ وہ، بشمول ادبی تنقید و صحافت، ادب کی ہمہ جہت اصناف میں لکھتے ہیں۔ اُن کے ناول مزاح نگاری، پراسرار قتل، تاریخ اور سیاسی ہلچل کو موضوع بناتے ہیں۔ اُن کے ناول ''کپتان پانتو جا اور سپیشل سروس''، ''چچی جولیا اور مصنف'' پر فلمیں بھی بنیں جن کے وہ خود اشترا کی ہدایت کار تھے۔ وہ لاطینی امریکا کے نہایت اہم ناول نگار اور اپنی نسل کا نمائندہ لکھاری ہیں۔ کچھ نقادوں کے نزدیک لاطینی امریکا کے دیگر مصنفین سے اُن کی عالمی شہرت کہیں زیادہ ہے۔

ماریو ورگاس یوسا کی شہرت کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں اُن کے تین ناولوں سے ہوا۔ ''ہیرو کا زمانہ'' (یا ''شہر اور کتے'') لیما ملٹری سکول کے کیڈٹوں پر لکھا ہوا مصنف کے ذاتی تجربات پر مشتمل پلاٹ کا حامل ناول ہے۔ ''سبز گھر'' نامی ایک قحبہ خانے کی دیو مالائی جہتیں کرداروں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ مرکزی کردار بونی فیشیا نامی دوشیزہ گرجا کی راہبہ بننے والی ہوتی ہے کہ اُس کی اندرونی نفسیاتی تبدیلی اُسے لاسیلوائیسا کے نام سے ''سبز گھر'' کی معروف کسبی بنا دیتی ہے۔ کچھ نقاد ''سبز گھر'' کو بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔ ''کیتھیڈرل میں مباحثہ'' ایک وزیر کے بیٹے اور شوفر کا بیانیہ ہے۔ جن کا کیتھیڈرل نامی شراب خانے میں مکالمہ

ہوتا ہے۔ وزیر زادہ ایک بدنامِ زمانہ زیرِ زمین شخصیت کے قتل میں اپنے باپ کے کردار کے بارے میں حقائق جاننا چاہتا ہے۔ آمریت کا کردار بھی بین السطور چلتا ہے۔ ان کامیاب ناولوں نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی اور نقاد بھی اِن کے نفیس اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اِس کے بعد یوسا کی تحریروں میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ وہ سیاسی اور معاشرتی مسائل جیسے سنجیدہ موضوعات منتخب کرنے لگے۔ ۱۹۷۳ء میں پہلا مختصر طنزیہ ناول ''کپتان پانتو جا اور سپیشل سروس'' تھا جس کے پلاٹ کے عناصر کو سابقہ ناول ''سبز گھر'' سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں پہلی بیوی جولیا یورقوئیدی کے ہمراہ متاہلانہ زندگی کو بنیاد بنا کر ناول ''چچی جولیا اور مصنف'' لکھا اور انتساب بھی جولیا کے نام کیا۔ اِس ناول کو تخیل اور ثقافت کے ادغام کی بہترین مثال سمجھا جاتا ہے۔ جواب آں غزل، جولیا یورقوئیدی نے آپ بیتی ''جو باتیں ننھا ورگاس نہیں کر پایا'' میں باہمی تعلقات کو بیان کیا کہ یوسا نے اُن کی ازدواجی زندگی کے منفی پہلوؤں کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا اور اپنے ادبی کیریئر میں جولیا کے مددگاری کردار کو گھٹا کر پیش کیا ہے۔ یوسا کا اگلا اہم ناول ''دُنیا کے خاتمے کی جنگ'' ۱۹۸۱ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ اب اُنھوں نے مختصر ناول لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۸۴ء میں ''ایلی جاندرو میتا کی حقیقی زندگی''، ۱۹۸۶ء میں ''پالومینو مولیرو کو کس نے قتل کیا؟''۔ پھر تقریباً پندرہ برس بعد ۲۰۰۰ء میں اہم ترین ناول ''بکری کی ضیافت'' سامنے آیا جسے ''دُنیا کے خاتمے کی جنگ'' کے بعد کامل، مضبوط اور بہترین ناول قرار دیا گیا۔

نوبیل اعزازی تقریب سے خطاب میں اپنے نوبیل خطبے ''مدحت در مطالعۂ فسانہ (فکشن)'' میں ماریو ورگاس یوسا نے مطالعے کی اہمیت کی یُوں مدح سرائی کی:

''کم و بیش ستر برس بعد بھی مجھے بخوبی یاد ہے کہ لفظوں کو کتابوں میں ڈھالنے کے طلسم نے زمان و مکان کی قیود کو توڑتے ہوئے میری زندگی کو کس قدر مالا مال کیا۔ ...... مطالعہ خوابوں کو زندگی میں ڈھالتا ہے اور ادب کی کائنات نے لڑکپن ہی میں زندگی کے خوابوں کو میرے سامنے نہاں کر دیا تھا۔ میں نے جب ابتدائی کہانیاں لکھیں تو میری ماں نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنی پڑھی ہوئی کہانیاں ہی لکھ دی ہیں۔ اِس بات سے میں افسردہ ہو گیا، میں اُن کے انجام بدلنا چاہتا تھا۔ ...... کہانیوں کی تخلیق آسان کام نہیں تھا۔ جب اُنھیں الفاظ کا رُوپ دیا جاتا تو خیال کاغذ پر دُھندلا جاتا اور ناکامی خیالات و تصوّرات کا مقدر ٹھیرتی۔ پھر اُنھیں کیسے حیات بخشی جائے؟ خوش بختی سے ماہرین موجود تھے، اساتذہ تھے جن سے سیکھا اور جن کی تقلید کی جا سکتی تھی۔ فلابرٹ نے سکھایا کہ صلاحیت غیر تسلیم شدہ تنظیم اور طویل صبر و تحمل ہے۔ فاکنر نے موضوع کی قدر میں اضافہ کرنے اور اُسے خامیوں سے بچانے والی ہیئت -- لکھت اور بُنت کاری -- سکھائی۔ مارٹوریل، سروانتیس، ڈکنز، بالزیک، ٹالسٹائی، کونرڈ، تھامس مین نے سکھایا کہ وسعتِ خیال اور اولوالعزمی بھی اُسلُوب اور بیانیے کی ہنرمندی جتنی اہم ہے۔ ...... لکھنے کی طرح مطالعہ بھی زندگی کے ادھوریوں کے خلاف احتجاج ہے۔ ...... ہم فکشن کے بغیر بسر ہونے والی زندگی کی آزادی سے کم آشنا ہوں گے۔ ...... ادب صرف حسن کے خواب کو ہی ہمارے اندر سرایت نہیں کرتا

عمل کہ ہمہ نوع ظلم وستم سے آگاہی بھی دیتا ہے۔ اُنھیں پُوچھیے کہ اپنے خوف پر قابُو پانے کے لیے حکومتیں شہریوں پر پابندیاں کیوں عاید کرتی ہیں؟ ...... اِس لیے کہ وہ تخیلاتی کتابوں میں شتر بے مہار آزادی کے خطرات سے آشنا ہیں، آگاہ ہیں کہ تحریک آمیز فکشن قارئین تک رسائی پاتا ہے تو وہ اپنی اصل آزادی اور حقیقی زندگی کے خوف کا موازنہ کرتے ہیں۔ ...... مختلف النسل لوگوں کے درمیان ادب پُل کا کام کرتا ہے۔ ...... انسانوں میں بھائی چارہ قائم کرتے ہوئے سرحدوں کو مٹاتا ہے۔ ...... لڑکپن میں فرانسیسی ادب سے متاثر ہو کر میں نے پیرس جانے کا خواب دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں رہ کر اور اُس فضا میں سانس لے کر جس میں بالزیک، سٹینڈ ہال، بودلیئر اور پراؤسٹ سانس لیتے ہیں، سچا ادیب بن جاؤں گا۔ اگر میں پیرو نہ چھوڑتا تو محض اتوار اور چھٹی والے دِنوں کا فرضی نام والا لکھاری ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ میں فرانس اور فرانسیسی ثقافت کے ناقابلِ فراموش اسباق کا مقروض ہوں۔ ...... میں اُس زمانے میں فرانس میں رہا جب سارتر اور کامیو حیات تھے اور لکھ رہے تھے۔ ...... جب جدید اور قوی ادب نمو پا رہا تھا۔ ...... میں نے ستر کی دہائی میں ہسپانیہ میں بتائے پانچ برسوں میں ہسپانوی ثقافت، کتب، جدید خیالات اور فن کی اقدار و اقسام سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ...... ادب کی طرف لوٹتا ہوں۔ ...... بچپن میں میرے نانے، چاچے، مامے، خالو، اُن کے بیٹے بیٹیاں، میرے دوست اور میں مل کر نارزن اور سلگائی کی کہانیاں مکرر لکھا کرتے تھے۔ ...... لکھنا ہمارا خاندانی کھیل تھا، میرے لیے باعثِ کشش کھیل۔ میرے ابا مُدا کو پیارے ہو گئے۔ ...... اُسی روز گیارہ برس کی عمر میں، میری شخصیت یکسر بدل گئی۔ میری معصومیت کھو گئی اور میرے اندر تنہائی، تحکم، بلوغت اور ہراس نے بسیرا کر لیا۔ میری نجات مطالعے، اچھی کتابیں پڑھنے اور لفظوں میں پناہ لینے میں تھی۔ ...... فلابرٹ نے کہا تھا: ''لکھنا زندگی کا ایک طور ہے۔'' ہاں، یقیناً تخیل سے لکھنے کا ایک طور ...... ادب زندگی کی وہ جھوٹی تصویر ہے جو بہتر زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ...... حقیقی زندگی میں ہم پر ہونے والی ناہمواریوں اور پریشانیوں کی ادب تلافی کرتا ہے۔ ...... میں ہمیشہ اِس تصور پر متحیر رہا ہوں کہ قدیم زمانے میں ہمارے اجداد، جو حیوانوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے اور جنھیں صرف نئی نئی وجود میں آنے والی زبان کی برتری حاصل تھی، غاروں میں آگ کے گرد دائروں میں بیٹھ کر کہانیاں گھڑتے اور سُناتے تھے۔ وہی ہماری منزل کا فیصلہ کُن لمحہ تھا۔ کیوں کہ وہی دائرے تخیل اور کہانی کی بنیاد بنے، تہذیب کا آغاز ٹھیرے اور طویل سفر کے بعد ...... آج ہم ستاروں کے سفر پر ہیں۔ سمجھنے کی کوشش والا یہ عمل تحریر اور کہانیوں کے جنم سے مزید پھلا پُھولا۔ ...... فکشن تفریح سے بڑھ کر چیز ہے، ذہنی مشقت سے زیادہ احساسات کو مہمیز کرنے والی۔ ...... ادب کے بغیر دُنیا خواہشات، نظریات یا توقیر کی دُنیا نہیں ...... ادب انسان سے سچا انسان بناتا ہے، ہمارے پاس ناموجود شے کو پانے کی آس دِلاتا ہے؛ جو ہم نہیں وہ ہونے کی اُمید جگاتا ہے اور ناممکن کو ممکن میں بدلتا ہے۔ ......''

VVVV

چلّی کی دوشیزائیں
(The Chilean Girls)

وہ ایک نہایت شان دار موسمِ گرما تھا۔ پیریز پراڈو اور اُس کے بارہ پروفیسروں کا طائفہ میرافلورس[1] کے کلب ٹیراجاس اور لیما[2] کے لان ٹینس میں سالانہ تہوار کے رقصوں کو زندہ جاوید کرنے آیا تھا۔ پلازہ ڈی آکو میں مانبو[3] کی قومی چمپیئن شپ کا اہتمام کیا گیا تھا جو لیما کے بڑے پادری کارڈینل جوان گال برٹو گووریا کی دھمکی کے باوجود کہ، اُس میں حصہ لینے والے کیتھولک فرقے سے خارج ہوں گے، ایک بڑی کامیابی تھی۔ میرے علاقے نے، جو میرافلورس کے باریو الیگرے کے محلوں ڈیگو فیرے، جوان فیننگ اور کولون پر مشتمل تھا، اولمپک کے کچھ کھیلوں مثلاً فٹ بال کے چھوٹے میچوں، سائیکل دوڑ اور ریبرا کی کے مقابلوں میں سیلیے سان مارٹن کے علاقے کے مقابلے میں حصہ لیا اور بلاشبہ ہم جیتے۔

۱۹۵۰ء کے اُس موسمِ گرما میں غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ کوجی نوبالا ناس کو پہلی بار کسی لڑکی سے محبت ہوئی ...... سُرخ بالوں والی سیمینول[4] لڑکی سے ...... اور اُس لڑکی نے اُس کی محبت کا اقرار کر کے سارے میرافلورس کو تحیّر سے دوچار کر دیا۔ کوجی نوبا اپنا لنگڑا پن بھول گیا اور اُس کے بعد وہ سڑکوں پر چارلس اٹلس کی طرح سینہ پھلا کر چلنے لگا۔ ٹکو ٹیرا و نٹے کا تعلق اِلسے سے ٹوٹا اور وہ لوریٹا کی محبت میں ڈوب گیا۔ وِکٹر اوجیڈا نے اِلسے سے تعلق جوڑ کر اِنگے سے ختم کر لیا۔ جوان باریٹو اِنگے کی جھولی میں جا گرا اور اُس نے اِلسے کو چھوڑ دیا۔ ہمارے اردگرد اِس قدر جذباتی جوڑتوڑ ہوئے کہ ہم چکرا کر رہ گئے۔ لوگ محبتوں کا شکار ہوتے اور محبتوں سے نکلتے رہے۔ حتّٰی کہ جب وہ ہر ہفتے کی شب ہونے والی تقریبوں سے واپس جاتے تو جانے والے جوڑے آنے والے جوڑے نہیں ہوتے تھے۔ ''کیا واقعہ ہے!'' بات کا بتنگڑ بنانے والی میری پھوپھی نے کہا، جس کے ہمراہ میں اپنے والدین کی وفات کے بعد سے رہ رہا تھا۔

میرافلورس کے ساحل پر لہریں دوبار بنتی ہیں۔ پہلے دُور، ساحل سے دوصد میٹر کے فاصلے پر جہاں ہم جیسے بہادر بغیر تختے کے اُن پر تیرنے کے لیے جاتے تھے۔ وہ ہمیں ایک سو میٹر کے فاصلے پر اُس مقام پر لے جاتیں جہاں وہ دم توڑ کر بڑی اور شان دار لہروں میں بدل جاتیں جو دوبارہ دم توڑ دیتیں اور بدن کو بلبلے کی طرح نرمی سے ساحل کے چھوٹے چھوٹے گول پتھروں پر لے آتیں۔

اُس غیر معمولی موسمِ گرما کے دوران میں ہر شخص نے والٹز[5] کوری ڈوس[6] بلیوز[7] بولیرو[8] ہَوایرا چاس[9] بند کر دیے کیوں کہ مامبو نے اُن رقصوں کو نابود کر دیا تھا۔ اڑوس پڑوس کی تقریبوں میں مامبو..... بچّوں، بوڑھوں، جوانوں ...... سب پر اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اور رقص کرتے ہوئے ایک زلزلے کی طرح طاری ہو گیا تھا۔ یقیناً یہی کچھ میرا فلورس سے باہر، ہماری دُنیا اور زندگی سے دُور، لنس، بریٖنا، کوری لوس حتّٰی کہ زیادہ گہما گہمی سے بھرے علاقوں لاوکٹوریا، مرکزی شہر لیما، ریمک اور اَل پورویٖنر میں بھی ہو رہا تھا جہاں ہم میرا فلورس والوں نے کبھی قدم رکھا نہ کبھی قدم رکھنے کے بارے میں سوچا تھا۔

جس طرح ہم والٹز ہَوایرا چاس، سمبا[10] اور پولکا[11] سے مامبو کی طرف گئے تھے اِسی طرح ہم نے پہیوں والے جوتوں اور سکوٹروں سے بائی سائیکلوں اور کچھ نے تو، مثلاً ٹیٹومو نجے اور ٹونی اسپیچو نے موٹر سکوٹروں اور علاقے کے نوجوان لیوچن جیسے ایک دو نے تو کار تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ کبھی کبھار اپنے والد کی کورٹیبل شیورلیٹ کار چوری چھپے اُڑا لیتا اور ہمیں ساحل کے ساتھ ٹیرا جاس سے آرمینڈ ارز کی جھیل تک ایک سو کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سیر پر لے جاتا۔

لیکن اُس موسمِ گرما کا سب سے اہم واقعہ دُور دراز واقع سرزمین چلی سے دو بہنوں کی آمد تھی جن کے دھماکا خیز ظہور اور ناقابلِ خطا پذیر اندازِ گفتگو نے، جو بہت تیز تھا کہ وہ لفظ کا آخری حرف ہضم کر جاتیں اور اپنے جملے فجائیہ انداز میں ختم کرتیں جو پیو (pue) جیسی آواز دیتے، میرا فلورس کے اُن تمام لڑکوں کو چت کر دیا جنھوں نے حال ہی میں نِکّھے چھوڑ کر لمبے والے پائجامے پہننا شروع کیے تھے اور میں اُن سب سے زیادہ چت ہوا تھا۔

چھوٹے والی بڑی جیسی دِکھتی تھی اور بڑے والی چھوٹی جیسی۔ بڑی کا نام للّی تھا۔ وہ قامت میں لُوسی سے ذرا کم تھی جو اُس سے ایک برس چھوٹی تھی۔ للّی چودہ پندرہ کے سِن سے اور لُوسی تیرہ چودہ سے زیادہ کی نہیں تھی۔ شاید "دھماکا خیز" کا اِسم صفت اُن ہی کے لیے ایجاد ہوا تھا۔ اگرچہ لُوسی بھی دھماکا خیز تھی لیکن اپنی بہن جتنی نہیں۔ جس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ اُس کے بال چھوٹے اور للّی جتنے سنہری نہیں تھے بل کہ اِس بنا پر بھی کہ للّی زیادہ مختصر لباس پہنتی تھی اور اِس بنا پر بھی کہ وہ زیادہ خاموش طبع تھی اور بہ وقتِ رقص وہ اپنے بدن اور کمر کو اِس قدر دلیری سے بَل دیتی کہ جس کی میرا فلورس کی لڑکیوں میں جرأت نہیں تھی۔ اُس کے بدن کے نشیب و فراز، حتّٰی کہ سارا بدن تیزی سے گھومتے ہوئے لٹّو کی طرح بے رنگ ہو جاتا تھا، وہ ہَوا کی لپیٹ میں آیا ہوا شعلہ بن جاتی اور جب گانے خودکار طریقے سے تبدیل ہونے والے ریکارڈر پر لگائے جاتے تو اُس کا غیر مرئی پن تسلسل برقرار رہتا، مامبو ظہور پذیر ہوتا اور ہم سب رقصاں ہو جاتے۔

لِلی لطیف آہنگ اور نہایت پُروقار انداز میں رقص کرتی۔ اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ سجی ہوتی اور وہ آہستگی سے گیت کے بول گنگناتے ہوئے اپنے ہاتھ اُٹھاتی، گھٹنے عریاں کرتی اور کندھوں کو اِس طرح تھرکاتی کہ پُورا بدن، جس سے اُس کا سکرٹ اور انگیا بے حیائی سے تہہ در تہہ لپٹے ہوتے تھے، ہلنے اور تھرکنے لگتا۔ چوٹی سے پیر تک اُس کا انگ انگ رقصاں ہوتا۔ اُس کے ساتھ مامبو رقص کرنا ہمیشہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا کیوں کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس کا ہمراہی رقاص اُس کا ساتھ دے پاتا اور مجنونانہ انداز میں پھلانگیں بھرتی اُس کی ٹانگوں کے عفریتی گرداب میں پھنس نہ جاتا؟ ناممکن! آپ اِس بات سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود آغاز ہی میں اُس سے پیچھے رہ جاتے کہ تمام جوڑوں کی نگاہیں لِلی کے مامبوئی کارناموں پر مرتکز ہیں۔ "کیا لڑکی ہے!" میری پھوپھی البرٹا ناگواری سے کہتیں۔ "ٹانگولیلے کے مانند ناچتی ہے۔ میکسیکو کی فلم میں رَمبا[۱۲] ناچنے والی کی طرح۔" وہ اپنے آپ کو خود ہی جواب دیتیں۔ "خوب، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ چِلی کی ہے اور اُس ملک میں عزت بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔"

میں ایک بچھڑے[۱۳] کی طرح لِلی کی محبت کا اسیر ہو گیا جو محبت میں شکار ہونے کا انتہائی رومانوی طریقہ ہے...... اِسے "سورج کا بخار چڑھ جانا" بھی کہتے ہیں۔"......اور اُسی ناقابلِ فراموش گرما میں، مَیں تین بار اُس کے سامنے چِت ہوا۔ پہلی مرتبہ میرا فلورس کے پارک سینٹرل (Parque Central) میں واقع سینما گھر ریکارڈو پاما کی بالائی بالکونی میں اتوار کے روز فلم کے دوران اور اُس نے مجھے نہ کر دی کہ وہ ابھی محبوب رکھنے کے لیے بہت کم عمر ہے۔ دوسری بار پارک سالازار (Parque Salazar) میں اُس گرما میں پہیوں والے جوتوں سے پھسلنے کے لیے کھلنے والے فرشی میدان میں اور اُس نے مجھے پھر کہا کہ نہیں، وہ اِس بارے میں سوچے گی کیوں کہ چاہے وہ مجھے تھوڑا بہت پسند کرتی ہے لیکن اُس کے والدین نے اُسے ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے چوتھے سال کی تعلیم ختم ہونے سے پہلے لڑکا دوست (بوائے فرینڈ) نہیں بنائے گی اور وہ ابھی تیسرے سال میں ہے۔ آخری مرتبہ اُس آفت کے نازل ہونے سے چند روز قبل شاہراہِ لارکو پر کریم ریکا میں جب ہم ونیلا ملک شیک پی رہے تھے اور بلاشبہ اُس نے کہا: نہیں کہ وہ ہاں کیوں کرے جب کہ ہم جس طور ساتھ چل رہے تھے وہ مستحکم ساتھ تھا۔ کیا ہم مارنا[۱۴] پر اکٹھے نہیں ہوتے جہاں ہم "سچائی" یا "جرأت" والے گیت گاتے ہیں؟ کیا ہم میرا فلورس کے ساحل پر اکٹھے نہیں بیٹھتے؟ کیا وہ محفلوں میں دُوسروں کی نسبت میرے ساتھ زیادہ رقص نہیں کرتی؟ پھر وہ مجھے رسماً ہاں کیوں کہے جب کہ سارا میرا فلورس پہلے ہی جانتا ہے کہ ہمارے تعلّقات پختہ ہیں؟ تشہیری ماڈل جیسی نگاہوں، شرارتی آنکھوں، بھرے بھرے ہونٹوں اور چھوٹے دہانے والی لِلی مجسمۂ نازو ادا تھی۔

"مجھے تمھاری ہر چیز پسند ہے۔" میں اُسے کہتا۔ "لیکن مجھے سب سے زیادہ تمھارا اندازِ گفتگو

پسند ہے۔''وہ اپنے اُتار چڑھاؤ اور موسیقیت کی وجہ سے شوخ و چنچل اور سچا انداز تھا جو پیرو کی دوشیزاؤں سے بہت مختلف تھا اور اس وجہ سے بھی کہ خاص تاثرات، الفاظ اور جملے جولڑکوں کو یہ سمجھنے کی کوشش کرنے کے لیے اندھیرے میں چھوڑ دیتے تھے کہ اُن کا مفہوم کیا ہے یا اُن میں محض مذاق پنہاں ہے۔ لِلی زیادہ تر وقت ذومعنی باتیں کرنے، پہلیاں بجھوانے یا ایسے ہلکے پھلکے جنسی لطائف سُنانے میں صرف کرتی جو وہاں کی لڑکیوں کے چہرے، حیا سے سُرخ کر ڈالتے۔''وہ نوخیز لڑکیاں خوف ناک ہیں۔'' میری پھوپھی البرٹا نے ہائی سکول کی اُستانی کی طرح اپنے چشمے کو بار بار اُتارتے اور لگاتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ دونوں اجنبی لڑکیاں میرا فلورس کا اخلاق تباہ و برباد کر کے چھوڑیں گی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے اِبتدائی برسوں میں میرا فلورس میں فلک بوس عمارتیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔بس ایک...... زیادہ سے زیادہ دومنزلہ مکانات......اور جرنیم[5] پوائن شیاناس[6] لارل[7] بوگن ولا[8] والے باغ، باغیچے اور برآمدے جن پر ہنی سکل[9] یا آئیوی[10] کی چڑھی ہوئی بیلیں اور جن میں پڑی ہوئی جھولنے والی کرسیاں، جن پر اہلِ علاقہ رات کے پڑنے کا انتظار کرتے، گپیں ہانکتے یا چنبیلی کی خوشبو اپنے اندر اُتارتے رہتے۔کچھ پارکوں میں ببیا کے خاردار درخت تھے، جن پر سُرخ اور گلابی پھول لگتے تھے۔سیدھی اور صاف ستھری سڑکوں کے فٹ پاتھوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی کے سُرخ پھولوں والے پودوں، جیکارانڈا اور توت کے درختوں کی قطاریں جو باغوں کے پھولوں اور پیلے رنگ کے ڈی اونوفرائیو آئس کریم کے چھوٹے چھوٹے ٹرکوں کے ساتھ مل کر عجب بہار دیتی تھیں۔ٹرکوں کے ڈرائیور دُھواں نُما سفید وردیاں اور چھوٹی ٹوپیاں پہنتے تھے۔وہ رات دِن ٹرکوں کو گلیوں میں دوڑاتے اپنی موجودگی کا اعلان بھونپو کے ذریعے کرتے جن کی دِھیمی گونج مجھ پر زمانۂ قدیم کے بھونپو، ماقبل تاریخ کی ایک یادگار کی طرح مجھ پر اثر کرتی تھی۔اُس میرا فلورس کے پنچھیوں کی چہچہاہٹیں اب بھی آتی ہیں جس میں لوگ، جب اُن کی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچتیں تو صنوبر کی ایک شاخ کاٹ دیتے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ بچاریاں میری پھوپھی البرٹا کے مانند کنواری بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتیں۔

لِلی نے کبھی ہاں نہیں کی لیکن حقیقت یہ ہے اُس رسمی ہاں کے علاوہ ہم ہر معاملے میں متحکم لگتے تھے۔ہم ریکارڈو پاپا، دی لیورو، مونٹی کارلو اور کولینا میں فلم دیکھتے ہوئے ایک دُوسرے کے ہاتھ تھام لیتے اور اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جھروکے کے اندھیرے میں ہم بھی بڑی عمر کے دُوسرے جوڑوں کی طرح سب کچھ کرتے...... سب کچھ کرنا ایک اصطلاح تھی جس میں ایک سادہ چُمّی سے لے کر گہرے بوس و کنار تک شامل تھے، جسے گناہ تصور کرتے ہوئے، آنے والے جمعے کو پادری کے سامنے اس کا اعتراف کرنا پڑتا تھا......تاہم لِلی نے مجھے اپنے گال، کانوں کی لَوؤں، مُنہ کے کناروں سے بوسہ لینے دیا اور بعض اوقات، محض ایک سیکنڈ کے لیے، وہ اپنے لب میرے ہونٹوں سے چھواتی اور پھر گہری سنجیدگی

کے تاثرات سے مُنھ پرے ہٹاتی: ''نہیں، نہیں۔ بالکل بھی نہیں، سلم۔'' میرے محلّے کے میرے دوست میرا مذاق اُڑاتے: ''تم ایک بچھڑے کی طرح ہو۔ تم نیلے پڑ رہے ہو، سلم۔ یہ بے لذّت تعلّق تمھیں گھلاتا جا رہا ہے، سلم۔'' اُنھوں نے کبھی مجھے میرے اصل نام سے نہیں بلایا تھا...... ریکارڈو سومو کرشیو...... بل کہ وہ ہمیشہ مجھے میری عرفیت سے پکارتے تھے۔ وہ قطعاً مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے تھے: میں للّی کے لیے اتنا ہی پُرجوش تھا کہ میں آگ میں جل رہا تھا۔

اُس گرما کو للّی کی وجہ سے میری اپنے بہترین دوست لُوقوین سے ہاتھا پائی ہو گئی۔ مِل بیٹھنے کی اُن تقریبوں میں سے ایک میں علاقے کے لڑکیاں اور لڑکے کولون اور ڈیا گو فیرے کے نکڑ پر جمع ہوے۔ چا کالٹاناس کے باغ میں لُوقوین نے، جو ہوشیار بننے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک کہا کہ چلّی والیاں گھٹیا ہیں کیوں کہ اُن کے بالوں کا رنگ اصل نہیں بل کہ وہ اپنے بال رنگتی ہیں اور یہ کہ میرا فلورس میں میری پیٹھ پیچھے لوگ اُنھیں جھوٹا کہتے ہیں۔ میں نے ایک گھونسا سیدھا، اُس کی ٹھوڑی پر رسید کیا اور دُوسرا اُس کے جبڑے پر۔ ایک ہفتے تک ہماری بول چال بند رہی تا آں کہ اگلی محفل میں لڑکوں اور لڑکیوں نے ہماری صلح کروا دی۔

ہر سہ پہر کو للّی کو پارک سالا زار کی نکڑ پر جانا پسند تھا۔ وہاں صنوبر کے درخت، یاسمین اور گھنٹی جیسے پھولوں کا خود رو جھاڑ جھنکار اُگا ہوا تھا۔ اینٹوں کی دیوار سے ہم خلیج لیما کا یُوں جائزہ لیتے جیسے بحری جہاز کا کپتان عرشے سے سمندر کا بغور جائزہ لیتا ہے۔ اگر آسمان صاف ہوتا تو...... اور میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اُس سارے موسمِ گرما کے دوران میں آسمان بے ابر رہا تھا اور میرا فلورس میں ہر روز سُورج چمکتا رہا تھا...... پس منظر میں اُفق پر بحرالکاہل کے پانیوں میں ڈُوبتی اور آگ کی لپٹیں چھوڑتی ہوئی، سُرخ رکابی سے، چکا چوند اور خیرہ کُن کرنیں نکلتی دِکھائی دیتی تھیں۔ للّی کے چہرے پر ویسا ہی جوش ہوتا جیسا پارک سینٹرل کے گرجا گھر میں مصلوب عیسٰی کے تہوار کے موقع پر کھاتے پیتے ہوئے، اُس کے چہرے پر آ جاتا تھا۔ اُس کی نگاہیں آتشی گولے پر مرتکز ہو کر اُس لمحے کی منتظر ہوتیں جب سمندر آخری کرن کو بھی نگل لیتا اور تب قبولیت والی دُعا کی جا سکتی۔ میری بھی ایک دُعا تھی، جس کے بارے میں مجھے مکمل یقین نہیں تھا کہ وہ پُوری ہوگی۔ ہمیشہ سے ایک ہی دُعا: بلاشبہ یہی کہ وہ کبھی تو ہاں کہہ دے، کہہ دے کہ ہم ایک ساتھ رہیں گے، سب کچھ کریں گے، ایک دُوسرے سے محبت کریں گے، منگنی اور شادی کر کے پیرس میں متمول اور خوش حال زندگی بسر کریں گے۔

شعور کی عمر کو پہنچتے ہی میں نے پیرس میں قیام پذیر ہونے کا خواب دیکھا تھا جس کے ذمہ دار غالباً، میرے والد، پال فیول، جُولز وَرنے، الیگزینڈر ڈیوماس اور بہت سی کتابیں تھیں جو اُنھوں نے مجھے اُس حادثے میں اپنی وفات سے قبل پڑھنے کے لیے دی تھیں جنھوں نے مجھے یتیم کر دیا تھا۔ اُن

ناولوں نے میرے دماغ میں مہم جوئیوں کو بھر دیا تھا اور مجھے یقین دِلا دیا تھا کہ فرانس میں زندگی ہر چیز اور ہر جگہ سے زیادہ اچھی، خُوش حال اور زیادہ خُوب صُورت ہے۔ اِسی لیے میں نے اپنی پھوپھی البرٹا کو رضامند کر لیا تھا کہ وہ مجھے شاہراہِ وِلسن پر الائنس فرانسیسی میں داخلہ لے دیں تاکہ میں انسٹیٹیوٹ بیرونا رتھ امریکا میں اپنی انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہفتے میں تین روز وہاں جا کر فرانسیسی زبان سیکھ سکوں۔ اگر چہ میرا محلّے کے لڑکوں کے ساتھ اچھا وقت گزرتا تھا لیکن حقیقتاً میں ایک کتابی کیڑا تھا۔ میں نے ہمیشہ اچھے درجے حاصل کیے تھے اور مجھے زبانوں سے محبت تھی۔

جب بھی میری جیب اجازت دیتی میں لِلی کو ٹائینڈ ےسٹا بلانکا میں چائے کی دعوت دے دیتا...... یہ کہنا درست ہو گا کہ دوپہر کے کھانے پر بُلانے کا اُس وقت تک رواج نہیں آیا تھا...... ٹائینڈ ےسٹا بلانکا کی پیشانی برف جیسی سفید تھی اور اُس کی چھوٹی میزیں اور چھتریاں سڑک کے کنارے پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کی مخملیں عربیئن نائٹس جیسی ہوتی تھیں ......برف لگی ہنڈیاں! دُودھ اور انڈوں کی جیلی سے بھرے بادام اور شہد کے کیک! بالائی کی تہہ! ......وہ لارکو، ایرے کیوبا کی شاہراہوں اور ایلا میڈا ریکارڈو پاما میں گھرا ہوا تھا۔ اُس پر تُوت کے طویل القامت درخت سایہ فگن رہتے تھے۔

لِلی کی قربت میں، ٹائینڈ ےسٹا آئس کریم اور پیسٹری کا ٹکڑا، کھانے جانا، اُس کی بہن لُوسی کی موجودگی سے بے کیف پڑ جاتا تھا کیوں کہ ہم جب بھی باہر جاتے، مجھے اُسے بھی ساتھ گھسیٹنا پڑتا۔ وہ کباب میں ہڈّی بنتے ہوئے ذرا بھی نہ ہچکچاتی، میرے سب کچھ کرنے میں وِلین ہوتی، مجھے لِلی سے تنہائی میں بات کرنے سے باز رکھتی اور مجھے اپنے تمام خُوب صُورت خواب، لِلی کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے بتانا پڑتے لیکن اِس پر بھی ہم بہت سی باتیں نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ لُوسی قریب ہی ہوتی تھی۔ اُس کی قربت، سر گھمانے پر، اُس کی گھنگھریالی زلفوں کا رقص اور اُس کی شہد کے گہرے رنگ جیسی آنکھوں کی شوخی کا نظارہ کرنا، اُس کی مخصوص لہجے میں باتیں سننا اور بعض لاپروا لمحوں میں اُس کے چست بلاؤز کے کھلے گریبان سے جھلکارے مارتے گول گول چھوٹے پستانوں کی بالائی گولائیوں اور کچے انگور جیسی سخت بھٹنیوں کی جھلکیاں انمول تھیں۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میں تم دونوں کے بیچ کباب میں ہڈّی کیوں بنی ہوئی ہوں۔'' کبھی کبھار لُوسی معذرت خواہانہ لہجے میں کہتی۔ میں اُس سے جھوٹ بولتا۔ ''کیا خیال ہے! ہم تمھاری رفاقت سے خُوش ہیں۔ کیا ہم خُوش نہیں ہیں، لِلی؟'' لِلی اپنی آنکھوں میں شرارت لیے قہقہہ لگاتی اور پکار اُٹھتی۔

''یقیناً، یووووو......''

دونوں طرف سے مکانوں میں گھری، شاہراہِ پارڈو پر، جہاں سفید وردیوں میں ملبوس باغوں اور برآمدوں میں دوڑتے بھاگتے لڑکوں اور لڑکیوں کی دیکھ بھال آیائیں کر رہی ہوتی تھیں، چہچہاتے

پرندوں سے بھرے تُوت کے درختوں کے سائے تلے چہل قدمی کرنا اُس موسمِ گرما کی روایت تھی۔ چُوں کہ لُوسی کی موجودگی نے میرے لیے لِلّی سے، اُن معاملات پر بات کرنا دشوار کر رکھا تھا، جن پر میں اُس سے گفتگو کرنے کا تمنائی تھا لہٰذا میں اِدھر اُدھر کے فضول موضوعات پر باتیں کرتا رہتا مثلاً مستقبل کے منصوبے کہ میں قانون کی ڈگری لینے کے بعد پیرس میں سفارتی آسامی پر بھرتی ہو جاؤں گا...... کیوں کہ وہاں، پیرس میں، زندگی زندگی ہے؛ فرانس ثقافت کا گہوارہ ہے...... یا پھر پیرو کی اپنی غریب عوام کو دوبارہ خوش حال اور عظیم بنانے کے لیے شاید سیاست دان بن جاؤں، جس کا مطلب تھا کہ میں اپنا یورپ کا سفر کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دوں۔ اُن کا کیا ارادہ تھا؟ وہ بڑی ہو کر کیا بننا اور کرنا پسند کریں گی؟ حساس لُوسی کے نپے تلے مقاصد تھے: ''سب سے پہلے سکول کی تعلیم ختم کروں گی۔ پھر ایک اچھی سی ملازمت حاصل کروں گی۔ شاید موسیقی کی کسی دُکان پر، جو بہت بڑی تفریح ہو گی۔'' لِلّی کسی ٹریول ایجنسی کے بارے میں سوچتی تھی یا پھر، اگر وہ اپنے والدین کو رضامند کر سکی تو، فضائی میزبان بنے گی۔ اِس طرح وہ پُوری دُنیا کی سیر کرتی پھرے گی۔ یا شاید ایک فلمی ستارہ لیکن وہ کبھی بیرا کی کے مختصر لباس میں تصویر نہیں بنوائے گی۔ سفر، سفر، ہر ملک کا سفر اُسے ہر کام سے زیادہ عزیز تھا۔ ''خوب، تم پہلے ہی کم از کم دو ملک تو دیکھ ہی چکی ہو، چِلّی اور پیرو۔ اب تم اَور کیا چاہتی ہو؟'' میں کہتا۔ ''مجھے دیکھو، میں کبھی میرا فلورس سے باہر نہیں گیا۔''

لِلّی سانتیا گو کے بارے میں جو کچھ بتاتی تھی وہ سب مجھے پیرس کی فردوسِ بریں دِکھائی دیتا تھا۔ میں اُس کی باتیں بے حد رشک و حسد کے ساتھ سُنتا! یہاں کی طرح اُس شہر میں لوگ غریب ہیں نہ گلیوں میں بھکاری پائے جاتے ہیں۔ والدین لڑکوں اور لڑکیوں کو صبح ہونے تک تقریبات میں رہنے اور مُنھ سے مُنھ جوڑ کر رقص کرنے دیتے ہیں اور یہاں کے برعکس ماؤں، خالاؤں اور چچیوں جیسی بُوڑھیا ئیں رقص کرتے ہوئے نوجوانوں کی جاسوسی نہیں کرتیں کہ اگر وہ حد پار کر جائیں تو اُنھیں ڈانٹ ڈپٹ یا لعن طعن کریں۔ چِلّی میں لڑکوں اور لڑکیوں کو بالغوں کی فلمیں دیکھنے کی اجازت ہوتی تھی، وہ سرِ عام تمباکو نوشی کرتے تھے۔ لیما کی نسبت وہاں زیادہ فلمیں، سرکس، تھیٹر، کھیل اور سازندوں کے ساتھ محفلیں، برف پر پھسلنے، پیٹ کا رقص کرنے کے کھیل تماشے منعقد ہوتے تھے اور موسیقی کی کمپنیاں سانتیا گو میں ریاست ہائے متحدہ امریکا سے آتی رہتیں اور چِلّی کے لوگ خواہ کچھ بھی کام کرتے لیکن وہ پیرو والوں سے دو تین گُنا زیادہ کماتے تھے۔

اگر یہ سب کچھ درست تھا تو چِلّی کی دوشیزاؤں کے والدین اُس عظیم الشان ملک کو چھوڑ کر پیرو کیوں آئے تھے؟ پہلی نظر میں یہی دِکھائی دیتا تھا کہ وہ دولت مند نہیں بل کہ نہایت غریب تھے۔ وہ بار یوالیگرے کے لڑکوں اور لڑکیوں جیسی زندگی بسر نہیں کر رہے تھے جن کے گھروں میں بٹلر، باورچی،

خادمائیں اور مالی تھے بل کہ وہ گامبر لینس ریستوران کے قریب کالے ایسپر انز پر ایک تنگ سہ منزلہ عمارت کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھے۔ مستقبل قریب کے برعکس جب بلند عمارتیں سر اُٹھانے لگیں اور چھوٹے چھوٹے مکانات غائب ہو گئے تھے اُس زمانے میں میرا فلورس میں صرف غریب لوگ ہی اپارٹمنٹوں میں رہتے تھے جو انسانوں کی غیر اہم نسل تھے...... آہ، کتنے افسوس کی بات ہے...... چلّی کی دوشیزاؤں کا تعلق بھی اُسی طبقے سے لگتا تھا۔

میں اُن کے والدین سے کبھی نہیں ملا۔ وہ کبھی مجھے یا کسی لڑکی یا لڑکے کو اپنے گھر نہیں لے کر گئیں۔ اُنھوں نے کبھی سالگرہ نہیں منائی یا کوئی اور تقریب منعقد نہیں کی اور نہ ہی کبھی ہمیں چائے پر یا کھیلنے کے لیے بُلایا جیسے وہ ہمیں اپنی عسرت زدہ رہائش گاہ دِکھاتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتی ہوں۔ اِس حقیقت کے باوجود کہ وہ غریب ہیں اور اپنی بے سروسامانی سے پریشان ہیں، میرے دِل میں اُن کے لیے ترس اور ہمدردی کے جذبات کے بجائے، اُن کی غربت اور بے سروسامانی نے چلّی کی دوشیزہ کے لیے میری محبت میں اضافہ کر دیا اور مجھے بے غرضانہ منصوبوں کی ترغیب دی: ''جب میری اور للّی کی شادی ہو جائے گی تو ہم اُس کے تمام خاندان کو لا کر اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔''

لیکن میرے میرا فلورس کے دوست، خاص طور پر لڑکیاں شکوک و شبہات کا شکار تھیں کہ لُوسی اور للّی، ہم پر، اپنے گھر کے دروازے کبھی نہیں کھولیں گی۔ ''کیا وہ اِتنی ہی بھوکی ہیں کہ ایک تقریب کا اہتمام بھی نہیں کر سکتیں؟'' اُنھوں نے پُوچھا۔ ''شاید اس کی وجہ اُن کی غربت نہ ہو بل کہ کنجوسی ہو۔'' ٹکو تراوانتے نے کہا جو ہمیشہ معاملات سدھارنے کی کوشش میں، اُنھیں زیادہ بگاڑ دیا کرتا تھا۔

علاقے کے لڑکے لڑکیوں نے اچانک ہی چلّی والیوں کو اُن کے میک اپ اور پہناووں کی بنا پر بُرا بھلا کہنا اور اُن کے پاس لباسوں کی کمی کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا...... ہمیں اُن کے سکرٹ، بلاؤز اور سینڈل حفظ ہو گئے تھے جن سے اُنھوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ اِس حقیقت کو چھپا لیں کہ اُن کے پاس وہ چیزیں بہت کم تعداد میں ہیں...... اور میرے اندر ناراضگی کے جذبات درست طور پر اُبھر جاتے۔ میں یہ کہہ کر اُن کا دفاع کرتا کہ یہ گفتگو محض حسد کی وجہ سے ہے، شدید حسد، زہر بھرا حسد کیوں کہ چلّی والیوں نے کبھی رقص کے لیے نہیں کہا تھا جب کہ تمام لڑکے اُن کے ساتھ رقص کرنے کے لیے قطار بنا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ''وہ اُنھیں دھتکار دیتی ہیں۔ بلاشبہ وہ رقص کے لیے نہیں کہتیں۔'' لورا نے جواب دیا...... یا اِس لیے کہ اجتماعوں میں، کھیلوں میں، ساحل پر اور پارک سالا زار میں وہ ہمیشہ مرکزِ نگاہ رہتی تھیں اور تمام لڑکے اُن کے گرد جھمگھٹا ڈالے رہتے تھے جب کہ دُوسری لڑکیاں...... ''وہ محض دِکھاوے اور عریانی کا مظہر ہیں اور تم لڑکوں نے ہمیشہ اُنھیں ایسے بے ہودہ لطائف سُنائے ہیں جن کو ہم نے تمھیں ہمیں سُنانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔'' ٹیرا سا نے جوابی حملہ کیا...... اور حتماً، کیوں کہ چلّی والیاں

جاذبِ نظر، جدید اور ہوشیار لیکن ہماری لڑکیاں مغرور، پسماندہ، پُرانے فیشنوں والی، تنگ نظر اور متعصب تھیں۔'' اور ہمیں اِس پر فخر ہے۔'' اِلسے ہمارا مذاق اُڑاتے ہوئے بولی۔

اگرچہ وہ اُن کی چغلیاں کھاتی تھیں پھر بھی باریوالنگرے کی لڑکیوں نے اُنھیں محفلوں میں مدعو کرنا اور گروہ کی صُورت میں اُن کے ہمراہ میرافلورس کے ساحل پر جانا، اتوار کی اتوار دوپہر بارہ بجے کا کھانا اکٹھے کھانا، سینما جانا اور مُنھ اندھیرے سے لے کر صبح کا تارہ طلوع ہونے تک کی سیر کو برقرار رکھا۔ صبح کا ستارہ جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اُس موسمِ گرما میں وِولیما کے آسمان پر ایک روز بھی بادلوں میں چھپے بغیر جگمگاتا رہا تھا۔ ایسا واقعہ اُس شہر میں ہر چار پانچ برس بعد وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ صبح خیزی اِس لیے کرتی تھیں کہ ہم لڑکے بھی یہی چاہتے تھے اور اِس لیے بھی کہ میرافلورس کی لڑکیاں حقیقتاً چِلّی کی دوشیزاؤں سے اِس طرح سحر زدہ تھیں جیسے نگلے جانے سے قبل پرندہ کوبرا سے، پاکباز گُناہ گار سے اور فرشتہ شیطان سے سحر زدہ ہوتا ہے۔ وہ دُور دراز کی سرزمین چِلّی سے تعلّق رکھنے والی اُن پردیسی لڑکیوں سے حسد کرتی تھیں کیوں کہ وہ اُن کی طرح ہر جگہ نہیں جاتی تھیں، وہ ذرا سی دیر کے لیے بھی بلا اجازت رات گئے تک چہل قدمی یا رقص کے لیے گھر سے باہر نہیں رُک سکتی تھیں اور اپنے ماں باپ یا بڑی بہن یا پھوپھی، خالہ، چچی، ممانی کی ہمراہی کے بغیر کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے اُن پر کھڑکی سے نظر رکھیں کہ وہ کس کی ہم رقص ہیں اور کیسے یا اُنھیں نصف شب کے بعد گھر لے جائیں کہ وہ وقت ایک شریف لڑکی کے لیے رقص یا گلی میں مردوں سے باتیں کرنے کے لیے مناسب نہیں ہوتا...... کہ وہ سب دِکھلاوا کرنے والی، گھٹیا اور دوغلی نسل کی لڑکیاں کرتی تھیں...... بل کہ وہ اپنے گھروں میں، اپنے بستروں پر فرشتوں کے خواب دیکھیں۔ وہ حسد کا شکار تھیں کیوں کہ چِلّی والیاں بہت آزاد اور آرام دہ حالت میں تھیں اور وہ اِس بات سے بے پرواہ ہو کر آزاد خیالی سے رقص کرتی تھیں کہ اُن کے گھٹنے عریاں ہیں۔ وہ اپنے کندھے، چھوٹے چھوٹے پستان اور گولے یُوں مٹکاتی تھیں کہ میرافلورس کی کوئی لڑکی اُن کی طرح نہیں کرتی تھی اور غالباً لڑکوں کو آزادی دینے کا تو وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن اگر لِلّی یا لُوسی اِتنی ہی آزاد تھیں تو وہ ایک پکّا دوست لڑکا کیوں چاہتی تھیں؟ اُنھوں نے ہم سب محبت کا شکار ہونے والوں کو رد کیوں کر دیا تھا؟ لِلّی نے صرف مجھے ہی ہاں نہیں کی تھی بل کہ اُس نے لالو مَوفیو اور پچو کلاکس اور لُوسی نے لوزَ، پے پے کانیپا اور نوبالغ جولیو بائن ویمنیڈا کو بھی انکار کر دیا تھا جو میرافلورس کا پہلا لڑکا تھا جس کے والدین نے اُس کی ہائی سکول کی تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی پندرھویں سالگرہ پر اُسے والکس ویگن تحفے میں دے دی تھی۔ چِلّی کی دوشیزائیں، جو بہت آزاد تھیں، کیوں ایک دوست لڑکا نہیں چاہتی تھیں؟

لِلّی اور لُوسی کے بارے میں یہ اور اِس جیسے دُوسرے اَسرار غیر متوقع طور پر اُس یادگار موسمِ

گرما کے آخری روز ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء کو چھوٹی فربہ سو رنی میری روزا اَلواریز کالڈیرن کی دی ہوئی دعوت میں کھل گئے ۔ وہ ایک ایسی محفل تھی جو عہد ساز اور اُس میں شریک ہر شخص کے لیے نا قابلِ فراموش ہے ۔ ۲۸۔ جُولیو اور لا پاز کے نکڑ پر واقع اَلواریز کالڈیرن کا گھر میرا فلورس مل کہ شاید پیرو کا خوب صورت ترین گھر تھا جس میں طویل القامت درختوں ، ہمہ قسم کے پھولوں ، طرح طرح کی بیلوں ، گلاب کے پودوں والا باغ اور نیلی ٹائیلوں والا بیرا کی کا تالاب تھا ۔ میرا فلورس کی تقریبات میں ہمیشہ سازندے اور شرکا کی خدمت کے لیے بڑی تعداد میں بیرے ، بھرے ہوئے توس ، سینڈوچ ، جُوس اور ہمہ قسم کے بغیر الکوحل والے مشروبات موجود ہوتے تھے ۔ وہ ایسی محفلیں ہوتی تھیں جن کے مہمان سمجھتے تھے جیسے وہ جنت میں آ گئے ہوں ۔ ہر چیز بالکل ٹھیک چل رہی تھی کہ بتیاں بجھتے ہی میرا فلورس کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے ہجوم نے گانا شروع کر دیا : "سالگرہ مبارک ۔" اور اُس نے کیک پر لگی پندرہ موم بتیاں بجھا دیں ۔ ہم سب نے اُس سے گلے مل کر اُسے مبارک باد دینے کے لیے قطار بنائی ۔

جب للی اور لُوسی کی گلے ملنے کی باری آئی تو میری روزا نے ، جو ایک خوش باش چھوٹی سی موٹی سو رنی تھی اور جس کی چربی کی تہیں اُس کے گلابی لباس سے اُس کی پشت کی گولائی سے باہر نکلی ہوئی تھیں ، اُن کے گالوں پر بوسہ دیا اور اپنی آنکھیں پھیلا لیں : "تم چلی والی ہو ، ہے نا ؟ میں تمھیں اپنی خالہ اَڈریانا سے ملواتی ہوں ۔ وہ بھی چلی میں رہتی ہیں ۔ وہ حال ہی میں سانتیاگو سے آئی ہیں ۔ آؤ ، آؤ ۔"

اُس نے ، اُن کے ہاتھ پکڑے اور پکارتی ہوئی ، اُنھیں گھر کے اندر لے گئی ۔ "خالہ اَڈریانا ، خالہ اَڈریانا ، میرے پاس تمھارے لیے ایک حیرت انگیز چیز ہے ۔"

کھڑکی کے ضخیم شیشے سے ایک منوّر مستطیل دیکھی جا سکتی تھی ، جس میں آتش دان ، آرام کرسیاں ، سوفے ، قالین ، قدرتی مناظر والی تصاویر اور شخصی خاکے لگی دیواریں اور ہاتھوں میں گلاس پکڑے ، درجن بھر مرد و زن والی ایک بڑی سی نشست گاہ نظر آ رہی تھی ۔ میں نے چند سیکنڈوں کے بعد میری روزا کو چلی والیوں کے ہمراہ پُر جوش انداز میں ، اندر داخل ہوتے دیکھا ۔ میں نے چوطرفہ روشنیوں کی بنا پر ، مدہم سایوں کے پس منظر میں ایک طویل القامت ، نہایت خوش لباس اور بہت ہی خوب صورت خاتون کو لمبے ہولڈر میں لگا سگریٹ پکڑے ، متکبرانہ مسکراہٹ لیے ، اپنی نوجوان ہم وطنوں کی سمت بڑھتے بھی دیکھا ۔

میں آم کا جُوس پینے اور چھپ کر وائسرائے کے کش لگانے کے لیے کیبنوں اور بیراکی کے تالاب کے بیچ کھسک گیا ۔ وہاں مجھے میرا دوست اور چیمپیگنیٹ کالج کا ہم جماعت جُوان بار یئوئل گیا ۔ وہ بھی اُس سنسان جگہ پر چھپ کر تمبا کو نوشی کرنے گیا تھا ۔ اُس نے مجھ سے آئیں بائیں شائیں کیے بغیر دریافت کیا ۔ "اگر میں للی سے پُوچھ لوں تو تم ناراض تو نہیں ہو گے ، سلم ؟"

وہ جانتا تھا کہ اگر چہ ایسا لگتا ہے کہ ہم مضبوطی سے ساتھ چل رہے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا اور وہ بھی ...... ہر شخص کی طرح ...... جانتا تھا، جس کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا کہ میں نے اُس سے تین بار دریافت کیا ہے اور تینوں مرتبہ اُس نے مجھے رد کر دیا ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں بہت زیادہ ناراض ہوں گا کیوں کہ اگر چہ لکی نے مجھے رد کر دیا ہے لیکن وہ کوئی کھیل تو نہیں، جو وہ کھیل رہی ہے ...... چلی کی لڑکیوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے ...... لیکن در حقیقت وہ مجھے پسند کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مضبوطی سے ساتھ چل رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ، اُس رات میں نے اُس سے چوتھی اور حتمی بار پُوچھنا شروع کیا ہی تھا اور وہ ہاں کہنے ہی والی تھی کہ اُس چھوٹی موٹی سؤرنی کے پندرہ موم بتیوں والے کیک نے مداخلت کر ڈالی۔ لیکن اب وہ جیسے ہی میری روزا کی خالہ سے بات چیت کے بعد باہر نکلے گی میں اُس سے پُوچھ لوں گا، وہ ہاں کر دے گی اور آج رات کے بعد سے، وہ میری مطلق حقیقی محبوبہ بن جائے گی۔

''خوب، تب تو میں لُوسی سے پُوچھوں گا۔'' جوان ہاریٹو پسپا ہوتے ہوئے بولا۔ ''دوست، یہ گھناؤنی بات سہی لیکن میں واقعی لکی کو پسند کرتا ہوں۔''

میں نے لُوسی سے دریافت کرنے کے لیے، اس کی حوصلہ افزائی کی اور وعدہ کیا کہ میں اُس کی اچھے الفاظ میں سفارش کروں گا تا کہ وہ ہاں کر دے۔ اُس کی اور لُوسی، میری اور لکی کی اچھی متاثر کُن چوکڑ بنے گی۔

پیرا کی کے تالاب کے قریب جوان ہاریٹو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے، میں رقص گاہ میں، آرمینو برادرز کے طائفے کی دُھن پر، جوڑوں کو رقص کرتے دیکھتا رہا ...... جو پیریز پراڈو تو نہیں ہو سکتے تھے لیکن وہ اچھے تھے۔ کیا خوب اُن کا طبلہ اور ڈھول تھا ...... ہم نے کئی وائسرائے بھونک ڈالیں۔ میری روزا کو کیا ہوا تھا کہ وہ عین اُس موقع پر اپنی خالہ سے لُوسی اور لکی کا تعارف کروانے چل پڑی تھی؟ وہ اتنی دیر سے کیا باتیں کر رہی ہیں؟ لعنت ہو، وہ میرا منصوبہ سبوتاژ کر رہی تھیں۔ کیوں کہ یہ سچ ہے کہ جب اُنھوں نے پندرہ موم بتیوں والا کیک کاٹنے کا اعلان کیا تو میں اپنی چوتھی کوشش کا آغاز کر چکا تھا ...... جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اِس بار کامیاب ہو جاتی ...... میں لکی سے محبت کا اعلان سازندوں کو رضامند کر کے کر چکا تھا کہ وہ ''مجھے تم سے محبت ہے'' گائیں، جو لڑکیوں کو شادی کی پیش کش کرنے کے لیے بہترین بولیرو تھا۔

اُنھوں نے واپسی میں بہت دیر لگائی اور جب لوٹیں تو وہ بہت تبدیل ہو چکی تھیں: لُوسی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے لیے بہت زرد پڑی ہوئی تھی جیسے اُس نے بھوت دیکھ لیا ہو اور اُس دُنیا سے نکلنے کی تگ و دَو میں ہو اور لکی غصّے میں تھی۔ اُس کے چہرے پر تلخی کے آثار تھے۔ اُس کی آنکھیں یُوں دہک رہی تھیں جیسے گھر میں اُن فیشن زدہ خواتین و حضرات نے اُسے کڑی آزمائش سے گزارا ہو۔ ٹھیک

اُسی وقت میں نے اُس سے ما'بو کے اُن رقصوں میں سے ایک کرنے کے لیے کہا جن پر اُسے بہت عبور حاصل تھا...... ''ما'بو نمبر ۵'' ......اور مجھے یقین نہیں ہوا۔ لکّی کچھ بھی ٹھیک نہیں کر پائی۔ وہ بڑھم بھول گئی، منتشر ہو گئی، اُس نے غلطیوں پر غلطیاں کیں۔ وہ لڑکھڑائی اور اُس کے بیلرز کے چھوٹے ہیٹ نے پھسل کر اُس کی حالت مضحکہ خیز بنا دی۔ اُس نے اُسے ٹھیک کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ کیا ہوا تھا؟

مجھے یقین ہے کہ ''ما'بو نمبر ۵'' ختم ہونے تک تمام شرکا معاملہ جان چکے تھے کیوں کہ چھوٹی سؤرنی نے ہر ایک کو بتا دینا اپنی ذمہ داری سمجھا تھا۔ اُس نے تفصیل سے، رنگ بھرتے اور مبالغے سے کام لیتے ہوئے اپنی آنکھیں زیادہ سے زیادہ پھیلاتے ہوے، تجسس اور خوف پیدا کرتے ہوئے مزے لے لے کر جب کہانی سُنائی تو اُس میں کتنا ہی لطف بھر گیا! کس قدر گھٹیا مسرت ......کس قدر اطمینان اور انتقام...... وہاں کی اُن لڑکیوں نے محسوس کیا جو چکّی والیوں سے حسد کرتی تھیں جو اُس موسم گرما میں بلوغت میں قدم رکھنے والے بچّوں کی روایات میں انقلاب برپا کرنے میرا فلورس آئی تھیں!

جب لکّی اور لُوسی، میری روزا یا کسی کو بھی خُدا حافظ کہے بغیر پراسرار طور پر غائب ہو چکیں تو میں وہ شخص تھا، جسے سب سے آخر میں، اُس سارے قصّے کا پتا چلا...... ''پشیمانی سے بوکھلائی ہوئیں۔'' میری پھوپھی البرتا اعلان کرتیں ......اور جب افواہ ساری رقص گاہ میں پھیل گئی تو لڑکوں لڑکیوں نے موسیقی، اپنی دوست لڑکیوں اور اپنا سب کچھ کرنا، بھلا کر رقص گاہ خالی کر دی اور وہ ٹولیوں میں بٹ کر کھسر پھسر اور خبردار کرنے اور اپنی آنکھیں کمینگی سے پھیلا کر حلقوں سے باہر نکالنے لگے۔ ''تمھیں معلوم ہے؟ تمھیں پتا چلا؟ تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا تم اِس پر یقین کر سکتے ہو؟ سوچو! وہ چکّی کی نہیں ہیں! نہیں، نہ ہی وہ تھیں! کہانی کے سوا کچھ نہیں! وہ چکّی کی نہیں ہیں۔ اُنھیں تو چکّی کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا! اُنھوں نے جھوٹ بولا! ہمیں بے وقوف بنایا! اُنھوں نے ہر بات گھڑی! میری روزا نے بھانڈا پھوڑ دیا! دھوکے بازوں کی جوڑی! کتنی بڑی دھوکے باز!''

وہ پیرو کی رہنے والی تھیں۔ یہی اُن کی اصل تھی۔ بیچاریاں! بیچاریاں! حال ہی میں سانتیاگو سے آنے والی خالہ اُڈریانا کے لیے تو وہ زندگی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ تھا جب اُنھوں نے اُسے، اس لہجے میں بات کرتے سُنا، جس سے، اُنھوں نے ہمیں بے وقوف بنا رکھا تھا تو اُنھوں نے فوراً ہی اُس لہجے کو جعلی قرار دے دیا۔ چکّی کی دوشیزاؤں کو کتنا بُرا لگا ہو گا جب چھوٹی سؤرنی کی خالہ نے، اُن کے چہروں سے تشویش بھانپتے ہوئے، اُن سے سانتیاگو میں، اُن کے خاندان، رہائشی علاقے، سکول، عزیز و اقارب اور اُن کے خاندان کے دوستوں کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا تو لُوسی اور لکّی کو اپنی مختصر سی زندگی کی زہریلی ترین گولیاں نگلنا پڑیں۔ خالہ سخت سے سخت ترین ہوتی چلی گئی۔ حتّٰی کہ جب وہ نشست گاہ میں، اُن پر جھپٹی تو وہ ذہنی اور جسمانی طور پر ٹُوٹ پھُوٹ کا شکار ہو کر زمین بوس ہو گئیں اور

اُس نے اپنے رشتے داروں، دوستوں اور احمق میری روزا کے سامنے اعلان کر دیا: ''کسی گدھے کی نظر میں ہی اِن کا تعلق چِلّی سے ہوگا! اِن لڑکیوں نے زندگی میں کبھی سانتیاگو میں قدم تک نہیں رکھا اور اگر یہ چِلّی کی ہیں تو میں تبّتی ہوں!''

۱۹۵۰ء کے گرما کا آخری روز...... جب میں ابھی پندرہ برس کا ہوا تھا...... میری اصل زندگی کا آغاز تھا، وہ زندگی جو ہوائی قلعوں، خوابوں، جھوٹے قصوں کو تلخ حقیقت سے جُدا کرتی ہے۔

مجھے یقینی طور پر کبھی اُن جھوٹی چِلّی والیوں کی مکمل کہانی معلوم نہیں ہوئی بلکہ اُن دونوں لڑکیوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ افواہوں کے بعد کی صورتِ حال کے مانند آرا، افواہیں، من گھڑتیں اور فرضی انکشافات اُن جعلی چِلّی والیوں کے غائب ہو جانے کے بہت عرصے بعد تک لوگوں کی گفت وشنید سے میرے سننے میں آتے رہے کیوں کہ اُنھیں دوبارہ کبھی تقریبوں، کھیلوں، چائے پر یا اجتماعوں میں مدعو نہیں کیا گیا۔ چغل خوریاں بتاتیں کہ باریوالیگر ے اور میرافلورس کی لڑکیوں نے اُن سے تعلق ختم کر دیا تھا اور اگر کبھی راہ چلتے نظر بھی آجاتیں تو وہ مُنہ موڑ لیتیں۔ لڑکوں اور مردوں نے چپکے چپکے اُن کا یُوں تعاقب کیا جیسے وہ گھٹیا لڑکیوں کا پیچھا کرتے تھے...... اور للی اور لُوسی گھٹیا لڑکیوں کے ساتھیں بھی کیا جو رینایا ایپروویز جیسے علاقے سے اُٹھ کر اپنی اصل چھپاتے ہوئے میرافلورس کے اعلیٰ لوگوں میں پردیسی بن کر...... مردوں کے ساتھ محبت جتانے اور اُنھیں وہ سب کچھ کرنے دینے کے لیے، جو صرف دوغلی نسل اور گھٹیا لڑکیاں ہی کرنے دیتی ہیں...... شامل ہوگئی تھیں؟

میرا خیال ہے کہ بعد میں وہ للی اور لُوسی کو بھولنے لگے کیوں کہ دُوسرے لوگوں اور دُوسرے معاملات نے ہمارے بچپن کے اُس آخری موسمِ گرما کے اُس ہیجان خیز واقعہ کی جگہ لے لی تھی۔ لیکن میں نہیں بھول پایا۔ میں اُنھیں، خاص طور پر للی کو نہیں بھلا سکا۔ اب چُوں کہ بہت سے برس بیت چکے ہیں اور میرافلورس بہت تبدیل ہو چکا ہے۔ ہماری رسوم ورواج، اخلاقی قدغنیں اور رقابتیں دُھندلا چکی ہیں جو کبھی احمقانہ طور پر مروّج تھیں (اب وہ رُوپ بدل چکی ہیں)۔ وہ اب بھی میری یادوں میں بسی ہے اور کبھی کبھار اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ تب مجھے اُس کا شوخ قہقہہ سُنائی دیتا ہے، میں اُس کی شہد جیسے گہرے رنگ والی چنچل نگاہوں اور ہَوا کے دوش پر ہلتے کنول کے پودے کی طرح مامبو کی دُھن پر تھرکتے اُس کے بدن کو دیکھتا ہوں۔ میرا اَب بھی یہی خیال ہے کہ میری زندگی کے گرما کے تمام موسموں میں وہ سب سے شاندار موسمِ گرما تھا۔

ا Miraflores: پیرو (Peru) کا ایک ساحلی شہر جو اپنی مصنوعی جھیل Miraflores Lake کی وجہ سے معروف ہے۔ یہ مصنوعی جھیل میرافلورس کے جنوبی کینال زون کو بحرالکاہل کو ملاتی ہے۔

۲۔ Lima: پیرو کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ۔

۳۔ Mambo: ایک معروف موسیقی جو کیوبائی نیگرو سٹائل سے اخذ کی گئی ہے جس میں چار سُروں کے ردھم کو اُلٹا جاتا ہے جن میں سے دُوسرے اور چوتھے سُر پر زور دیا جاتا ہے۔ مامبو دھنوں پر کیے جانے والے مخصوص تیز رفتار رقص کو بھی مامبو کہتے ہیں۔

۴۔ Seminauel (also Seminole): فلوریڈا، شمالی امریکا کے انڈینوں کا مسکوجی (Muskhogean) زبان بولنے والا ایک قبیلہ جو کریکوں (Creeks) کی ایک شاخ ہے۔ لغوی طور پر مسکوجی اور کریک علیحدگی پسند اور بھگوڑے کو کہتے ہیں۔ اس قبیلے کی اکثریت اب اوکلوہاما میں بستی ہے۔

۵۔ Waltz: رقص کی ایک قسم جس میں جوڑے ایک دُوسرے کے ہاتھ تھام کر فرش پر گھومتے ہیں اور موسیقی کی تال پر قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہیں۔

۶۔ Corridos: ایک قسم کا ہسپانوی رقص۔

۷۔ Blues: گیت کی ایک معروف قسم جو چھوٹے بندوں میں تحریر کیا جاتا ہے جس کی خصوصیات مدہم چار ردھم اور اُداسی و مایوسی ہوتی ہے۔

۸۔ Bolero: ایک روایتی ہسپانوی رقص۔

۹۔ Huarachas: میکسیکو کا ایک رقص جو چپلیں پہن کر کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ Samba: برازیلوی پُرجوش رقص۔

۱۱۔ Polka: انیسویں صدی کا معروف ہسپانوی رقص۔

۱۲۔ Rumba: کیوبا کے حبشیوں کا رقص۔

۱۳۔ Calf love: (محاورہ) کم سنی کی محبت۔

۱۴۔ Marta: عیسائیوں کا ایک تہوار جو حضرت عیسیٰؑ کی دوست مارتا کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

۱۵۔ Geranium: باغیچوں میں لگانے والا ایک پھول دار پودا، جس پر مختلف رنگوں کے پھول لگتے ہیں۔

۱۶۔ Poincianas: جھاڑی نما ایک سجاوٹی پست قامت درخت۔

۱۷۔ Laurel: ایک ساحلی درخت جس کے پتے فتح و نصرت کی علامت ہیں۔

۱۸۔ Bougainvilleas: ایک سدابہار پھول دار بیل جو عام طور پر گھروں میں دیواروں پر چڑھائی جاتی ہے۔

۱۹۔ Honeysuckle: ایک خوشبودار بیل۔ شہد آشام۔

۲۰۔ Ivy: ایک سدابہار بیل جو عام طور دیواروں وغیرہ پر چڑھائی جاتی ہے۔

vvvv

للکار

(The Challenge)

جب ریوربار کی راہداری میں لیونی داس نمودار ہوا تو ہم، ہر ہفتے کے دن کی طرح، اُس روز بھی بیئر پی رہے تھے۔ ہم نے اُس کے چہرے سے فوراً ہی قیاس لگا لیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔

''کیا ہوا ہے؟'' لیون نے استفسار کیا۔

لیونی داس ایک کرسی کھینچ کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔

''میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔''

میں نے اُس کے لیے گلاس اتنا بھرا کہ وہ کنارے سے چھلک کر میز پر بہنے لگا۔ لیونی داس نے ہلکی سی پھونک ماری اور اپنے خیالوں میں گُم پھوٹتے ہوئے بلبلے دیکھتا رہا۔ پھر وہ آخری قطرے تک، پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔

''آج رات جسٹو مبارزہ کرنے جا رہا ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

ہم تھوڑی دیر چپ رہے۔ لیون پیتا رہا اور برائسیو نے سگریٹ سلگالی۔

''اُس نے مجھے کہا ہے کہ تمھیں بتادوں۔'' لیونی داس نے اضافہ کیا۔ ''وہ چاہتا ہے کہ تم لوگ بھی آؤ۔''

بالآخر برائسیو نے دریافت کیا۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''وہ آج سہ پہر کیتا کاؤس پر ملے تھے۔'' لیونی داس نے اپنا ماتھا پونچھا اور ہوا میں ہاتھ جھٹکا تو اُس کی اُنگلیوں سے پسینے کے چند قطرے فرش پر جا گرے۔ ''باقی تم خود تصور کر سکتے ہو۔''

''اگر۔'' لیون بولا۔ ''وہ قاعدے قانون کے مطابق لڑنا چاہتے ہیں تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جسٹو کو پتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟''

''ہاں۔'' لیونی داس نے غائب دماغی سے اتفاق کیا۔ ''شاید یہ بھی اُسی طرح بہتر ثابت ہو۔''

بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ فرحت بخش ہوا چل رہی تھی اور کچھ دیر قبل پلازے سے آنے والی گراڈ کے طائفے کی موسیقی، اب ہماری سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے ہونے والی محفل سے لوٹنے والوں لوگوں سے پُل بھرا ہوا تھا اور دریا کے کنارے اندھیری جگہوں پر چھپے ہوئے جوڑے

بھی اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے تھے۔ ریوربار کے دروازے کے سامنے سے بے شمار لوگ گزر رہے تھے۔ چند ایک اندر آ گئے۔ جلد ہی پیدل چلنے والوں کے راستے کے ساتھ بنا کیفے مردوزن سے بھر گیا جو بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

''نو بجے کے قریب کا وقت ہے۔'' لیون بولا۔ ''ہمیں چلنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، لڑکو۔'' لیوئی واس نے کہا۔ ''بیئر کا شکریہ۔''

ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''وہ ٹھنٹھر پر ہوگی، ٹھیک؟'' مرانسیو بولا۔

''ہاں۔ گیارہ بجے۔ جستوساڑھے دس بجے تمھارا انتظار کرے گا، ٹھیک اِسی جگہ پر۔''

بُوڑھے نے الوداعی ہاتھ ہلایا اور شاہراہ ستیلا پر جانے لگا۔ وہ شہر کے مضافات میں، جہاں سے ٹیلے شروع ہوتے تھے، ایک تنہا کٹیا میں رہتا تھا جو یُوں لگتی تھی جیسے شہر کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو۔ ہم پلازا کی سمت چلنے لگے۔ پلازا قریب قریب سنسان پڑا تھا۔ ٹورسٹ ہوٹل کے پاس کھڑے چند نوجوان اُونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم نے اُن کے درمیان ایک لڑکی دیکھی جواُن کی باتیں سُن کر مُسکرا رہی تھی۔ وہ حسین تھی اور محظوظ ہوتی دِکھائی دے رہی تھی۔

''گمپ اُسے مار ڈالے گا۔'' مرانسیو نے اچانک کہا۔

''بکومت۔'' لیون تڑک کر بولا۔

گرجا گھر والے موڑ سے ہمارے راستے جُدا ہو گئے۔ میں سرعت سے گھر پہنچا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جُبے اور اُن پر دو پتلے سویٹر پہن کر اپنی پتلون کی عقبی جیب میں رومال لپٹا چاقو چھپا لیا۔ جب میں روانہ ہونے لگا تو اُسی وقت میری بیوی گھر لوٹ آئی۔

''دوبارہ باہر جا رہے ہو؟'' اُس نے استفسار کیا۔

''ہاں۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔''

لڑکا اپنے بازوؤں کی آغوش میں یُوں سویا ہوا تھا کہ مجھے لگا جیسے وہ مُردہ ہو۔

''تمھیں صبح جلد اُٹھنا ہے۔'' اُس نے بہ اصرار کہا۔ ''تمھیں اتوار کو کام کرنا ہوتا ہے، یاد ہے؟''

''فکرمت کرو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں چند منٹوں میں لوٹ آؤں گا۔''

میں دوبارہ ریوربار پر گیا اور وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے بیئر اور ایک سینڈوچ منگوایا جسے میں ختم نہیں کر پایا۔ میری بُھوک مر گئی تھی۔ کسی نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ وہ اُس جگہ کا مالک موسیٰ تھا۔

''لڑائی ہو رہی ہے؟''

''ہاں۔ ٹھنٹھر پر ہوگی۔ بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کرو۔''

''مجھے تمھاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے کہا۔'' مجھے اِس کے بارے میں کچھ ہی دیر پہلے معلوم ہوا ہے۔ مجھے جسٹو کے لیے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے لیکن درحقیقت وہی کچھ عرصے سے اِس کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اور گمپ میں برداشت کا مادہ نہیں ہے..... اب تو یہ بات ہم سب کو پتا ہے۔''

''گمپ، گدھے کا بچہ۔''

''وہ کبھی تمھارا دوست ہوا کرتا تھا.....'' موسیٰ نے کہنا شروع کیا لیکن پھر باز رہا۔

کوئی اُسے بیرونی میز سے پکار رہا تھا اور وہ چلا گیا لیکن چند ہی منٹوں بعد دوبارہ میری طرف پلٹ آیا۔

''چاہو تو میں ساتھ چلوں۔'' اُس نے دریافت کیا۔

''نہیں، ہم بہت لوگ ہیں۔ شکریہ۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر میری ضرورت پڑے تو بتانا۔ جسٹو میرا بھی دوست ہے۔'' اُس نے اجازت لیے بغیر میری بیئر سے ایک چسکی لی۔''گزشتہ شب گمپ اپنے ٹولے سمیت یہاں آیا تھا۔ وہ تمام وقت جسٹو کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور قسم کھائی کہ وہ اُس کا قیمہ کر دے گا۔ میں دُعا کر رہا تھا اُس وقت تم لوگ یہاں نہ آؤ۔''

''میں گمپ کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔'' جب وہ غصّے میں ہوتا ہے تو اُس کا مُنھ واقعی مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔''

موسیٰ ہنسا۔'' کل رات وہ شیطان جیسا دکھ رہا تھا۔ وہ اِس قدر کریہہ ہے کہ اُسے دیکھ کر جی متلانے لگتا ہے۔''

میں نے بیئر ختم کی اور دریا کنارے ٹہلنے کے لیے چلا لیکن میں نے ریور بار کی راہداری سے جسٹو کو اکیلے ایک بیرونی میز پر بیٹھے دیکھا۔ اُس نے ربڑ کی چپلیں پہنی ہوئی تھیں اور ایک بدرنگ سویٹر جو اُس کے کانوں تک پہنچا ہوا تھا۔ ایک طرف سے اور بیرونی اندھیرے کے مقابل دیکھنے پر وہ اُس زاویے سے ایک بچے یا عورت جیسا لگ رہا تھا۔ اُس کے نقش و نگار نازک اور نفیس تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے مُڑ کر دیکھا تو مجھے اُس کے چہرے کے دُوسرے رُخ پر زخم کا کاسنی نشان دکھائی دیا جو اُس کے مُنھ سے پیشانی تک پھیلا ہوا تھا۔ (کچھ لوگ کہتے تھے کہ یہ نشان اُسے بچپن میں میں لڑائی کے دوران میں ایک گھونسا لگنے کی وجہ سے آیا تھا لیکن لیوتی داس کا اصرار تھا کہ وہ سیلاب والے دِن پیدا ہوا تھا اور نشان اُس کی ماں کے اُس ہراس کی وجہ سے تھا جو اُس پر دروازے تک پہنچ جانے والا پانی دیکھ کر طاری ہوا تھا۔)

''میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔'' وہ بولا۔'' باقی لوگوں کا کیا ہوا؟''

''وہ آ رہے ہیں۔ یقیناً راستے میں ہوں گے۔'' جُستو نے براہِ راست مجھے دیکھا۔ وہ مُسکرانے لگا لیکن پھر اُس نے بے حد سنجیدہ ہو کر مُنھ دُوسری طرف کر لیا۔

''آج سہ پہر کیا ہوا تھا؟''

''ہمارا آمنا سامنا سنگلین کارٹ پر ہوا تھا۔ میں وہاں صرف پینے گیا تھا کہ میرا ٹکراؤ کِمپ اور اُس کے ساتھیوں سے ہو گیا۔ سمجھے؟ اگر پادری مداخلت نہ کرتا تو وہ وہیں میرا گلا کاٹ کر رکھ دیتے۔ وہ مجھ پر کتّوں کی طرح پِل پڑے تھے۔ پاگل کتّوں کی طرح۔ پادری نے ہمیں کھینچ کر الگ الگ کیا۔''

''تم مرد ہو؟'' کِمپ چیخ کر بولا۔

''تم سے زیادہ۔'' جُستو بھی چلّایا۔

''چپ رہو، وحشیو۔'' پادری بولا۔

''تو پھر آج رات 'ٹُھنٹھ' پر!'' کِمپ چیخا۔

''ٹھیک ہے۔'' جُستو نے کہا۔

''بس یہی کچھ ہوا تھا۔'' رِیور بار کا ہجوم ختم ہو گیا تھا۔ بار کے اندر چند لوگ بچے تھے لیکن ایک بیرونی میز پر ہم اکیلے بیٹھے تھے۔

''میں یہ لایا ہوں۔'' میں اُسے چاقو پکڑاتے ہوئے بولا۔

جُستو نے چاقو کھول کر تولا۔ دھار بالکل اُس کے ہاتھ جتنی لمبی تھی، کلائی سے لے اُنگلیوں کے ناخنوں جتنی۔ پھر اُس نے اپنی جیب سے ایک اَور چاقو نکالا اور دونوں کا موازنہ کرنے لگا۔

''دونوں ایک جیسے ہیں۔'' اُس نے کہا۔ ''میں اپنا ہی رکھوں گا۔''

اُس نے بیئر منگوائی اور ہم دونوں نے بغیر بات کیے پی۔ جُستو تمبا کو نوشی کرنے لگا۔

''میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔'' جُستو بولا۔ ''لیکن دس بجے کے بعد کا وقت ہو گا۔ آؤ، اُن سے ملنے چلیں۔''

پُل پر ہمیں برائسیو اور لیون مل گئے۔ اُنھوں نے جُستو سے ہاتھ ملا کر سلام دُعا کی۔

''جُستو، بھائی۔'' لیون بولا۔ ''تم اُس کے چیتھڑے اُڑانے جا رہے ہو۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' برائسیو نے کہا۔ ''کِمپ تمھیں چُھو تک نہیں سکتا۔''

وہ دونوں پہلے والے لباس ہی میں تھے اور لگتا تھا کہ وہ جُستو کے سامنے بالاتفاق اعتماد اور خاص ہلکے پھلکے پن کا مظاہرہ کر رہے ہوں۔

''آؤ، اِس طرف سے چلیں۔'' لیون بولا۔ ''یہ مختصر راستہ ہے۔''

''نہیں۔'' جُستو نے کہا۔ ''ہم گھوم کر جائیں گے۔ ابھی میری ٹانگیں ٹُوٹی نہیں ہیں۔''

وہ ڈرمضحکہ خیز تھا کیوں کہ ہم ہمیشہ دریا کے پیٹ میں پُل پر لگی سلاخوں سے لٹک کر نیچے گئے تھے۔ہم چُپ چاپ سڑک پر اگلے چوراہے تک گئے، پھر دائیں مُڑ کر کافی دیر چلتے رہے۔دریا کے پیٹ تک تنگ راستہ جاتا تھا۔براسیولڑکھڑایا اور اُس نے قسم کھائی۔ریت نیم گرم تھی اور ہمارے پیر اُس میں یُوں دھنس رہے تھے جیسے ہم رُوئی کے سمندر میں چل رہے ہوں۔لیون نے بغور آسمان کو دیکھا۔

''ہم آگ روشن کرلیں گے۔''بُجستو بولا۔

''کیا تم پاگل ہو؟''میں بولا۔''تم چاہتے ہو کہ پولیس آ جائے؟''

''اِس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔''براسیو نے بے یقینی سے کہا۔''اِسے کل تک بجھا ہوا رکھا جا سکتا ہے۔وہ اندھیرے میں تو لڑنے سے رہے۔''

کسی نے جواب نہیں دیا اور براسیو نے اصرار نہیں کیا۔

''وہ رہا''ٹھنٹھ''۔''لیون بولا۔

ایک زمانے میں— کوئی نہیں جانتا تھا کب— کیروب کا ایک درخت دریا کے پیٹ میں گر گیا تھا اور وہ اتنا بڑا تھا کہ وہ خشک دریا کے پاٹ کے تین چوتھائی حصے پر پھیلا ہوا تھا۔وہ اِس قدر بھاری بھر کم تھا کہ پانی میں ڈُوب گیا اور پانی اُسے اُبھار نہیں پایا محض چند گز تک گھسیٹ سکا۔اِس طرح ہر برس ''ٹھنٹھ''شہر سے تھوڑا تھوڑا کر کے دُور ہوتا چلا گیا۔کسی کو علم نہیں ہے کہ اُسے ''ٹھنٹھ''کا نام کس نے دیا تھا لیکن اب سب اُسے اِسی نام سے پُکارتے تھے۔

''وہ یہاں پہلے سے موجود ہیں۔''لیون نے بتایا۔

ہم ''ٹھنٹھ''سے پانچ گز کے فاصلے پر ٹھہر گئے۔رات کے نیم اندھیرے میں ہم چہرے شناخت نہیں کر سکے کہ کون کون ہمارا منتظر ہے۔صرف اُن کے سائے دِکھائی دے رہے تھے۔وہ تعداد میں پانچ تھے۔میں نے گِنتے ہوئے گروپ کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

''تم جاؤ۔''بُجستو بولا۔

میں چہرے پر سکون کے تاثرات رکھتے ہوئے، درخت کے تنے کی جانب بڑھا۔

''رُک جاؤ۔''کوئی چلّایا۔''کون ہو؟''

''جولیان۔''میں پُکارا۔''جولیان ہُوارطاس۔تم اندھے ہو؟''

ایک پست قامت سایہ مجھ سے ملنے آگے بڑھا۔وہ چاکو پاس تھا۔

''ہم جانے ہی والے تھے۔''وہ بولا۔''ہم نے سمجھ لیا تھا کہ بیچارا جسٹو پولیس کے پاس اپنی حفاظت کی درخواست لے کر چلا گیا ہے۔''

''میں کسی مرد سے شرائط طے کرنا چاہتا ہوں۔''میں اُسے جواب دیے بغیر چلّایا۔''اِس

ہونے سے نہیں۔"

"کیا تم واقعی اتنے بہادر ہو؟" چالُو پاس نے تیکھے لہجے میں پُوچھا۔

"چپ!" رگمپ چیخا۔ وہ سب قریب آ گئے اور رگمپ میری طرف بڑھا۔ وہ طویل القامت تھا، دُوسروں سے زیادہ لمبا۔ مجھے دِکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں نے تصور میں اُس کا پھنسیوں بھرا چہرہ، بے حد چکنی اور بے داڑھی جلد، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو دو نقطوں میں ڈُوبی ہوئی تھیں جیسے کسی نے جبڑے کے اُفقی اُبھاروں کے گوشت میں دو چھوٹے چھوٹے چھید کر دیے ہوں، اور اُس کے اُنگلیوں جتنے موٹے موٹے ہونٹ جو اُس کی ٹھوڑی سے نیچے گرگٹ کی صُورت لٹکتے تھے، دیکھ لیے تھے۔ رگمپ بائیں پیر سے لنگڑاتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اُس کے اُس پیر پر صلیب جیسا ایک نشان ہے جو ایک سؤر کی دی ہوئی نشانی ہے، جس نے اُسے سوتے میں کاٹ کھایا تھا لیکن کسی نے بھی اُس نشان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم لیونی داس کو کیوں لائے ہو؟" رگمپ نے ترش روئی سے استفسار کیا۔

"لیونی داس؟ کون لایا ہے لیونی داس کو؟"

رگمپ نے اپنی اُنگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ بُوڑھا چند گز پیچھے ریت پر کھڑا تھا۔ جب اُس نے اپنا نام سُنا تو پاس چلا آیا۔

"میرے بارے میں کیا!" وہ بولا۔ اُس نے نظریں جماتے ہوئے رگمپ کو دیکھا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ یہ مجھے ساتھ لائیں۔ میں خُود آیا ہوں، اپنے دونوں پیروں پر چل کر کیوں کہ میں نے اِس کی ضرورت محسوس کی۔ اگر تم مقابلے سے بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہو تو سیدھی طرح کہو۔"

جواب دینے سے قبل رگمپ ہچکچایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بُوڑھے کی توہین کرے گا پس میں پُھرتی سے اپنا ہاتھ عقبی جیب کی طرف لے گیا۔

"آپ ملوث نہ ہوں، بڑے میاں۔" رگمپ دِھیمے لہجے میں بولا۔ میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا۔"

"یہ مت سوچو کہ میں بُوڑھا ہوں۔" لیونی داس نے کہا۔ "میں تم سے زیادہ بہتر چل پھر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، بڑے میاں۔" رگمپ بولا۔ "مجھے آپ پر یقین ہے۔" وہ میری سمت مُڑا۔ "کیا تم تیار ہو؟"

"ہاں، اپنے ساتھیوں سے کہہ دو کہ وہ بیچ میں مداخلت نہ کریں۔ اگر اُنھوں نے ایسا کیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

رگمپ نے قہقہہ لگایا۔ "جولیان، تم جانتے ہو کہ مجھے کمک کی ضرورت نہیں۔ خاص طور پر آج تو۔ فکر مت کرو۔"

رگمپ کے پیچھے کھڑا ایک شخص ہنسا۔ رگمپ نے میری طرف کوئی چیز بڑھائی۔ میں نے ہاتھ آگے کیا۔ اُس کے چاقو کا پھل باہر نکلا ہوا تھا اور میں نے اُسے دھار سے تھام لیا تھا۔ مجھے اپنی ہتھیلی پر خراش اور کپکپی محسوس ہوئی۔ دھات برف کے ٹکڑے کے مانند یخ تھی۔

''ماچس لائے ہوے، بڑے میاں؟''

لیونی داس نے ایک تیلی جلائی اور اُسے تب تک جلائے رکھا جب تک شعلہ اُنگلیوں کے ناخن نہیں جلانے لگا۔ میں نے شعلے کی مدہم لَو میں چاقو کا جائزہ لیا، اُس کی لمبائی اور چوڑائی جانچی، دھار اور وزن دیکھا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔'' میں بولا۔

''چونگا۔'' رگمپ نے حکم صادر کیا۔ ''اِس کے ساتھ جاؤ۔''

چونگا میرے اور لیونی داس کے درمیان چلنے لگا۔ جب ہم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو پرائسیتو تمبا کو نوشی کر رہا تھا اور ہر کش پر جَسنو کا بے تاثر چہرہ اور سختی سے بھینچے ہونٹ اور لیون کچھ چباتا ہوا نظر آتا، شاید گھاس کا کوئی تنکا۔ جب کہ جُو دپرائسیتو پسینے میں شرابور تھا۔

''آپ سے کس نے آنے کے لیے کہا تھا؟'' جَسنو نے تلخ لہجے میں دریافت کیا۔

''مجھ سے کسی نے نہیں کہا۔'' لیونی داس نے زور دے کر بلند آواز میں کہا۔ ''میں اِس لیے آیا ہوں کہ میں آنا چاہتا تھا۔ تم مجھ سے وضاحت مانگ رہے ہو؟''

جَسنو نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اِشارے سے اُس کی توجہ چونگا کی طرف دِلائی جو چند قدم پیچھے کھڑا تھا۔ جَسنو نے اپنا چاقو نکالا اور اُس کی طرف پھینک دیا جو اُس کے جسم کے قریب کہیں گرا اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''معذرت۔'' میں نے چاقو تلاش کرنے کے لیے ریت ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھ سے گر گیا تھا۔ یہ رہا۔'' ''تم اتنی جلدی اِتنے اچھے نہیں بن سکتے۔'' چونگا بولا۔

پھر اُس نے وہی کیا جو میں نے کیا تھا۔ ماچس کی روشنی میں پھل پر اپنی اُنگلیاں پھیریں۔ کچھ کہے بغیر چاقو ہمیں لوٹایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ''ٹھاٹھر'' کو لوٹ گیا۔ چند منٹ تک ہم چُپ چاپ کپاس کے نزدیکی کھیت سے آنے والی مہک سونگھتے اور پُل کی سمت سے آنے والی گرم ہَوا سہتے رہے۔ ہمارے عقب میں دریا کے دونوں اطراف شہر کی بتیاں دِکھائی دے رہی تھیں۔ مکمل سکوت طاری تھا جو کبھی کبھار بھونک یا ڈھینچوں ڈھینچوں سے اچانک ٹوٹ جاتا تھا۔

''تیار!'' دُوسری طرف سے چیخ آئی۔

''تیار!'' میں چلّایا۔

''ٹھاٹھر'' کے پاس والے گروہ میں کھڑ بڑ مچی اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر لنگڑاتا ہوا

سایہ دونوں گروہوں کے متعین کیے ہوئے مقام کے مرکز کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ کمپ نے اپنے پاؤں سے وہاں کی زمین کو یہ جانچنے کے لیے پرکھا کہ وہاں پتھر یا کھڈ تو نہیں۔ میری نگاہوں نے جسٹو کو متلاشا۔ لیون اور برانسیو اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ جسٹو نے پھرتی سے اپنے آپ کو اُن سے الگ کیا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو مُسکرایا۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹنا شروع ہوا لیکن لیونی داس نے جست لگا کر اُسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ بُوڑھے نے اپنی پشت پر پہنا ہوا پونچو اُتارا۔ وہ میرے ساتھ کھڑا تھا۔

''ایک سیکنڈ کے لیے بھی اُس کے قریب مت ہونا۔'' بُوڑھا دھیمی آواز میں بولا۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''ہر وقت فاصلے پر رہنا۔ جب تک وہ تھک نہ جائے اُس کے ارد گرد ناچتے رہنا۔ سب سے زیادہ اپنے پیٹ اور مُنھ کی حفاظت کرنا۔ تمام وقت ہاتھ اوپر اُٹھائے رکھنا۔ نیچے جھکنا، قدم زمین پر مضبوطی سے جما کر رکھنا۔ اگر تم پھسل جاؤ تو لاتیں چلانا یہاں تک کہ وہ پیچھے ہٹ جائے ......ٹھیک ہے۔ اب جاؤ۔ اپنے آپ کو ایک مرد کی طرح لے کر جاؤ......''

جسٹو سر جھکائے لیونی داس کو سُنتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اُس سے گلے ملے گا لیکن اُس نے اپنے آپ کو ایک گستاخانہ اشارے تک محدود رکھا۔ اُس نے بُوڑھے کے ہاتھ سے پونچو کھینچا اور اُسے اپنے بازو پر لپیٹ لیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ کر سر بلند کیے مضبوط قدموں سے چلتا ہوا چلا گیا۔ جب وہ ہم سے دُور ہو رہا تھا تو اُس کے دائیں ہاتھ میں تھاما ہوا دھاتی ٹکڑا پیچھے سے دمک رہا تھا۔ جسٹو کمپ سے دو گز کے فاصلے پر ٹھیر گیا۔

چند سیکنڈوں تک وہ، یقینی طور پر آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے کہ دونوں ایک دُوسرے سے کس قدر شدید نفرت کرتے ہیں، ساکت کھڑے رہے۔ ایک دُوسرے کو پرکھتے رہے۔ اُن کے پٹھے اُن کے لباس میں سخت پڑے ہوئے ہوں گے اور دائیں ہاتھ اپنے اپنے چاقو زور زور سے بھینچ رہے ہوں گے۔ فاصلے سے وہ گرم رات کے اندھیرے میں ادھ چھپے مبارزے کے لیے تیار دو انسانوں کے بجائے، کسی کالے مادے سے بنے ہوئے سیاہ مُجسمے یا دو جوانوں کے سائے دریا کنارے لگے کیروب کے ٹھوس درخت دِکھائی دے رہے تھے جن کے عکس زمین پر نہیں بل کہ فضا میں تھے۔ وہ بہ یک وقت حرکت میں آئے گویا یہ کسی تحکمانہ آواز کا ردِ عمل ہو۔ شاید جسٹو پہلے حرکت میں آیا تھا، محض ایک سیکنڈ پہلے۔ اپنے مقابل پر نظریں جمائے اُس نے آہستہ آہستہ اپنے گھٹنوں سے کندھوں تک جھومنا شروع کیا اور کمپ بھی اُس کی نقالی کرتے ہوئے اپنے پیروں کو پھیلا کر آگے پیچھے، دائیں بائیں جھومنے لگا۔ اُن کی حرکات یکساں تھیں: دایاں بازو کہنی کے خم سے سامنے کی طرف تھوڑا سا جھکا ہوا، ہاتھ دشمن کے بدن کے عین وسط کی جانب اور بایاں بازو پونچو میں لپٹا عدم توازنی سے بہت آگے بڑھا

اُور مُنھ کے سامنے ڈھال کے انداز میں مُڑا ہوا۔ آغاز میں محض اُن کے بدنوں نے حرکت کی البتہ اُن کے سر، پیر اور ہاتھ ساکت رہے۔ وہ دونوں بلا سوچے سمجھے آگے کی سمت اپنی پشتوں کو کمان بنائے جھکے اور اپنی ٹانگوں کو یُوں موڑے ہوئے تھے جیسے پانی میں چھلانگ لگانے والے ہوں۔ گمپ نے حملے میں پہل کی۔ اُس نے اچانک آگے کی طرف زقند بھری اور اُس کا بازو ایک وسیع قوس میں گھوما۔ جسٹو کا تعاقب کرتے ہوئے ہتھیار نے زخم لگائے بغیر فضا میں ایک نامکمل راستہ طے کیا جب کہ جسٹو سرعت سے گھوم گیا۔ اپنی ڈھال ہٹائے بغیر اُس نے ریت پر آہستہ روی سے پھسلتے ہوئے اپنی رفتار بڑھا کر گمپ کے گرد ایک دائرہ بنایا۔ گمپ اپنی جگہ گھوم کر رہ گیا۔ وہ نیچے جھکا اور اپنے دشمن کی تقلید میں گھومتے ہوئے اُس نے اُس پر اپنی نگاہیں اس طرح رکھیں گویا ہو بہو ناز ہو گیا ہو۔ غیر متوقع طور پر جسٹو سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ڈبّے کے سپرنگ والے گڈّے کے مانند اُسے دُوسرے شخص پر اپنا سالم بدن گراتے اور واپس اپنی جگہ جاتے دیکھا۔

''وہ'' برائسینو نے سرگوشی کی۔ ''اُس نے اُسے کاٹ ڈالا ہے۔''

''کندھے پر۔'' لیونی داس بولا۔ ''لیکن پُھرتی سے۔''

چیخے بغیر اپنی جگہ پر قائم رہتے ہوئے، گمپ نے رقص جاری رکھا جب کہ جسٹو زیادہ دیر تک اُس کے گرد گھومنا برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ اپنا پونچو جھلاتے ہوئے بہ یک وقت گمپ کے قریب آتا اور پھر دُور جاتا، کبھی اپنی ڈھال ہٹاتا اور کبھی سامنے لاتا، اپنا جسم شکار کے لیے پیش کرتا اور برق رفتاری سے پرے ہٹا لیتا، پھسلتا اور سریع حرکت کرتا، تپی ہوئی عورت کے مانند ترغیب دلاتا اور انکار کرتا۔ وہ اُسے چکرا دینا چاہتا تھا لیکن گمپ نہ صرف تجربہ کار بلکہ عیار بھی تھا۔ اُس نے پیچھے ہٹتے ہوئے دائرہ توڑا اور بدستور جھکے جھکے نہایت چھوٹے چھوٹے قدموں سے منزل کا تعاقب کرتا، گردن باہر نکالے اور اپنے ہاتھ کے گرد لپٹے پونچو سے مُنھ بچاتے ہوئے جسٹو کو رُکنے اور اپنا پیچھا کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ گمپ پیچھے ہٹا، اپنی ٹانگیں کھینچیں اور اتنا نیچے جھک گیا کہ اُس کے گھٹنے قریب قریب زمین کو چھونے لگے۔ جسٹو نے دو مرتبہ اُس کے بازو پر حملہ کیا لیکن دونوں بار اُس کا وار خالی گیا۔ ''اِتنے قریب مت ہوؤ۔'' میرے ساتھ موجود لیونی داس نے اِس قدر آہستگی سے کہا کہ اُسے صرف میں ہی سُن سکا۔ ٹھیک اُسی وقت اُس شکل کی وحشت نے ۔ بڑا اُور بدشکل سایہ جو سکڑ کر اپنے آپ کو اکٹھا کر کے مکوڑے نما ہو گیا تھا۔ عروج پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ پے در پے حملے ہونے لگے جس سے جسٹو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم ایک، دو یا شاید تین سیکنڈوں کے لیے دم سادھے مبارزت کرتے گرانڈیل جثّے کو دیکھتے رہے۔ پھر ہم نے مقابلے کی پہلی بار چنگھاڑ جیسی ایک مختصر سی آواز سُنی۔ اگلے ہی لمحے، اُن میں سے کسی نے، ایک چھوٹی لیکن شاندار جست لی اور دو زقندوں ہی میں دونوں لڑاکوؤں کے درمیان ایک نادیدہ دیوار تن گئی۔

اِس بار رَگمپ نے گھومنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دائیں پاؤں پر گھوم اور بائیں پاؤں کو گھسیٹ رہا تھا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھنے اور یہ جاننے کے لیے کہ جَستو کے ساتھ کیا ہوا تھا، جب وہ دونوں دو محبت کرنے والوں کی طرح یک قالب بنے ہوئے تھے، بیکار ہی اپنی آنکھیں سکیڑیں۔ ''وہاں سے ہٹو۔'' لیونی داس نے بے حد دِھیمی آواز میں کہا۔ ''تم اِتنے نزدیک ہو کر کیوں لڑ رہے ہو؟'' پُراَسرار طور پر جیسے مدہم ہُوا، اِس خفیہ پیغام کو اُس تک لے گئی۔ جَستو بھی رَگمپ کی طرح شکار کا تعاقب کرتے ہوئے چوکنا اور طاقت بھرے انداز میں کودنے لگا۔ وہ برق رفتاری سے دفاع سے حملے؛ اور حملے سے دفاع کی طرف پلٹے لیکن کوئی بھی دُوسرے کے دھوکے میں نہیں آیا، دُشمن کے ٹھوکر مارنے والے انداز سے فریب نہیں کھایا جس کا مقصد دُشمن کو نقصان پہنچانا نہیں بل کہ اپنے سے دُور رکھنا، لمحے بھر کے لیے اُلجھانا، ڈھال کو گرانا تھا جس پر دُوسرا فرد خُود کار انداز میں ردِعمل ظاہر کرتا اور اپنی رفتار سست کرتے ہوئے بایاں ہاتھ اُٹھاتا۔ میں اُن کے مُنہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُنھیں بہتر انداز میں دیکھنے لگا جیسے میں اُن کے درمیان موجود ہوں: رَگمپ کے پسینے چھوٹے ہوئے ہیں، اُس کا مُنہ بھنچا ہوا، سؤر جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پلکوں کے عقب میں جلتی ہوئیں شعلے اُگل رہی ہیں، اُس کے بدن پر لرزہ طاری ہے، چپٹے ناک کی پُڑپُڑیاں اور مُنہ کا دہانہ ناقابلِ یقین طور پر تھرّا رہے ہیں؛ اور جَستو اپنے معمول کے طنز بھرے انداز کو چہرے پر سجائے ہوئے غصّے سے بے قابو ہے اور اُس کے ہونٹ اشتعال اور کف سے نم پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ اُسی وقت جَستو نے دُوسرے فریق کو ہر طرح کا فائدہ اُٹھانے کا موقع فراہم کرتے ہوئے اُس کی طرف اِس طرح اندھادھند بڑھا کہ جَستو نے احمقانہ طور پر خُود ہی اپنا چہرہ اور اُس کی رسائی میں دے دیا۔ غصّے اور بے صبرے پن نے اُسے زمین سے اُٹھا کر عجیب انداز میں فضا میں معلّق کرتے ہوئے، اُس کا آسمان پر خاکہ بنا دیا۔ وہ بُری طرح اپنے شکار سے ٹکرایا۔ وحشیانہ حملے نے یقیناً رَگمپ کے اوسان خطا کر دیے ہوں گے کہ وہ تھوڑی دیر تک فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا اور جب وہ نیچے جھکا تو اُس نے اپنا ہاتھ تیر کی طرح لمبا کیا۔ گو چمکتا ہوا پھل ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا لیکن ہمارے تصوّر نے ہمیں دِکھا دیا کہ جَستو کا احمقانہ عمل مکمل طور پر ناکام نہیں ہوا۔ اُس ٹکر پر، ہم پر لپٹی ہوئی رات آسمان سے گرنے والی بجلی کے چمکاروں کی طرح بلند اور گاڑھے خُون والی چیخوں سے بھر گئی۔ تب ہمیں پتا نہیں تھا کہ وہ، کبھی پتا بھی نہیں چلے گا، کتنی دیر اُس جھٹکے والی حالت میں رہے۔ تاہم یہ جانے بغیر کہ اُن میں سے کون سا کون ہے، یہ جانے بغیر کہ کس کے ہاتھ وار کر رہے ہیں، کس کے حلق سے مسلسل چنگھاڑیں ایک دُوسرے کے پیچھے گونج کے مانند نکل رہی ہیں۔ ہم نے بس چاقوؤں کے ننگے پھلوں کو بار بار فضا میں بلند ہوتے دیکھا جو آسمان کی طرف یا اندھیرے میں حرکت کر رہے تھے اور اُن کے پہلوؤں میں نیچے کی تیزی سے سمت

آ رہے تھے، چمکتے ہوے، کبھی نظروں کی پکڑ میں آتے تو کبھی نہیں، کبھی رات کے اندھیرے میں چھپتے تو کبھی دِکھتے گویا کسی جادوگر کا تماشا ہمارے سامنے چل رہا ہو۔

ہم گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے متجسس ہو رہے تھے۔ ہم تب تک دم سادھے، آنکھیں پھاڑے اور شاید نا قابلِ فہم بُڑبُڑ کرتے رہے جب تک کہ ایک انسانی اہرام تڑخ نہیں گیا، یکا یک ہی وسط سے نا دیدہ کاٹ دار، دو حصّوں میں منقسم نہیں کر دیا گیا۔ دونوں نے بہ یک وقت ایک دُوسرے کو یکساں وحشیانہ طاقت سے پیچھے دھکیلا گویا مقناطیس کی ایک جیسی طاقت والے دونوں رُخ آمنے سامنے آگئے ہوں۔ وہ دونوں ایک دُوسرے سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑے بھاری بھاری سانسیں لیتے رہے۔ ''ہمیں اُنھیں روکنا ہوگا''لیون کی آواز اُبھری۔''بہت ہوگیا''لیکن اس سے پہلے کہ ہم حرکت میں آتے رَگمپ نے شہابیے کے مانند اپنی جگہ چھوڑی۔ جَستو سرعت سے ایک طرف نہیں ہو پایا اور دونوں زمین پر لڑھکنیاں کھانے لگے۔ وہ ریت پر ایک دُوسرے سے گتھم گتھا اُوپر تلے لڑھکتے ہوئے ایک دُوسرے کو مارنے اور بوجھل سانسوں سے فضا کا سکوت توڑ رہے تھے۔ اُسی وقت لڑائی اچانک ہی بند ہو گئی۔ جلد ہی وہ دریا کے پیٹ میں ہاتھ پاؤں پسار کر ساکت پڑ گئے جیسے سو گئے ہوں۔ میں اپنے قیاسات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اُن کی جانب بھاگنے کے لیے تیار ہی تھا کہ اُن میں سے ایک اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور شرابی کی طرح جھومتے ہوئے، دوسرے کے پاس، جو گرا ہوا تھا، کھڑا ہو گیا۔ وہ گمپ تھا۔

لڑائی کے دوران میں وہ اپنے پونچو گرا بیٹھے تھے جو چند گز دُور پڑے کئی کناروں والی چٹانوں جیسے لگ رہے تھے۔''آؤ، چلیں''لیون بولا۔ لیکن اِس بار بھی کچھ ایسا ہوا، جس نے ہمیں بے حس و حرکت کر دیا۔ جَستو اپنے جسم کا سارا وزن اپنے دائیں ہاتھ پر ڈالتے اور آزاد ہاتھ سے اپنے سر اور مُنھ کو ڈھانپتے ہوے بہ مشکل اُٹھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی نظروں کو کسی دہشت ناک شے سے دُور رکھنا چاہتا ہو۔ جب وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو رَگمپ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ چہرے پر سے نہیں ہٹایا تھا۔ پھر ہم سب نے ایک آواز سُنی جسے ہم شناخت نہیں کر سکے جیسے وہ اچانک اندھیرے سے پھُوٹی ہو۔

''جولیان!''رَگمپ پُکارا۔''اِسے کہو ہار مان لے!''

میں لیوئی داس کے تاثرات دیکھنے کے لیے مُڑا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا مُنھ لیون کے مُنھ سے جڑا ہوا ہے۔ وہ سراسیمگی سے منظر دیکھ رہا تھا۔ میں اُنھیں دیکھنے کے واپس مُڑا۔ وہ ایک بار پھر گتھم گتھا تھے۔ بلا شبہ اپنے بارے میں رَگمپ کے الفاظ سے جوش میں بھرے جَستو نے اُس وقت، جب میری نگاہیں میدانِ کارزار سے ہٹی تھیں، اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر تکلیف میں ہونے کے باوجود اپنی تمام طاقت مجتمع کرتے ہوئے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دُشمن پر جست لگا دی تھی۔ عقبی سمت زقند بھر کر گمپ اُس جذباتی اور بے کار حملے سے بہ آسانی بچ نکلا۔

''لیونی داس!'' وہ دوبارہ غصّے سے لجاجت بھرے لہجے میں چلّایا۔ ''اِس سے کہو ہار مان لے!''

''بکواس بند کرواورلڑو۔'' لیونی داس بلا جھجک ڈکرایا۔

جُستو نے ایک اَور حملے کی کوشش کی تو ہم سب، بالخصوص لیونی داس جو عمر رسیدہ تھا اور جس نے اپنی زندگی میں بے شمار معرکے دیکھے تھے، سمجھ گئے کہ اب کچھ نہیں ہونے والا کیوں کہ اُس کے بازو میں اِتنی قوت نہیں رہی تھی کہ وہ گمپ کی چکنی جلد تک پہنچ سکتا۔ اُس کے اندر سے اُٹھنے والا غصہ ہونٹوں تک پہنچ کر اُنھیں خشک کر گیا اور یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں میں بادل منڈلانے لگے۔ اُس نے سست رَوی سے سعی کی۔ ہم اُسے دُوسری بار حرکت میں آتا دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا اور ایک بھدّی آواز کے ساتھ زمین پر ڈھے گیا۔

جب ہم اُس جگہ پہنچے جہاں جُستو گرا ہوا تھا تو گمپ اپنے آدمیوں کے پاس واپس جا چکا تھا اور وہ بلا کچھ کہے وہاں سے جانے لگے تھے۔ میں نے اُس کے سینے پر اپنا چہرہ رکھا تو ایک گرم سیلا مواد میری گردن اور کندھوں سے سختی سے چپک گیا اور جیسے ہی میرا ہاتھ پھٹے ہوئے کپڑے کے سوراخ سے اُس کے پیٹ اور پشت پر پہنچا تو وہ ساحلی جیلی فش جیسی نرم، گیلی اور سرد لاش کو ٹٹو لنے لگا۔ برانسیو اور لیون نے اپنی اپنی جیکٹیں اُتار کر اُسے احتیاط سے اُن میں لپیٹا؛ اور بازوؤں اور ہاتھوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ میں نے لیونی داس کے پونچو[2] کی تلاش میں نظریں دوڑائیں جو چند فٹ دُور پڑا تھا اور میں نے دیکھے بغیر ہی اندازے سے اُس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ پھر دو قطاروں میں چلتے ہوئے ہم چاروں اُسے تابوت کے مانند اپنے کندھوں پر اُٹھا کر قدم سے قدم ملا کر اُس راستے پر چلنے لگے جو دریا کے کنارے پر چڑھتا اور شہر کو جاتا تھا۔

''روؤ مت، بُوڑھے کھلاڑی۔'' لیون نے کہا۔ ''میں نے تمھارے بیٹے جیسا بہادر شخص کبھی نہیں دیکھا۔ میرا مطلب واقعی یہی ہے۔''

لیونی داس نے جواب نہیں دیا۔ وہ میرے پیچھے چل رہا تھا اِس لیے میں اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کاستیلا کی پہلی کٹیا کے قریب میں نے اُس سے دریافت کیا۔ ''کیا اِسے تمھارے گھر لے کر جانا ہے، لیونی داس؟''

''ہاں۔'' بُوڑھے نے بلند آواز میں یُوں جواب دیا جیسے وہ بہرہ ہو۔

---

[1] carob: موٹے تنے والا ایک اُوقیانوسی درخت جس کی پھلیاں بطور غذا استعمال ہوتی ہیں۔

[2] Poncho: سر کے مقام پر سوراخ والا کھیس۔ سوراخ میں سے سر گزار کر اُسے کندھوں پر ڈال لیا جاتا ہے جس سے سارا بدن ڈھنپ جاتا ہے۔

مَو یان
(Mo Yan)

نوبیل انعام برائے ادب ۔۲۰۱۲ء سے چینی النسل ناول نگار اور افسانہ نگار مَو یان کو نوازا گیا کہ ''وہ اپنی تحریروں میں تخیلاتی حقائق نگاری کا ادغام فوک داستانوں، تاریخ اور عصرِ حاضر سے کرتے ہیں۔'' سویڈش اکیڈمی کے سربراہ پیٹر این گلنڈ کے مطابق: ''اُن کا اسلوب اس قدر لاثانی ہے کہ آدھا صفحہ پڑھتے ہی آپ کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ مَو یان ہیں۔'' گیارہ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو سویڈش اکیڈمی کے اعلان کے بعد مَو یان یہ انعام جیتنے والے دُنیا کے یک صد نویں اور چین کے دُوسرے ادیب ہیں لیکن چین ہی میں قیام پذیر پہلے ادیب ہیں۔مَو یان سے قبل ۲۰۰۰ء میں ایک چینی ادیب گاؤ ژنگ جیان کو یہ انعام مل چکا ہے لیکن وہ فرانس کے شہری تھے۔

مَو یان کا اصل نام گُو آن مَو ئے (Guan Moye) ہے۔گُو آن اُن کا خاندانی نام ہے جب کہ گھر میں اُنھیں صرف مَو کہہ کر پکارا جاتا ہے لیکن دُنیا بھر میں اُن کی شہرت اُن کے قلمی نام مَو یان سے ہے۔ مَو یان کا چینی زبان میں مطلب ہے: ''چپ یا خاموش رہو۔'' نیشنل انڈوومنٹ فار ہیومینیٹیز کے چیئر مین جم لیچ کو انٹرویو دیتے ہوئے گُوان مَو ئے نے بتایا کہ یہ نام اُن کے ذہن میں اپنے ماں باپ کی تنبیہہ سے آیا تھا کہ گھر سے باہر اپنے دِل کی بات زبان پر مت لاؤ کیوں کہ اُن کے لڑکپن میں ۱۹۵۰ء سے چین میں سیاسی انقلاب کی صُورتِ حال تھی۔اُن کے قلمی نام مَو یان کا اُن کی تحریروں سے گہرا تعلق ہے جو چین کی سیاسی اور جنسی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔ گُوان مَو ئے ۱۷۔ فروری ۱۹۵۵ء کو مَو یان شندونگ (Shandong) صوبے کے گاؤمی (Gaomi) ضلع کے دیہی علاقے دلان (Dalan) (جسے اُنھوں نے اپنے ناولوں میں گاؤمی ضلع کے ''شمال مشرقی قصبہ'' کا نام دیا ہے) میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ثقافتی انقلاب کے دوران وہ سکول چھوڑ کر پٹرولیم مصنوعات کی ایک فیکٹری میں کام کرنے لگے۔انقلاب کے بعد وہ پیپلز لبریشن آرمی میں بھرتی ہوئے اور فوج کی ملازمت کے دوران ہی اُنھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔تین سال بعد اُنھیں پیپلز لبریشن آرمی کی اکادمی برائے فن وادب کے شعبۂ ادب میں استاد کی نشست مل گئی جہاں سے ۱۹۸۴ء میں اُنھوں نے اپنا ناولچہ A Transparent Radish شائع کیا۔اُنھوں نے ادب میں ماسٹر ڈگری بیجنگ نارمل یونیورسٹی سے حاصل کی۔

مَو یان نے بطور مصنف اپنے کیریئر کا آغاز چینی زبان میں اصلاح اور ایک نئے عہد کا آغاز کرنے

والی ہزاروں کہانیاں اور ناول لکھ کر کیا۔ اُن کا پہلا ناول "Falling Rain on a Spring Night"
۱۹۸۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُن کے لاتعداد ناولوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُن کا ناول "Red
Sorghum Clan" شندوگ خاندان کی ۱۹۲۳ء تا ۱۹۷۶ء تک بکھری ہوئی داستانی تاریخ ہے۔ مصنف نے
اِس ناول میں چینی تاریخ کے نشیب و فراز کو غیر روایتی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ ناول مختلف ناموں کی پانچ
جلدوں پر مشتمل ہے: i) Shorgum Wine ii) Shorgum Funeral iii) Dog Road iv)
The Odd Dead v) Red Shorghum۔ مغربی قارئین اُن کے ۱۹۸۷ء کے ناول "Red
Sorghum Clan" کی وجہ سے اُن سے خُوب آشنا ہیں۔ اِس ناول کی دو جلدوں 'Red Sorgum' اور
"Sorgum Wine" پر بعد میں "Red Sorgum" کے نام سے فلم بنائی گئی۔ اُن کا اگلا ناول The
Garlic Ballad ایک سچی کہانی پر لکھا گیا ہے کہ گاؤں قصبے کے لوگ اِس بنا پر حکومت کے خلاف شورش برپا
کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کی فصلیں نہیں خریدتی۔ The Republic of Wine شراب اور لذیذ پکوانوں
پر ایک طنزیہ تحریر ہے جس میں شراب اور لذیذ پکوانوں کو چینیوں کی اپنی تباہی آپ کرنے کی علامتوں کے طور
پر استعمال کیا گیا ہے۔ Big Breasts and Wide Hips ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کرتا ہے جس
کے لپتان جاپانیوں کی گولیوں سے چیتھڑوں میں بدل گئے تھے۔ یہ ناول چین میں متنازعہ رہا کیوں کہ کچھ بائیں
بازو کے نقادوں کا خیال تھا کہ Big Breasts اشترا کی فوجیوں کی منفی کردار نگاری کے طور پر سامنے آتا ہے۔
لکھنے کی توانائی سے بھرپور مویان نے اپنا تازہ ترین ناول Life and Death Are Wearing Me
Out صرف ۴۲ دنوں میں ہاتھ سے لکھ کر مکمل کیا۔ وہ اپنے ناولوں کو ٹائپ کرنے کی بجائے ہاتھ ہی سے لکھنے پر
ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ اُن کا خیال ہے کہ ٹائپ "ذخیرۂ الفاظ کو محدود کر دیتی ہے۔" اِس ناول کی کہانی ایک
ایسے جاگیردار کی کہانی ہے جو زرعی اصلاحات کی تحریک کے دوران مختلف جانوروں کے رُوپ میں بار بار زندہ
ہوتا ہے۔ جاگیردار اشترا کی معاشرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے اُس پر طنز کرتا ہے مثلاً جب وہ (گدھے کے
رُوپ میں) دو نچروں کو اپنی خوراک میں سے اُسے حصّہ دینے پر مجبور کرتا ہے کیوں کہ "اشترا کی دور
میں..... میری چیز تمھاری، تمھاری چیز میری۔" مویان کے دیگر اہم ناولوں میں 1) Sandalwood
Death
2) Change 3) Pow! شامل ہیں۔ جب کہ مختصر افسانوں کے مجموعوں میں 1) Explosion and
Other Stories 2) Shifu: You'll Do Anything for a Laugh اور دیگر تصانیف میں i)
Whit Dog Swing ii) Man and Beast iii) Soaring iv) Iron Child v) The
Cure, v) Love Story vi) Shen Garden and Abondened Child شامل ہیں۔

مویان کا کام اغلب طور پر معاشرتی تبصرے پر محیط ہے۔ وہ لُو جن (Lu Xun) کی معاشرتی اور
گیبریل گارشیا مارکیز کی ساحرانہ حقائق نگاری سے لیکن روایتی چینی ادب میں وہ فوک داستان پر لکھے جانے

والے کلاسیکی رزمیہ ناول Water Margin سے بہت متاثر ہیں۔مویان بین الاقوامی ادب کے تراجم کا مطالعہ کرتے ہیں (کیوں کہ مویان کی تصانیف کو انگریزی میں ترجمہ کرنے والے ہاورڈ گولڈ بلیٹ کے بقول اُنھیں چینی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں آتی) اور دُنیا بھر کے ادب کے مطالعے کے بہت بڑے حامی ہیں۔ اُنھوں نے فرینکفرٹ بک میلہ ۲۰۰۹ء کی افتتاحی تقریر میں گوئٹے کے نظریے کو یہ کہتے ہوئے بیان کیا: ''ادب ملکوں اور قوموں کے درمیان موجود سرحدوں پر غلبہ پا سکتا ہے۔''

مویان کی تحریریں رزمیہ تاریخی اسلوب رکھتی ہیں جس میں تخیلاتی حقائق نگاری اور مزاح کی پُرکاری کی آمیزش موجود ہے۔اُنھوں نے انسانی حرص وطمع اور بدعنوانی کو اپنا مستقل موضوع بنایا ہے۔اُنھوں نے خیرہ کُن، پیچیدہ اور اکثر پُرتشدد کرداروں کو استعمال کرتے ہوئے بہت سی کہانیاں اپنے آبائی گاؤں، شندوگ صوبے کے شمال مشرقی قصبے گاؤمی کے پس منظر میں لکھی ہیں۔اس بارے میں مویان کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے محسوس کیا کہ ولیم فاکنر کے The Sound and the Fury کے مطالعے کے بعد وہ اپنے خاندان، شناسا لوگوں، دیہاتیوں ہی کو..... اپنے کردار بنا سکتے ہیں۔مویان کا اُسلوب ''ماضی اور حال، مردہ اور زندہ، اچھے اور بُرے'' میں فرق کو دھندلانے کی خُوبی رکھتا ہے۔وہ اپنے ناولوں میں نیم خودنوشتی کردار کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں جو مصنف کی دیگر کہانیوں کو ترمیم کر کے دوبارہ سُناتا ہے۔اُن کے نسوانی کردار اکثر اپنا روایتی نسوانی کردار نبھانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔امریکا ٹائم میگزین میں ڈونلڈ موریسن اُن کے بارے میں لکھتا ہے: وہ تمام چینی ادیبوں سے زیادہ معروف، اکثر پابندیوں کا شکار رہنے والے اور سرقہ ہونے والے ادیب ہیں۔'' اور جم لیچ اُنھیں فرانز کافکا اور جوزف ہیلر کا جواب قرار دیتا ہے۔

مویان کو ملنے والے انعامات واعزازت کی طویل فہرست ہے۔جن میں کری یاما-۲۰۰۵ء، ڈاکٹر آف لیٹرز-۲۰۰۵ء، فیوکوکا ایشین کلچر پرائز-XVII، نیومین پرائز برائے چینی ادب-۲۰۰۹ء، آنریری فیلو ماڈرن لینگوایج ایسوسی ایشن-۲۰۱۰ء، ماؤ ڈن لٹریچر پرائز-۲۰۱۱ء اور نوبیل انعام برائے ادب-۲۰۱۲ء شامل ہیں۔

''قصہ گو'' کے عنوان سے اپنے نوبیل خطبے میں مویان نے اپنے خاندان کے شدید معاشی بدحالی و مالی تنگ دستی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی وغیر ادبی زندگی، تخلیقات، کردار نگاری اور موضوعات پر بھرپُور اظہارِ خیال کیا۔جس میں سے چند ایک چیدہ چیدہ باتیں یہ ہیں:

''میں امریکی ناول نگار ولیم فاکنر اور کولمبیا کے ناول نگار گابریئل گارشیا مارکیز سے بے حد متاثر تھا ...... میں نے اُن سے سیکھا کہ ایک لکھاری کی اپنی ایک سرزمین ہونا چاہیے جو صرف اُسی کی ذاتی ملکیت ہو...... دو برس تک میں اُن کے نقشِ قدم پر چلا پھر مجھے احساس ہوا کہ مجھے اُن کے اثر سے نکلنا ہوگا..... میں اپنی کہانیاں اپنے انداز میں لکھتا ہوں۔میرا طور ایک بازاری قصہ گو جیسا ہے جس سے میری خُوب آشنائی ہے، وہی طور جو میرے والد، والدہ اور پُرانے زمانے کے قصہ گوؤں کا تھا..... میری ابتدائی کہانیاں میرے ذاتی تجربات کے

بیا ہے تھے ...... قدرتی طور پر اپنے ذاتی تجربات فکشن میں من وعن منتقل نہیں کیے جا سکتے خواہ وہ کتنے ہی لاثانی کیوں نہ ہوں۔ افسانے کو افسانہ اور تخیلاتی ہی ہونا چاہیے ...... تخلیقی عمل ہر مصنف کے لیے لاثانی ہوتا ہے ...... خواہ اُس کی تخلیق تخیلاتی ہو یا حقیقی ...... میرے ابتدائی کام کو خود کلامیاں کہا جا سکتا ہے کہ مجھے کسی قاری کا تصور تک نہیں تھا۔ لیکن ناول Sandalwood Death کے لکھنے کے آغاز کے ساتھ ہی میری چشمِ تصور نے مجھے دکھایا کہ میں چوک میں کھڑا سامعین کی بڑی تعداد کو اپنی کہانی سُنا رہا ہوں ...... میں نے ہر قسم کی اسلوبیات کا تجربہ کیا لیکن انجام کار میں اپنی روایات کی طرف پلٹ آیا لیکن یہ پلٹنا تبدیلی کے بغیر نہیں تھا۔ میں نے اس ناول اور بعد میں آنے والے ناولوں میں چینی کلاسیکی روایت کو مغربی ادبی تیکنیکوں کے ساتھ آگے بڑھایا ہے ...... میں نے اپنے ناول The Garlic Ballads میں زندگی کے ایک حقیقی کردار کو لیا ہے جو ناول میں ایک قصہ گو اور گویا کا اہم کردار ہے۔ گو اُس کے مکالمے اور افعال افسانوی ہیں لیکن کاش میں اُس کا نام استعمال نہ کرتا۔ یہ فعل مجھ سے ہر بار سرزد ہو جاتا ہے۔ میں حقیقی ناموں سے آغاز کرتا ہوں تاکہ مانوسیت کا احساس قائم رہے اور جب کام ختم ہو جاتا ہے تو لگتا ہے کہ اُن کے نام تبدیل کرنے کا مرحلہ کبھی کا گزر چکا۔ لوگ ناولوں میں اپنے نام دیکھ کر ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے میرے والد کے پاس جاتے۔ وہ ہمیشہ اُن سے میری جگہ معذرت کرتے اور اُنھیں کہتے کہ وہ اس چیز کو سنجیدگی سے نہ لیں ...... میری ایک سگی خالہ میرے تازہ ترین ناول ''مینڈک'' کا مرکزی کردار ہیں ...... مجھے اس سے مفر نہیں کہ ''مینڈک'' میں وہ میرا ماڈل ہیں لیکن اُن میں اور افسانوی خالہ میں وسیع تفاوت ہے۔ افسانوی خالہ غصیلی اور حاوی شخصیت کی حامل ہے اور بعض اوقات تو جھگڑالو بھی۔ لیکن میری سگی خالہ مہربان اور نرم خُو، خیال رکھنے والی روایتی بیوی اور شفیق والدہ ہیں ...... میرے لیے بڑا مرحلہ ناولوں میں سماجی حقائق سے نپٹنا رہا ہے ...... اس لیے نہیں کہ میں معاشرے کے تاریک پہلوؤں کا کُھلا ناقد بننے سے ڈرتا ہوں بلکہ اس لیے کہ تند و تیز جذبات اور طیش سیاست کو ادب پر غلبے کا موقع فراہم کر دیتے ہیں۔ معاشرے کا رکن ہونے کے ناطے ناول نگار کو اپنے مؤقف کو بیان کرنے کا پُورا حق حاصل ہے لیکن لکھتے ہوئے اُسے انسانیت کے مؤقف کو مدِنظر رکھنا چاہیے ...... ایک لکھاری کے لیے بہترین طریقۂ اظہار اُس کی تحریریں ہیں۔''

VVVV

پرواز
(Soaring)

ارض وسما کی تعظیم کے بعد ہنا کھا ہانگ ژی اپنے جوش پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اُس کی دُلھن کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا لیکن اُس کے سڈول بازو اور پتلی کمر ظاہر کر رہی تھی کہ وہ شمالی جیاؤ ژہو قصبے کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ پری جمال ہے۔ چالیس سالہ اور چیچک سے بُری طرح بگڑے چہرے والا ہانگ ژی شمال مشرقی گاؤمی قصبے کا معروف کنوارہ تھا۔ اُس کی پیرانہ سال ماں نے حال ہی میں اُس کی شادی یان یان سے، اُس کی بہن یانگ ہُوا کے، جس کا حسن گاؤمی کا خالص حسن تھا، وٹے سٹے میں طے کی تھی۔ اُس کی شادی یان یان کے گونگے بھائی سے ہو رہی تھی۔ اپنی بہن کی قربانی سے بہت زیادہ متاثر ہو کر ہانگ ژی نے سوچا کہ وہ گونگے کے بچے پیدا کرے گی اور اُس کے اُلجھے ہوئے جذبات کی تہہ میں اپنی دُلھن کے لیے نفرت کی لہر نے جنم لیا۔ گونگے، اگر تم نے میری ننھی بہن کو تنگ کیا تو میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔

دوپہر کو ہانگ ژی کی دُلھن حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی۔ بے وقوف بچوں کے ایک گروہ نے کھڑکی ڈھانپنے کے لیے لگائے گئے گلابی کاغذ میں چھید ڈال دیے تھے تا کہ جب دُلھن اینٹوں کے بستر پر بیٹھے تو وہ بے ہودگی سے تانک جھانک کر سکیں۔ ایک پڑوسن نے ہانگ ژی کے کندھے کو تھپتھپایا اور ٹھٹھے بازی کرنے لگی۔ ''موچھلو، تم خوش قسمت انسان ہو۔ تمھیں کنول کا نرم و گداز پھول ملا ہے، اُسے نرمی سے برتنا۔''

ہانگ ژی نے اپنے پاجامے سے ہاتھ رگڑے اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ اُس کے چہرے کے نشان سُرخ پڑ کر دمکنے لگے۔

آسمان پر سُورج جامد کھڑا تھا جب کہ ہانگ ژی رات ہونے کے انتظار میں صحن میں اِدھر اُدھر بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اُس کی ماں اپنی لاٹھی کے سہارے لنگڑاتی ہوئی آئی اور بولی۔ ''ژی، میری نئی نویلی بہو میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔ خیال رکھنا وہ بھاگ نہ نکلے۔''

''ماں، فکر مت کرو۔ یانگ ہُوا کے وہاں ہوتے ہوئے وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ اُن ٹڈوں کی طرح ہیں جنھیں ایک ہی رسّی سے باندھ دیا گیا ہو کہ ایک دُوسرے کے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔''

ماں اور بیٹا باتیں کر ہی رہے تھے کہ نئی نویلی دُلھن دو مصاحباؤں کے ہمراہ، باہر صحن میں نکل آئی ۔ ہانگ ژی کی ماں بُرا مناتے ہوئے بڑبڑائی ۔''کیا کسی نے کبھی سُنا ہے کہ اندھیرا پڑنے سے پہلے دُلھن خُود کو آرام دینے کی غرض سے بستر سے اُٹھ آئی ہو؟ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شادی زیادہ عرصہ چلنے والی نہیں ۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے ۔''

لیکن ہانگ ژی اپنی بیوی کے حسن و جمال کے سحر میں ایسا کھویا کہ وہ ماں کی پریشانی پر دھیان نہیں دے سکا ۔ اُس کا چہرہ بیضوی، بھنویں عمدہ، ستواں ناک اور آنکھیں ققنُس کے مانند ترچھی تھیں ۔ لیکن جب اُس نے ہانگ ژی کا چہرہ دیکھا تو اُس کے قدم وہیں تھم گئے اور ایک لمبے سکوت کے بعد وہ چیخ مار کر بھاگ اُٹھی ۔ مصاحباؤں نے دوڑ کر اُسے بازوؤں سے پکڑنا چاہا تو اُس کے سرخ چغے نے دھجی دھجی ہو کر اُس کے برف جیسے سپید بازو، نرم و نازک گردن اور نیچے پہنی شمیز کو عریاں کر دیا ۔

ہانگ ژی ہکا بکا رہ گیا ۔ اپنی لاٹھی کی متعدد چوٹوں سے، اُس کے سر پر طبلہ بجاتے ہوئے، اُس کی ماں چلائی ۔''اُس کے پیچھے جاؤ، احمق!''

یہ سنتے ہی وہ سکتے سے باہر آیا اور لڑکھڑاتے ہوئے اُسے کے پیچھے دوڑ پڑا ۔

یان یان اپنے کھلے بالوں کو پرندے کی دُم کی طرح ہلاتی ہوئی گلی میں نکل گئی ۔

''اُسے روکو ۔'' ہانگ ژی چیخا ۔''روکو اُسے ۔''

اُس کی چیخوں نے گھروں سے لوگوں کے جتھے کے جتھے باہر گلی میں نکال دیے اور درجن بھر سے زائد وحشیانہ انداز میں بھَو نکتے ہوئے جسیم اور خوفناک کتوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ۔

یان یان نے مُڑ کر جنوبی سمت ایک کھیت کا رُخ کیا جہاں گندم کے پودے ہَوا سے جھکے ہوئے تھے ۔ اُن کی بالیاں سبز سمندر کی لہروں کے مانند ڈُوب اور اُبھر رہی تھیں ۔ یان یان گندم کی کمر جتنی بلند لہروں کو روندتی چلی گئی ۔ اُن کا سبز رنگ اُس کی سرخ شمیز اور دُودھ جیسے سفید بازوؤں کے امتزاج سے ایک خُوب صُورت متحرک تصویر بنا رہا تھا ۔

ایک دُلھن کا شادی کے روز بھاگ نکلنا، شمال مشرقی گاؤں قصبے کے سب باسیوں کے لیے توہین آمیز تھا ۔ لہٰذا گاؤں کے تمام مرد ایک انتقامی جذبے کے تحت اُس کے تعاقب میں تھے اور اُسے چاروں طرف سے گھیر رہے تھے ۔ کتے بھی سبز لہروں میں اُچھلتے کودتے پیچھے تھے ۔

جیسے ہی انسانی جال قریب ہوا یان یان نے گندم کی لہروں میں غوطہ لگا دیا ۔

ہانگ ژی نے سکون کا سانس لیا ۔ متعاقب سست پڑ گئے ۔ وہ بھاری بھاری سانسیں لیتے اور ہاتھ ملتے ہوئے نہایت محتاط ہو کر گھیرا تنگ کر رہے تھے جیسے مچھیرے جال کستے ہیں ۔

اچانک کھیت سے سرخ روشنی کی ایک دھار بلند ہوئی، جس نے مجمعے کو ہکا بکا کر دیا اور وہ زمین

پر گر گئے۔ پھر اُنھوں نے یان یان کو دیکھا۔ وہ گھیرے سے سلیقے سے بلند ہوئی تو فضا میں اپنے ہاتھوں کو تیزی سے حرکت دے رہی تھی اور اُس کی ٹانگیں ایک عظیم الجثہ تتلی کے مانند آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔

لوگ مٹی کے بتوں کی طرح ساکت ہو گئے۔ اُس نے ہاتھوں کو ہلاتے اور اُن کے اُوپر منڈلاتے ہوئے فاصلہ بڑھایا۔ پھر اُس نے اُڑنا شروع کیا۔ اُس کی پرواز اس قدر آہستہ تھی کہ اگر وہ اُس کے پیچھے بھاگنا چاہتے تو اُس کے سایے کے ہم قدم رہ سکتے تھے۔ وہ اُن کے سروں سے محض چھ سات میٹر کی بلندی پر تھی لیکن اوہ، وہ بہت پُرکشش اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔ عجیب ترین شے یا واقعہ جس کے بارے میں وہ سب کچھ جو آپ سوچ سکتے ہیں شمال مشرقی گاؤمی قصبے میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت آسمان کی رفعتوں کو چُھو رہی تھی۔

صدمے سے گزرنے کے بعد لوگوں نے تعاقب جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ لوگ گھروں کو بھاگے اور اُس کے سائے کو پیچھا کرنے کے لیے اپنی سائیکلوں پر لوٹے۔ وہ اُسے پکڑنے کے لیے اُس کے زمین پر اُترنے کے منتظر تھے۔

بَوابازار نیچے موجود لوگ پکڑن پکڑائی کا ڈراما کھیتوں میں ہر طرف سے آنے والی لوگوں کی چیخ و پکار کے باوجود انہماک سے کھیل رہے تھے۔ گاؤں والوں کے ساتھ مل کر راہ گیر بھی آسمان پر ہونے والا تحیّر انگیز واقعہ گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ پرواز کرنے والی عورت سحر انگیز حد تک حسین و جمیل تھی۔ اُس کے متعاقب بھاگتے بھاگتے زمین سے اُوپر دیکھتے، ناہموار کھیتوں میں لڑکھڑاتے اور ہاری ہوئی فوج کے سپاہیوں کی طرح ایک دُوسرے سے ٹکراتے۔

آخر کار یان یان قصبے کے مشرقی کنارے پر قبرستان کے بیچوں بیچ لگے صنوبروں کے جھنڈ پر اُتر گئی۔ تقریباً ایک ایکڑ کو محیط سیاہ صنوبر شمال مشرقی گاؤمی کے آباواجداد کی سینکڑوں مٹی کی ڈھیریوں کی نگرانی کرتے چلے آرہے تھے۔ وہ تمام قدیمی درخت سیدھے اور اُونچے اُونچے تھے کہ اُن کی چوٹی کی شاخیں نچلے بادلوں کو کاٹ ڈالتی تھیں۔ پُرانا قبرستان اور کالے صنوبروں کا جھنڈ دونوں قصبے کے نہایت خوف ناک اور بہت مقدس مقامات تھے۔ مقدس اس لیے کہ وہ قصبے والوں کے اجداد کی آرام گاہ تھی اور خوف ناک اس بنا پر کہ بھوت پریتوں کے تمام واقعات وہیں پیش آئے تھے۔

یان یان قبرستان کے عین درمیان میں لگے سب سے بلند اور سب سے قدیم درخت کی چوٹی پر ٹک گئی۔ نیچے آتے ہوئے لوگوں نے اُس کا وہاں تک پیچھا کیا۔ پھر کھڑے ہو کر اُوپر اُسے دیکھنے لگے کہ وہ بلندترین نازک شاخوں پر نرمی سے بیٹھی تھی جنھوں نے اُسے بہ آسانی سنبھال رکھا تھا حالاں کہ اُس کا وزن سو پونڈ سے زائد تھا۔ اُسے دیکھنے والوں کے لیے یہ امر باعثِ حیرت تھا۔

درجن بھر سے زائد کتے اپنے سر اُٹھائے فضا میں تیرتی یان یان پر بھونک رہے تھے۔

ہانگ ژی چلّایا۔ ''نیچے آجاؤ، اِسی وقت نیچے اُتر آؤ۔''

کتوں کا بھونکنا اور ہانگ ژی کا چلّانا بہرے کو داستانِ غم سُنانے کے مترادف ثابت ہوا۔ یان یان بے نیازی سے بیٹھی ہَوا کے جھونکوں کے ساتھ اُوپر نیچے جھول رہی تھی۔

سوائے چند پُرجوش لڑکوں کے، نیچے موجود ہجوم جلد ہی وہاں فضول کھڑے کھڑے اُکتا گیا۔ لڑکے چلّا رہے تھے۔ ''نئی دُلھن، اے نئی دُلھن! ہم تمھیں اُور اُڑتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔''

یان یان نے اپنے بازو اُوپر اُٹھائے۔ ''اُڑو۔'' لڑکے چیخے۔ ''کچھ اور اُڑو۔ وہ اُڑنے لگی ہے۔'' لیکن اُس نے اُڑنے کے بجائے شکاری پرندے کے مُڑے ہوئے پنجوں جیسی اپنی اُنگلیاں بالوں میں یُوں پھیریں جیسے پرندہ چونچ سے اپنے پَر سنوارتا ہے۔

ہانگ ژی گھٹنوں کے بَل گر گیا اور آہ و بکا کرنے لگا۔ ''چاچیو، مامیو، بھائیو، ساتھیو! اُسے نیچے اُتارنے میں میری مدد کرو۔ تمھیں تو پتا ہے کہ مجھے کتنی مشکل سے بیوی ملی ہے۔''

اُسی لمحے ہانگ ژی کی ماں ایک گدھے پر وہاں آپہنچی۔ وہ پھسل کر اُس کی پشت سے اُتری اور ٹھوکر کھا کر زمین پر گر کے درد سے ہائے ہائے کرنے لگی۔

''کہاں ہے وہ؟'' بُڑھیا نے ہانگ ژی سے دریافت کیا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

ہانگ ژی نے درخت کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ وہاں اُوپر ہے۔''

ہاتھوں کا چھجا بنا کر بُڑھیا نے اُوپر دیکھا کہ اُس کی بہو اُوپر درخت پر کہاں بیٹھی ہے اور اُس نے چیخ ماری۔ ''ڈائن! وہ ڈائن ہے۔''

قصبے کا سربراہ آئرن ماؤنٹین بولا۔ ''وہ ڈائن ہے یا نہیں لیکن ہمیں اُسے نیچے لانے کا طریقہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ اِس سلسلے کا اب انجام ہونا چاہیے جیسے ہر چیز کا ایک انجام ہوتا ہے۔''

''بڑے۔'' بُڑھیا بولی۔ ''میں تمھاری منّت کرتی ہوں کہ براہِ مہربانی اِس معاملے کو سنبھالو۔''

جس پر آئرن ماؤنٹین نے جواب دیا۔ ''اب ہم سب سے پہلے یہ کریں گے کہ اِس کی ماں، بھائی اور یا نگ ہُوا کو لانے کے لیے کسی کو شمالی جیاؤ ژہُو قصبے کو بھیجیں گے۔ اگر پھر بھی یہ نیچے نہیں آتی تو ہم یانگ ہُوا کو یہاں رکھ لیں گے اور اُسے واپس نہیں جانے دیں گے۔ ہمارا اگلا قدم یہ ہوگا کہ ہم کچھ لوگوں کو گھر بھیج کر تیر کمانیں بنوائیں گے اور کچھ لمبے لمبے بانس کٹوائیں گے۔ اگر یہ حربے ناکام ہوئے تو ہم سخت قدم اُٹھا کر اُسے نیچے لائیں گے اور ہم اِس کی رپورٹ مقامی حکومت کو کریں گے۔ چُوں کہ ہانگ ژی اور وہ میاں بیوی ہیں لہٰذا مقامی حکومت عائلی قوانین کی پاسداری کے لیے لازماً مداخلت کرے گی۔ تو ٹھیک ہے، ہانگ ژی تم یہیں درخت کے نیچے ٹھیر کر اُس پر نظر رکھو۔ ہم کسی کو ٹُل دے کر واپس بھیجیں گے۔ اگر کچھ ہو جائے تو اُسے بجا دینا۔ تمھیں سب کچھ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے اُس

سے مجھے قوی یقین ہے کہ اُس پر آسیب ہے۔ ہمیں گاؤں واپس جا کر ایک کتا بھی مارنا ہوگا تاکہ بوقتِ ضرورت ہمارے پاس کتے کا خون موجود ہو۔"

ہجوم نے بکھر کر تیاری کرنے کے لیے واپسی کا رُخ کیا۔ ہانگ ژی کی ماں نے اپنے بیٹے کے ہمراہ رُکنے پر اصرار کیا لیکن آئرن ماؤنٹین سخت آدمی تھا۔ "بے وقوف مت بنو۔ تم یہاں رُک کر کون سا کارنامہ سرانجام دے سکتی ہو؟ اگر صُورتِ حال بگڑ گئی تو تم درمیان ہی میں پکڑی جاؤ گی۔ گھر جاؤ۔" بحث کو بے سُود پا تے ہوئے بُوڑھیا گدھے کی پشت پر سوار ہوئی اور وہاں سے روتی پیٹتی چلی گئی۔

کہرام کے ختم ہوتے ہی ہانگ ژی نے، جو شمال مشرقی گاؤمی قصبے کا بہادر ترین شخص گردانا جاتا تھا، سکوت کو ناقابلِ برداشت پایا۔ سُورج کے مغرب میں غروب ہوتے ہی درختوں کے بیچ ہَوا چکّرانے اور رَونے لگتی تھی۔ ہانگ ژی نے سر جھکا کر اپنی دُکھتی ہوئی گردن کو مَلا اور قریب پڑے پتھر کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ سلگا رہا تھا کہ ایک منحوس قہقہے کی آواز اُوپر سے نیچے اُتری۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اُس نے اپنے پُورے بدن میں کپکپی محسوس کی۔ وہ تیزی سے تیلی بجھا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کئی قدم پیچھے ہٹ کر اُوپر درخت کی چوٹی کو دیکھا۔ "مجھ پر چڑیلوں والے حربے استعمال مت کرو۔ صبر کرو، ذرا میرے ہاتھ لگ جاؤ۔"

پس منظر میں ڈُوبتے ہوئے سُورج میں لگتا تھا جیسے یان یان کی لال شمیز کو آگ لگی ہوا ور اُس کا چہرہ ملمع چڑھی شے کے مانند چمک رہا تھا۔ ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا کہ وہ منحوس قہقہہ اُس نے لگایا ہے۔ اپنے گھونسلوں کو لوٹتا ہوا کوّوں کا ایک غول پاس سے گزرا تو اُن کی سرمئی بیٹیں بارش کی طرح گریں۔ بہت سی گرم گرم بیٹیں سیدھی اُس کے سر پر آ گریں۔ زمین پر تھوکتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ اُس پر بدقسمتی آ گری تھی۔ اگرچہ درخت کی چوٹیاں اب بھی دھوپ سے روشن تھیں لیکن صنوبروں کے جھنڈ میں اندھیرا اُتر آیا تھا اور چمگادڑیں درختوں کے اردگرد اور اُن کے بیچ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتی بکھر رہی تھیں۔ قبرستان میں لومڑیاں چلّانے لگی تھیں۔ اُس کا خوف لوٹ آیا۔

جھنڈ میں ہر سمت بَدرُوحیں تھیں۔ وہ اُنھیں محسوس کر سکتا تھا۔ اُس کے کانوں میں ہر طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ منحوس قہقہہ سُنائی دیتا رہا اور اُس ہر بلند آہنگ آواز سے، اُسے ٹھنڈے پسینے چھوٹتے رہے۔ اُسے یاد آیا کہ اپنی درمیانی اُنگلی کی پور کو چبانا بدرُوحوں کو بھگانے کا بہترین طریقہ ہے۔ اُس نے یہی کیا۔ تیز درد کی رَو نے اُس کا دماغ صاف کر دیا۔ اب جھنڈ اُسے پہلے جتنا تاریک نہیں لگ رہا تھا۔ وہ قبروں کی ڈھیریوں اور اُن کے سرہانے لگے کتبوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اُسے ڈُوبتی ہوئی دھوپ کی چتّیاں درختوں کے تنوں پر نظر آ رہی تھیں۔ کچھ چھوٹی لومڑیاں قبروں کے بیچ اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں، جن پر گھاس کے ڈھیر پر بیٹھی اُن کی ماں نظر رکھے ہوئے تھی اور وہ ہر بار ناخوش کن آواز میں غرّاتے ہوئے، اُنھیں

اپنی موجودگی کا احساس دِلا رہی تھی۔ پھر اُس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ ساکت وصامت یان یان کے گرد کوے منڈلا رہے تھے۔

ایک زرد رُو چھوٹے لڑکے نے، دو درختوں کے درمیان سے نمودار ہو کر، اُسے ایک ٹُل اور لکڑی کا ہتھوڑا، ایک کلھاڑی اور ایک بڑا سا خشک کیک دیا۔ لڑکے نے اُسے بتایا کہ آئرن ماؤنٹین تیر کمانوں کے بننے کی نگرانی کر رہا ہے، لوگ شالی جیاؤ زہو روانہ کر دیے گئے ہیں اور قصبے کے معززین اس معاملے کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ وہ جلد ہی کسی کو یہاں بھیجیں گے۔ ہانگ ژی خشک کیک سے اپنی بھوک مٹا کر نگرانی جاری رکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو وہ ٹُل بجا سکتا تھا۔

جب لڑکا جا چکا تو ہانگ ژی نے ٹُل کو کتبے کے پتھر پر رکھا، کلھاڑی کو اپنے سینے میں اڑسا اور خشک کیک نگلنے لگا۔ کھانا ختم کرتے ہی اُس نے کلھاڑی نکالی اور چیخا۔ ''تم نیچے آ رہی ہو یا نہیں؟ نہیں تو میں یہ درخت ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔''

یان یان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

ہانگ ژی نے کلھاڑی درخت میں دے ماری تو وہ بُری طرح ہلنے لگا۔ اب بھی یان یان کی کوئی آواز نہیں آئی۔ کلھاڑی اتنی بُری طرح گڑی تھی کہ وہ اُسے نکال نہیں پایا۔

کیا وہ مر گئی؟ ہانگ ژی حیرت زدہ تھا۔

ہانگ ژی نے اپنے بیلٹ کو کس کر جوتے اُتارے اور درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ کھردرے تنے پر چڑھنا آسان ثابت ہوا اور جب وہ آدھ میں پہنچ گیا تو اُس نے رُک کر اُوپر دیکھا۔ اُس کشادہ منظر دِکھانے والے مقام سے، اُس نے، اُس کی لٹکتی ہوئی ٹانگیں اور شاخ پر دھرے ہوئے کولہے دیکھے۔ اُس نے غصّے سے سوچا: اِس وقت مجھے تمھارے ساتھ بستر میں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے تم مجھے ایک درخت پر چڑھا رہی ہو۔ اُس کا اشتعال طاقت میں بدل گیا۔ تاہُوں جُوں پتلا ہوتا گیا وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا جس سے اُس کے اُوپر چھتری پر چڑھنا آسان ہو گیا جہاں اُس نے اپنے قدم جمائے اور وہ چپکے سے اُسے پکڑنے کو لپکا۔ ابھی اُس نے اُس کے پاؤں کے تلوے کو چھوا ہی تھا کہ اُسے ایک طویل آہ سُنائی دی اور اُس نے اپنے اُوپر شاخوں میں ہل جل محسوس کی۔ سونے کے ٹکڑے ہَوا میں اُچھلے جیسے پانی میں مچھلیوں کی قطار اُچھلتی ہے۔ یان یان نے اپنے بازو پھڑ پھڑائے اور چھتری سے اُوپر اُٹھ گئی۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دیتی اور بالوں کو ہَوا میں لہراتی ہوئی اُڑ کر ایک دُوسرے درخت کی چوٹی پر جا بیٹھی۔ ہانگ ژی یہ دیکھ کر متنبہ ہو گیا کہ گندم کے کھیت کی نسبت اُس کے اُڑنے کی صلاحیتوں میں بظاہر اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ پہلے ہی جیسے انداز میں نئے درخت کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ غروب ہوتے ہوئے گلابی

سُورج کے سامنے وہ خُود بھی ایک تازہ گلاب لگ رہی تھی۔ ''یان یان۔'' ہانگ ژی نے آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں اُسے پُکارا۔ ''میری پیاری بیوی، گھر چلو اور میرے ساتھ زندگی گزارو۔ اگر تم نہیں آؤ گی تو میں یانگ ہُو کو بھی تمھارے گونگے بھائی کے بستر میں نہیں جانے دوں گا.....''

وہ فضا میں لٹکا ہوا چیخ رہا تھا کہ اُس نے اپنے نیچے کچھ ٹُوٹنے کی آواز سُنی۔ شاخ تڑاک سے ٹُوٹی اور وہ زمین پر گوشت کے بے جان لوتھڑے کی طرح آ گرا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے سے پہلے وہ کافی دیر تک وہیں پڑا رہا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ڈھیرے ڈھیرے صنوبر کے گلتے سڑتے کانٹوں کے قالین سے اُٹھایا اور درخت کے تنے کی طرف چلتے ہوئے چند آزمائشی قدم بھرے۔ سوائے درد اور تکلیف کے وہ بالکل ٹھیک تھا..... اُس کی ہڈیاں سلامت تھیں۔ اُس نے یان یان کی تلاش میں آسمان پر دیکھا تو اُسے چاند دِکھائی دیا جس کی پانی جیسی کرنیں صنوبر کی شاخوں سے چھن چھن کر نیچے قبروں کے کچھ حصّوں، کتبے کے ایک سرے کو اور عارضی طور پر پیدا ہو جانے والی کائی کی ایک ڈھیری پر پڑ رہی تھیں۔ یان یان چاندنی میں نہائی ہوئی ایک بڑے جسیم اور خُوب صُورت پرندے کے مانند لگ رہی تھی جو شب بسری کے لیے درخت پر آ بیٹھا ہو۔

کسی نے قبرستان کے باہر سے اُس کا نام پُکارا۔ اُس نے چلّا کر جواب دیا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے بِل کتبے پر رکھا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا لیا لیکن اُسے لکڑی کا ہتھوڑا کہیں نہیں ملا۔

شور مچاتا ہجوم لالٹینوں، تارچوں اور فلیش لائٹوں کے ہمراہ صنوبروں کے جھنڈ میں داخل ہوا، جو درختوں کے بیچ خالی جگہوں کو روشن کرتی ہوئیں چاندی کرنوں کو پلٹا رہی تھیں۔

اُن میں یان یان کی بُوڑھی ماں، اُس کا بڑا بھائی اور ہانگ ژی کی بہن یانگ ہُوا بھی شامل تھی۔ اُس نے آئرن ماؤنٹین اور سات آٹھ اچھے تن و توش والے آدمیوں کو دیکھا، جن کی کمروں سے تیر کمانیں لٹک رہی تھیں۔ دُوسروں کے پاس لمبے بانس، شکاری رائفلیں، یہاں تک کہ پرندے پکڑنے والے جال بھی تھے۔ پیلگوں سبز وردی میں ایک وجیہہ جوان آدمی اپنی کمر کے گرد چوڑے بیلٹ میں سرکاری پستول باندھے ہوئے تھا۔ ہانگ ژی نے پہچان لیا کہ وہ مقامی پولیس والا تھا۔

ہانگ ژی کے چہرے پر زخموں اور خراشوں کو دیکھ کر آئرن ماؤنٹین نے استفسار کیا۔ ''یہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' اُس نے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟'' یان یان کی ماں نے بلند آواز میں پُوچھا۔

ایک نے درخت کی چوٹی کی طرف فلیش لائٹ لگائی اور پھر روشنی سیدھی اُس کے چہرے پر ڈالی۔ لوگوں نے اُوپر شاخیں ہلنے کی آوازیں سُنیں اور پھر ایک سیاہ سائے کو خاموشی سے اُس درخت سے

دُوسرے درخت کی چوٹی پر جاتے دیکھا۔

''حرامیو!'' یان یان کی ماں نے گالی دی۔''میں جانتی ہوں کہ تم نے میری بیٹی کو قتل کر دیا ہے اور اب تم ایک بُوڑھی بیوہ اور اُس کے یتیم بیٹے کو ایک جھوٹی کہانی سُنا رہے ہو۔ایک لڑکی اُلّو کے مانند کیسے اُڑ سکتی ہے؟''

''خالہ، ٹھنڈی پڑو۔'' آیرَن ماؤنٹین بولا۔''ہم اِس پر کبھی یقین نہ کرتے اگر ہم نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا۔ مجھے یہ بتاؤ کیا کبھی تمھاری بیٹی کسی عامل سے علم حاصل کرتی رہی ہے؟ غیر معمولی علوم سیکھے ہیں؟ اُس کا ساحراؤں یا جادوگرنیوں سے کوئی تعلق رہا ہے؟''

''میری بیٹی کبھی کسی عامل سے نہیں پڑھی۔'' یان یان کی ماں نے کہا۔''اور نہ ہی اُس نے غیر معمولی علوم سیکھے ہیں اور یقیناً اُس کا ساحراؤں اور جادوگرنیوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ جب وہ بڑی ہو رہی تھی تو میں نے اُسے اپنی نظروں میں رکھا اور وہ ہمیشہ وہی کرتی تھی، جو اُسے کہا جاتا تھا۔تمام پڑوسی کہتے تھے کہ مجھے کتنی اچھی لڑکی نصیب ہوئی ہے۔اب یہ اچھی لڑکی تمھارے گھر ایک دِن گزارنے کے بعد عقاب بن کر درخت پر جا بیٹھی ہے۔یہ کیسے ہوا؟ میں اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گی جب تک یہ نہ معلوم کر لوں کہ تم نے اُس کے ساتھ کیا کِیا ہے۔ مجھے میری یان یان لوٹا دو ورنہ تمھیں یا نگ ہُوا کبھی واپس نہیں ملے گی!''

''اتنی بکواس بھی بہت ہے، بڑی خالہ۔''پولیس والا بولا۔

''اپنی نظریں درخت کی چوٹی پر رکھو۔''اُس نے اپنی فلیش لائٹ کا رُخ درخت کے اُوپر کی طرف کیا، پھر اُسے روشن کیا اور اُس کی روشنی کی دھار کو، یان یان کے چہرے پر ڈالا۔وہ بازو پھڑ پھڑاتی ہوئی اُوپر اُٹھی اور ایک اَور درخت کی چوٹی پر چلی گئی۔

''بڑی خالہ،تم نے اُسے دیکھا؟''پولیس والے نے پُوچھا۔

''ہاں۔''یان یان کی ماں بولی۔

''کیا یہ تمھاری بیٹی ہی ہے؟''

''یہ میری بیٹی ہے۔''

''ہم کوئی خطرناک قدم اُٹھانا نہیں چاہتے جب تک کہ یہ مجبوری نہ بن جائے۔''پولیس والا بولا۔''اگر تم اُسے کہو گی کہ وہاں سے نیچے اُتر آئے تو وہ تمھاری مان لے گی۔''

اُسی وقت یان یان کا گونگا بھائی جوش سے غوں غاں کرنے اور اپنے بازوؤں کو حرکت دینے لگا جیسے وہ اپنی بہن کے اُڑنے کی نقالی کر رہا ہو۔

یان یان کی ماں زار و قطار رَو رہی تھی۔''میں نے اپنے پچھلے جنم میں ایسا کیا کر دیا جو آج مجھے

یہ بھوگنا پڑ رہا ہے۔''

''بڑی خالہ، روؤ مت۔'' پولیس والے نے کہا۔''اپنی بیٹی کو وہاں سے نیچے لانے پر توجہ دو۔''

''وہ ہمیشہ سے مضبوط ارادے کی مالک رہی ہے۔ شاید وہ میری بات نہ مانے۔'' یان یان کی ماں نے افسردگی سے اعتراف کیا۔

''یہ رونے پیٹنے کا وقت نہیں ہے، بڑی خالہ۔'' پولیس والا بولا۔''اُسے نیچے بلاؤ۔''

ننھے ننھے بوجھل پیروں کے ساتھ یان یان کی ماں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی اُس درخت کی طرف گئی جس پر اُس کی بیٹی نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اُس نے اپنا سر پیچھے کی سمت جھکایا اور رُندھی ہوئی آواز میں پکارنے لگی۔''یان یان، اچھی بیٹی بنو اور اپنی ماں کی بات مانو۔ براہِ مہربانی نیچے آ جاؤ...... مجھے پتا ہے کہ تمھارے ساتھ غلط سلوک ہوا ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نیچے نہیں آئیں تو ہم یانگ ہُوا کو نہیں رکھ سکیں گے اور اگر یہ ہو گیا تو خاندان ختم ......''

بُڑھیا کلام جاری نہ رکھ سکی اور گریہ کرتے ہوئے اپنا سر درخت کے تنے پر مارنے لگی۔ درخت کی چوٹی سے ایک کھردری آواز آئی جو پرندے کے پروں کے پھڑ پھڑانے جیسی تھی۔

''بات جاری رکھو۔'' پولیس والے نے اصرار کیا۔

گونگے نے اپنے بازوؤں کو حرکت دی اور بلند آواز میں اُوپر بیٹھی اپنی بہن کی جانب غوں غاں کی۔

''یان یان۔'' ہانگ ژی چلّایا۔ تم ابھی انسان ہو۔ کیا نہیں ہو؟ اگر تم میں رتّی بھر بھی انسانیت بچی ہے تو نیچے اُتر آؤ۔''

یانگ ہُوا بھی نوحے میں شامل ہو گئی۔''بھابھی، براہِ مہربانی نیچے آ جاؤ۔ اِس دنیا میں تم اور میں دونوں ہی شکار ہوئی ہیں۔ میرا بھائی بدصورت ضرور ہے لیکن بول تو سکتا ہے۔ مگر تمھارا بھائی ...... براہِ مہربانی نیچے آ جاؤ...... یہی ہماری قسمت ہے......''

یان یان دوبارہ فضا میں اُڑنے لگی اور اُس نے لوگوں کے اُوپر آسمان کا ایک چکر لگایا۔ شبنم کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے زمین پر گرے...... جو شاید اُس کے آنسو تھے۔

''پرے ہٹ جاؤ، اُسے اُترنے کے لیے جگہ دو۔'' آئرن ماؤنٹین نے ہجوم سے کہا۔

بُڑھیا اور یانگ ہُوا کے سوا سب پیچھے ہٹ گئے۔

لیکن جو آئرن ماؤنٹین نے سوچا تھا وہ نہیں ہوا کیوں کہ لوگوں کے اُوپر سے چکر لگانے کے بعد یان یان واپس درخت پر جا بیٹھی۔

چاند آسمان میں مغربی سمت چلا گیا تھا اور رات گہری ہو گئی تھی۔ زمین پر موجود لوگوں پر تھکن

اور ٹھنڈ نے غلبہ پانا شروع کر دیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سخت قدم ہی اُٹھانا پڑے گا۔''پولیس والے نے کہا۔

آئرن ماؤنٹین بولا۔''مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہجوم اُسے جھنڈ سے بھگا نہ دے اور اگر ہم اُسے آج کی رات نہ پکڑ سکے تو بعد میں یہ کام بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''میرا اندازہ ہے کہ۔''پولیس والے نے کہا۔''اُس کے پاس زیادہ دُور تک اُڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ اگر وہ جھنڈ سے نکل جائے تو درحقیقت اُسے پکڑنا آسان ہو گا۔''

''لیکن اگر اُس کے خاندان والوں نے ہمارے منصوبے سے اتفاق نہ کیا تو؟'' آئرن ماؤنٹین بولا۔

''میں اُن سے نبٹتا ہوں۔''پولیس والے نے اُسے یقین دہانی کروائی۔

وہ اُن کی طرف گیا اور اُس نے نوجوانوں کو ہدایت کی کہ گونگے اور اُس کی ماں کو صنوبر وں کے جھنڈ سے باہر لے جائیں۔ بُڑھیا نے، جو رورو کر نڈھال ہو رہی تھی، کوئی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ گونگے نے اپنی ناراضگی کا اظہار غوں غاں کر کے کیا لیکن جب پولیس والے نے اُسے اپنے سرکاری پستول کی جھلک دکھائی تو وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ اب وہاں صرف پولیس والا، آئرن ماؤنٹین، ہانگ ژی اور دو اور آدمی رہ گئے تھے، جن میں سے ایک کے پاس بانس اور دُوسرے کے پاس جال تھا۔

''گولی چلنے کی آواز لوگوں کو خبردار کر دے گی۔''پولیس والے نے کہا۔''لٰہذا ہم تیر کمان استعمال کریں گے۔''

''میری نظر کمزور ہے۔'' آئرن ماؤنٹین بولا۔''اِس لیے میں یہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ اگر قریب کا نشانہ ہوتا تو میں اُسے مار گراتا۔ ہانگ ژی یہ کام سرانجام دے۔''

اُس نے بانس کی بنی کمان اور پَر لگا ایک تیز دھار تیر ہانگ ژی کے حوالے کیا۔ اُس نے اُنھیں اُس سے لے تو لیا لیکن گہری سوچ میں ڈوبا محض کھڑا رہا۔''میں یہ نہیں کر سکتا۔'' اچانک یہ احساس ہوتے ہی کہ اُس سے کیا توقع کی جا رہی ہے وہ بولا۔''میں نہیں کر سکتا۔ میں نہیں کروں گا۔ وہ میری بیوی ہے۔ کیا نہیں ہے؟ میری بیوی!''

''ہانگ ژی۔'' آئرن ماؤنٹین بولا۔''احمق مت بنو! تمھارے بازوؤں میں وہ تمھاری بیوی ہے لیکن درخت کی بلندی پر بیٹھی وہ ایک عجیب النسل پرندہ ہے۔''

''تم لوگ۔''پولیس والا غصّے سے بولا۔''کیا تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے؟ اگر تم نے کھڑے کھڑے محض باتیں ہی بگھارنا ہیں تو تیر کمان مجھے دو۔''

اُس نے اپنے پستول کو ہولسٹر میں ڈالا، تیر کمان لیا، درخت کی چوٹی پر نشانہ باندھا اور تیر چھوڑ دیا۔ ایک مدہم بھدی آواز نے اُنھیں بتایا کہ اُس کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ درخت کی چوٹی ہلنے لگی تو اُنھوں نے دیکھا کہ تیر یان یان کے پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ وہ چاندنی میں اُڑ کر ایک دُوسرے درخت کی چھتری پر جانے کے لیے اُوپر کو اُٹھی۔ لیکن اب وہ زیادہ دیر تک اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ پولیس والے نے ایک اَور تیر چلّے پر چڑھایا، یان یان کا نشانہ باندھا جو ایک چھوٹے صنوبر پر پاؤں پسارے پڑی تھی۔ وہ چیخا۔ ''نیچے آؤ، یہاں!'' دُوسرا تیر اُس کی چیخ کی گونج ختم ہونے سے پہلے ہی چل پڑا تھا۔ ایک درد بھری چیخ اُبھری اور یان یان سر کے بَل زمین پر آ گری۔

''حرامزادے!'' ہانگ ژی چلّایا۔ ''تم نے میری بیوی کو مار ڈالا......''

لوگ، جو جھنڈ سے دُور چلے گئے تھے، اپنی لالٹینیں اور ٹارچیں لیے آ گئے۔ ''کیا وہ مر گئی؟'' اُنھوں نے تجسس سے پُوچھا۔ ''کیا اُس کے بدن پر پَر ہیں؟''

ایک لفظ بھی کہے بغیر آئرن ماؤنٹین نے کتے کے خُون کی بوتل اُٹھائی اور اُسے یان یان کے بدن پر اُلٹ دیا۔

VVVV

سانڈ
(Bull)

لاؤلان وہ شخص تھا جس نے مذبح جانوروں کی وریدوں میں دباؤ سے پانی داخل کرنے کا سائنسی طریقہ اختراع کیا تھا۔ اِس طریقے سے، دو صد جن مالیت کے سؤر میں بھری ہوئی بالٹی، خالی کی جا سکتی تھی جب کہ پُرانے طریقے سے آپ پانی کی محض آدھی بالٹی گائے کے لاشے میں خالی کر سکتے تھے۔ اِن برسوں کے دوران میں ہمارے گاؤں کے پانی پر عیار شہریوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ گوشت کی قیمت ادا کر رہے ہیں جو رقم خرچ کی تھی اُس کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ حیرت انگیز حد تک خاصی بڑی رقم ہوگی۔

لاؤلان کی بڑی سی توند، سُرخ گال اور زور سے ٹن ٹن کرتی گھنٹی جیسی آواز تھی۔ ایک فقرے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے جنم ہی ایک امیر کبیر سرکاری اہلکار بننے کے لیے لیا تھا۔ گاؤں کا سربراہ بننے کے بعد اُس نے بے غرضی سے اپنے گاؤں والوں کو پانی داخل کرنے کا طریقہ سکھایا اور مقامی سطح کی عیاری سے امیر بننے کی تحریک کے رہنما کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ کچھ دیہاتی اپنے غم و غصہ کا زبانی اظہار کرتے تو کچھ نے دیواروں پر پوسٹر لگا کر اُس پر حملہ کیا تھا۔ اُسے متشم مزاج جاگیردار طبقے کا نمائندہ کہا جاتا، جو دیہی پرولتاری راج کو نکال باہر کرنے کے درپے تھا۔ لیکن اِس قسم کی گفتگو مروّج نہیں رہی تھی۔ گاؤں کے پی اے (PA) نظام پر لاؤلان نے اعلان کیا: ''اژدر اژدروں کو جنم دیتے ہیں، ققنس ققنسوں کو اور چوہا محض بِل ہی کھودنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔'' کچھ عرصے کے بعد ہمیں ادراک ہوا کہ وہ ایک کنگ فو ماہر کے مانند ہے، جو اپنے شاگردوں کو اپنا تمام فن منتقل نہیں کرتا بل کہ کافی کچھ اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ لاؤلان کے گوشت میں بھی ہر ایک کے گوشت کے مانند پانی شامل ہوتا تھا لیکن اُس کا گوشت زیادہ تر و تازہ اور خوشبودار ہوتا تھا۔ آپ اُسے دو روز تک دھوپ میں رکھ چھوڑتے تب بھی وہ خراب نہ ہوتا جب کہ دیگر لوگوں کا گوشت اگر پہلے ہی روز فروخت نہ ہو پاتا تو اُس میں بہ کثرت کیڑے پڑ جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ اگر اُس کا گوشت پہلے دِن نہ بکتا تب بھی وہ قیمت کم نہ کرتا۔ اُس کے گوشت جیسے اچھے گوشت کو کبھی فروخت نہ ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا۔

میرے ابا، لؤ تا نگ، نے مجھے بتایا کہ لاؤلان اپنے گوشت میں پانی نہیں فارمل ڈی ہائیڈ

(formal dehyde) بھرتا ہے۔ میرے ابا لاؤلان سے زیادہ تیز وطرار تھے۔ اُنھوں نے کبھی طبیعات نہیں پڑھی لیکن وہ منفی اور مثبت بجلی کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے، اُنھوں نے کبھی بیالوجی نہیں پڑھی لیکن وہ بیضے اور نطفے پر مہارت رکھتے تھے اور اُنھوں نے کبھی کیمیا نہیں پڑھی لیکن وہ بخوبی آگاہ تھے کہ فارمل ڈی ہائیڈ بیکٹیریا کو ختم کرسکتا ہے، گوشت کو خراب ہونے سے محفوظ اور لحمیات کو برقرار رکھتا ہے، جس سے اُنھوں نے اندازہ لگایا کہ لاؤلان گوشت میں فارمل ڈی ہائیڈ داخل کرتا ہے۔ اگر میرے والد کا امیر کبیر بننے کا ارادہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ گاؤں کے امیر ترین شخص بن سکتے تھے۔ لیکن وہ تو انسانوں بیچ اژدر تھے اور اژدروں کو جائیدادیں بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ آپ نے گلہری اور چوہے جیسے گھریلو جانوروں کو خوراک جمع کرنے کے لیے بل کھودتے دیکھا ہے لیکن کیا کبھی جانوروں کے بادشاہ شیر کو ایسی حرکت کرتے دیکھا ہے؟ شیر اپنا زیادہ وقت اپنی کچھار میں سوتے ہوئے گزارتے ہیں اور صرف اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر شکار کے لیے کچھار سے باہر نکلتے ہیں۔ بعینہ میرے ابا بھی اپنا بیشتر وقت گھر میں کھاتے، پیتے اور موج مستی کرتے گزارتے اور صرف تب ہی باہر نکلتے جب بھوک کی اینٹھن کچھ کھانے پر مجبور کرتی۔ وہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی لاؤلان یا اُس قبیل کے لوگوں سے مماثل دِکھائی نہیں دیے جو بدن میں سفید چاقو گھونپتے اور اُسے سُرخ نکال کر خونی دولت جمع کرتے تھے؛ نہ ہی کبھی اُنھوں نے ٹرین سٹیشن جا کر گاؤں کے دیگر محنت کش لوگوں کی طرح قلی بن کر پسینہ بہاتے ہوئے دولت کمانے کی کوشش کی۔ میرے والد اپنی ذہانت سے اپنی روزی کماتے تھے۔

زمانۂ قدیم میں پاؤڈِنگ نامی ایک سردار ہوا کرتا تھا جو گائے کا گوشت صفائی سے اُتارنے میں مہارت رکھتا تھا۔ زمانۂ جدید میں ایک شخص تھا جو اُنھیں وزن کرنے میں ماہر تھا— میرا والد۔ پاؤڈِنگ کی نظروں میں گائیں؛ ہڈیوں اور گوشت کے سوا کچھ نہیں تھیں۔ میرے والد کی نگاہوں میں بھی اُن کی حیثیت اِس سے زیادہ نہیں تھی۔ پاؤڈِنگ کی بصیرت نشتر کے مانند تیز تھی؛ میرے والد کی بصیرت نہ صرف نشتر کے مانند تیز بلکہ ترازو کی طرح بالکل درست بھی تھی۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ایک زندہ گائے میرے والد کے پاس لے جائیں تو وہ اُس کے گرد دو یا زیادہ سے زیادہ تین چکر لگائے گا، بعض اوقات— محض دِکھاوے کے لیے— جانور کی اگلی ٹانگوں کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر دیکھے گا اور پُراعتمادی سے اُس کا کُل وزن اور ہڈیوں پر گوشت کی، ہمیشہ کلوگرام میں، مقدار بتا دے گا کہ وہی وزن انگلستان کے سب سے بڑے مذبح خانے میں استعمال ہونے والا ہندسائی پیمانہ بھی بتاتا۔ شروع شروع میں لوگوں نے میرے والد کو محض ایک بڑبولا سمجھا لیکن معتدد بار امتحان لینے کے بعد وہ اُس پر یقین کرنے لگے۔ اُن کی موجودگی مویشی والوں اور قصابوں کے درمیان سودے بازی کو مساوات عطا کرتی اور دیانت داری کی بنیاد قائم کرتی۔ جیسے ہی وہ سامنے آتے مویشی والے اور قصاب دونوں ہی اپنے اپنے

مفاد کی خاطر اُن کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن صاحبِ بصیرت ہونے کی بنا پر وہ کبھی اپنی شہرت داؤ پر نہ لگاتے کیوں کہ ایسا کرنے سے اپنا چاولوں کا پیالہ توڑ بیٹھتے۔ اگر کوئی مویشی والا اپنے معمولی فائدے کی خاطر ہمارے گھر شراب اور سگریٹ کے تحفے ہمراہ لاتا تو میرے ابا اُن چیزوں کو گلی میں پھینک دیتے اور پھر ہمارے باغیچے کی دیوار پر چڑھ جاتے اور چیخ چیخ کر بُرا بھلا کہنے لگتے۔ اگر کوئی قصاب سؤر کا سر لے آتا تو میرے والد اُسے بھی گلی میں پھینک دیتے، پھر ہمارے باغیچے کی دیوار پر چڑھ کے چیخ چیخ کر گالم گلوچ کا طومار باندھ دیتے۔ مویشی والے اور قصاب دونوں کہتے کہ لوتانگ احمق ہے لیکن وہ جتنے لوگوں کو جانتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ ایمان دار ہے۔

لوگ اُن پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ اگر کوئی سودا طے نہ پا سکتا تو فریقین اُن کی طرف دیکھتے کہ وہ معاملے کو سلجھائیں۔ ''ہمیں بحث چھوڑ کر یہ سُننا چاہیے کہ لوتانگ کیا کہنا چاہتا ہے!'' ''ٹھیک ہے، ہم یہی کرتے ہیں۔ لوتانگ، تم منصف بن جاؤ!'' تفاخر سے میرے والد خریدار اور فروخت کنندہ کی سمت دیکھے بغیر جانور کے گرد دو چکر لگاتے، پھر آسمان کی طرف نظریں اُٹھاتے اور صریح وزن، گوشت کی مقدار اور قیمت بھی بتا دیتے۔ پھر وہ سگریٹ پھُونکنے لگتے۔ خریدار اور فروخت کنندہ معاملہ طے کرتے اور زور سے ہاتھ ملاتے۔ ''خُوب، یہ سودا طے ہوا۔'' جب سودا مکمل ہو جاتا تو وہ میرے والد کے پاس آتے اور دونوں دس یُوآن کا ایک ایک نوٹ میرے ابا کے حوالے اور اُن کی محنت کا شکریہ ادا کرتے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میرے والد کی مویشیوں کی نیلامی میں آمد سے قبل سودے بازی پُرانے طور طریقوں والے دلّالوں کے ذریعے ہوتی: سیاہ، ضعیف، خستہ حال بُوڑھے جو اپنی کچھ جھکی پشتوں کی قطار میں اپنی انگلیوں کے نشانات میں بے حد بول تول کے مخفی فن کے ماہر اور اپنی جھولتی ہوئی آستینوں سے اپنے پیشے کو پُراسرار بنانے والے دلّال تھے۔ میرے ابا نے کامیابی سے اُن بڑی بڑی آنکھوں والے عیّار دلّالوں کو تاریخ کے منظر سے ہٹا دیا تھا۔ منڈی میں مویشیوں کی اُس خرید و فروخت میں ترویج کو، محض ذرا سی مبالغہ آرائی کے ساتھ، انقلابی کہا جا سکتا تھا۔ میرے والد کی گہری نگاہ محض مویشی تک محدود نہیں تھی بل کہ اُن کے دائرۂ کار میں سؤر اور بھیڑیں بھی آتی تھیں۔ ایک ماہر بڑھئی کے مانند جو نہ صرف میز بل کہ کُرسی اور، اگر اُس میں خاص صلاحیت ودیعت ہو، تابوت بھی بنا سکتا ہے، میرے والد کو اُونٹوں کا حجم لگانے میں بھی دِقّت نہیں ہوتی تھی۔

موسمِ گرما کے ایک ابتدائی دِن میرے ابا مجھے اپنے کندھوں پر سوار کر کے منڈی لے گئے۔ ہم ابھی تک تین کمروں والی ایک کُٹیا ہی میں رہ رہے تھے جو ہمیں اپنے دادا سے وراثت میں ملا تھا۔ ہماری کُٹیا اب خاص طور پر اُس بھکاری کے مانند دِکھائی دینے لگی تھی جو ریشم و کمخواب زیبِ تن کیے ہوئے جاگیرداروں اور تاجروں کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا خیرات کا طالب ہو کیوں کہ وہ نئے تعمیر شدہ

سُرخ ٹائلوں کی چھتوں والے گھروں کے بیچ گھر گئی تھی۔ ہمارے صحن کی دیوار ایک بالغ شخص کی کمر جتنی بلند رہ گئی تھی اور جگہ جگہ جھاڑ جھنکاڑ نکل آیا تھا۔ میرے کاہل، بسیار خور باپ کا شکریہ کہ ہم دو انتہاؤں کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ یا تو اچھے وقتوں میں چُولہے پر چڑھے ہمارے برتن گوشت سے بھرے ہوتے یا پھر بُرے وقتوں میں بالکل خالی۔ جب وہ اماں کی مجنونانہ لعنت ملامت کا نشانہ بنتے تو کہتے۔ ''اب کسی بھی دن، جلد ہی دُوسری زرعی اصلاحات مہم شروع ہوگی اور جب یہ ہوگی تو تم میرا شکریہ ادا کرو گی۔ ایک منٹ کے لیے لاؤلان سے حسد کرنا چھوڑو کیوں کہ وہ بھی اپنے جاگیردار باپ کی طرح ختم ہو جائے گا اور غریب ہاری اُسے پُل پر لے جا کر اپنے ہاتھوں سے قتل کریں گے۔'' وہ ایک تخیلاتی بندوق ماں کے سر پر تانتے ہوئے گولی چلا دیتے: ٹھاہ! وہ اپنا سر تھامتے ہوئے خوف سے زرد پڑ جاتیں۔ لیکن دوسری زرعی اصلاحات مہم کبھی نہیں آئی اور بیچاری اماں لوگوں کے پھینکے ہوئے خراب میٹھے آلو اُٹھا کر گھر لانے پر مجبور ہوگئی کہ وہ سؤروں کا تو پیٹ بھر سکے۔ ہمارے دو چھوٹے چھوٹے سؤر کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھا سکے تھے اور وہ اکثر بھوک سے اِدھر اُدھر چلّاتے پھرتے تھے۔ یہی چیز باعثِ اشتعال تھی۔

اُس صبح ابا نے طیش سے چڑھائی کی تھی: ''تم کیا چلّاتے پھر رہے ہو؟ اِنھیں قابو رکھو ورنہ میں ان ننھے حرامیوں کو برتن میں ٹھونس کر تمھارے لیے رات کا کھانا بنا دوں گا۔''

بُھدا ہاتھ میں تھامے اماں اُنھیں گھورنے لگی۔ ''اِس کا تو سوچو بھی مت۔'' وہ بولی۔ ''یہ میرے سؤر ہیں۔ میں نے اُنھیں پالا ہے اور کوئی اِن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ مچھلی مر جائے گی یا جال ٹُوٹ جائے گا۔''

میں نے سؤروں پر ایک طویل نظر ڈالی۔ یہ درست تھا کہ اُن دونوں میں سے کسی پر بھی زیادہ گوشت نہیں تھا، لیکن وہ چار رہڑ گوشت کان اچھے سٹیک بنانے کے لیے بنے تھے۔ میرے نزدیک ایک سؤر میں کان بہترین حصہ ہوتے تھے۔ نہ چربی، نہ زیادہ چکنائی اور بہترین چھوٹی چھوٹی چپٹی ہڈیاں۔ کھیروں کے ساتھ وہ بہترین ہوتے۔ جیسے کانٹوں کے ساتھ پُھول۔ اور کچھ کُوٹی ہوئی لہسن اور گُجد کا تیل۔ ''ہم اِن کے کان کھا سکتے ہیں۔'' میں بولا۔

''میں اِس سے پہلے تمھارے کان کاٹ کھاؤں گی، ننھے حرامی!'' اماں نے کہا۔ اُس نے میرا کان جھپٹا اور اُسے زور کا جھٹکا دیا جب کہ ابا چھڑوانے کے لیے مجھے کھینچنے لگے۔ گردن سے پکڑ کر۔ اور میں اس خوف سے کہ میرا کان جڑ سے اُکھڑ جائے گا اپنی پُوری قوت سے چیختا رہا۔ میری چیخیں گاؤں میں ذبح کیے جانے والے سؤروں کے ڈکرانے کی آوازوں سے مماثل تھیں۔ بالآخر زیادہ طاقت ور ہونے کی بنا پر ابا جھٹکا دے کر مجھے چھڑوانے میں کامیاب ہو گئے۔

غصے سے اماں کا چہرہ گیلا اور ہونٹ نیلے پڑ گئے؛ وہ چُولہے کے پاس کھڑی سرتاپا کانپ رہی

تھی۔ ابا کی حفاظت کی شہ پر میں نے لعنت بھیجی اور اُن کا پُورا نام چبا تے ہوئے لیا۔ ''یا نگ یوزھن، زہریلی بُوھیا، تم میری زندگی جہنم بنا رہی ہو!'' میرے گلا پھاڑنے سے سکتہ طاری ہونے پر وہ مجھے بس گھورتی رہیں جب کہ ابا کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ اُنھوں نے مجھے اُٹھایا اور بھاگ نکلے۔ ہم صحن میں پہنچے تو ہم نے ماں کی بہ آوازِ بلند گریہ و زاری سنی۔ ''میں مر جاؤں گی۔ میں پاگل ہو گئی ہوں، چھوٹے حرامی ......''

ابا نے میرے سر ہلکی سی چپت رسید کی اور ملائمت سے بولے۔ ''ننھے شیطان، تمھیں اپنی ماں کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے نظریں اُٹھا کر اُن کے گہرے سانولے اور اُداس چہرے کو دیکھا۔ ''میں نے آپ کو یہ نام لیتے سنا ہے!''

''میں نے تمھیں کب بتایا ہے کہ اُس کا نام یا نگ یوزھن ہے؟''

''آپ نے آنٹی وائلڈ میول کو بتایا تھا۔ آپ نے کہا تھا: یا نگ یوزھن، وہ زہریلی بُوھیا میری زندگی جہنم بنا رہی ہے۔''

ابا نے اپنے ہاتھ سے میرا مُنھ بند کیا اور سرگوشی میں بولے۔ ''بکومت، تم پر لعنت ہو۔ میں اب تک بہت اچھا باپ رہا ہوں۔ اب تم میرے معاملات کی تباہی کا سبب مت بنو۔''

اماں بُعد ا ہاتھ میں پکڑے گھر سے باہر نکلی۔ ''لوُ تا نگ۔'' وہ چلّا ئیں۔ ''لوُ ژیاؤ تا نگ، تم دونوں کتیا کے بچو، گردن تک حرامیو، مجھے پروا نہیں چاہے میں آج ہی مر جاؤں لیکن تم دونوں کو ساتھ لے کر مروں گی۔ آج کا دن اس خاندان کا خاتمہ دیکھے گا!''

اُن کے چہرے پر نظر آنے والی خوف ناکی سے مجھے ادراک ہوا کہ وہ مذاق نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے والد نے ایک عیاش زندگی بسر کی ہو لیکن وہ احمق بہر حال نہیں تھے۔ وہ زیرک شخص خطرات سے گریز کرتا تھا۔ اُنھوں نے میری مشتعل ماں اور تمام تر مصیبت کو پیچھے چھوڑتے ہوئے مجھے سینا، اپنی بغل میں دبو چا، مُڑے، سیدھے دیوار کی سمت دوڑے اور اُسے قلابازی لگا کر پار کیا۔ مجھے اپنی ماں کی، ہماری ہی طرح، دوڑتے ہوئے دیوار پر چڑھ آنے کی صلاحیت پر کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اُنھوں نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ہمیں صحن سے نکال چکیں تو اُنھوں نے ہمارا تعاقب ختم کیا۔ وہ کچھ دیر تک دیوار کے ساتھ اُچھلتی رہیں پھر فضا کو گالیوں کی بوچھاڑ سے بھرتی ہوئیں، سڑے بسے میٹھے آلوؤں کے قتلے بنانے کے لیے پلٹ گئیں۔ طوفان ٹالنے کا یہ بہترین طریقہ تھا، جس میں کوئی قانون شکنی نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ خراب آلو اُس کے دشمنوں کے سروں کے لیے آہنی گولے تھے۔

اب جب میں ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ اُن کے ذہن میں حقیقی دشمن ابا تھا نہ

میں — مِس کرِ وائلڈ میول تھی جو گاؤں میں ایک شراب خانہ چلاتی تھی۔ میری اماں کو یقین تھا کہ اُس بدکار نے میرے ابا کو ورغلا لیا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا قیاس درست تھا یا غلط۔ جہاں تک میرے والد اور وائلڈ میول کے تعلقات کا تعلق ہے تو لوگ جانتے تھے کہ کس نے کس کو ورغلایا یا کس نے پہلی دعوت انگیز نظر ڈالی یا دونوں ہی قصوروار ہیں۔

جب ہم وہاں پہنچے تو مویشیوں کے سات آٹھ بیوپاری منڈی کے کنارے اپنے کولہوں کے بھار بیٹھے قصابوں کے انتظار میں سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ (ایک زمانہ تھا جب ہمارا گاؤں مذبح خانے میں تبدیل ہو گیا تھا، کھیتوں کے تمام اغراض و مقاصد کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے وہ مویشیوں کی خرید و فروخت کا واحد مقام بن چکا تھا۔) مویشی غائب دماغی سے اپنا کھا جا چرتے ہوے، اپنی تقدیر سے نا آشنا ایک سمت کھڑے تھے۔ تاجر، جن میں سے اکثریت مغربی ممالک کے باشندوں کی تھی، ریڈیو کے اداکاروں کی طرح پُرمزاح لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہر دس یا اس سے زائد دِنوں کے بعد اپنے ہمراہ دو یا تین مویشی لے کر آتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر ایک مال بردار اور سواریوں کی ایک سست رفتار مشترکہ ریل گاڑی سے، ایک ہی گاڑی، جس میں انسان اور جانور اکٹھے سفر کرتے تھے، ہمارے گاؤں کے قریب ترین ریلوے سٹیشن پر غروبِ آفتاب کے وقت پہنچتے۔ گو سٹیشن دس کوس سے زیادہ دُور نہیں تھا لیکن وہ ہمارے گاؤں میں رات کے پچھلے پہر سے پہلے نہیں پہنچتے تھے۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں اُنھیں اور اُن کے مویشیوں کے لیے ایک یا دو گھنٹے لگنا چاہئیں تھے۔ وہ ہمارے گاؤں میں آدھی شب کو پہنچنے کو کیوں ترجیح دیتے تھے؟ یہ آج تک راز ہی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں نے اپنے والدین اور گاؤں کے چند بڑے بوڑھوں سے یہ سوال کیا۔ لیکن اُنھوں نے جواب دینے کے بجائے مجھے سخت نظروں سے یوں گھورا جیسے میں نے اُن سے زندگی کا مفہوم دریافت کر لیا ہو یا کوئی ایسا سوال، جس کا جواب سب جانتے ہوں۔

مویشیوں کی آمد گاؤں کے کتّوں کے لیے اشارہ ہوتی تھی کہ وہ بھونکوں کی باڑ باندھ دیتے جس سے ہر شخص جاگ اُٹھتا ___ مرد و زن، بچے بُوڑھے __ اور ہم مطلع ہو جاتے کہ مویشیوں کے بیوپاری پہنچ گئے ہیں۔ میری نوجوانی کی یادوں میں وہ پُراسرار لوگوں کا گروہ تھا اور اسرار کا یہ احساس یقیناً اُن کی ہمارے گاؤں میں رات گئے آمد سے جُڑا ہوا تھا۔ جب چاندنی راتوں میں کتّوں کی بھونکوں کے راگ سے سکوت ٹُوٹ جاتا تو اماں اُٹھتی، خود کو چادر میں لپیٹتی، اپنا چہرہ کھڑکی سے لگاتی اور باہر کا منظر دیکھنے لگتی۔ یہ میرے والد کے ہمارے پاس سے وائلڈ میول کے پاس کھسک جانے سے قبل ہوتا تھا، لیکن ایسی راتیں بھی ہوتی تھیں جب وہ گھر آتے ہی نہیں تھے۔ میں بھی چپکے سے اُٹھتا اور ماں کے قریب سے کھڑکی سے باہر جناتی برتنوں کی طرح چمکتے تازہ تازہ نہائے اور چاندنی میں دمکتے جانوروں کو گھر کے

پاس سے گزرتے دیکھنے لگتا۔ اب جب میں پیچھے دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر بھونکوں کی ہیجان خیزی کی بنا پر یہ واقعہ نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ میں ایک حسین خواب کا منظر دیکھ رہا ہوں۔

ہمارے گاؤں میں بہت سی سرائیں تھیں لیکن بیوپاری وہاں کبھی نہیں ٹھیرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ اپنے مویشی ہانکتے ہوئے سیدھے منڈی جاتے اور وہیں صبح ہونے کا انتظار کرتے چاہے طوفانِ باد و باراں آتا یا سرد ہوائیں یا لُو چل رہی ہوتی۔ طوفانی راتوں کو سراؤں کے مالکان نکل کر اپنے کاروبار کا ڈھول پیٹتے لیکن بیوپاری اور اُن کے مویشی نامساعد عناصر کے بیچ مجسموں کے مانند ساکت و صامت کھڑے رہتے خواہ کتنی ہی پُرکشش پیشکش کیوں نہ کی جاتی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ معمولی سی بھی رقم خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے؟ لوگ بتاتے تھے کہ اپنے مویشی فروخت کر کے وہ قصبے میں پینے پلانے اور موج مستی کرنے جاتے اور تب ہی بس کرتے جب اُن کے پاس صرف سست رفتار گاڑی سے گھر لوٹنے کا ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے بچتے۔ اُن کا طرزِ حیات اوباشوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اُن کی سوچ ایسی ہی تھی۔ بچپن میں مَیں نے متعدد مواقع پر ہمارے دیہاتوں کے نمایاں باشندوں کو، جو مارکیٹ میں بُھوری اور سیاہ گائیں، نر اور مادہ، جوان اور بچھڑیاں، دُودھ دینے والی نوجوان گائیں جن کے تھن پانی کے جگوں جیسے دِکھتے تھے خریدنے آتے تھے جن کی میرے والد کے لیے قیمت کا تخمینہ لگانا دشوار ہو جاتا کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ تھن کھائے جاتے ہیں یا نہیں، آہ بھرتے ہوئے تبصرہ کرتے سُنا تھا۔ "ہے، یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟ اِن کے دماغوں کی دُنیا میں کیا ہے؟" جب وہ میرے والد کو دیکھتے ہی مویشیوں کے تاجر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ وہ علی الصبح ہی شیشوں کی عینکیں پہنے ہوتے تھے جب کہ ابھی ڈرانے والا اندھیرا ہوتا تھا، تاہم وہ اُنھیں توقیر بھری مسکراہٹ سے نوازتے۔ ابا مجھے اپنے کندھوں سے اُتارتے، کولھوں پر دھرا دے کر بیوپاریوں سے دس یا زیادہ فٹ دُور بیٹھ جاتے، سگریٹوں کی ایک مسلی ہوئی ڈبیا نکال لیتے اور اُس میں سے ایک مُڑی تُڑی اور سیلی سگریٹ لیتے۔ مویشیوں کے بیوپاری اپنی اپنی ڈبیائیں نکالتے اور دس یا زائد سگریٹیں میرے والد کے پیروں کے نزدیک زمین پر رکھ دیتے۔ وہ اُنھیں اکٹھا کرتے اور واپس صاف جگہ پر رکھ دیتے۔ "لاؤ لو، بُڈھے حرامی۔" ایک تاجر کہتا۔ "اِنھیں پی لو۔ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم اِن چند معمولی سگریٹوں کے عوض تمھاری حمایت خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو؟" ابا محض مسکراتے اور اپنی سَستی سگریٹ سلگا لیتے۔

پھر دو دو تین تین کر کے گاؤں کے قصاب نمودار ہونا شروع ہوتے۔ وہ تازہ تازہ نہائے دھوئے دِکھائی دیتے تھے پھر بھی مجھے اُن کے بدنوں سے خُون کی مہک آتی جو بتاتی کہ خُون — چاہے وہ گائیوں کا ہوتا یا سؤروں کا — دُھلا نہیں۔ قصابوں سے آتی خُون کی بُو پا کر مویشی ایک دُوسرے میں گُھس جاتے۔ اُن کی آنکھوں میں خوف چمک رہا ہوتا۔ نوجوان گائیں گوبر کا فوارہ چھوڑ بیٹھتیں۔ بڑی عمر کی

گائیں حوصلے میں دِکھائی دیتیں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ محض دِکھاوا ہے کیوں کہ میں اُن کے پُٹھوں میں پاخانہ روکنے کے لیے اُن کی اکڑی ہوئی دُمیں دیکھ سکتا تھا۔ اُن کی ٹانگیں تالاب کے پانی پر ہَوا سے لرزتے بلبلوں کے مانند کانپ رہی ہوتی تھیں۔

قصابوں کے آتے ہی بھاؤ تاؤ شروع ہو جاتا۔ جانوروں کے گرد، اُن کے گھیرا ڈالنے سے ایک تماشائی سمجھتا کہ اُنھیں یہ فیصلہ کرنے میں دشواری کا سامنا ہے کہ کون سا جانور خریدا جائے۔ لیکن اگر کوئی ایک فیصلے پر پہنچ جاتا اور کھڑے ہوے جانوروں میں سے کسی ایک کو تھام لیتا تو اگلے تین سیکنڈ وں میں دُوسرے بھی یہی کرتے اور پلک جھپکتے میں تمام گائیں خریدا رپا چکی ہوتیں۔ کسی کو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی دو قصاب ایک ہی جانور کے لیے جھگڑے ہوں لیکن اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہوگا تو معاملہ فوراً ہی سلجھا لیا گیا ہوگا۔ اکثر پیشہ جات میں ہم پیشہ حریف ہوتے ہیں لیکن ہمارے گاؤں کے قصاب دوستوں کے مانند متحد اور اپنے تمام دُشمنوں کے لیے بھائیوں کی طرح اکٹھے آمادۂ پیکار ہوتے تھے۔ جب وہ سب وہاں کھڑے جانوروں میں سے ایک ایک تھام چکے ہوتے تو مویشیوں کے تاجر پژمردگی سے آگے بڑھتے اور سودے بازی شروع ہو جاتی۔ اب چُوں کہ میرے والد اپنا اعتبار قائم کر چکے تھے لہٰذا وہ سودے بازی کم ہی اہمیت رکھتی تھی، محض رسمی، ایک ریت کیوں کہ اِسے اُن پر چھوڑ دیا جاتا — وہ آخری بات کرتے۔ لوگ کچھ دیر کے لیے مول تول کرتے، پھر میرے والد کے پاس آتے دو دو گائیں لیے جیسے ٹاؤن ہال میں شادی کا لائسنس لینے اُمیدوار جوڑے آتے ہیں۔

لیکن اُس خاص دِن کچھ خاص بات ظہور پذیر ہوئی: سیدھا گائیوں کی جانب جانے کے بجائے قصابوں نے چوک کے کنارے پر ٹہلنے کو منتخب کیا۔ جس کسی نے بھی اُنھیں مضطرب دیکھا اُسے اُن کی معنی خیز مُسکراہٹیں نظر آئیں اور جب وہ میرے والد کے سامنے سے گُزرے تو اُن کی مُسکراہٹوں میں کچھ پنہاں تھا جو کسی ناخُوش گوار واقعے کا پیش خیمہ تھیں جیسے کوئی سازش سر پر کھڑی ہو کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے ابا پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالی جو روزانہ کی طرح بت بنے بیٹھے اپنی گھٹیا سگریٹ پی رہے تھے۔ تاجروں کی پھینکی ہوئی اچھی سگریٹیں زمین پر اَن چھوئی پڑی تھیں۔ جب سودے طے پا جاتے تو وہ آتے، سگریٹیں جمع کرتے اور اُنھیں پینے لگتے۔ تمباکو نوشی کرتے ہوئے وہ میرے والد کی دیانت داری کی تعریف کرتے جاتے۔ ''لاؤلو۔'' ایک تمسخرانہ انداز میں کہتا۔ ''اگر تمام چینی تمھارے جیسے ہوتے تو اشتراکی نظام کبھی کا آچکا ہوتا۔'' وہ مُسکراتے لیکن بولتے کچھ نہیں۔ اُس لمحے میرا سینہ فخر سے پُھول جاتا اور میں عہد کرتا کہ میں اِسی طرح اپنے افعال سرانجام دوں گا کیوں کہ میں اُن جیسا بننا چاہتا تھا۔ بیوپاریوں کو بھی احساس تھا کہ اُس روز فضا میں کچھ تناؤ ہے اور وہ میرے والد کو دیکھنے کے لیے مُڑے ماسوائے چند ایک کے جو سر دہری سے قصابوں کو آتا دیکھتے رہے۔ ایک خاموش معاہدہ طے پا چکا

تھا ہر ایک منتظر تھا کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے، بالکل تماشائی کے مانند کھیل شروع ہونے کے منتظر۔

مشرق سے کھیتوں کے اُوپر روشن سُرخ سُورج لوہار کے تپتے چہرے کی طرح طلوع ہوا اور آخر کار سٹیج پر ڈرامے کا مرکزی کردار طویل القامت اور مضبوط پٹھوں کا حامل بٹا کٹا لاؤلان، نمودار ہوا۔ بالکل اُس کی آنکھوں کی ہم رنگ اُس کی جھاڑی نما بُھوری داڑھی تھی جس سے حیرت ہوتی تھی کہ آیا وہ واقعی اصل النسل ہان ہے۔ جس لمحے وہ چوک میں آیا تو سب کی نگاہیں اُس پر جم گئیں۔ چمکتی دھوپ میں اُس کا چہرہ لشکارے مار رہا تھا۔ وہ میرے والد کی جانب آ رہا تھا لیکن اُس کی نظریں مشرقی سمت کھڑی دیوار کے پار کھیتوں پر ٹھہری ہوئی تھیں جہاں سُورج کی کرنیں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ فصلیں زمردیں سبز تھیں، لہلہاتے ہوئے پُھول فضا کو معطر کر رہے تھے اور چنڈول سُرخ گلاب جیسے آسمان پر چہچہا رہے تھے۔ میرے ابا، جن کی لاؤلان کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں تھی، جیسے شاید دیوار کے قریب بیٹھے ہی نہیں تھے اور فطری طور پر اگر اُس کے نزدیک میرے ابا کی کوئی حیثیت نہیں تھی تو میری کیسے ہو سکتی تھی۔ شاید وہ دھوپ سے چندھیا گیا تھا — یہ وہ خیال تھا جو سب سے پہلے میرے بچگانہ ذہن میں آیا — لیکن جلد ہی میں سمجھ گیا کہ لاؤلان میرے والد کو اشتعال دِلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

قصابوں اور بیوپاریوں سے بات کرنے کے لیے اُس نے اپنا سر ٹیڑھا کرتے ہوئے اپنی پتلون کی زِپ کھولی اور مجھ پر اور ابا کے عین اُوپر جلتے ہوئے مُوت کی دھار ماری۔ سڑاند میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ وہ خاصی بڑی دھار تھی، جسے اُس نے غالباً رات بھر اپنے آپ کو اذیّت میں ڈال کر روکے رکھا ہو گا تا کہ وہ میرے والد کی تذلیل کر سکے۔ زمین پر پڑی سگریٹیں تھرتھرائیں اور گھومتی ہوئیں پیشاب میں جا کر بُھولنے لگیں، یہاں تک کہ اُن کی شکل بگڑ گئی۔ جب لاؤلان ایسا کر رہا تھا تو قصابوں اور تاجروں کے جتھے سے ایک عجیب و غریب ہنسی اُبھری تھی لیکن اُنھوں نے فوراً ہی اُس کا گلا گھونٹ دیا تھا جیسے کسی جناتی ہاتھ نے اُن کے گلے دبا دیے ہوں۔ وہ کھلے مُنھوں اور بندھی ہوئی زبانوں سے ہمیں گھورتے رہے، استعجاب اُن کے چہروں پر چپک گیا تھا۔ حتّٰی کہ قصابوں کو بھی، جو جانتے تھے کہ لاؤلان میرے والد سے آمادۂ جنگ ہے، یہ گمان تک نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا۔ اُس کا پیشاب ہمارے پیروں، ٹانگوں اور چہروں سے ٹپک رہا تھا۔ میں طیش میں آ کر اُچھلا لیکن ابا نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ وہ وہاں پتھر بنے بیٹھے رہے۔ "تیری بیوی کی ـ ـ ـ!" میں نے گالی دی۔ میرے والد نے اُف تک نہیں کی۔ لاؤلان کے چہرے پر عجیب مُسکراہٹ آ گئی۔ میرے والد کی آنکھیں یُوں کُھلا ہوا رہو رہی تھیں جیسے اُولتی سے ٹپکتے پانی کو دیکھ کر کسان کی آنکھیں مسرور ہوتی ہیں۔

جب لاؤلان مُوتنا ختم کر چکا تو اُس نے پتلون کی زِپ چڑھائی اور اُدھر چلا گیا جہاں مویشی کھڑے تھے۔ میں نے قصابوں اور تاجروں کی طویل آہیں سُنیں لیکن اُن سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ

کچھ نہ ہونے پر ناخُوش تھے یا اِس پر خُوش تھے کہ کچھ نہیں ہوا۔ اِس کے ساتھ ہی قصاب مویشیوں میں پھر نے لگے اور جلد ہی اُنھوں نے اپنا اپنا انتخاب کر لیا۔ پھر بیوپاری آگے بڑھے اور مول تول ہونے لگا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اُن کا دھیان اس میں نہیں تھا کیوں کہ اُن کے دماغ سودے بازی سے ہٹ کر کسی اَور ہی معاملے میں مصروف تھے۔ گو وہ میرے والد کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اُنھی کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور وہ خُود کیا کر رہے تھے؟ اُنھوں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے کر اپنا چہرے اُن کے پیچھے یُوں چھپا لیا تھا جیسے عقاب درخت کے دوشاخہ میں سو رہا ہو۔ چُوں کہ میں اُن کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا مجھے نہیں معلوم کہ کیسے دِکھ رہے تھے۔ لیکن میں اُن کی کمزوری پر برافروختہ تھا۔ اگر چہ میں محض ایک لڑکا ہی تھا تا ہم میں بخوبی آگاہ تھا کہ لاؤلان نے میرے والد کو کس قدر ذلیل وخوار کیا ہے اور میں اِس سے بھی آگاہ تھا کہ حقیر ترین شخص بھی اُس رُسوائی کو بنا لڑائی کے قبول نہ کرتا جو میں اپنی گالیوں سے بھی ثابت کر چکا تھا۔ لیکن میرے والد خاموش رہے جیسے وہ مر چکے ہوں۔

اُس روز بھاؤ تاؤ اُن کی مداخلت کے بغیر ہی تکمیل پائے۔ لیکن جب وہ مکمل ہو چکے تو تمام فریق معمول کے مطابق آئے اور اُنھوں نے اُن کے پیروں میں کچھ نوٹ پھینکے۔ یہ کام کرنے والا سب سے پہلا شخص لاؤلان کے علاوہ کوئی اَور نہیں تھا۔ اُس حرامی کُتّے نے، بظاہر میرے والد کے چہرے پر پیشاب کر کے غیر مطمئن، دس یُوآن کے دو کرارے نوٹ نکال کر میرے والد کو متوجہ کرنے کے لیے اپنی اُنگلیوں میں تھام لیے۔ یہ ترکیب کارگر نہیں ہوئی کیوں کہ اُنھوں نے اپنا مُنھ اپنے گھٹنوں میں چھپایا ہوا تھا جس نے لاؤلان کو مایوس کر دیا۔ اُس نے تیزی سے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی، پھر دونوں نوٹ میرے والد کے پیروں میں پھینک دیے، جن میں سے ایک اُس کی دھار سے چھوٹے سے گڑھے میں جمع ہو جانے والے پیشاب پر، گر کے سیلی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والی سگریٹوں پر ٹھیر گیا۔ اُس لمحے میرا باپ بھی مُردہ تھا۔ وہ اپنا چہرہ اپنے آپ اور اپنے آباؤ اجداد کے لیے کھو چکا تھا۔ وہ ایک انسان سے حقیر ہو کر دُشمن کے مُوت سے بھُولی ہوئی سگریٹوں کے درجے پر آ چکا تھا۔ لاؤلان کے رقم پھینکنے کے بعد تاجروں اور قصابوں نے اُس کی تقلید کی۔ اُن کے چہرے پر ہمدردی تھی جیسے ہم باپ بیٹا بھکاریوں کی رحم کی مستحق جماعت تھے۔ اُنھوں نے عام دِنوں کی نسبت دُگنی رقم پھینکی جو یا مزاحمت نہ کرنے کا صلہ تھی یا پھر لاؤلان کی سخاوت کی پیروی کی کوشش۔

ہمارے پیروں میں بہت سے مُردہ پتوں کے مانند گرے ہوئے اُن نوٹوں کو دیکھتے ہوئے میں رونے لگا اور بہت دیر بعد میرے والد نے اُوپر دیکھا۔ اُن کے چہرے پر غصّے یا ملال کا رتّی بھر احتمال تک نہیں تھا۔ اُن کا چہرہ لکڑی کے پالش کیے ہوئے ٹکڑے کی سی چمک دمک لیے ہوئے تھا۔ اُنھوں نے سرد نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں تشویش تھی جیسے اُنھیں علم ہی نہ ہو کہ میں کیوں رو رہا

ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن کی گردن میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ ''ابا'' میں بولا۔ ''اب تم میرے باپ نہیں رہے۔ تمھیں دوبارہ کبھی ابا کہنے سے قبل میں لاؤلان کو ابا کہوں گا۔''

میرے چلّانے سے وقتی طور پر سکتے میں آنے والے ہمارے اردگرد کھڑے لوگ اچانک ہنس پڑے۔ لاؤلان نے میری سمت اپنا انگوٹھا اُٹھایا۔ ''ژیاؤ تانگ۔'' وہ بولا۔ ''تم واقعی کوئی چیز ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسا بیٹا میں چاہتا ہوں۔ آج سے تم جب بھی آؤ گے تمھیں میرے گھر خوش آمدید کہا جائے گا۔ اگر تم سؤر کا گوشت چاہو گے تو ملے گا اور اگر بڑے کا تو وہ بھی ملے گا۔ اگر تم اپنی ماں کو بھی ساتھ لاؤ گے تو میں تم دونوں کا پُرتپاک استقبال کروں گا۔''

وہ نظرانداز کر دی جانے والی توہین نہیں تھی لہٰذا میں مشتعل ہو کر اُس کی جانب دوڑا۔ وہ بہ آسانی ایک طرف ہو کر میرے حملے سے بچ نکلا اور میں زمین پر مُنھ کے بَل گر کر اپنا ہونٹ کٹوا بیٹھا۔

بلند آہنگ قہقہے کے ساتھ وہ بولا۔ ''ننّھے نشتر، مجھے ابا کہنے کے بعد مجھ پر حملہ کر رہے ہو! کون باہوش شخص تمھیں اپنا بیٹا بنانا چاہے گا؟''

چُوں کہ کسی نے مجھے اُٹھنے میں مدد نہیں دی لہٰذا مجھے خُود ہی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا پڑا۔ میں اپنے والد کی طرف گیا اور میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اُنھیں لات دے ماری۔ اِس امر نے بھی اُسے غصّہ نہیں دِلایا بل کہ اُسے اِس کا پتا بھی نہیں چلا۔ اُنھوں نے صرف اپنے بڑے اور نرم ہاتھ سے اپنا چہرہ رگڑا۔ پھر اُنھوں نے اپنے بازو پھیلائے اور ایک کاہل نام بِلّی کے مانند جماہی لی، زمین کو دیکھا اور دِھیرے دِھیرے، بےضمیری اور احتیاط سے لاؤلان کے پیشاب میں تر بتر نوٹ سمیٹ کر ایک ایک کو روشنی میں دیکھا جیسے یقین کرنا چاہتے ہوں کہ وہ جعلی تو نہیں۔ حتماً، اُنھوں نے لاؤلان کے نئے نوٹ اُٹھائے جو پیشاب سے غلیظ ہو چکے تھے اور اُنھیں اپنی پتلون سے صاف کیا۔ اب تمام رقم اُن کے گھٹنوں پر جمع ہو چکی تو اُنھوں نے اُسے اپنے بائیں ہاتھ کی درمیانی اُنگلیوں میں تھاما، اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی پر تھوک لگایا اور اُسے گننے لگے۔ میں اُسے اُن سے چھیننے، پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور لاؤلان کے مُنھ پر دے مارنے کے لیے دوڑا، تاکہ ہم دونوں باپ بیٹا کی تذلیل کو بدلہ لے سکوں۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلے نکلے، وہ اچھلے اور اُنھوں نے بُڑبُڑاتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کر لیا۔ ''بےوقوف لڑکے، تمھیں پتا ہے تم کیا کر رہے ہو؟ دولت، دولت ہے۔ یہ نہیں لوگ مَوردِ الزام ہیں۔ رقم پر اپنا غصّہ مت نکالو۔'' میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اُن کی کہنی کو جھپٹتے ہوئے اُن کے ہاتھ سے اُس شرمناک دولت کو چھیننے کے لیے اپنا بدن اُوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک مکمل قد کاٹھ والے مرد کے سامنے مجھے ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ میں اِتنا دِیوانہ ہو چکا تھا کہ میں نے اُن کے پُوتڑوں پر بار بار ٹکریں ماریں لیکن وہ محض میرا سر تھپتھپاتے رہے اور نرمی سے بولے۔ ''بس

بیٹے، بہت ہو گیا۔ رومت۔ لاؤلان کے سانڈ کو دیکھو۔ وہ مشتعل ہو رہا ہے۔''

وہ تنے ہوئے سینگوں اور اُبھرے ہوئے پٹھوں پر ساٹن جیسی چمک دار منڈھی کھال والا ایک ہٹا کٹا اور حصاری نسل کا سانڈ تھا۔ ویسا سانڈ میں نے بعد میں اٹھلیٹس میں دیکھا تھا۔ وہ تمام کا تمام زرد لیکن اُس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر سفید تھا۔ میں نے اُس سے قبل سفید چہرے والا بیل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھینگا تھا اور جس انداز سے اپنی ایک آنکھ کو ترچھا کر کے دیکھتا تھا وہ انداز آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ اب میں ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ دیکھنے کا وہ انداز ویسا تھا جیسا ہیجڑوں کی باتیں کرتے ہوئے لوگ اپناتے ہیں۔ بھینگا پن فرد کی فطرت بدل دیتا ہے اور یہی سانڈوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ابا نے بیل کی سمت میری توجہ بٹا کر کم از کم وقتی طور پر مجھے رقم بھلا دی۔ میں چوک میں اپنے سانڈ کو لے کر جاتے ہوئے لاؤلان بدمعاش کو دیکھنے کے لیے مڑا۔ بدمعاش کیوں نہیں؟ آخر اُس نے میرے صلح جو والد کو ذلیل کیا ہے۔ گاؤں اور مویشیوں کے بیوپاریوں میں اُس کی توقیر میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ صرف اُس شخص کے خلاف اُٹھا تھا جس نے اُسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے نظر انداز کیا اور وہ جیت گیا تھا۔ اب گاؤں کا کوئی فرد اُس کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کرے گا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ناقابلِ یقین حد تک حیران کن تھا کہ آج برسوں بعد بھی مجھے اُس پر یقین نہیں آ رہا۔

اُس کا وہ حصاری بیل اڑ گیا۔ لاؤلان نے اُسے نکیل سے کھینچ کر حرکت دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ذرا سی کوشش کیے بغیر ہی سانڈ نے لاؤلان کی طاقت کے مظاہرے کو مذاق بنا کر رکھ دیا۔ پیشے کے اعتبار سے قصاب ہونے کی بنا پر اُس کے بدن کی مہک ایک کم زور دِل بچھڑے کو پتے کے مانند کپکپا دیتی اور جب وہ ہاتھ میں چاقو پکڑے ایک ہٹ دھرم جانور کے سامنے آتا تو اُسے عاجزی سے اپنی موت کے انتظار پر مجبور کر دیتا تھا۔ نکیل کھینچ کر چلانے کی دُوسری کوشش ناکام ہونے پر اُس نے گھوم کر کان کے پردے پھاڑ ڈالنے والی چلّاتی ہوئی آواز کے ساتھ اُس کے پٹھے پر مارا۔ ایسی چوٹ اور چیخ کے بعد اکثر جانور پیشاب خطا کر بیٹھتے لیکن اُس حصاری بیل نے اُسے ایک معمول کی حرکت سے زیادہ نہیں لیا۔ میرے والد پر فتح کے نشے میں چُور اور ایک مغرور فوجی کی سی اداکاری کرتے ہوئے لاؤلان نے سانڈ کی فطرت کا خیال کیے بغیر اُس کے پیٹ پر لات رسید کی۔ خوب، جانور نے اپنا پہلو بدلا، بلند آواز میں ڈکرایا، اپنا سر جھکایا اور لاؤلان کو اپنے سینگوں پر اُٹھا لیا گویا اُس کا وزن تنکوں کی ایک چٹائی سے زیادہ نہ ہو۔ مویشیوں کے بیوپاری اور قصاب آناً فاناً ہونے والے واقعے پر سکتے میں آ گئے، ساکت اور گُنگ، اور اُن میں سے ایک بھی لاؤلان کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ سانڈ نے دوبارہ اپنا سر جھکایا اور حملہ آور ہوا۔ اب لاؤلان کوئی عام شخص تو تھا نہیں، جب اُس نے

سینگوں کو اپنی سمت بڑھتے دیکھا تو وہ زمین پر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے اُس کے راستے سے ہٹ گیا۔ طیش سے چمکتی آنکھیں لیے سانڈ گھوما اور دوبارہ حملہ آور ہوا تو لاؤلان نے دُوسری اور پھر تیسری بار بھی زمین پر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے اپنی جان بچائی۔

بالآخر جب وہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو ہم نے دیکھا کہ معمولی سا زخمی تھا۔ وہ اپنے کولہے ایک طرف جھکائے اور نظریں جھپکائے بغیر سانڈ کے مقابل کھڑا تھا۔ سانڈ نے اپنا سر جھکایا اور بلند آواز میں پھنکارا، اُس کی باچھوں میں کف جمع ہو رہا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ اگلے حملے کے لیے تیار ہے۔ لاؤلان نے بیل کی توجہ ہٹانے کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھایا لیکن عیاں تھا کہ وہ بہادری کا محض دِکھاوا کر رہا ہے۔ وہ اُس خوف زدہ بُل فائٹر کے مانند دِکھائی دے رہا تھا جو اپنے آپ کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو۔ وہ احتیاط سے ایک قدم آگے بڑھا، سانڈ نے کوئی حرکت نہیں کی بلکہ اپنا سر مزید جھکا لیا جو اِس امر کا غماز تھا کہ حملہ ہونے ہی والا ہے۔ آخرش لاؤلان نے اپنا مردانگی والا انداز ترک کیا، ایک آخری اور دبنگ چیخ ماری، مُڑا اور پاگلوں کی طرح بھاگ اُٹھا۔ سانڈ اُس کے پیچھے لگ گیا۔ اُس کی دُم لوہے کی سلاخ کے مانند سخت اور تن کر چپکی ہوئی تھی۔ سُموں سے مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ کی طرح ہر سمت کیچڑ کی چھینٹیں اُڑنے لگیں۔ جب کہ لاؤلان نے اپنی جان بچانے کی نیت سے تماشائیوں کا رُخ کیا۔ لیکن اُسے بچانے کا خیال اُن کے ذہنوں کے آخری گوشے میں کہیں تھا۔ ہر طرف چیخیں گونج اُٹھیں اور وہ بھی، اپنے ماں باپ کو بددعائیں دیتے ہوئے کہ اُنھوں نے اُنھیں دو سے زیادہ ٹانگیں کیوں نہیں دیں، بھاگ نکلے۔ خُوش قسمتی سے سانڈ میں اِتنی عقل تھی کہ وہ ہجوم میں بھی لاؤلان کو پہچان سکے اور اپنا غصہ کسی اَور پر نہ نکالے۔ تاجروں اور قصابوں کے دیواروں اور درختوں کی اَوٹ لینے کے لیے بھاگنے سے دُھول اُڑنے لگی۔ اِس خطرناک صُورتِ حال سے حواس باختہ ہو کر لاؤلان سیدھا ہم باپ بیٹے کی طرف دوڑا۔

حالات کی نازکی کا ادراک کرتے ہوئے والد نے اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن اور دُوسرے سے پینٹ پکڑ کر مجھے اُٹھایا اور لعنتی لاؤلان اُن کے عقب میں پناہ لینے اور اُن کے کپڑے جکڑنے کہ وہ وہاں سے ہٹ نہ سکیں اور اُنھیں حملہ آور سانڈ کے سامنے ڈھال بنانے سے قبل ہی، دِیوار پر چڑھا دیا۔ ابا پیچھے ہٹے اور بلاشبہ لاؤلان بھی، یہاں تک کہ اُن کی پشتیں دِیوار سے لگ گئیں۔ ابا نے ہاتھ میں پکڑے روپے بیل کے سامنے لہرائے اور بڑبڑائے۔ ''سانڈ، اے سانڈ، تمھاری میری کوئی دُشمنی نہیں، نہ آج ہے اور نہ کبھی رہی ہے تو آؤ اِس معاملے کو ختم کر دیں ......''

یہ سب کچھ اِتنی تیزی سے وقوع پذیر ہوا کہ الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں: ابا نے روپے بیل کے مُنھ پر دے مارے اور اِس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا وہ چھلانگ لگا کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔

پھر اُنھوں نے اپنی اُنگلیاں اُس کے نتھنوں میں گھسا کر اُس کی نکیل کو تھاما اور جھٹکا دے کر اُس کے سر کو کافی اُوپر اُٹھا دیا۔ مغربی ممالک سے بیوپاریوں کی لائی جانے والی گائیں پالتو ہوتی تھیں اس لیے اُن سب کے نتھنوں میں نکیل ڈالی ہوتی تھی۔ چُوں کہ ناک سانڈ کا کم زور حصّہ ہوتا ہے اور کوئی بھی، حتیٰ کہ مویشیوں کا بہترین حیات طویلے والا بھی، میرے والد سے زیادہ بیلوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا گو اُن کا اپنا مویشی پالنے سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔ دِیوار کے بالائی سرے پر بیٹھے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے سوچا: ابا، مجھے تم پر بہت فخر ہے کہ جس طرح تم نے اپنی تذلیل کے داغ کو دھویا اور اپنی دانش مندی اور حوصلے سے جس طرح ہماری کھوئی ہوئی عزت بحال کی۔

قصابوں اور بیوپاریوں نے سفید مُنھ والے زرد سانڈ کو زمین پر گرانے میں اُن کی مدد کی تا کہ وہ دوبارہ بے قابو ہو کر کسی اور کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ خرگوش کی سی پھرتی سے ایک قصاب بھاگ کر گھر گیا اور ایک چھری لا کر پہلے بڑے لاؤلان کو دینا چاہی لیکن لاؤلان نے پیچھے ہٹتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اُسے دُور رہنے اور یہ کام کسی اَور کے سپرد کرنے کو کہا۔ قصاب نے چھری ہاتھ میں تھامے تھامے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کون کرے گا یہ کام؟ کوئی نہیں؟ ٹھیک ہے، تب میرا خیال ہے کہ یہ مجھ پر آ پڑا ہے۔'' اُس نے اپنی آستینیں چڑھائیں، دھار کو اپنے جُوتے کے تلوے سے صاف کیا، پھر نیچے جھکا اور رَندا لگانے والے بڑھئی کے مانند اپنی ایک آنکھ بند کی۔ اُس نے بیل کے سینے میں بائیں جانب نظر آنے والی دبی ہوئی جگہ کا نشانہ لیتے ہوئے چھری گھونپ دی اور جب اُس نے اُسے کھینچا تو خُون کا فوارہ چُھوٹ پڑا جس سے میرے والد لال ہو گئے۔

اب جب سانڈ مر چکا تو ہر شخص نیچے اُتر آیا۔ زخم سے بہتا سیاہی مائل سُرخ خُون فوارے کے پانی جیسے بلبلے بناتا ہوا صبح کی خستہ ہَوا میں گرم گرم مہک بکھیر رہا تھا۔ کسی حد تک چُرمُرائے اور کم زور پڑے لوگ ہَوا نکلے غباروں کے مانند گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن سوائے میرے والد کے کسی نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا، جنھوں نے اپنا سر کندھوں میں گھسیڑا اور مُنھ کھول کر اپنے مضبوط لیکن پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ''آسمان کے بُوڑھے شخص، میں بہت ڈر گیا تھا!''

اِس پر سب نے مُڑ کر لاؤلان کی طرف دیکھا جس کی واضح تمنا تھی کہ وہ کسی بِل میں گھس جائے۔ اُس نے نظریں نیچی کر کے بیل کو دیکھتے ہوئے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کی جس کی ٹانگیں سیدھی پھیلی ہوئی تھیں اور اُس کی رانوں کے پُرگوشت حصّے اب بھی تھرتھرا رہے تھے۔ اُس کی ایک نیلی آنکھ یُوں کھلی ہوئی تھی جیسے وہ اُس کی اندرونی نفرت ظاہر کر رہی ہو۔ ''لعنت ہو تم پر!'' لاؤلان مُردہ جانور کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ساری زندگی جنگلی ہنسوں کے شکار میں گزاری، اپنی نظر محض

ٹھونگیں مارتے ہنس کے بچے ہی پر رکھی۔'' اُس نے میرے والد کو دیکھا۔''مجھ پر تمھارا ایک قرض چڑھ گیا ہے لیکن ہمارا قضیہ ابھی ختم نہیں ہوا۔''

''کیا ختم نہیں ہوا؟'' میرے ابا نے پُوچھا۔''تمھارے اور میرے بیچ کوئی قضیہ نہیں ہے۔''

''تم اُسے چُھو تے نہیں ہو!'' لاؤلان نے سُوں سُوں کرتے ہوئے مُنھ بنایا۔

''میں نے اُسے کبھی چُھونے کی خواہش نہیں کی۔ اُسی نے کی ہے۔'' میرے والد نے ہلکا سا فخر بھرا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''وہ تمھیں کُتّا کہہ کر پُکارتی ہے اور وہ کبھی تمھیں اپنے آپ کو ہاتھ نہیں لگانے دے گی۔''

اُس وقت تک مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ تاہم مجھے بعد میں پتا چل گیا کہ وہ وائلڈ میول کا ذکر کر رہے تھے۔

لیکن جب میں نے پُوچھا۔''ابا، کس کی بات کر رہے ہو؟'' تو وہ بولے۔''بچّوں کے جاننے کی بات نہیں ہے۔''

''بیٹے۔'' لاؤلان بولا۔''کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم لان خاندان کا فرد بننا چاہتے ہو؟ تو پھر تم نے ابھی اِسے ابا کیوں کہا ہے؟''

''تمھاری اوقات بدبُودار کُتّے کے گُو سے زیادہ نہیں!'' میں نے کہا۔

''بیٹے۔'' وہ بولا۔''گھر جاؤ اور اپنی ماں سے کہو کہ تمھارا باپ وائلڈ میول کی کھوہ میں چلا گیا ہے اور اب وہاں سے نہیں نکل سکتا۔''

اِس بات نے میرے والد کو سانڈ ہی کے مانند آگ بگولہ کر دیا۔ اُنھوں نے سر جھکایا اور لاؤ لان پر حملہ کر دیا۔ اُنھیں ایک دُوسرے کو گردن سے پکڑے لحہ بھر بھی نہیں گُزرا تھا کہ دیگر لوگ اُن میں بیچ بچاؤ کرانے دوڑ پڑے۔ لیکن اُس مختصر سے لمحے کے دوران میں لاؤلان میرے والد کی چھنگلی توڑنے اور میرے ابا اُس کا آدھا کان چبا ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ غصّے سے تھوک پھینکتے ہوئے وہ بولے۔''تم نے میرے بیٹے کے سامنے ایسی بات کرنے کی جرأت کیسے کی، حرامی کُتّے!''

VVVV

ایلس مُنرو

(ALICE MUNRO)

۱۰- جولائی ۱۹۳۱ء کو پیدا ہونے والی کینیڈا کی انگریزی زبان کی ۸۲ سالہ افسانہ نگار ایلس مُنرو کے لیے نوبیل انعام برائے سال ۲۰۱۳ء کا اعلان ۱۰- اکتوبر ۲۰۱۳ء کرتے ہوے سویڈش اکادمی کے مستقل سیکریٹری این گلنڈ نے اُنھیں ''معاصر افسانے کی ماہر'' قرار دیا۔ اِس کے علاوہ ایلس مُنرو کو ''عہدِ حاضر کی بہترین افسانہ نگار'' بھی کہا جاتا ہے۔ سنتھیا اوزِک (Cynthia Ozick) نے تو اُنھیں ''ہماری چیخوف'' تک کہہ دیا۔ ایلس مُنرو ادب کا نوبیل انعام پانے والی پہلی کینیڈین اور اب تک نوبیل انعام پانے والی خواتین میں تیرھویں خاتون ہیں۔

ایلس مُنرو، ایلس اَین لیڈ لا (Alice Anne Laidlaw) کے نام سے وِنگ ہام (Wingham)، اونٹاریو (Ontario) میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد رابرٹ ایرک لیڈ لا لومڑیوں اور منک (Mink: ایک چھوٹا جانور جس کے بدن پر خُوب اُون ہوتی ہے جس سے کوٹ بنائے جاتے ہیں جنھیں منک کوٹ کہا جاتا ہے۔مترجم) کا باڑا تھا جب کہ اُن کی والدہ این کلارک لیڈ لا ایک سکول میں اُستاد تھیں۔ مُنرو نے اپنی نوجوانی ہی سے کہانیاں کہنا شروع کر دی تھیں۔ اُن کی سب سے پہلی کہانی "The Dimension of Shadows" ۱۹۵۰ء میں اُس وقت شائع ہوئی جب وہ محض اُنیس برس کی تھیں اور دو سالہ وظیفے کے تحت یونیورسٹی آف ویسٹرن اونٹاریو میں انگریزی اور صحافت کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اِس دوران اُنھوں نے تمباکو چننے، بیراگری اور کتب خانے میں کلرک کے طور پر بھی کام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں اپنے ہم جماعت جیمز مُنرو سے شادی کرنے کے لیے یونیورسٹی چھوڑ دی جہاں وہ ۱۹۴۹ء سے زیرِ تعلیم تھیں۔ وہ دونوں ڈُنڈاراوے (Dundarave) چلے گئے جہاں جیمز ایک ڈیپارٹمنٹ سٹور پر ملازم ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ جوڑا وِکٹوریا چلا آیا اور یہاں اُنھوں نے ''مُنرو بکس'' کے نام سے کتابوں کی ایک دُکان کھولی جو اب تک چل رہی ہے۔ ایلس مُنرو اور جیمز کی شادی ۱۹۷۲ء تک قائم رہی اور طلاق پر منتج ہوئی۔ اِس دوران اُن کے ہاں چار بیٹیاں پیدا ہوئیں جن میں سے ایک اپنی پیدائش کے محض پندرہ گھنٹے بعد وفات پا گئی۔

۱۹۷۲ء میں طلاق کے بعد ایلس مُنرو باقاعدہ لکھاری بننے کے لیے اونٹاریو چلی آئیں اور یونیورسٹی

آف ویسٹرن اونٹاریو کی ''رائٹر ان ریزیڈینس'' مقرر ہو گئیں۔ اسی جامعہ نے اُنھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا۔ ۱۹۷۶ء میں اُنھوں نے جیرالڈ فرملن سے، جو ایک نقشہ نویس اور جغرافیہ دان تھا اور جس سے اُن کی ملاقات یونیورسٹی کے دِنوں میں ہوئی تھی، شادی کر لی اور دونوں کلنٹن، اونٹاریو سے باہر ایک دیہی علاقے میں چلے گئے۔ بعد ازاں وہ کلنٹن کے ایک گھر میں منتقل ہو گئے جہاں فرملن ۱۷ اپریل ۲۰۱۳ء میں چل بسا۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران ایلس مُنرو نے آسٹریلیا، چین اور سکینڈے نیویا کا دورہ بھی کیا۔

۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے ایلس مُنرو کی کہانیوں کے سب سے پہلے مجموعے ''خوش باش سایوں کا رقص'' (Dance of Happy Shadows) نے انگریزی زبان کی افسانہ نگاری کا گورنر جنرل ایوارڈ حاصل کیا جو کینیڈا کا سب سے بڑا اَدبی ایوارڈ ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ''دوشیزاؤں کی زندگیاں'' (Lives of Girs) کی اشاعت پر، جو ایک دُوسرے سے منسلک کہانیوں کا مجموعہ ہے لیکن اِسے بعض اوقات غلط فہمی سے ناول تصور کیا جاتا ہے، ایک بار پھر کامیابی نے اُن کے قدم چومے اور اس مجموعے پر اُنھیں ''کینیڈین بُک سیلرز ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں ایلس مُنرو کی ایک دُوسرے سے منسلک کہانیوں کے اگلے مجموعے ''تم کیا سمجھتے ہو کہ تم کیا ہو؟'' (Who Do You Think Who You Are?) چھپا (عنوان: بھکاری دوشیزہ: فلو اور روز کی کہانیاں۔ The Beggar Maid: Stories of Flo and Roses) تو اُسے بھی ''گورنر جنرل لٹریری ایوارڈ'' ملا۔ ۱۹۸۰ء میں وہ کیونز لینڈ کی یونیورسٹی آف کولمبیا کی بھی ''رائٹر ان ریزیڈینس'' بن گئیں۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں اُنھوں نے ہر چار سال بعد ایک افسانوی مجموعہ شائع کروایا۔ اُنھیں تیسری بار ''گورنر جنرل لٹریری ایوارڈ'' اُن کے افسانوی مجموعے ''محبت میں بڑھوتری'' (The Progress of Love) پر ۱۹۸۶ء میں دیا گیا۔ اسی طرح دیگر مجموعوں پر ٹریلیم بُک ایوارڈ ۱۹۹۰ء، گلر ایوارڈ ۱۹۹۸ء و ۲۰۰۴ء بھی ملے۔ ایلس مُنرو کی کہانیاں عالمی افق کے معروف جرائد نیویارکر، اٹلانٹک منتھلی، گرانڈ سٹریٹ، میڈ موائیز یلے، پیرس ریوو، ہارپر میگزین وغیرہم میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں اپنی کتاب ''قلعے کی فصیل سے نظارہ'' (View from Castle Rock) کی تشہیری مہم کے دوران دیے گئے انٹرویوز میں اُنھوں نے اعلان کیا کہ شاید وہ آیندہ کوئی مجموعہ شائع نہ کروا پائیں۔ لیکن بعد میں اُنھوں نے اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کی اور اگست ۲۰۰۹ء میں ایک اور افسانوی مجموعہ ''بے پایاں مسرت'' (Too Much Happiness) چھپوا دیا۔

ایلس مُنرو کی بیشتر کہانیاں ضلع ہیورون (Huron County)، اونٹاریو کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اُن کا یہ علاقائی مرکزِ نگاہ اُن کی افسانہ نگاری کی ایک خصوصیت ہے۔ دُوسری خصوصیت واحد راوی کا ہونا ہے جو دُنیا کی تفہیم کرتا ہے۔ اکثر ناقدین مُنرو کا، ایک چھوٹے گاؤں کے پس منظر کے حوالے سے، امریکا کے جنوبی مضافاتی مصنفین سے موازنہ و مقابلہ کرتے ہیں۔ ولیم فاکنر اور اوکانر کے کرداروں کی مانند اُن کے کردار

بھی اکثر گہری جڑیں رکھنے والے رسوم ورواج سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔لیکن ایلس مُنرو کا ردِعمل جنوبی معاصرین کی نسبت کم تناؤ آمیز ہوتا ہے۔اُن کے مردانہ کردار عام مردوں کی صفات رکھتے ہیں جب کہ اُن کے نسوانی کردار زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔اُن کے کام کا موازنہ اکثر وبیشتر عظیم مصنفین کے کام سے بھی کیا جاتا ہے،مثلاً چیخوف۔ایلس مُنرو کا زیادہ تر کام وسطی زمانے کے جنوبی اونٹاریو کی ادبی صنف کی مثال ہے۔

ایلس مُنرو کی تحریروں میں بار بار در آنے والا موضوع۔خاص طور پر ابتدائی زمانے کی کہانیوں میں۔۔ایک چھوٹے گاؤں کی جوان ہوتی ہوئی لڑکی کا اپنے خاندان کے ساتھ نبھاؤ ہے۔تاہم اپنی تازہ کہانیوں میں انھوں نے وسطی عمر،تنہا اور بڑی عمر کی عورتوں کو موضوع بنایا ہے۔اُن کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ اُن کے کردار واقعے پر روشنی ڈالتے اور اس کے معنی قائم کرنے والے انکشاف کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ایلس مُنرو کی تحریریں زندگی کے ابہامات کو بھی نمایاں کرتی ہیں:''تضاد پر بہ یک وقت طنز اور سنجیدگی''،''اچھائی کے رویے، خوف اور بھڑکتی ہوئیں منضبط،غیر معقول اور متعصب آرا کا اظہار''،''خاص،فضول علم''،''چلانا اور خوشی میں اشتعال کا مظاہرہ''،''بد ذوقی اور بے رحمی سے لطف اندوزی''۔اُن کا اسلوب عام کے بعد خاص کو یُوں پیش کرتا ہے کہ دونوں ایک دُوسرے کی اِس طرح تفہیم کرتے ہیں کہ بہ آسانی اور بلا تردّد زندگی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

مُنرو کی اکثر کہانیوں میں اتنا کچھ پایا جاتا ہے کہ جتنا کئی ناولوں میں۔یہی وجہ ہے کہ متعدد ناقدین نے بہ اصرار کہا ہے کہ مُنرو کی کہانیاں ناولوں کی سی جذباتی اور ادبی گہرائی رکھتی ہیں۔کچھ نے تو یہ بھی دریافت کیا ہے کہ آیا مُنرو کہانیاں لکھتی ہیں یا ناول؟

ایلس مُنرو نے متعدد افسانوی مجموعے شائع کیے ہیں جن میں سے چند ایک کے نام اُوپر آچکے ہیں۔تاہم تادمِ تحریر،اُن کا آخری افسانوی مجموعہ''پیاری زندگی''(Dear Life) ۲۰۱۲ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔اب تک ایلس مُنرو کی منتخب کہانیوں کے بھی پانچ مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

ایلس مُنرو اپنی پیرانہ سالی اور ۲۰۰۹ء میں دِل کے بائی پاس کی وجہ سے نوبیل انعام خُود وصول کرنے نہیں جاسکیں البتہ انھوں نے نوبیل خطبے کی بجائے سٹیفن ایلس برگ کو اپنا انٹرویو ریکارڈ کروایا جو تقریبِ تقسیم انعام کے روز پڑھا گیا۔اُن کا یہ انٹرویو بھی اُن کی تحریروں، لکھنے کے انداز،طریقہ کار اور اسلوب کو بخوبی بیان کرتا ہے۔چیدہ چیدہ جوابات کچھ یُوں ہیں۔

''میں ہر وقت کہانیاں گھڑتی رہتی تھی۔مجھے سکول جانے کے لیے کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا اور اس دوران میں عام طور کہانیاں ہی بُنتی رہتی تھی۔جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی تو زیادہ تر کہانیاں میرے اردگرد گھومنے لگیں کہ میں خُود ہی کسی نہ کسی صُورتِ حال میں کہانی کی ہیروئن ہوتی۔ظاہر ہے کہ کہانیاں چھپنے کے لیے تو جاتا نہیں تھیں......مجھے خیال آیا کہ دُنیا میں کہانیوں کی بہت اہمیت ہے اور میں بھی کچھ کہانیاں کہنا چاہتی تھی۔میں اِس کام کو جاری رکھنا چاہتی تھی اور اِس کا دُوسروں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں

تھی۔ لیکن مجھے بہت دیر بعد احساس ہوا کہ یہ بہت دلچسپ بات ہوگی اگر اِن میں سے کسی کہانی کو بہت سے لوگ جانیں ...... ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں کہانی کا خُوش گوار انجام ہی اہمیت رکھتا تھا۔ میں اپنی ہیروئنوں کے لیے کسی بھی طرح کا ناخُوش گوار انجام برداشت نہیں کرتی تھی۔ بعد میں جب میں نے پڑھنا شروع کیا، مثلاً Wuthering Heights، اور پتا چلا کہ ناخُوش گوار انجام بھی وقوع پذیر ہو سکتے ہیں تو میں نے اپنا خیال مکمل طور پر تبدیل کیا اور المیے کی طرف گئی جس سے مجھے لطف آیا ...... زندگی دلچسپ ہو سکتی ہے، اس کے لیے کوئی بھی ماحول (علاقہ) دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے ...... میں اکثر کہانی شروع کرنے سے پہلے ایک خاکہ (پلاٹ) تیار کرتی ہوں۔ اُس خاکے سے شروع کرتی ہوں، اُس پر کام کرتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ وہ (کہانی) تو کسی اَور ہی طرف جا رہی ہے اور جیسے جیسے میں لکھتی جا رہی ہوں واقعات خُود بخود جنم لیتے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں ایک واضح تصور کے ساتھ لکھنا شروع کرتی ہوں۔ ...... اوہ، نہایت مشکل ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایک گھریلو عورت رہی ہوں۔ مجھے بچّوں کے لیے کھانا تیار کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے فارغ اوقات میں لکھا اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی لکھنا ترک کیا ہو۔ ایسے وقت بھی آئے جب میری ہمت شکنی ہوئی کیوں کہ میں نے دیکھا کہ میری شروع کی ہوئی کہانیاں اچھی نہیں ہیں اور مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور یہ کام میری توقع سے بہت، بہت ہی زیادہ مشکل نکلا۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا ...... میرے خیال میں کہانی کا سب سے مشکل ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جب آپ اپنی کہانی کو دوبارہ پڑھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ کتنی خراب ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ پہلا مرحلہ پُر جوشی کا اور دُوسرا قدرے بہتر ہوتا ہے لیکن جب ایک صبح آپ اپنی کہانی اُٹھا کر پڑھتے ہیں تو سوچتے ہیں: ''کتنی بکواس ہے۔'' اور پھر آپ کو واقعی اُس پر کام کرنا پڑتا ہے۔ میرے لیے ہمیشہ یہی کام ایسا رہا ہے جسے میں نے درست کام سمجھا ہے۔ اگر کہانی بری تھی تو اِس میں میرا قصور تھا نہ کہ کہانی کا ...... اگر میں مطمئن نہ ہوں تو سخت محنت کرتی ہوں۔ میں زیادہ بہتر طریقے سے بیان کرنے کی سعی کرتی ہوں۔ آپ کے پاس ایسے کردار موجود ہوتے ہیں جنھیں آپ نے موقع نہیں دیا ہوتا۔ آپ کو اُن کے بارے میں سوچنا اور کچھ مختلف کرنے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے ...... اوہ خُوب، میں چاہتی ہوں کہ میری کہانیاں لوگوں میں سرایت کر جائیں خواہ وہ عورتیں ہوں، مرد یا بچے۔ میں اپنی کہانیوں کو زندگی کا حصہ بنانا چاہتی ہوں کہ لوگ کہیں: نہیں، اوہ، کیا یہ سچ ہے ...... اصل بات یہ ہے کہ کہانی میں جو بھی بیان کیا گیا ہو، وہ لوگوں میں سرایت کرنے والا ہو اور جب آپ کہانی ختم کر لیں تو آپ کو احساس ہو کہ آپ ایک منفرد شخصیت ہیں ......''

VVVV

وَین لاک اَیج ۱

(Wenlock Edge)

میری والدہ کا اُن سے خاصا کم عمر ایک عم زاد تھا، جو ہر موسم گرما میں ہمارے گاؤں آیا کرتا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ اپنی والدہ خالہ نیل باٹس کو لاتا تھا۔ اُس کا اپنا نام اَرنی باٹس تھا۔ وہ ایک طویل القامت، اچھی فطرت والا سُرخ و سپید، چوڑے چہرے اور پیشانی سے شروع ہو جانے والے گھنگھریالے بالوں والا شخص تھا۔ اُس کے ہاتھ اور ناخن اتنے ہی صاف تھے جتنا خود صابن ہوتا ہے۔ اُس کے کولہے البتہ کچھ بھاری تھے۔ میں نے اُس کا نام ۔ جب وہ قرب و جوار میں موجود نہ ہوتا تو ۔ اَرنسٹ باٹم رکھا تھا۔ میرا لہجہ ناشائستہ ہوتا تھا۔

لیکن اِس سے مقصود اُسے تکلیف مل کہ بالکل بھی تکلیف پہنچانا نہیں ہوتا تھا۔

خالہ نیل باٹس کے انتقال کے بعد اَرنی کبھی ہمارے ہاں نہیں آیا البتہ وہ ہمیشہ کرسمس کارڈ بھیجتا رہا۔

جب میں اُس کے شہر کے کالج میں داخلہ لیا تو اُس نے ہر دُوسرے اتوار مجھے رات کے کھانے کے لیے باہر لے جانا اپنی عادت بنالی۔ وہ یہ اس لیے کرتا تھا کہ میں اُس کی عزیزہ تھی ۔ یہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہمارا اکٹھے وقت گزارنا ہمیں راس ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی مقام پر لے کر جاتا؛ دی اولڈ چیلسیا نامی ایک ریستوران جو ڈُنڈاس سٹریٹ کی ایک کم بلند عمارت کی دُوسری منزل پر واقع تھا۔ وہاں مخملی پردے آویزاں، میز پوش اور گلاب رنگ جیسے لیمپ میزوں پر دھرے تھے۔ وہ خاصا مہنگا مل کہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ اُس کی حیثیت سے زیادہ مہنگا تھا لیکن یہ بات میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی کیوں کہ میرے دماغ میں دیہاتی لڑکیوں والا یہی تصور تھا کہ ہر شہری مرد روزانہ سُوٹ تبدیل کرتا ہے اور میں سمجھتی تھی کہ اتنے صاف شفاف ناخن اُس خوش حالی کی ضمانت ہیں جہاں اِس نوع کے چونچلے روزمرّہ کا حصّہ ہوتے ہیں۔

میں نے فہرست سے ہمیشہ مکمل غیر ملکی کھانوں کا انتخاب کیا۔ چکن وال آو ینٹ یا ڈک اے لورینج۔ جب کہ اُس نے ہمیشہ بڑے کا بھنا ہوا گوشت ہی کھایا۔ میٹھی چیزیں ٹرالی پر میز تک لائی جاتیں: ناریل کا ایک بڑا سا کیک، کسٹرڈ کے قتلے جن پر موسم نہ ہونے کے باوجود بھی سٹابریاں رکھی ہوتیں، پھینٹی

ہوئی بالائی سے بھری اور چاکلیٹ کی تہہ چڑھی سپنگ جیسی پیسٹری۔ میں انتخاب میں، اُس پانچ سالہ لڑکی کی طرح، جو آئس کریم کے ذائقے منتخب کرنے کی کوشش کر رہی ہو، کافی وقت لگاتی اور پھر سوموار کو اتنا کچھ کھایا پیا ہضم کرنے کے لیے تمام دن بھوکا رہ کر گزارتی۔

ارنی میرے والد سے کچھ ہی کم عمر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے تو قع تھی کہ ہمیں کالج کا کوئی فرد نہیں دیکھ پائے گا اور اگر دیکھ بھی لے گا تو وہ اُسے میرا بوائے فرینڈ ہی سمجھے گا۔

اُس نے میرے نصاب کے بارے میں دریافت کیا اور جب میں نے اُسے بتایا یا یاد دلایا کہ میں انگریزی آنرز اور فلسفہ پڑھ رہی ہوں تو اُس نے پُر وقار انداز میں سر ہلایا۔ اُس نے اِس اطلاع پر اپنی ڈیلے ویسے نہیں گھمائے جیسے لوگ گھر میں گھماتے تھے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ تعلیم کی بہت قدر کرتا ہے اور افسوس کا اظہار کرتا کہ وہ خود دہائی سکول کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ پایا۔ اِس کے بجائے وہ کینیڈین نیشنل ریلوے میں بطور ٹکٹیں بیچنے والا بھرتی ہوگیا۔ اب وہ نگران تھا۔

اُس نے بتایا کہ وہ سنجیدہ تحریریں پسند کرتا ہے لیکن یہ کالج کی تعلیم کا نعم البدل نہیں۔

مجھے کامل یقین تھا کہ سنجیدہ تحریروں سے، اُس کی مراد ریڈرز ڈائجسٹ کی ضخیم کتب ہوں گی۔

اپنی تعلیم کے موضوع سے، اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے، میں نے اُسے رہائش گاہ کے بارے میں بتایا۔ اُس زمانے میں کالجوں کی اقامت گاہیں نہیں ہوتی تھیں۔ ہم سب گھروں کے کمروں یا سستے اپارٹمنٹوں یا رشتے داروں یا پھر طلبا یا طالبات کی تنظیموں کے گھروں میں رہتے تھے۔ میرا کمرہ ایک پُرانے گھر کی بالائی منزل پر تھا، جس کا صحن کھلا لیکن کمرہ بڑا نہیں تھا۔ البتہ کسی زمانے میں ملازمہ کا کوارٹر ہونے کی بِنا پر اُس کا اپنا غسل خانہ تھا۔ دو اور وظیفہ خور طالبات، جو جدید زبانوں کے آخری سال میں تھیں، دُوسری منزل پر قیام پذیر تھیں۔ اُن کے نام کے (Kay) اور بیورلی تھے۔ ارضی منزل کی بلند چھت لیکن خستہ حال کمروں میں طب کا طالب علم رہتا تھا جو شاذ ہی گھر پر ہوتا اور اُس کی بیوی، بیتھ، ہر وقت گھر میں موجود رہتی کیوں کہ اُن کے دو بہت چھوٹے بچے تھے۔ بیتھ گھر کی نگران اور کرایہ وصول کرنے پر مامور تھی اور وہ اکثر و بیشتر دُوسری منزل والی لڑکیوں سے اس بات پر لڑتی جھگڑتی رہتی کہ وہ اپنے کپڑے غسل خانے میں دھو کر سوکھنے کے لیے ٹانگ دیتیں۔ جب بیتھ کا شوہر بلیک گھر پر ہوتا تو وہ بعض اوقات دُوسری منزل کا غسل خانہ استعمال کرتا کیوں کہ نچلی منزل کا غسل خانہ بچوں کی غلاظت سے بھرا ہوتا اور بیتھ کا مؤقف ہوتا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اُس کا خاوند اُن کے زیر جامے اور دیگر چیزیں دیکھے۔ کے اور بیورلی جواباً کہتیں کہ جب وہ آئی تھیں تو اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ میاں بیوی اپنا غسل خانہ استعمال کریں گے۔

میں نے ارنی کو بتانے کے لیے یہ بات کیوں منتخب کی؟ وہ اِس پر شرم سے لال ہوگیا اور بولا

کہ اُنھیں یہ بات تحریر میں لانا چاہیے تھی۔

کے اور بیورلی میرے لیے ایک مایوسی تھیں۔ وہ جدید زبانوں میں سخت محنت کرتیں لیکن اُن کی گفتگو اور حرکات بینکوں اور دفاتر میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بہ مشکل مختلف تھیں۔ وہ ہفتے کے روز اپنے بالوں کو سُوئیاں لگا کر گھنگھریالے بناتیں اور ناخنوں کو چمکاتیں کیوں کہ اُس رات اُنھیں اپنے خاص بوائے فرینڈوں سے ملاقات کرنے جانا ہوتا تھا۔ اتوار کو وہ اپنے چہروں پر بوائے فرینڈوں کے دیے ہوئے زخموں کو لوشنوں سے آرام پہنچاتیں۔ میں اپنی تمام تر تمنا کے باوجود کوئی بوائے فرینڈ نہیں پا سکی اور حیران ہوتی کہ اُنھیں کیسے مل گئے۔

اُنھوں نے بتایا کہ ایک بار اُن کے دِل میں اقوامِ متحدہ میں ترجمان کے طور پر کام کرنے کا احمقانہ خیال آیا تھا لیکن اب وہ اِس بات پر ٹِک چکی ہیں کہ وہ ہائی سکول میں معلم بنیں گی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو شادی کریں گی۔

اُنھوں نے مجھے غیر خُوش آمدیدانہ مشورہ دیا۔

مجھے کالج کے کیفے ٹیریا میں ملازمت مل گئی تھی۔ میں ایک ٹھیلا لے کر بکھری ہوئی پلیٹیں اکٹھا اور میزیں صاف کرتی تھی۔

اُنھوں نے مجھے تنبیہہ کی کہ یہ ملازمت نہیں ہے۔

''اگر لوگ تمھیں اِس قسم کا کام کرتے دیکھیں گے تو کوئی بھی تمھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھے گا۔''

میں نے اَرنی کو یہ بات بتائی تو وہ بولا۔ ''تو تم نے کیا کہا؟''

میں نے اُسے بتایا کہ میں نے کہا ہے کہ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتی جو ایسی سوچ رکھتا ہو، لہٰذا مسئلہ کیا ہے؟

اب میں نے درست چوٹ لگائی تھی۔ اَرنی کِھل اُٹھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہَوا میں اُوپر نیچے زور زور سے چلانے لگا۔

''بالکل درست۔'' وہ بولا۔ ''بالکل یہی روّیہ اپنانا چاہیے۔ ایماندارانہ کام۔ کسی بھی ایسے شخص کی بات پر دھیان نہ دو جو تمھارے ایماندارانہ کام کی وجہ سے تمھیں حقیر جانے۔ بس سیدھے راستے پر بڑھتے چلے جاؤ اور اُنھیں نظر انداز کر دو۔ اپنا سر فخر سے بلند رکھو۔ جو شخص اِسے پسند نہ کرے اُسے تم بتا دو کہ اِسے برداشت کرو۔''

اُس کی اِس تقریر، اُس کے چہرے پر چھائی ہمدردی اور خُوشنودی کی چمک، اُس کی جھٹکے دار حرکات وسکنات کے جوش وخروش نے پہلی بار میرے اندر شک پیدا کیا۔ پہلا مبہم شک کہ اُس تنبیہہ میں آخر کچھ تو وزن تھا۔

اُس شب جب میں گھر پہنچی تو میرے دروازے کے نیچے سے کھسکایا ہوا بیتھ کا ایک رقعہ موجود تھا جس میں مجھے اُس سے بات کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سیڑھیوں کے کٹہرے پر سُوکھنے کے لیے لٹکے ہوئے میرے کوٹ کی بابت ہوگی، یا پھر اُوپری منزل پر اُس وقت شور کی وجہ سے جب بلیک (کبھی کبھار) اور بچے (ہمیشہ) دِن کے اوقات میں سو رہے ہوتے ہیں۔

نکبت اور اُلجھا پس منظر لیے دروازہ کھلا۔ جس میں دِکھائی دیتا تھا کہ بیتھ کے دِن گُزر چکے ہیں۔ گیلے کپڑے — بچّوں کی چڈیاں اور اُونی کپڑے — چھت کی کھونٹیوں سے لٹک رہے تھے، چُولہے پر جراثیم کش سیال میں بوتلیں اُبل اور کھنکنا رہی تھیں۔ کھڑکیوں پر بھاپ آئی ہوئی تھی اور کُرسیاں سیلے کپڑوں اور ڈھول جیسے کھلونوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ بڑا بچہ ایک چوکھٹے کی سلاخوں سے چمٹا شکایتی انداز میں چلّا رہا تھا — ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے ابھی وہاں ڈالا گیا ہے — اور چھوٹا ایک بلند کرسی پر براجمان تھا، اُس کے مُنہ اور ٹھوڑی پر لوکی کے گُودے کی ہم رنگ کھانے کی کوئی چیز سُرخ باد کے مانند پھیلی ہوئی تھی۔

اُن سب کے بیچ سے بیتھ نے یُوں دیکھا کہ اُس کے چھوٹے سے سپاٹ چہرے پر سخت برتری کا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہو: خواہ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن بہت کم لوگ اُس کی طرح عفریت سے نپٹنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

''تمھیں معلوم ہے نا کہ جب تم آئی تھیں۔'' وہ بولی۔ پھر اُس نے اپنی آواز اتنی بلند کی کہ بڑے بچے کی چیخوں میں بھی سُنائی دے سکے۔ ''تمھیں معلوم ہے نا کہ جب تم آئی تھیں تو میں نے تم سے کہا تھا کہ اُوپر دو افراد جتنی جگہ ہے۔''

اُس نے مجھے بتایا کہ ایک اَور لڑکی آ رہی ہے۔ وہ لڑکی وہاں کالج میں اپنی پڑھائی کے ایام میں، منگل سے جمعے تک، رہا کرے گی۔

''بلیک شام تک پلنگ لے آئے گا۔ وہ زیادہ جگہ نہیں لے گی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اپنے ساتھ زیادہ کپڑے لائے گی — وہ گاؤں کی رہنے والی ہے۔ چھے ہفتوں سے تم نے اکیلے استعمال کیا ہے اور اب بھی تم ہفتہ وار تعطیل کے دِنوں میں حسبِ سابق تنہا استعمال کرتی رہوگی۔''

کرائے میں کمی کا کوئی ذکر تک نہیں۔

نینا نے واقعی زیادہ جگہ نہیں لی۔ وہ پست قامت اور اپنی حرکات و سکنات سے خیالوں میں گُم رہنے والی تھی — اُس کا سر میری طرح کبھی شہتیروں سے نہیں ٹکرایا۔ وہ اپنا زیادہ وقت ٹانگ پر ٹانگ رکھے بستر پر گُزارتی۔ اُس کے بھُورے مائل سُنہرے بال مُنہ پر گرے رہتے اور اُس کے سفید بچگانہ زیرِ جامے پر ڈھیلا ڈھالا کیمونو (جاپانی چغا: مترجم) چڑھا ہوتا۔ اُس کے پاس خُوب صُورت لباس تھے — اُونٹ کے بالوں سے بنا ایک کوٹ، نرم اُونی سویٹر، پلیٹیں ڈالا ہوا چوخانہ لہنگا جس میں بڑا سا بکسوا

لگا ہوا تھا۔ اُس قسم کے کپڑے جو آپ رسائل کے سرورق پر دیکھتے ہیں، جن کے نیچے لکھا ہوتا ہے: ''آنسہ محترمہ فلاں فلاں کی کالج کی نئی زندگی کا لباس۔'' لیکن کالج سے لوٹتے ہی وہ اپنے تمام کپڑے اُتار کر صرف کیمونو پہن لیتی۔ میں بھی اپنے سکول کے کپڑے تبدیل کرتی لیکن میرا مقصد میرے لہنگے کی استری برقرار اور اپنی انگیا یا سویٹر کو صاف رکھنا ہوتا تھا، لہٰذا میں ہر چیز کو احتیاط سے ٹانگتی۔ ینا جہاں چاہتی اپنے کپڑے اُچھال دیتی۔ میں اپنی اُجرت کے حصے کا کھانا کالج ہی میں جلد کھا لیتی اور ینا کے بارے میں لگتا جیسے وہ بھی کھا چکی ہو، گو میں نہیں جانتی تھی کہ اُس نے کہاں سے کھایا ہے۔ شاید اُس کا کھانا وہی تھا جو وہ رات کو کھاتی تھی ـــ بادام اور سنگترے اور سُرخ پنّے میں لپٹا ہوا تھوڑا سا چاکلیٹ۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے اُس ہلکے پھلکے پہنے میں ٹھنڈ نہیں لگتی۔

''اُوں ہُونہہ۔'' وہ بولی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن سے لگایا۔ ''میں ہمیشہ گرم رہتی ہوں۔'' اُس نے کہا اور وہ واقعی گرم تھی۔ گو اُس کا کہنا تھا کہ وہ محض سانولا پن ہے جو ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کی گرم جلد میں جائفل جیسی اور معطر ایک مخصوص مہک تھی جو ناگوار تو نہیں تھی لیکن اُس بدن جیسی نہیں تھی جو مستقل نہاتا دھوتا ہو۔ بیتھ کے اُصول کہ ہفتے میں دوبار سے زائد غسل نہیں لینا کی بنا پر میں خود بھی مکمل طور پر صاف ستھری نہیں ہوتی تھی۔

میں عام طور پر رات گئے تک مطالعہ کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کمرے میں کسی اَور کی موجودگی میں پڑھنا دشوار ہوتا ہے لیکن ینا کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اپنے سنگترے اور چاکلیٹ چھیلتی اور سالیٹائر کھیلتی رہتی۔ جب وہ کوئی پتہ حرکت دینے کے لیے کھینچتی تو ہلکا سا شور کرتی، ایک کراہٹ یا غُرفش، جیسے وہ اپنے جسم کی اِس ہلکی سی تطبیق کی شکایت کر رہی ہو لیکن اس سے بایں ہمہ حظ بھی اُٹھا رہی ہو۔ اِس کے علاوہ وہ سکون سے رہتی اور جب نیند آتی تو روشنی میں بھی سمٹ سمٹا کر سو جاتی۔ اگرچہ ہمارے پاس گفتگو کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی لیکن ہم جلد ہی گُھل مل گئیں اور ہم نے ایک دُوسرے کو اپنی اپنی زندگیوں کے بارے میں بتایا۔

ینا بائیس برس کی تھی اور اُس کے ساتھ یہ تب ہوا تھا جب وہ پندرہ کے سن میں تھی۔

پہلی بار وہ خُود حاملہ ہوئی (اُس نے یہی بتایا تھا) اور اپنے ہونے والے بچّے کے باپ سے شادی کر لی جو عمر میں اُس سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ واقعہ شکاگو سے باہر کسی قصبے میں وقوع پذیر ہوا تھا، قصبے کا نام لینے والے تھا اور وہاں لڑکوں کے لیے صرف غلّہ ڈھونے اور مشینیں نصب کرنے اور لڑکیوں کے لیے محض سٹوروں پر کام کرنے کی ملازمتیں تھیں۔ ینا کی خواہش ایک مشاطّہ بننے کی تھی لیکن اُس کے لیے وہاں سے دُور جانا اور تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ وہ سدا سے لینے والے کی رہنے والی نہیں تھی ـــ وہاں اُس کی نانی رہتی تھی اور وہ اپنی نانی کے پاس رہتی تھی کیوں کہ اُس کا والد وفات پا گیا تو اُس کی والدہ

نے دُوسری شادی کر لی اور اُس کے سوتیلے باپ نے اُسے نکال باہر کیا تھا۔

اُس کے ہاں دُوسرا بچہ ہوا، ایک اَور بچہ، اور اُس کے خاوند کو مبیّنہ طور پر دُوسرے قصبے میں نوکری مل گئی تھی، اِس لیے وہ وہاں چلا گیا — اُس نے اُسے اخراجات بھجوانے کا وعدہ کیا لیکن کبھی ایک ٹکا تک نہیں بھیجا۔ لہٰذا اُس نے اپنے دونوں بچّوں کو اپنی نانی کے پاس چھوڑا اَور ٹوکیو/شکاگو جانے والی بس پکڑ لی۔

بس پر اُس کی ملاقات مَرسی نام کی ایک لڑکی سے ہوئی جو اُسی کی طرح شکاگو جا رہی تھی۔ مَرسی ایک شخص کو جانتی تھی جس کا وہاں ریستوران تھا اور اُس نے اُسے بتایا کہ وہ اُنھیں ملازمت دے دے گا۔ لیکن جب وہ شکاگو پہنچیں اور اُس ریستوران کا کھوج نکالا تو پتا چلا کہ وہ شخص اُس کا مالک نہیں تھا — وہ وہاں صرف کام کرتا تھا اور کچھ عرصہ پہلے کام چھوڑ گیا تھا۔ البتہ اُس کے مالک کے پاس بالائی منزل پر ایک خالی کمرہ تھا اور اُس نے اُنھیں ہر شب ریستوران کی صفائی کے عوض وہاں ٹھیرنے کی اجازت دے دی۔ وہ ریستوران میں خواتین کا کمرہ استعمال کرتی تھیں لیکن دِن میں وہاں زیادہ وقت نہیں گزار پاتیں — رات کو اُنھیں صفائی کرنا ہوتی تھی۔

اُنھیں نیند لینے کا بھی بہ مشکل وقت ملتا۔ وہ سڑک کی دُوسری جانب واقع بار کے بارمین کی دوست بن گئیں، جو ایک عجیب وغریب لیکن اچھا شخص تھا — اور وہ اُنھیں ادرک کی شراب مفت پلا دیا کرتا تھا۔ وہیں اُن کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جس نے اُنھیں ایک پارٹی میں دعوت دی اور اُس کے بعد اُنھیں مزید دعوتیں ملیں۔ اِسی دوران میں نینا کی ملاقات مسٹر پروِس سے ہوئی۔ درحقیقت یہی وہ شخص تھا جس نے اُسے نینا کا نام دیا۔ اِس سے قبل وہ جُون تھی۔ وہ مسٹر پروِس کی قیام گاہ پر جا کر رہنے لگی۔

اُس نے اپنے بیٹوں کا معاملہ اُس کے سامنے لانے کے لیے کچھ عرصہ انتظار کیا۔ مسٹر پروِس کے گھر میں اِتنے زیادہ کمرے تھے کہ اُسے توقع تھی کہ وہ وہاں اُس کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اُس نے یہ تذکرہ چھیڑا تو مسٹر پروِس نے اُسے بتایا کہ وہ بچّوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہ کبھی حاملہ ہو لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ہو گئی اور وہ اور مسٹر پروِس اسقاطِ حمل کے لیے جاپان چلے گئے۔

اب تک، آخری لمحے تک، اُس کا یہی خیال تھا کہ وہ اسقاط کروا لے گی لیکن پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ نہیں، وہ حمل برقرار رکھے گی اور بچّے کو جنم دے گی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ وہ شکاگو لوٹ کر اُسے ادائیگی کر دے گا۔ لیکن تب سے اب تک وہ اپنی مددآپ کے تحت ہی تھی۔

تب تک وہ اپنے راستے کے بارے میں تھوڑا بہت جان چکی تھی اور وہ ایک ایسی جگہ گئی جہاں کے لوگ اُس وقت تک دیکھ بھال کرتے ہیں جب تک کہ بچہ پیدا نہ ہو جائے اور آپ اُسے اپنا لے نہ

لیس۔بچہ پیدا ہوا تو وہ لڑکی تھی جس کا نام بینا نے جیما رکھا اور اُسے ہر حال میں اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اُس جگہ اُس کی جان پہچان ایک اَور لڑکی سے ہوئی جس نے وہاں بچہ جنم دیا اور اپنے پاس رکھا تھا۔اُس نے اور اُس لڑکی نے باری باری کام کرنے، اکٹھے رہنے اور اپنے بچے پالنے کا انتظام کیا۔ اُنھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق ایک اپارٹمنٹ لیا اور ملازمتیں کرنے لگیں۔بینا ایک کاک ٹیل لاؤنج میں—اور ہر چیز ٹھیک ہو گئی۔پھر بینا کرسمس سے فوراً پہلے گھر آئی تو—اب جیما آٹھ ماہ کی ہو چکی تھی— اُس نے دیکھا کہ دُوسری ماں نیم مدہوشی کے عالم میں ایک مرد کے گرد جھوم اور جیما بخار میں جل رہی تھی اور وہ اِس قدر بیمار تھی کہ اُس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

بینا نے اُسے کپڑے میں لپیٹا اور ٹیکسی میں ہسپتال لے گئی۔کرسمس کی وجہ سے ہر جگہ ٹریفک رُکی ہوئی تھی اور بالآخر جب وہ وہاں پہنچی تو اُسے بتایا گیا کہ وہ غلط ہسپتال میں آ گئی ہے اور اُسے ایک دُوسرے ہسپتال بھیج دیا گیا۔راستے میں جیما لوٹ پوٹ ہوئی اور دم توڑ گئی۔

بینا، جیما کی حقیقی تدفین چاہتی تھی نہ کہ وہ اُسے کسی بُوڑھے مفلوک الحال مُردے کے ساتھ قبر میں ڈالنا (اُس نے سُن رکھا تھا جب آپ کے پاس رقم نہ ہو تو بچے کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے)۔لہٰذا وہ مسٹر پرویں کے پاس گئی۔وہ اُس کے لیے اُس کی توقع سے زیادہ اچھا نکلا۔اُس نے اُسے تابوت اور جیما کے نام کے کتبے کے لیے رقم دی اور جب یہ معاملہ نپٹ گیا تو وہ بینا کو واپس لے گیا۔وہ اُسے اپنے ہمراہ لندن، پیرس اور دیگر بے شمار مقامات کی طویل سیاحت پر لے کر گیا۔جب وہ گھر آئے تو اُس نے اپنے شکا گو والے مکان کو تالا لگایا اور وہ یہاں آ گئے۔اُس کی یہاں قریب ہی گاؤں میں کچھ جائیداد اور ریس کے گھوڑے تھے۔

اُس نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا وہ کچھ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے اور اُس نے جواب دیا کہ ہاں۔اُس نے اُسے کہا کہ وہ چند کورسوں میں داخلہ لے کر دیکھے کہ وہ کیا پڑھنا چاہتی ہے۔اُس نے اُسے بتایا کہ وہ عام طلبا کی طرح رہنا چاہتی ہے جس پر اُس نے کہا کہ اِس کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

بینا کی زندگی کے بارے میں جان کر میں نے اپنے آپ کو احمق محسوس کیا۔

میں نے اُس سے پُوچھا کہ مسٹر پرویں کے نام کا پہلا حصہ کیا ہے۔

''آرتھر۔''

''تم اُسے اِس نام سے کیوں نہیں پکارتیں؟''

''اِس کی صوت فطری محسوس نہیں ہوتی۔''

سوائے کالج کی مخصوص تقریبات کے، مثلاً کسی کھیل (ڈراما) یا کسی گیت سنگیت کی محفل یا

لیکچر کے، نینا رات کے وقت باہر نہیں نکلتی تھی۔ وہ شاید دوپہر اور رات کا کھانا کیفے ٹیریا میں کھا لیتی تھی۔ گو، جیسا کہ میں نے بتایا ہے، میں نہیں جانتی کہ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ ناشتے کے لیے ہمارے کمرے میں کیس کیفے تھا اور ایک روز قبل کی میری کیفے ٹیریا سے لائی ہوئی میٹھی ٹکیا ہوتی تھیں۔ مسٹر پروس کو اس کا نام تک پسند نہیں تھا لیکن اس نے اُسے نینا کی کالج کی طالب علمی کی سوانگ والی زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ جب کہ اُسے گمان تھا کہ وہ ایک وقت کا بہترین کھانا کھاتی اور ایک سینڈوچ اور کسی اَور کھانے کے ساتھ یخنی لیتی ہے۔ وہ ہمیشہ کھوج لگاتی رہتی کہ کیفے ٹیریا میں کیا کچھ ملتا ہے تا کہ وہ اُسے بتا سکے کہ اُسے سابیج یا سالسبری کا قتلہ، اور مچھلی یا انڈہ اور سلاد ملا سینڈوچ کھایا ہے۔

''اگر تم باہر چلی جاؤ تو اُسے کیسے معلوم ہوگا؟''

نینا اُسی شکایت یا خوشی بھری مدہم آواز کے ساتھ اپنے پیروں پر اُٹھی اور اُس نے بالائی کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔

''یہاں آؤ۔'' وہ بولی۔ ''پردے کے پیچھے کھڑی ہو جاؤ۔ دیکھا؟''

ایک سیاہ کار، جو سڑک کے بالکل پار لیکن سامنے نہیں چند گھر چھوڑ کر، کھڑی تھی۔ سٹریٹ لائٹ میں ڈرائیور کے سفید بال چمک رہے تھے۔

''بیگم وِنّر۔'' نینا بولی۔ ''وہ آدھی رات تک یہیں رہے گی۔ یا پھر دیر تک، میں نہیں جانتی۔ اگر میں باہر نکلی تو میرا تعاقب کرے گی اور میں جہاں جہاں جاؤں گی میرے اردگرد رہے گی اور پھر واپسی پر بھی میرے پیچھے لگی رہے گی۔''

''اگر اُسے نیند آ جائے تو؟''

''یہاں نہیں۔ یا اگر وہ سو بھی گئی اور میں نے کوشش کی تو وہ رکھوالی والے کتے کی طرح فوراً ہی جاگ اُٹھے گی۔''

نینا کے منصوبے کے مطابق محض بیگم وِنّر کو کچھ حرکت میں لانے کی خاطر ایک شام ہم گھر سے نکلے اور سٹی لائبریری جانے والی بس پکڑ لی۔ بس کی کھڑکی سے ہم نے دیکھا کہ ہر بس سٹاپ پر لمبی سیاہ کار سست اور مدہم ہوتی اور پھر ہمارے قریب رہنے کے لیے رفتار پکڑ لیتی۔ ہم نے کتب خانے کا ایک بلاک پار کیا ہی تھا کہ بیگم وِنّر ہمارے پاس سے گزر کر داخلے پر کار روک کے عقبی شیشے سے۔ ہمیں یقین تھا۔ دیکھنے لگی۔

میں ''دی سکارلیٹ لیٹر'' کی تلاش میں تھی جو مجھے میرے ایک کورس کے سلسلے میں درکار تھی۔ میں خریدنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور کالج کا سارا کتب خانہ چھان چکی تھی۔ میں نینا کے لیے بھی ایک کتاب لینا چاہتی تھی۔ ایک ایسی کتاب جس میں تاریخ کے سادہ ترین نقشے دیے گئے ہوں۔

بینا نے اپنے کورس کی نصابی کتب خریدیں۔ اُس نے روزنامچے اور قلم بھی خریدے۔ اُس زمانے کے بہترین فاؤنٹین قلم۔ ہم رنگ۔ سُرخ قلم کولمبوی تہذیب، نیلا رومانوی شاعروں، سبز وکٹوریائی ورجارجائی ناول نگاروں، زرد پنسل سے اینڈرسن تک کی دیومالائی کہانیوں کے لیے۔ وہ ہر لیکچر میں پچھلی قطار میں بیٹھتی کیوں کہ اُس کے خیال میں وہ اُس کے لیے مناسب جگہ تھی۔ وہ لطف لیتے ہوئے یُوں گفتگو کرتی جیسے وہ آرٹس بلڈنگ سے دُوسرے طلبا کے اژدحام سے گزرتے، اپنی نشست ڈھونڈتے، مخصوص صفحے پر اپنی نصابی کتاب کھولتے اور اپنا قلم نکالتے ہوئے لطف اُٹھاتی تھی۔ لیکن اُس کے روزنامچے خالی رہے۔

مصیبت یہ تھی، جیسا کہ میں نے دیکھا، اُس کے پاس لکھنے کے لیے کوئی موضوع تھا ہی نہیں۔ اُسے وکٹوریائی، یا رومانوی، یا قبل از کولمبوی تک کا مطلب ہی معلوم نہیں تھا۔ وہ جاپان اور بار باڈوس اور یورپ کے دیگر بہت سے ممالک گئی تھی لیکن وہ اُن مقامات کو نقشے میں کبھی تلاش نہیں کر پائی۔ اُسے معلوم نہ ہو پایا کہ فرانسیسی انقلاب پہلی جنگِ عظیم سے قبل رُونما ہوا تھا یا بعد میں۔

میں متحیّر ہوتی کہ اُس کے لیے اِن کورسوں کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ کیا اُن کی صوت اُس کے کانوں کو بھلی لگتی تھی؟ کیا مسٹر پرِوس کا خیال تھا کہ وہ اُن میں مہارت حاصل کر لے گی؟ شاید اُس نے (مسٹر پرِوس نے) طنزاً منتخب کیا تھا کہ اُس کا دِل جلد ہی طالبِ علمی سے بھر جائے؟

جب میں اپنی مطلوبہ کتاب تلاش کر رہی تھی تو میری نظر ارنی ہاٹس پر پڑی۔ اُس کی بغل میں پُراسرار کہانیوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا جو اُس نے اپنی والدہ کی ایک دوست کے لیے منتخب کیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہ کام ہمیشہ کرتا ہے جیسے وہ ہمیشہ ہر ہفتہ کی صبح مہرہ بازی کا کھیل اپنے والد کے ایک گہرے دوست کے ہمراہ وار ویٹرانز ہوم (War Veterans' Home) میں کھیلتا ہے۔

میں نے اُس کا تعارف بینا سے کروایا۔ میں نے بینا کے صرف وہاں آنے کے بارے میں بتایا لیکن اُس کی سابقہ اور حتیٰ کہ موجودہ زندگی کا ذکر گول کر گئی۔

اُس نے بینا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ اُسے اُس سے مل کر خوشی ہوئی اور اچانک پُوچھا کہ کیا وہ ہمیں ہمارے گھر چھوڑ دے گی۔

میں یہ کہنے ہی والی تھی کہ نہیں شکریہ، ہم بس سے چلے جائیں گے کہ بینا نے اُس سے پُوچھ لیا کہ اُس کی کار کہاں کھڑی ہے۔

''عقب میں۔'' اُس نے کہا۔

''کیا عقبی دروازہ بھی ہے؟''

''ہاں، ہاں۔ وہ ایک سیڈان ہے۔''

''نہیں ۔میرا مطلب ہے کہ لائبریری میں ۔''نینا بولی ۔''اِس عمارت میں ۔''

''ہاں، ہاں ۔ ہے ۔'' اَرنی ہڑ بڑا کر بولا ۔''معذرت خواہ ہوں، میں سمجھا کہ آپ کی مراد کار سے تھی ۔ہاں، لائبریری میں عقبی دروازہ ہے ۔ میں بھی اُسی دروازے سے آیا ہوں ۔معذرت چاہتا ہوں ۔''اب وہ شرم سے لال ہو رہا تھا ۔اگر نینا ایک مشفق قہقہے سے مداخلت نہ کرتی تو وہ معذرت کرتا چلا جاتا ۔

''خوب، تب تو ۔'' وہ بولی ۔''ہم عقبی دروازے سے باہر جا سکتے ہیں ۔لو، یہ طے ہوا ۔ شکریہ ۔''

اَرنی ہمیں بٹھا کر گھر لے گیا ۔اُس نے دریافت کیا کہ کیا ہم کافی کے کپ یا گرما گرم چاکلیٹ کے لیے اُس کے ہاں جانا پسند کریں گے ۔

''معذرت، ہم ذرا جلدی میں ہیں ۔''نینا نے کہا ۔''تاہم پوچھنے کا شکریہ ۔''

''میرا خیال ہے تمھیں گھر کا کام کرنا ہے ۔''

''گھر کا کام، ہاں ۔''وہ بولی ۔''ہم یقیناً کرتی ہیں ۔''

میں سوچ رہی تھی کہ اُس نے مجھے تو ایک بار بھی اپنے گھر چلنے کو نہیں کہا ۔ترجیحات ۔ایک لڑکی نہیں ۔دو لڑکیاں، ٹھیک ہے ۔

جب ہم نے شکریے ادا کیے اور شب بخیر کہا تو سڑک کے پار سیاہ کار نہیں تھی ۔بالائی کھڑکی سے بھی سیاہ کار نظر نہیں آئی ۔کچھ ہی دیر بعد نینا کے لیے فون بجا اور میں نے اُسے ارضی منزل سے کہتے سُنا ۔''اوہ نہیں، ہم بس لائبریری تک گئی تھیں اور واپس آ گئی ہیں سیدھی گھر ۔بس کے ذریعے ۔ہاں، وہ وہاں سے دُور کہیں تھی ۔ میں ٹھیک ہوں ۔ یقیناً ۔شب بخیر ۔''وہ جھومتی اور مُسکراتی ہوئی اُوپر آئی ۔''بیگم وُرنے نے تو آج مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی ۔''

ایک صبح نینا اپنے بستر سے نہیں اُٹھی ۔اُس نے کہا کہ اُس کا گلا خراب ہے اور اُسے بخار ہے ۔ ''مجھے چھوؤ ۔''

''مجھے تو تم ہمیشہ گرم محسوس ہوتی ہو ۔''

''آج میں زیادہ گرم ہوں ۔''

وہ جمعہ تھا ۔اُس نے مجھے کہا کہ میں مسٹر پروِس کو فون کروں اور اُسے بتا دوں کہ وہ ہفتہ وار تعطیل پر یہیں ٹھہرنا چاہتی ہے ۔

''وہ مجھے رہنے دے گا — وہ کسی بیمار کو اپنے پاس برداشت نہیں کرتا — اِس معاملے میں وہ بے حس شخص ہے ۔''

مسٹر پرِوس نے دریافت کیا کہ کیا وہ ڈاکٹر بھیجے۔ ینا یہ بات پہلے ہی جانتی تھی اور اُس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں کہہ دوں کہ اُسے بس آرام کی ضرورت ہے اور وہ اُسے فون کرے گی یا پھر اگر اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو پھر میں کروں گی۔ ''بہتر، اُس سے کہیں کہ اپنا خیال رکھے۔'' اُس نے کہا اور فون کرنے اور ینا کی اچھی دوست ہونے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر، جیسے کسی خیال کے تحت، اُس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں اُس کے ہمراہ ہفتے کی رات کھانا پسند کروں گی۔ اُس نے کہا کہ اُسے تنہا کھانا بیزار کُن لگتا ہے۔ ینا کا بھی یہی خیال تھا۔

''اگر وہ کہہ رہا ہے کہ کل شب تم اُس کے ہاں آؤ اور کھانا کھاؤ تو تم کیوں نہیں جاتیں؟ ہفتے کے روز رات کے کھانے پر ہمیشہ کوئی اچھی چیز ہوتی ہے — خاص کھانا ہوتا ہے۔''

ہفتے کے روز کیفے ٹیریا بند ہوتا تھا۔ مسٹر پرِوس سے ملاقات کا امکان گھبراہٹ اور ترغیب آمیز تھا۔

اِس لیے میں نے اُس کے ہمراہ رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا — اُس نے درحقیقت کہا تھا ''رات کا کھانا۔'' جب میں دوبارہ بالائی منزل پر گئی تو میں نے ینا سے پُوچھا کہ مجھے کیا پہننا چاہیے۔

''ابھی سے پریشانی کیوں؟ کل سے پہلے تو یہ ہوگا نہیں۔''

پریشانی کیوں، بلا شبہ؟ میرے پاس بس ایک ہی اچھا لباس تھا، کریپ کا چُنٹیں پڑا ایک تر کی لباس جو میں نے اپنے وظیفے کی رقم سے اپنی ہائی سکول کی مشقوں کے آغاز کی تقریب میں تقریر کی خاطر پہننے کے لیے خریدا تھا۔

بیگم وِز مجھے لینے آئی۔ اُس کے بال سفید نہیں تھے بلکہ سلوری رنگ میں رنگے ہوئے تھے، ایک ایسا رنگ جس کے بارے میں میرا یقین تھا کہ وہ سخت دِل لوگوں، غیر اخلاقی حرکات اور زندگی کی غلیظ عقبی گلیوں میں طویل ناہموار سفر کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرنے کے لیے کار کا اگلا دروازہ کھولا کیوں کہ میرے خیال میں ایسا کرنا ہی عمدہ اور جمہوری طریقہ تھا۔ اُس نے مجھے منع نہیں کیا، میرے پاس کھڑی رہی اور پھر پھرتی سے پچھلا دروازہ کھولا۔

میرا خیال تھا کہ مسٹر پرِوس شہر کے شمالی حصے میں ایکڑوں تک پھیلے باغیچوں اور غیر مزروعہ کھیتوں کے بیچ کسی بڑے سے محل میں رہتے ہوں گے۔ غالباً اِس خیال کی وجہ ریس کے گھوڑے تھے۔ اِس کے بجائے ہم شرقی سمت خوش حال لیکن شاہانہ سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے اینٹوں اور ٹیوڈور عہد کی نقل میں بنے مکانات کے قریب سے گزرے جن کی روشنیاں دھند لکا چھاتے ہی روشن ہوگئی تھیں اور کرسمس کی روشنیاں پہلے ہی سے برف سے ڈھکی بیلوں اور جھاڑیوں میں جھلملا رہی تھیں۔ ہم باڑ میں گھری ایک تنگ روش پر مڑے اور ایک گھر کے سامنے ٹھیر گئے جسے میں نے اُس کی مسطح چھت، بڑی

بڑی کھڑکیوں اور اس حقیقت کے سبب کہ وہ کنکریٹ سے بنی عمارت تھی "جدید" سمجھا۔ وہاں کرسمس کی روشنیاں تھیں نہ کسی اَور طرح کی۔

مسٹر پریوس کا نام بھی اُس پر کندہ نہیں تھا۔ کار ایک ڈھلوان سے ہوتی ہوئی ایک زیرِ زمین وسیع وعریض گیراج میں پھسل گئی۔ ہم برقی سیڑھیوں کے ذریعے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے جو مدہم روشنی اور نشست گاہ کے مانند سیدھی پشت کی گدیلی کرسیوں، چھوٹی چھوٹی پالش شدہ میزوں، آئینوں اور قالینوں سے سجایا گیا تھا۔

بیگم وِزّر نے مجھے اُس بڑے کمرے میں کھلتے دروازوں میں سے ایک دروازے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ دروازہ بغیر کھڑکیوں والے ایک کمرے میں کھلا جس میں بینچ اور کھونٹیوں کے گرد صرف دیواریں تھیں۔ لکڑی پر پالش اور فرش پر قالین کے علاوہ وہ بالکل سکول کے کپڑے تبدیل کرنے والے کمرے جیسا تھا۔ "اپنے کپڑے یہاں اُتار دو۔" بیگم وِزّر بولی۔

میں نے اپنے اوپر والے بُوٹ اُتارے۔ بے انگشت دستانے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے اور اُسے کھونٹی پر لٹکایا۔ بیگم وِزّر میرے پاس موجود رہی۔ میری جیب میں ایک کنگھی تھی اور میں اپنے بال ٹھیک کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کے سامنے نہیں، اور مجھے آئینہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"اب باقی بھی۔" اُس نے کہا۔

وہ سیدھی میری جانب دیکھ رہی تھی کہ میں سمجھ گئی ہوں یا نہیں اور جب میں نے ظاہر کیا کہ میں نہیں سمجھی تو (اگر چہ ایک طرح سے۔ سمجھ گئی تھی لیکن مجھے توقع تھی کہ مجھے غلطی لگی ہے) وہ بولی۔ "گھبراؤ مت، تمھیں ٹھنڈ نہیں لگے گی۔ تمام گھر خُوب گرم ہے۔"

میں نے تعمیل کے لیے حرکت نہیں کی تو اُس نے عام سے انداز میں یُوں کہا جیسے اُس کی توہین کر کے اُسے زِچ نہیں کیا جا سکتا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بچّی نہیں ہو۔"

اُس لمحے میں اپنے کوٹ تک پہنچ سکتی تھی، میں اپنے کرائے کے کمرے والے گھر واپس پہنچانے کا مطالبہ کر سکتی تھی اور یہ بھی کہ میں خُود پیدل بھی جا سکتی تھی۔ مجھے وہ راستہ یاد تھا جس سے ہم آئے تھے اور اگر چہ ٹھنڈ تھی لیکن مجھے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لگتا۔

"اوہ، نہیں۔" مجھے اب بھی حرکت میں نہ پا کر بیگم وِزّر بولی۔ "تو تم محض ایک کتابی کیڑا ہو، بس۔"

میں نیچے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے جوتے اُتارے۔ اپنی لمبی جراب ڈھیلی کی اور اُتار دی۔ میں اُٹھی اور زِپ کھول کر وہ لباس بھی اُتار ڈالا جسے پہن کر میں نے تقریب سے خطاب کیا تھا جو لاطینی زبان کے اِن الفاظ پر ختم ہوا تھا: *Ava atqua vale*

میں اب بھی اپنے جانگیا میں ڈھکی ہوئی تھی۔ میں ہاتھ پشت پر لے گئی اور اپنی انگیا کھولی اور پھر اُسے اُتارنے کے لیے طوطا ہو کر ہا اپنے بازوؤں اور سامنے کے حصے سے بہ مشکل کھینچا۔ اگلی باری لچک دار بیلٹ کی آئی، پھر چڈی کی۔ جب وہ اُتر گئے تو میں نے اُن کی گیند بنا کر اُنھیں انگیا میں چھپا دیا۔ میں نے دوبارہ اپنے پاؤں جوتوں میں ڈالے۔

"ننگے پاؤں۔" بیگم وِزر آہ بھرتی ہوئی بولی۔ لگتا تھا جیسے جانگیا کا نام لینا اُس کے لیے خاصا تکلیف دہ ہے لیکن جب میں نے اپنے جوتے اُتارنے شروع کیے تو وہ بولی۔ "تم عریاں کے لفظ کا مفہوم تو جانتی ہو؟ عریاں۔"

میں نے جانگیا اپنے سر پر کھینچ لی۔ اُس نے مجھے لوشن کی ایک بوتل دی اور کہا۔ "اِسے اپنے بدن پر مَل لو۔"

اُس کی مہک نیبا جیسی تھی۔ میں نے کچھ اپنے بازوؤں اور کندھوں پر مَلا، صرف اُن حصوں پر جو میرے ہاتھوں کی رسائی میں تھے۔ بیگم وِزر کھڑی دیکھتی رہی اور ہم پھر بڑے کمرے میں چلے گئے۔ میری نگاہیں آئینوں سے نظریں چرا رہی تھیں۔ اُس نے ایک اَور دروازہ کھولا اور دُوسرے کمرے میں مَیں تنہا گئی۔

مجھے یہ گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ مسٹر پرِوِس میرے ہی مانند عریاں حالت میں منتظر ہوگا اور وہ عریاں تھا بھی نہیں۔ اُس نے گہرا نیلا بلیزر، سفید قمیص اور گلے کا ایک اسکاٹ[۳] رومال (گو میں اُس وقت نہیں جانتی تھی کہ اُسے کیا کہہ کر پکارا جاتا ہے) اور سُرمئی ڈھیلا پاجاما پہنے ہوئے تھا۔ وہ مجھ سے بہ مشکل ہی لمبا، دبلا پتلا اور بُوڑھا تھا۔ جب وہ مُسکراتا تھا تو اُس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑتی تھیں۔

مجھے یہ بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ بے لباسی آبرو ریزی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے یا کھانے کے علاوہ کسی اَور تقریب کا باعث (اور بلا شبہ، کمرے میں پھیلی ہوئی اشتہا انگیز خُوشبوؤں اور نعمت خانے میں چاندی کے ڈھکنوں والی رکابیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایسا نہیں ہے)۔ لیکن میں یہ بات کیوں سوچ رہی تھی؟ میں کیوں اِتنی خوف زدہ ہو رہی تھی؟ یہ معاملہ میرا بُوڑھے مردوں کے بارے میں خیالات کی بنا پر تھا۔ میرا خیال تھا وہ نہ صرف اپنی جسمانی صحت گرنے کے سبب نااہل ہوتے ہیں بلکہ بہت زیادہ ختم شد — یا مایوس وافسردہ — اپنے معتد بہ آزمائشوں اور تجربات کی وجہ سے اُن کی دِلچسپی بچی ہی نہیں ہوتی۔ میں اِتنی بھی احمق نہیں تھی کہ یہ نہ سمجھ سکتی کہ میری بے لباسی کا میرے بدن کے جنسی استعمال سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن میں نے اِسے مزید پامالی کے ابتدائیے کے بجائے زیادہ حوصلے سے لیا اور میرا اِسے حتمی طور پر اختیار کرنے کا زیادہ تعلق غرور سے تھا یا کسی اَور شے کے بجائے مُذبذب بے احتیاطی سے۔ اور پھر وہ لفظ "کتابی کیڑا۔"

مجھے تمنا ہوئی کہ میں کہوں کہ میں یہاں اپنی کھال پہنے موجود ہوں جس سے مجھے اِتنی شرم بھی نہیں آ رہی تھی جتنی اپنے دانتوں کے ننگے پن سے آتی ہے۔ بلا شک وشبہ، یہ بات درست نہیں تھی اور درحقیقت میں پسینے سے شرابور ہو چکی تھی لیکن مجھے عصمت دری کا کوئی خوف نہیں تھا۔

مسٹر پروس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ میں لباس سے محروم ہوں۔ اُس نے کہا کہ نینا کی دوست سے ملاقات اُس کے لیے باعثِ خوشی ہے، بالکل ایسے جیسے میں کوئی ایسا فرد تھی جسے نینا سکول سے گھر لائی ہو۔ یہ بات ایک طرح سے درست بھی تھی۔ اُس نے بتایا کہ میں نینا کے لیے ایک تحرک ہوں۔

''وہ تمھاری بہت زیادہ تعریف کرتی ہے۔ اب تمھیں بھوک لگی ہوگی۔ آؤ دیکھیں، اُنھوں نے ہمارے لیے کیا بنایا ہے؟''

اُس نے ڈھکن ہٹائے اور مجھے کھانا نکال کر دینے لگا۔ کارنش مرغیاں جنھیں میں نے چھوٹے چوزے سمجھا تھا، خشک پھلوں والے زعفرانی چاول، خوب صورت انداز میں کٹی ہوئی مختلف سبزیاں جن کا ایک زاویہ مخصوص رُخ پر تھا اور اُن کے رنگ اُن سبزیوں سے اِتنے حقیقی تھے جنھیں میں روز دیکھتی تھی۔ ایک رکابی میں سبز مصالحے والا اچار اور دُوسری میں سُرخ رنگ کے محفوظ کیے ہوئے پھل اور سبزیاں۔

''یہ زیادہ مت لینا۔'' مسٹر پروس نے اچار اور محفوظ کی ہوئی چیزوں کے بارے میں کہا۔ ''شروع میں یہ کچھ گرمی ابھارتی ہیں۔''

اُس نے واپس میز تک میری رہنمائی کی، نعمت خانے کی سمت واپس مڑا، اپنے لیے بہت کم کھانا لیا اور بیٹھ گیا۔

میز پر پانی کا ایک گھڑا اور شراب کی بوتل دھری تھی۔ میں نے پانی لیا۔ اُس نے کہا کہ اُس کے گھر میں مجھے شراب پیش کرنا غالباً ایک بہت بڑا جرم ثابت ہوگا۔ میں قدرے مایوس ہوگئی کیوں کہ مجھے کبھی شراب پینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جب اَرنی اور میں اولڈ چیلسیا جاتے تھے تو اُس نے ہمیشہ اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ اتوار کے روز شراب یا دِیگر منشی سیال نہیں دیے جاتے۔ وہ نہ صرف شراب سے انکار کر دیتا بل کہ، اتوار یا کسی اور دِن بھی، وہ دُوسروں کو بھی پیتے دیکھ کر اظہارِ ناپسندیدگی کرتا تھا۔

''ہاں تو، نینا نے مجھے بتایا ہے۔'' مسٹر پروس نے کہا۔ ''کہ تم انگریزی فلسفہ پڑھ رہی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ یہ انگریزی اور فلسفہ کے مضامین ہوں گے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ کیوں کہ یقیناً انگریز فلسفیوں کی تعداد اِتنی زیادہ نہیں ہے۔''

اُس کی تنبیہ کے باوجود، میں نے سبز اچار کا ایک بڑا قتلہ اپنے مُنھ میں رکھ لیا اور جواب دینے

کے لیے میری زبان سُن ہوگئی۔ وہ خلیقانہ انداز میں مجھے پانی نگلتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''ہم یونانیوں سے آغاز کرتے ہیں۔ یہ سروے کورس ہے۔'' جب میں بولنے کے قابل ہوئی تو میں نے کہا۔

''اوہ ہاں، یونان۔ خُوب، تمھارا اَب تک پسندیدہ یونانی کون ہے — اوہ نہیں، ایک منٹ ٹھہرو۔ اِسے اِس طرح علاحدہ کرنا زیادہ آسان ہوگا۔''

پھر کارنِش مُرغی کی ہڈیوں سے گوشت علاحدہ کر کے دِکھانے لگا — نہایت عمدگی اور کسی احساسِ برتری کے بغیر، جیسے وہ محض ایک لطیفہ ہو جو ہم ایک دُوسرے کو سُنا رہے ہوں۔ ''تمھیں پسند ہے۔''

''ہم اب تک اُسے نہیں پا سکے — ہم قبل از سقراط زمانہ پڑھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن افلاطون۔''

''افلاطون تمھارا پسندیدہ ہے۔ تو تم ابھی آگے پڑھو، جہاں تمھارا خیال ہے تمھیں وہیں ٹھہر جانا چاہیے۔ افلاطون، ہاں میں اِس کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ تمھیں 'غار' پسند ہے۔''

''ہاں، یقیناً 'غار'، یہ خُوب صُورت ہے۔ کیا نہیں ہے؟''

جب میں بیٹھی ہوئی تھی تو میرا زیادہ تر خطا پذیر حصہ نظروں سے اوجھل تھا۔ اگر نینا کی طرح میرے پستان بھی چھوٹے اور مزیّن ہوتے تو میں بھی تقریباً آرام میں ہوتی۔ لیکن وہ بڑے بڑے اور جھولتے ہوئے تھے۔ وہ اندھیری رات کے پیدا کردہ حیوانوں کے مانند تھے جو روشنی میں سٹپٹا کر ایک دُوسرے سے ٹکراتے پھرتے ہیں۔ میں بولتے ہوئے اُس کی جانب دیکھنے کی کوشش کرتی لیکن اپنی خواہش کے برعکس شرما جاتی۔ جب یہ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز ذرا سی تبدیل ہو کر زیادہ تشفی آمیز، شائستگی بھری اور اطمینان بخش ہوگئی تھی جیسے اُس نے شہ مات والی چال چلی ہو۔ لیکن وہ نہایت مہارت اور خُوش اخلاقی سے بات کرتا رہا اور مجھے اپنے یونان کے دورے کے بارے میں بتاتا رہا۔ ڈیلفی، دی ایکروپولس، وہ معروف روشنی جس پر آپ یقین نہ کریں کہ سچ ہو سکتی ہے لیکن سچ ہے۔ پلپونیسس[۶] کی عریاں ہڈیاں۔

''اور پھر کریٹ[۷] — کیا تم منوآن[۸] تہذیب کے بارے میں جانتی ہو؟''

''ہاں۔''

''بے شک تم جانتی ہوگی۔ بے شک۔ اور تم جانتی ہو کہ منوآن خواتین کس انداز کا لباس پہنتی تھیں؟''

''ہاں۔''

اِس بار، میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں حیا اور بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کروں گی، تب بھی نہیں جب میں نے اپنے حلق میں گرمی محسوس کی۔

''بہت خُوب، وہ انداز۔'' وہ تقریباً افسردگی سے بولا۔ ''مختلف ادوار مختلف مخفی چیزوں کو عجیب وغریب بناتے ہیں اور سامنے لائی جانے والی چیزیں بھی اُنھیں مختلف بناتی ہیں۔''

میٹھے میں ونیلا کسٹرڈ اور پھینٹی ہوئی بالائی تھی جس میں کیک کے ٹکڑے اور رَس بھریاں تھیں۔اُس نے محض چند لقمے لیے۔لیکن پہلی مرتبہ مکمل طور پر لطف اندوز ہونے میں ناکام رہنے پر میں تہیہ کرلیا تھا کہ میں کسی بھی مزے دار اور میٹھی چیز سے محروم نہیں رہوں گی اور میں نے اپنی اشتہا اور دھیان کا رخ چمچ کی طرف کرلیا۔

اُس نے کافی چھوٹے چھوٹے کپوں میں اُنڈیلی اور مجھے دعوت دی کہ کتب خانے میں چل کر پیتے ہیں۔

جب میں نے کھانے کے کمرے کی کرسی کی نرم اور پھولی ہوئی گدی سے اپنے آپ کو آزاد کیا تو میرے گو۔لہے تالیاں بجانے لگے۔لیکن اُن کی آواز اُس کے بُوڑھے لرزتے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے میں دھرے نفیس کپوں کی کھنکھناہٹ میں قریب قریب دَب کر رہ گئی۔

گھریلو کتب خانوں سے میری آشنائی محض کتابوں کے ذریعے تھی۔اُس کتب خانے میں کھانے کے کمرے کی دِیوار میں لگے لکڑی کے تختے سے اندر داخل ہوا جاتا تھا۔اُس کے اُٹھے ہوئے پیر کے چھونے پر تختہ گھوم کر بلا آواز کھلا۔اُس نے میرے آگے چلنے پر معذرت کی کہ کافی لے جاتے ہوئے اُسے یہی کرنا پڑتا تھا۔میرے لیے یہ بات باعثِ اطمینان تھی۔ مجھے خیال آیا کہ بدن کا عقبی حصہ — نہ صرف میرا بلکہ کسی کا بھی — سب سے زیادہ حیوانی حصہ ہوتا ہے۔

جب میں اُس کی بتائی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گئی تو اُس نے مجھے کافی دی۔کھانے کی میز کی نسبت وہاں کھلی جگہ پر بیٹھنا آسان نہیں تھا۔ وہ کُرسی ہموار پٹی دار رَیشم سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن یہ والی خاصی مہنگی گدیوں والی تھی جو مجھے یُوں چبھ رہی تھیں کہ میرے اندر ہیجان برپا کر رہی تھیں۔

اِس کمرے میں تیز روشنی تھی جو دِیوار کے ساتھ کتب، قدرتی مناظر والی تصاویر اور رَوشنی جذب کرتے لکڑی کے تختوں کے ساتھ زیادہ ہُو ہ لگانے اور شرم دلانے والی محسوس ہوتی تھی۔

ایک لمحے کے لیے، ایک کمرے سے دُوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے، مجھے ایک کہانی کے ایک منصوبے کا خیال آیا — وہ کہانی میں نے سُنی ہوئی تھی لیکن اُسے پڑھنے کا اتفاق چند ہی لوگوں کو ہوا تھا — کہانی میں ایک کمرہ، جو کتب خانہ ظاہر کیا گیا تھا، مدہم روشنی، پھولی پھولی گدّیاں اور رُوئیں دار پوشوں کے تمام تکلفات سے مزیّن خواب گاہ میں بدل جاتا ہے۔لیکن جس کمرے میں

ہم تھے وہ واقعی ایک کتب خانہ ہی تھا۔ مطالعے کی روشنیاں، شیشے والے کارنسوں پر دھری کتابیں اور کافی کی توانائی بخش مہک۔ مسٹر پروس نے ایک کتاب اُٹھائی، اُس کے ورق پلٹے اور اپنی مطلوبہ چیز ڈھونڈنے لگے۔

''تمھاری بڑی مہربانی ہوگی اگر تم مجھے یہ پڑھ کر سنادو۔ رات کے وقت میری نظر ٹھیک کام نہیں کرتی۔ تم اِس کتاب کے بارے میں جانتی ہو؟''

''شراپشائر[۹] کا ایک نوجوان۔''

میں اُس کے بارے میں جانتی تھی۔ درحقیقت اُس کی بہت سی نظمیں مجھے زبانی یاد تھیں۔

''اور کیا میں تم سے درخواست کر سکتا ہوں۔ کیا میں تم سے درخواست کر سکتا ہوں۔ اپنی ٹانگیں ایک دُوسرے پر نہ رکھو۔''

جب میں نے کتاب پکڑی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''ہاں۔''

اُس نے کتابوں والے خانے کے سامنے، میرے روبرو ایک کُرسی منتخب کی۔

''اُفتاد پڑی ہے جنگل پر وَین لاک اَیج میں،۔''

شناسا سا الفاظ اور ردھم نے مجھے پُرسکون کر دیا۔ وہ مجھ پر غالب آ گئے۔ دھیرے دھیرے میں نے مزید سکون محسوس کیا۔

''پودوں کے انبار لگا۔ تیز جھکڑ
اتنے شدید کہ جلد ہوگی ہر سمت بربادی
رُومی اور اور اُن کی مشکل آج
یُوریکان[۱۰] کی خاک تلے ہے''

یُوریکان کہاں تھا؟ کون جانتا تھا؟

حقیقتاً ایسا نہیں تھا کہ میں بھول بیٹھی تھی کہ میں کہاں ہوں یا کس کے ساتھ اور کس حالت میں وہاں بیٹھی ہوں۔ لیکن میں کسی قدر دُور کہیں اَور ہی کچھ فلسفیانہ محسوس کر رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ دنیا میں کسی نہ کسی طور پر ہر شخص ننگا ہے۔ اگرچہ مسٹر پروس نے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن وہ بھی ننگا تھا۔ ہم سب افسردہ عریاں مخلوق تھے۔ شرم کم ہو گئی۔ میں بس ورق اُلٹتی، ایک کے بعد ایک نظم پڑھتی چلی گئی۔ میری آواز پسند آتی گئی۔ مجھے حیرت ملی کہ نہایت مایوسی ہوئی جب۔ جب کہ ابھی حیرت انگیز مصرعے آنا تھے۔ مسٹر پروس نے مجھے ٹوک دیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے آہ بھری۔

''بہت ہے، بہت ہے۔'' وہ بولا۔ ''یہ بہت خُوب تھا۔ تمھارا شکریہ۔ تمھارا دیہی لب ولہجہ

نہایت مناسب تھا۔اب میرے سونے کا وقت ہوگیا ہے۔''

میں نے اُسے کتاب پکڑا دی۔اُس نے اُسے الماری میں منتقل کیا اور شیشہ بند کر دیا۔ وہی لب ولہجہ میرے لیے ایک خبر تھی۔''اور مجھے ڈر ہے کہ اب تمھیں تمھارے گھر بھیجنے کا وقت آ گیا ہے۔''

اُس نے اُسی بڑے کمرے میں کھلنے والا ایک دروازہ کھولا، جسے میں نے بہت دیر پہلے رات کے آغاز کے وقت دیکھا تھا۔ میں اُس کے سامنے سے گزری اور میرے پیچھے دروازہ بند ہوگیا۔شاید میں نے شب بخیر کہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے اُس کا رات کے کھانے کا شکریہ ادا کیا ہو اور اُس نے بھی مجھ سے چند خشک الفاظ یکلخت تھکے ہوئے بوڑھے، شکستہ اور بے نیاز لہجے میں کہے ہوں (کوئی بات نہیں، تمھاری معیّت کا شکریہ، تمھاری بہت مہربانی، ہاؤز مین [1] پڑھنے کا شکریہ)۔ اُس نے مجھ پر ہاتھ تک نہیں رکھا۔

وہی پھیکی پھیکی روشنی والا کپڑے تبدیل کرنے والا کمرہ۔ترک لباس، میری لمبی جرابیں اور جانگیا۔ جب میں اپنی لمبی جرابیں باندھ رہی تھی تو بیگم وِنر نمودار ہوئی ۔ جب میں رخصت ہو رہی تھی تو اُس نے مجھ سے صرف ایک بات کہی۔''تم اپنا گلوبند بھول گئیں۔''

اور وہاں واقعی گلوبند موجود تھا جسے میں نے ہوم اکنامکس کی جماعت میں بُنا تھا، واحد چیز جو میں نے زندگی میں بُنی تھی، میں اُسے، اُس جگہ چھوڑنے ہی والی تھی۔

جیسے ہی میں کار سے نکلی، بیگم وِنر بولی۔''مسٹر پروِس سونے سے قبل بینا سے بات کرنا چاہیں گے۔آپ اُنھیں بتادیں۔''

لیکن بینا یہ پیغام موصول کرنے کے لیے موجود نہیں تھی۔اُس کا بستر لگا ہوا تھا۔اُس کا کوٹ اور بُوٹ غائب تھے۔اُس کے چند ایک کپڑے الماری میں ٹنگے ہوئے تھے۔

بیورلی اور گَے بھی ہفتہ وار تعطیل پر گھر جا چکی تھیں،لہٰذا میں نیچے کو دوڑی کہ شاید بیتھ کے پاس کسی قسم کی معلومات ہوں۔''مجھے افسوس ہے۔'' بیتھ نے کہا، جسے میں نے کسی شے پر کبھی افسوس کرتے نہیں دیکھا تھا۔''میں تمھارے ہر وقت کے آنے جانے پر نظر نہیں رکھ سکتی۔'' پھر جیسے ہی میں مُڑی۔''میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ سیڑھیوں پر تھپ تھپ کر کے مت چلا کرو۔ میں نے کرسٹوفر کو ابھی سلایا ہے۔''

میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ گھر پہنچنے پر میں بینا کو کیا بتاؤں گی۔ کیا میں اُس سے دریافت کروں گی کہ اُسے بھی اُس گھر میں عریاں رہنے کے لیے کہا جاتا ہے — کیا وہ جانتی تھی کس قسم کی رات میری منتظر تھی؟ یا میں اُس سے کچھ نہ کہتی اور اُس کے استفسار کا انتظار کرتی؟ یا پھر معصومیت سے یہ کہتی کہ میں نے کارنش مُرغی اور زرد چاول کھائے جو بہت لذیذ تھے؟ یا یہ کہ میں نے شراپشائر کا ایک نوجوان''

سے کچھ پڑھا؟ کیا میں بس اُسے کشش وپیچ کا شکار رہنے دیتی؟

اب جب کہ وہ جا چکی تھی ان میں سے کسی بات کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ توجہ کا مرکز بدل گیا تھا۔ بیگم وِزر نے دس بجے کے بعد فون کیا۔ بیتھ کے ایک اَور قاعدے کی خلاف ورزی۔ اور جب میں نے اُسے بتایا کہ نینا وہاں موجود نہیں ہے تو اُس نے کہا۔ "کیا تمھیں اس کا یقین ہے؟"

جب میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نہیں معلوم نینا کہاں گئی ہوگی تو اُس نے پھر دہرایا۔ "کیا تمھیں یقین ہے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ بیتھ کے قواعد اور بچّوں کے سونے کی وجہ سے وہ اب صبح تک فون نہ کرے تو وہ بولی۔ "بہتر۔ میں نہیں جانتی۔ یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔"

جب میں صبح اُٹھی تو کار سڑک کے پار کھڑی تھی۔ بعد میں بیگم وِزر نے گھنٹی بجائی اور بیتھ کو بتایا کہ اُسے نینا کے کمرے کی تلاشی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ بیتھ کو بھی بیگم وِزر نے سرنگوں کر دیا۔ اُس نے ہمارے کمرے، غسل خانے اور الماری کی اچھی طرح تلاشی لی۔ حتّٰی کہ الماری کے فرش پر تہہ کر کے رکھے ہوئے دونوں کمبلوں تک کو جھاڑ کر دیکھا۔

میں اب تک اپنا پاجامہ پہنے "سر گاوَین اینڈ گرین نائٹ" (Sir Gawain and Green Kinght) پر ایک مضمون لکھ اور ٹیس کیفے پی رہی تھی۔

بیگم وِزر نے بتایا کہ اُس نے ہسپتالوں میں فون کیا تھا کہ کہیں نینا بیمار نہ پڑ گئی ہو اور مسٹر پروِس مختلف جگہوں پر خود بھی تلاش کرنے گئے جہاں جہاں اُس کے ہونے کا امکان تھا۔

"اگر تم کچھ جانتی ہو تو تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہمیں بتا دو۔" وہ بولی۔ "کچھ بھی۔"

پھر جیسے ہی وہ سیڑھیاں اُترنے لگی تو مُڑ کر ایسے لہجے میں بولی جو کم خطرناک نہیں تھا۔ "کیا کالج میں کوئی ایسا شخص ہے جو اُس کا دوست ہو؟ کوئی بھی جسے تم جانتی ہو؟"

میں نے بتایا کہ میرے خیال میں ایسا کوئی نہیں ہے۔

میں نے نینا کو کالج میں صرف دو بار دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ وہ آرٹس بلڈنگ کی نچلی راہداری سے جماعتوں کے ہجوم کے بیچ گزر رہی تھی۔ غالباً وہ بھی اپنی جماعت کی جانب جا رہی تھی۔ دوسری دفعہ وہ کیفے ٹیریا میں تھی۔ دونوں بار وہ تنہا تھی۔ جب آپ ایک جماعت سے دُوسری کی طرف جلدی میں جا رہے ہوں تو تنہا ہونا بالخصوص غیر معمولی امر نہیں ہوتا لیکن سہ پہر پونے چار بجے جب کیفے ٹیریا کی جگہ واقعی سنسان ہوتی ہے تو وہاں کافی کے کپ کے ساتھ اکیلے بیٹھنا کچھ عجیب لگتا ہے۔ وہ چہرے پر مُسکراہٹ لیے بیٹھی تھی جیسے ظاہر کر رہی ہو کہ وہ وہاں اپنے آپ میں بہت مسرور اور بہت مطمئن ہو، جیسے ہی اُس نے سمجھا کہ اِس زندگی کے مطالبے کیا ہیں۔ وہ اُنھیں پورا کرنے کے لیے پوری طرح چوکس اور

تیار ہو۔

سہ پہر کو برف باری شروع ہو گئی۔ سڑک کے پار والی کار کو وہاں سے ہٹنا اور برف ہٹانے والے ہَل کو جگہ دینا پڑی۔ جب میں غسل خانے میں گئی تو میں نینا کے کیمونو کی دروازے کی کھونٹی سے پھڑ پھڑاہٹ سُنی تو مجھے حتماً محسوس ہوا کہ میں کس چیز کو کچل رہی تھی۔ نینا کے لیے حقیقی خوف کو۔ میں اُسے راستہ کھوئے، بکھرے بالوں کے ساتھ روتے، اپنے اُونٹ کے بالوں والے کوٹ کے بجائے سفید زیر جامے میں برف میں مارے مارے پھرتی دیکھ سکتی تھی جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ اپنا کوٹ اپنے ساتھ لے گئی ہے۔

سوموار کی صبح میں اپنی پہلی جماعت کے لیے گھر سے روانہ ہونے ہی والی تھی کہ فون بج اُٹھا۔

''میں ہوں۔'' نینا نے ایک تیز تنبیہی لیکن فتح سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''سنو، براہِ مہربانی۔ کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کر سکتی ہو؟''

''تم کہاں ہو؟ وہ تمھاری تلاش میں ہیں۔''

''کون؟''

''مسٹر پروِس اور بیگم وِنّر۔''

''خوب، تم اُنھیں مت بتانا۔ اُنھیں کچھ بھی مت بتانا۔ میں یہاں ہوں۔''

''کہاں؟''

''اَرنسٹ کے ہاں۔''

''اَرنسٹ کے ہاں۔'' میں بولی۔ ''اَرنی کے ہاں۔''

''شش۔ کیا وہاں کوئی تمھاری آواز سننے والا ہے؟''

''نہیں۔''

''سنو، کیا تم براہِ مہربانی، براہِ مہربانی بس پکڑ کر میرا باقی سامان لا سکتی ہو؟ مجھے اپنے شیمپو کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنے کیمونو کی ضرورت ہے۔ میں اَرنسٹ کا غسل والا لباس پہنے رہی ہوں۔ تم مجھے دیکھ لو۔ میں ایک بڑے بڑے بالوں والے بُوڑھے بھورے گنجے کی طرح دِکھائی دیتی ہوں۔ کیا کار اب بھی باہر موجود ہے؟''

میں گئی اور میں نے دیکھا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔ تب تم بس پکڑو اور معمول کے مطابق کالج جاؤ اور پھر مرکزی قصبے کے لیے بس پکڑ لو۔ تمھیں پتا ہی ہے کہ کہاں آنا ہے۔ ڈُنڈاس اینڈ رچمنڈ۔ پھر پیدل یہاں آ جاؤ۔ کار سلسلے

سٹریٹ، تین سوتر لیسٹھ۔ تم اِس جگہ کو جانتی ہو، کیا نہیں جانتیں؟''

''کیا ارنی موجود ہے؟''

''نہیں، ڈم۔ڈم۔ وہ کام پر گیا ہے۔ وہ ہمارا خرچ اُٹھاتا ہے، کیا نہیں اُٹھاتا؟''

ہمارا؟ کیا ارنی میرا اور نینا کا خرچ اُٹھاتا تھا؟

نہیں، ارنی اور نینا کا۔ ارنی کو اپنا اور نینا کا خرچ اُٹھانا پڑتا تھا۔

نینا بولی۔ ''اوہ، براہِ مہربانی تم میری واحد دوست ہو۔''

میں نے ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ بیگم وِزر کو بے وقوف بنانے کے لیے میں نے نینا کا سامان اپنے سکول بیگ میں ڈال لیا۔ میں نے کالج کی بس پکڑی اور پھر مرکزی قصبے کی۔ میں ڈنڈاس اینڈ رچمنڈ پر اُتری اور کارلسلے سٹریٹ کی غربی سمت چلنے لگی۔ برف کا طوفان گزر چکا تھا اور آسمان صاف تھا۔ وہ ایک روشن، بے ہوا اور گو دا جما دینے والا دِن تھا۔ روشنی میری آنکھوں کو تکلیف پہنچا اور برف میرے پیروں تلے چُرمُرا رہی تھی۔

کارلسلے سٹریٹ میں شمالی آدھے بلاک کے فاصلے پر مجھے وہ گھر مل گیا جہاں ارنی اپنے ماں باپ کے ساتھ، پھر اپنی ماں کے ساتھ اور پھر اکیلا رہتا تھا اور اب — یہ کیسے ممکن تھا — نینا کے ساتھ۔

گھر بالکل ویسا ہی دِکھائی دیتا تھا جیسا وہ تب تھا جب میں ایک دوبار اپنی والدہ کے ہمراہ آئی تھی۔ اینٹوں سے بنا بنگلہ جس کے سامنے والے حصے میں ایک چھوٹا سا صحن، نشست گاہ کی ایک قوسی کھڑکی جس کے بالائی خانے میں رنگین شیشہ جڑا ہوا تھا۔ محدود اور مہذب۔

جیسا اُس نے بتایا تھا نینا بالکل ویسے ہی ایک مردانہ جھالردار لبادے میں لپٹی ہوئی تھی جس میں معصوم ارنی کی شیونگ کریم اور لائف بوائے صابن کی خوشبو آ رہی تھی۔

اُس نے میرے ہاتھ دبوچ لیے جو میرے بے انگشت دستانوں میں ٹھنڈ سے سخت پڑ گئے تھے۔

''جم گئے۔'' وہ بولی۔ ''آ جاؤ۔ ہم انھیں گرم پانی میں ڈال لیتے ہیں۔''

''جمے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جم رہے ہیں۔''

لیکن اُس نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور میری چیزیں اُتارنے میں میری مدد کی۔ مجھے باورچی خانے میں لے گئی اور پیالہ بھر پانی بہایا۔ پھر جیسے ہی تکلیف دیتے ہوئے خون میری اُنگلیوں میں دوڑنے لگا تو اُس نے مجھے بتایا کہ کیسے ارنسٹ (ارنی) ہفتے کی شب ہمارے کرائے والے گھر آیا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک رسالہ لایا تھا جس میں آثارِ قدیمہ، قلعوں اور ایسی بہت سی چیزوں کی بے شمار تصاویر تھیں جن میں، اُس کے خیال میں، اُسے دِلچسپی ہو سکتی تھی۔ چوں کہ وہ اُوپر نہیں آ سکتا تھا لہٰذا میں

نچلی منزل پر آئی اور جب اُس نے دیکھا کہ وہ کتنی بیمار ہے تو اُس نے کہا کہ وہ اُس کے گھر چلے تا کہ وہ اُس کی تیمارداری کر سکے، جو اُس نے اِس قدر بہترین کی کہ اُس کا خراب گلا بالکل ٹھیک ہو گیا اور اُس کا بخار مکمل طور پر اُتر گیا اور پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ وہیں قیام کرے گی۔ اب وہ وہیں رہے گی اور جہاں پہلے تھی وہاں کبھی نہیں جائے گی۔

وہ مسٹر پروِس کا نام لینے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

''لیکن یہ بہت بڑا راز ہے۔'' وہ بولی۔ ''اِس سے صرف تم ہی آگاہ ہو۔ کیوں کہ تم ہماری دوست ہو اور تم ہمارے مِلن کا سبب بنی ہو۔''

وہ کافی بنا رہی تھی۔ ''اُدھر دیکھو۔'' اُس نے کہا۔ وہ ایک کھلی الماری کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ''دیکھو، وہ اپنی چیزیں کیسے رکھتا ہے۔ یہاں مگ، وہاں کپ اور پرچیں۔ ہر کپ کی اپنی کھونٹی ہے۔ کیا یہ سب صاف ستھرا نہیں ہے؟ اِسی طرح سارا گھر ہے۔ مجھے اِس سے محبت ہے۔''

''تم ہمارے مِلن کا سبب ہو۔'' اُس نے دہرایا۔ ''اگر ہمارے ہاں بچہ ہوا اور وہ لڑکی ہوئی تو ہم اُس کا نام تمھارے نام پر رکھ سکتے ہیں۔''

میں نے کپ کے گرد اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی۔ میری اُنگلیوں میں اب بھی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ سنک کے اُوپر کھڑکی کے چھجے پر افریقی بنفشہ لگا ہوا تھا۔ گھر میں اُس کی ماں والا نظم وضبط اور اُس کی ماں کے لگائے ہوئے گھریلو پودے۔ اشوک کا بڑا سا درخت غالباً اب بھی نشست گاہ کی کھڑکی کے سامنے موجود تھا اور بازو کرسیوں پر سوراخوں والے کپڑے۔ نینا نے اپنے اور اَرنی کے بارے میں جو کہا تھا، ڈھٹائی لگتا تھا اور — خاص طور پر جب میں نے اُس میں اَرنی کے کردار کے بارے میں سوچا — تو وہ بے حد قابلِ نفرین لگا۔

''تم شادی کرنے جا رہے ہو؟''

''خوب۔''

''تم نے کہا کہ اگر تمھارے ہاں بچہ ہوا۔''

''خوب، تم کبھی نہیں سمجھو گی۔ ہم نے شاید یہ سب شادی کے بغیر ہی شروع کر دیا ہو۔'' نینا نے اپنا سر عیاری سے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اَرنی کے ساتھ؟'' میں بولی۔ ''اَرنی کے ساتھ؟''

''خوب، اَرنی ہی ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''اور پھر اَرنسٹ ہے۔'' اُس نے اپنے گرد لپٹے غسل کے لبادے کو بھینچ لیا۔ ''شاید سب کچھ پہلے ہی سے ہو رہا ہو، تم کبھی نہیں جان سکتیں۔''

''مسٹر پروِس کا کیا ہوگا؟''

''اُسے کیا ہوا ہے؟''

''خوب، اگر یہ کچھ پہلے ہی سے ہو رہا تھا تو کیا وہ اس کا باعث نہیں ہو سکتا؟''

ہینا کی ہر شے بدل گئی۔ اُس کا چہرہ ملول اور افسردہ ہو گیا۔ ''وہ۔'' وہ نفرت سے بولی۔ ''تم اُس کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہو؟ اُس میں کبھی یہ صلاحیت نہیں رہی۔''

''او ہ، جیما کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''تم ماضی کے بارے میں کیا کریدنا چاہتی ہو؟ مجھے پریشان مت کرو۔ وہ سب ختم ہوا اور بیت گیا۔ اُس کی میرے اور اَرنسٹ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اب ہم اِکٹھے ہیں اور ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں۔''

محبت۔ اَرنی کے ساتھ۔ اَرنسٹ۔ اب۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''معافی چاہتی ہوں کہ میں نے تمھارے ساتھ اُونچی آواز میں بات کی۔ کیا میں چلائی؟ مجھے افسوس ہے۔ تم ہماری دوست ہو اور تم نے میرا سامان لا کر دیا ہے۔ میں ممنون ہوں۔ تم اَرنسٹ کی خالہ زاد ہو اور ہمارے خاندان کا حصہ۔''

وہ میرے عقب میں آئی اور اپنی اُنگلیاں میری بغلوں میں دے کر گدگدانے لگی، پہلے آہستہ آہستہ اور پھر کھبا دینے والے انداز میں۔

''نہیں ہو تم؟ نہیں ہو تم؟''

میں نے اُس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ گدگداہٹ سے مجھ پر ہنسی کے دورے پڑنے لگے اور میرا بدن مچلنے لگا۔ میں چیخنے اور گدگدی بند کرنے کے لیے اُس کی منتیں کرنے لگی۔ اُس نے گدگدانا تب بند کیا جب مجھے مکمل طور پر بے بس کر دیا اور ہم دونوں بے حال ہو گئیں۔

''میں جتنے بھی لوگوں سے آج تک ملی ہوں اُن میں تمھیں سب سے زیادہ گدگدی ہوتی ہے۔'' اُس نے کہا۔

اپنے پیر روش پر مار مار کر مجھے بس کے لیے بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب میں کالج پہنچی تو میں اپنی پہلی کے ساتھ ساتھ دُوسری جماعت بھی کھو چکی تھی اور مجھے کیفے ٹیریا میں اپنے کام سے بھی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے جھاڑو رکھنے والی کوٹھڑی میں جا کر اپنی سُوتی سبز وردی پہنی اور اپنے سیاہ بالوں کے گچھے کو سُوتی رومال کے تلے باندھا کہ منیجر کی مجھے تنبیہ تھی کہ وہ خوراک میں دِکھائی دینے والے دُنیا کے گھناؤنے ترین بال ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے لیے دروازہ کھلنے سے قبل میرا کام سینڈوچوں اور سلاد کو کارنسوں پر لگا دینا ہوتا تھا لیکن اب مجھے اُنھیں میری منتظر بے صبری قطار کو تقسیم کرنا تھا۔

میں نے سوچا کہ بیورلی اور کے نے میرے مردوں کے ساتھ مواقع ضائع کرنے کے بارے میں کہتے ہوئے نشاندہی کی تھی کہ میں غلط راستے پر ہوں۔ اُنھوں نے جب یہ بات کی تھی تو میں کس قدر اشتعال میں آ گئی تھی لیکن شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ سوائے اِمتحانات کے یہ ہر جگہ ظاہر ہوا کہ میں نے بہت سے غلط کام کیے تھے۔

کیفے ٹیریا کی میزیں صاف کرنے کے بعد میں نے دوبارہ عام لباس پہنا اور اپنے مضمون پر کام کرنے کے لیے کالج کے کتب خانے میں چلی گئی۔

آرٹس بلڈنگ سے کتب خانے تک ایک زیرِ زمین سُرنگ جاتی تھی اور اُس سرنگ میں داخلے کے گرد اخباری بورڈوں پر فلموں، ریستورانوں، استعمال شدہ بائیسکلوں، ٹائپ رائٹروں کے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ کھیلوں اور تقریبات کے اطلاع نامے بھی چسپاں تھے۔ موسیقی کے شعبے نے اعلان کیا تھا کہ انگریزی مضافاتی شاعروں کی نظموں پر مشتمل گیت سنگیت کا ایک مفت پروگرام فلاں تاریخ کو پیش کیا جائے گا، جواب گُزر چکی تھی۔ میں نے اُس اطلاع نامے کو پہلے بھی دیکھا تھا اُن ناموں کو یاد رکھنے کے لیے ایک نظر ڈالی تھی: ہیرک، ہاؤزمین، ٹینی سن۔ سُرنگ میں چند قدم چلتے ہی مصرعے مجھ پر حملہ آور ہو گئے: اُفتادپڑی ہے جنگل پر وَین لاک ایج میں۔

کیا وہ جانتا تھا؟ کیا وہ جانتا تھا کہ میں دوبارہ کبھی اپنی رانوں اور کولہوں پر گدگدی کے چبھن کے احساس کی بنا پر اِن مصرعوں کو سوچ سکوں گی؟ ایک چٹ جانے اور چبھنے والی حیا۔ ایک ایسی شدید حیا جو اُس وقت کے بجائے اب محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے میرے بدن کے بجائے مجھے حاصل کیا تھا۔

دیشب اور سحر سے پرے
وہاں رہَواؤں کا آسماں
مری زندگی کی بُنت کا ساماں
اِدھر آ، میں ہوں یہاں
نہیں
یا دُر ہنے والی وہ نیلی پہاڑیاں
کیسے کلس، کیا بُنت رکھتی ہیں؟
نہیں، کبھی نہیں

مجھے مری محبت سے دُور لے جانے والا
چاندنی میں بچھا ہوا راستہ
نہیں نہیں نہیں۔

مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ میں سن کچھ کرنے پر رضامند ہوگئی تھی۔ مجھے مجبور کیا گیا نہ حکم دیا گیا اور نہ ہی ورغلایا گیا۔ لیکن اس کے باوجود میں سب کرنے پر راضی ہوگئی۔

بینا جانتی ہوگی۔ وہ اِس پر ہنستی ہوگی۔ ظالمانہ ہنسی نہیں، بل کہ بالکل ویسے ہی جیسے وہ دُوسری بہت سی چیزوں پر ہنستی ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد دِلاتی رہے گی۔

بینا اور اَرنی۔ اب وہ سدا میری زندگی میں رہیں گے۔

کالج کا کتب خانہ ایک بلند خوب صُورت جگہ تھی جسے اُن لوگوں نے ڈیزائن اور تعمیر کیا اور ادائیگی کرتے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ وہ کھلی کتابیں سامنے رکھ کر اُس کی لمبی میز پر بیٹھیں — خواہ وہ نشے میں ہوں، نیند میں، اشتعال میں اور گردونواح سے بے نیاز ہوں — اُن کے پاس اپنے سے بالاتر جگہ ہو، جس میں اُن کے اردگرد گہری چمک والی لکڑی کے مسطح تختے اور لاطینی زبان میں لکھی نصیحتوں والے بارڈر والی کھڑکیاں ہوں جن سے آسمان کا نظارہ ہو سکے۔ چند سال قبل تک جو سکول میں پڑھاتے یا کاروبار کرتے یا جنھوں نے بچوں کو پال پوس کر جوان کیا اُن کے پاس یہ جگہ ہونا چاہیے۔ اور اب میری باری تھی اور اب یہ مجھے بھی حاصل تھی۔

''سَر گاوَین اینڈ گرین نائٹ۔''

میں ایک اچھا مضمون لکھ رہی تھی۔ غالباً میں درجہ ''اے'' حاصل کرلوں گی۔ میں مضامین لکھتی اور ''اے'' حاصل کرتی رہوں گی کیوں کہ میں بس یہی کرسکتی ہوں۔ وہ لوگ جنھوں نے وظائف حاصل کیے، جامعات اور کتب خانے تعمیر کیے، رقم خرچ کرتے رہیں تاکہ میں اِسے جاری رکھ سکوں۔

مسٹر پرِوِس جیسے لوگ۔

اِن اخراجات، اِس خیرات نے بھی اُن کی نگاہوں میں میری عزّت قائم نہیں کی تھی۔ میں وہاں جو کچھ کر رہی تھی وہ غیر اہم تھا۔ میں یہ بات نہیں جانتی تھی لیکن بینا آگاہ تھی اور غالباً ہمیشہ سے آشنا تھی۔ اَرنی بھی، جس نے اُلٹا سوانگ رچانا اپنا فرض سمجھا تھا۔ مسٹر پرِوِس اور بیگم وَرِ۔ نٹی کہ بیتھ، گے اور بیورلی بھی بخوبی آشنا تھیں کہ اصل راہ کیا ہے۔ یہ سب محض ایک کھیل تھا۔

اور میں نے سوچا تھا کہ دُوسرا راستہ گول ہے۔

جیسے ہی میں نے اپنے آپ کو یقین دِلا دیا کہ وہ مسٹر پرِوِس کے ساتھ مبارزت تھی جس میں مجھے فتح حاصل ہوئی ہے، یا پھر برابر کا مقابلہ رہا ہے۔

برابر؟

اَرنی کے ساتھ بینا ایک ہفتہ بھی نہیں رہی۔ایک روز وہ گھر لوٹا تو دیکھا کہ وہ جا چکی ہے۔ اُس کے کوٹ اور بُوٹ، اُس کے پیارے پیارے کپڑے اور کیمونو جو میں لے کر گئی تھی، غائب تھے۔ اُس کے چیچپے بال، گُدگُدیاں، جلد کی بڑھی ہوئی حدت اور حرکت کرتے ہوئے چھوٹی سی ''اُونہہ ہونہہ'' غائب تھی۔بلا وضاحت غائب،کوئی تحریر تک نہیں چھوڑ کر گئی تھی۔

لیکن اَرنی اُن میں سے نہیں تھا جو اپنے آپ کو قیدِ تنہائی کا شکار بنا کر آہ وزاری کرتے ہیں۔ اُس نے جب مجھے یہ خبر سنانے اور اتوار کے روز رات کے کھانے پر میری دستیابی معلوم کرنے کے لیے فون کیا تو اُس نے یہی بتایا تھا۔ہم اولڈ چیلسیا کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اُس نے یہ حقیقت آشکار کی کہ کرسمس کی تعطیلات سے قبل یہ ہمارا آخری کھانا ہے۔اُس نے میرا کوٹ اُتارنے میں میری مدد کی تو مجھے بینا کی مہک آئی۔کیا وہ اب بھی اُس کی جلد میں رچی ہوئی ہے؟

نہیں،اُس کا منبع تب سامنے آیا جب اُس نے مجھے ایک بڑے رومال جیسی ایک چیز دی۔

''اِسے بس اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لو۔''اُس نے کہا۔

وہ رومال نہیں تھا۔اُس کا کپڑا سخت اور موٹا تھا جس پر ہلکی ہلکی اُبھری ہوئی لہریں تھیں۔وہ ایک شمیض تھی۔

''میں اِسے اپنے پاس دیکھنا نہیں چاہتا۔''وہ بولا تو اُس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ ایسا زیر جامہ ہے جسے وہ اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے نہ یاد رکھنا کہ وہ بینا کا ہے اور اُس سے بینا کی مہک آتی ہے۔

اُس نے بُھنا ہوا بڑے کا گوشت منگوایا،اُسے کاٹا اور معمول بھری عجلت اور شائستگی سے اپنی اشتہا مٹانے لگا۔میں اُسے گھر سے موصولہ خبریں دینے لگی جو سال کے اُس حصّے میں ان اطلاعات پرمبنی تھیں کہ برف کے تودوں کا حجم کیا ہے،کتنی سڑکیں بند ہوئیں،ہمیں دُوسروں سے ممتاز کرنے والی سرما کی تباہی۔

کچھ دیر بعد اَرنی نے کہا۔''میں نے اُس کے گھر کا چکر لگایا ہے لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔''

''کس کے گھر کا؟''

''اُس کے چچا کے گھر کا۔''وہ بولا۔وہ اُس گھر کے بارے میں جانتا تھا کیوں کہ وہ اور بینا اُس گھر کے قریب سے اندھیرا اچھا جانے کے بعد گاڑی میں گُزرے تھے۔اُس نے بتایا کہ اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔وہ لوگ بوریا بستر سمیٹ کر وہاں سے جا چکے تھے۔

بہرحال وہ بینا کا اپنا انتخاب تھا۔''عورت کو حق حاصل ہے۔''وہ بولا۔''وہ کہتے ہیں نا کہ اپنا ذہن تبدیل کرنا عورت کا حق ہے۔''

اب میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن میں حسرت تھی اور اُن کے گرد کی جلد سیاہ اور جھرّیوں سے اَٹی پڑی تھی۔ اُس نے اپنا مُنھ سکیڑا، صدمے پر قابو پایا اور پھر چاروں طرف دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''دولت وجہ نہیں تھی۔ اِس کا سبب محض یہ تھا کہ وہ بُوڑھا تھا اور اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے کمزور یادداشت کا شکار اور اپنی دیکھ بھال سے قاصر ہو گیا تھا، اور وہ نرم دل ہے؛ اور یہ حقیقت بھی سبب ہے کہ اُس نے اُس کے والدین کے قتل ہونے کے بعد اُس کی پرورش کی ہے۔''

اگر میں نے کچھ دیر کے لیے اُس پر نظریں جمائیں بھی تو اُس نے توجہ نہیں دی۔

''مجھے اِس پر اعتراض نہ ہوتا اگر ہم اُسے اپنے ہاں لے آتے۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ میں بُوڑھے لوگوں کا عادی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اُسے مجھ پر بوجھ نہیں بنانا چاہتی تھی۔''

''جب میں گھر واپس آیا تو وہ جا چکی تھی اور یہ میرے لیے باعثِ صدمہ تھا۔ آپ کو بس صدمات ہی سہنے پڑتے ہیں۔ بہتر ہے کہ کسی سے زیادہ توقع نہ ہی رکھی جائے۔ آپ ہر شے کو تو حاصل نہیں کر سکتے نا۔''

جب میں زنانہ کمرے میں جاتے ہوئے ٹنگے ہوئے کوٹوں کے پاس سے گزری تو میں نے ٹشوز اپنی جیب سے نکالی اور اُسے استعمال شدہ تولیوں میں ٹھونس دیا۔

اُس روز کتب خانے میں مَیں سَر گاوَین پر کام نہیں کر سکی۔ میں نے اپنی نوٹ بک سے ایک کاغذ پھاڑا اور اپنا قلم اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ کتب خانے کے دروازے کے باہر ادائیگی والا فون تھا اور اُس کے ساتھ ہی ایک فون بُک لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فون بُک میں سے تلاش کر کے کاغذ پر دو چیزیں لکھیں جو فون نمبر نہیں بلکہ پتے تھے۔

۱۶۴۸۔ ہَیفرن سٹریٹ۔

دُوسرا پتا جس کی میں محض تسلّی کرنا چاہتی تھی، ۳۶۴۔ کارلسلے سٹریٹ تھا۔

میں واپس سرنگ سے ہوتی ہوئی آرٹس بلڈنگ کی طرف آئی اور کامن رُوم کے سامنے ایک چھوٹی سی دُکان میں داخل ہو گئی۔ میری جیب میں اِتنی ریزگاری تھی کہ میں ایک لفافہ اور ایک ٹکٹ خرید سکوں۔ میں نے کارلسلے سٹریٹ والا پتا پھاڑ کر علاحدہ کیا اور اُس کباڑ کو اُس میں ٹھونس دیا۔ میں نے لفافہ بند کیا اور مسٹر پروِس کا نام اور ہَیفرن سٹریٹ والا پتا جلی حروف میں تحریر کیا۔ پھر تھوک لگا کر ٹکٹ چسپاں کیا۔ میرا خیال ہے کہ اُس زمانے میں شاید چار سینٹ کا ٹکٹ لگتا تھا۔

دُکان کے بالکل باہر ڈاک کا ایک ڈبّا تھا۔ میں نے لفافہ اُس میں ڈالا۔ آرٹس بلڈنگ کی چوڑی راہداری میں میرے قریب سے لوگ گزر کر اپنی جماعتوں یا سگریٹ پینے یا کامن رُوم میں برج

کھیلنے جا رہے تھے۔

اُن میں سے بیشتر، میری طرح، کورس والے تھے جو اپنی برائیاں جاننے کے راستے پر تھے۔

میں نے علم کا حصول جاری رکھا۔ میں نے جانا کہ رُومی کیمپ یُوریکان اب روگزیٹر (Wroxeter) میں ہے جو دریائے سیورن (Severn) پر واقع ایک قصبہ ہے۔

vvvv

۱۔ WENLOCK: انگلستان کے ضلع شراپشائر میں مچ وین لاک (Much Wenlock) کے قریب چُونے کی ایک طویل ڈھلان ہے جو اپنی ارضی ساخت کی وجہ سے سائنسی دلچسپی کا باعث ہے کیوں کہ چُونے کی اِن ڈھلانوں پر جنگلات ہیں۔ اِسے ۲۰۰۵ء میں ٹی وی کے ایک پروگرام میں "سات قدرتی عجائبات" میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ Solitaire: تاش کا ایک کھیل جس میں یکے سے شروع ہو کر ترتیب وار بادشاہ تک ہر رنگ کے پتّے علیحدہ علیحدہ جوڑے جاتے ہیں۔

۳۔ Tudor: ایک انگریزی شاہی خاندان جس کا جدِ امجد سر اووین ٹیوڈور (Sir Owen Tudor) تھا۔

۴۔ ascot: جسے گلے میں باندھ کر چوڑے سرے ایک دُوسرے کو کاٹتے ہوئے چھوڑ دیے جائیں۔

۵۔ Cornish: انگلستان کے ایک ضلع کا نام کارن وال (Cornwall) ہے، اِس علاقے کے لوگوں اور چیزوں کو کارنش کہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز تک انگلستان کی زبان بھی اسی حوالے سے کارنش تھی جس کی جگہ انگریزی نے لی۔

۶۔ Peloponnesus: یُونان کے جنوب میں واقع جزیرہ نما۔

۷۔ Crete: ایک یونانی جزیرہ جو Mediterranean Sea میں ۱۶۰ میل لمبائی تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا کل رقبہ ۳۲۰۷ مربع میل ہے۔

۸۔ Minoan: ۳۰۰۰ سے ۱۱۰۰ قبلِ مسیح تک کی ترقی یافتہ تہذیب جس میں کانسی کے استعمال نے عروج پایا۔

۹۔ Shropshire: ویلز (Wales) کی سرحد پر ایک انگلستانی ضلع کا نام۔

۱۰۔ Uricon: شراپشائر کے دو چھوٹے گاؤں روگزیٹر (Wroxeter) اور رَوکن (Wrokin) جن کو غلط تلفظ میں یُوریکان کہا جاتا ہے۔ رُومی حکومت کے شہر تباہی کا شکار ہو کر ان دونوں گاؤوں تلے دفن ہیں، جن کے کچھ آثار اب بھی ملتے ہیں۔

۱۱۔ Housman: پُورا نام الفریڈ ایڈورڈ ہاؤزمین (Alfred Edward Housman)، ۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۶ء، انگریزی زبان کا شاعر اور کلاسیکی دانش وَر۔

ٹرین
(Train)

ٹرین بہر حال سست ہے اور موڑ آنے پر اَور آہستہ ہو گئی ہے۔ جیکسن اکیلا مسافر بچا ہے اور اگلا پڑاؤ تقریباً بیس میل کی دُوری پر ہے۔ پھر ریلے، پھر کنکارڈائن اور پھر لیک کا پڑاؤ آئے گا۔ قسمت اُس کے ساتھ ہے اور موقع گنوانے کا وقت نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی اپنی ٹکٹ سے زائد سفر طے کر چکا ہے۔

وہ اپنا بیگ گھسیٹتا ہے اور اُسے آرام سے پٹڑیوں کے بیچ زمین پر گرتا دیکھتا ہے۔ اب کوئی اَور راستہ نہیں بچا۔ ٹرین اب مزید آہستہ ہونے والی نہیں۔

وہ موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ وہ سدا سے اچھی جسامت والا چست شخص رہا ہے۔ لیکن چھلانگ اور زمین پر گرنا اُسے مایوس کرتا ہے۔ اپنے خیال کے برعکس وہ زیادہ بے لچک ہے۔ بدن کا اکڑاؤ اُسے آگے کو دھکیلتا ہے، اُس کی ہتھیلیاں پٹڑی کے چوڑے تختوں کے بیچ پڑی بجری پر پڑتی ہیں۔ اُس کی جلد پر اُبھری نسیں چھل جاتی ہیں۔

ٹرین نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ موڑ کے پار اُس کی رفتار پکڑنے کی آواز سنتا ہے۔ اپنے زخمی ہاتھوں پر تھوک لگا کر کنکر نکالتا ہے۔ پھر اپنا بیگ اُٹھا کر واپس اُسی سمت چل پڑتا ہے جدھر سے وہ ٹرین پر آیا ہے۔ اگر وہ ٹرین کے پیچھے پیچھے جاتا تو اندھیرا چھٹنے کے بعد سٹیشن پر پہنچ جاتا۔ وہ اب بھی شکایت کر سکتا تھا کہ اُسے نیند آ گئی تھی اور چکرائی ہوئی حالت میں آنکھ کھلی تو اُسے خیال آیا کہ وہ اُس وقت سو گیا تھا جب اُسے نہیں سونا چاہیے تھا اور اُس کی منزل نیند میں گزر گئی تو اُس نے بدحواسی میں چھلانگ لگا دی۔

اُس کا یقین کر لیا جاتا۔ اِتنے لمبے سفر، جرمنی اور جنگ سے آنے پر وہ بدحواسی کا شکار ہو گیا ہو گا۔ ابھی دیر نہیں ہوئی، وہ وہاں پہنچ چکا ہوتا جہاں اُسے نصف شب سے قبل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تمام وقت وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ مخالف سمت سفر کر رہا ہے۔ وہ زیادہ تر درختوں کے نام نہیں جانتا تھا۔ میپل اور چیڑ کو تو ہر کوئی جانتا ہے۔ اُسے خیال گزرا کہ جہاں اُس نے چھلانگ لگائی ہے وہ جگہ جنگل ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ درخت صرف پٹڑی کے ساتھ ساتھ تھے، کنارے پر گھرے لیکن وہ اُن کے بیچ سے کھیتوں کی جھلکیاں دیکھ سکتا تھا: سبز، سُرخی مائل بھورے اور پیلے کھیت، چراگاہیں، فصلیں اور کٹی ہوئی فصل ڈھیر۔

وہ جانتا تھا کہ محض اِتنا بھی بہت ہے۔ ابھی اگست ہے۔

اور جب ٹرین کا شور خاموشی نگل لیتی ہے تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہاں اُس کی توقع کے برعکس مکمل سکوت نہیں ہے۔ وہاں کافی غُل تھا، ہَوا کے بنا اگست کے مہینے کے پتّوں کی حرکت، نامعلوم مقام سے جھینگر اور نظروں سے اوجھل پرندوں کی آوازیں سماعت چھید رہی تھیں۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران میں اُسے جو لوگ ملے تھے وہ سمجھتے تھے کہ وہ شہری نہیں بل کہ دیہاتی ہے۔ یہ بات درست نہیں تھی۔ جیکسن ایک پلمبر کا بیٹا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی باڑے میں نہیں رہا، کبھی مویشی نہیں چرائے اور بھٹے نہیں بھُونے۔ یا جیسا اب وہ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو یُوں لگتی تھی کہ لوگوں اور سازوسامان کو لے جانے والے اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر جنگلی سیب کے درختوں، بیر کی خاردار جھاڑیوں، جھولتی ہوئی انگور کی بیلوں اور دِکھائی نہ دینے والے باڑوں سے ٹکراتی گایوں کی سرزمین بن چکی ہے؛ اور ابھی پٹڑیوں کے درمیان رینگتا ہوا چکیلا سانپ جو مکمل طور پر پُراعتماد ہے کہ وہ نہایت اطمینان سے رینگتا ہے اور اُسے مار ڈالے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ سانپ بےضرر ہے لیکن اُس کا اعتماد اُسے متزلزل کر دیتا ہے۔

ہلکی بھُوری چھوٹی گائے[1] جس کا نام مارگریٹ روز تھا، روزانہ صبح شام دو بار دُودھ دینے کے لیے باڑے کے دروازے پر آجاتی۔ اکثر بَیلے کو اُسے بلانا بھی نہ پڑتا۔ لیکن اُس صبح اُس کی دلچسپی کا مرکز چراگاہی کھیتوں کی گہرائی یا پھر باڑ کی دُوسری جانب ریل کی پٹڑیاں چھپائے ہوئے درخت تھے۔ اُس نے بَیلے کی سیٹی اور پھر اُس کی پُکار سنی تو جھجکتی ہوئی باہر آنے لگی۔ لیکن پھر اُس نے ایک اَور نظر ڈالنے کے لیے واپسی کا قصد کیا۔

بَیلے نے بالٹی اور سٹول رکھا اور صبح کی گیلی گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی۔

''سو-باس، سو-باس۔''

وہ کچھ ورغلا اور کچھ ڈانٹ رہی تھی۔

درختوں میں کسی شے نے حرکت کی۔ ایک مرد کی آواز آئی کہ سب ٹھیک ہے۔

خُوب، بلا شبہ سب ٹھیک ہی تھا۔ کیا اُس کا خیال تھا کہ مارگریٹ اُس سے خوف زدہ تھی کہ اُس پر حملہ آور ہوگا اور اپنے سینگ تانے ہوئے تھی؟

پٹڑی کی باڑ پھلانگتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ یُوں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

مارگریٹ روز کے لیے اِتنا بھی بہت تھا۔ اُس نے اپنی کارروائی دِکھانا تھی۔ وہ پہلے ایک طرف کو دی، پھر دُوسری طرف اور اپنے چھوٹے چھوٹے سینگوں کو جھٹکا دیا۔ زیادہ تو نہیں لیکن ہلکی

بھوری گائے ہمیشہ اپنی رفتار اور مزاج کی آتش فشانی سے متحیّر کر دیتی ہے۔ بَیلے، گائے کو تنبیہ کرنے اور اُسے یہ یقین دِلانے کے لیے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں، للکارا۔

''یہ آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بس ہلنا مت۔ یہ اس کی فطرت ہے۔''

تبھی بَیلے کی نظر اُس کے ہاتھ میں پکڑے بیگ پر پڑی جس نے مسئلہ کھڑا کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ محض صبح خیزی کے لیے نکلا ہے لیکن وہ تو کہیں جا رہا تھا۔

''مصیبت کا سبب یہ ہے۔ وہ آپ کے بیگ سے ڈری ہے۔ آپ اِسے کچھ دیر کے لیے نیچے رکھ دیں۔ مجھے اُسے واپس باڑے میں لے جا کر اُس کا دُودھ دوہنا ہے۔''

اُس نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر کھڑے ہو کر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے بغیر دیکھنے لگا۔

وہ مارگریٹ روز کو واپس وہاں لے گئی جہاں باڑے کے ایک طرف بالٹی اور سٹول پڑا تھا۔

''اب آپ اِسے اُٹھا سکتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''جب تک آپ اِسے اُس کے گرد لہراتے نہیں۔ آپ فوجی ہیں، نہیں ہیں؟ اگر آپ دُودھ دوہنے تک انتظار کر لیں تو میں آپ کو تھوڑا بہت ناشتہ دے سکتی ہوں۔ شب بخیر، میں بوکھلا گئی تھی۔ جب آپ کو اِس پر چیخنا پڑے تو یہ ایک احمقانہ نام ہے، مارگریٹ روز۔''

وہ ایک پست قامت ہٹی کٹی، سامنے سے بچّوں کے انداز میں کٹے ہوئے صاف بھورے اور سیدھے بالوں والی ایک عورت تھی۔

''میں ہی اِس کی ذمہ دار ہوں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ملوکیت پسند ہوں یا کبھی ہوا کرتی تھی۔ میں نے چُولہے کے پیچھے دَلیا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ مجھے دُودھ دوہنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو گھوم کر باڑے کی دُوسری طرف جا کر انتظار کر لیں جہاں یہ آپ کو دیکھ نہیں سکے گی۔ یہ نہایت بُری بات ہے کہ میں آپ کو انڈا پیش نہیں کر سکتی۔ ہم مُرغیاں رکھتے تھے لیکن اُنھیں لومڑیاں لے جاتی رہیں اور آخر ہم تنگ آ گئے۔''

ہم۔ ہم مُرغیاں رکھتے تھے۔ اِس کا مطلب ہے کہ وہیں کہیں اُس کا مرد بھی ہے۔

''دَلیا اچھی چیز ہے۔ مجھے تمھیں ادائیگی کر کے خُوشی ہو گی۔''

''اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جائیں۔ یہ اِتنی چوکنا ہو گئی ہے کہ اِس کا دُودھ نہیں اُتر رہا۔''

وہ باڑے کی دُوسری جانب چلا گیا۔ وہاں کی حالت بُری تھی۔ اُس نے تختوں کے درمیان سے یہ جاننے کے لیے جھانکا کہ اُس کے پاس کون سی کار ہے لیکن اُس نے دیکھا کہ وہاں ایک پُرانی بگھی

اُورخراب مشینری پڑی تھی۔

گھر کا سفید رنگ اُکھڑ رہا تھا اور خاکستری پڑ گیا تھا۔ ایک کھڑکی پر شیشے کی جگہ میخوں سے گتا ٹھونکا گیا تھا۔ شکستہ ڈربہ، جس کے بارے میں اُس نے بتایا تھا کہ لومڑیاں وہاں سے مُرغیاں لے جاتی تھیں۔ روڑوں کا ایک ڈھیر۔

اگر وہاں کوئی مرد تھا بھی تو وہ نا کارہ تھا یا پھر کاہلی کا شکار۔

قریب ہی سے ایک سڑک گُزر رہی تھی۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹی باڑ والا کھیت اور کچا راستہ تھا۔ کھیت میں چتّیوں والا ایک پُرامن گھوڑا کھڑا تھا۔ اُسے گائے رکھنے کی وجہ تو سمجھ آ رہی تھی، لیکن گھوڑا؟ زمانۂ جنگ سے قبل ہی لوگ گھوڑوں سے جان چھڑانے لگ گئے تھے اور اُن کی جگہ ٹریکٹر لینے لگے تھے۔ وہ اس قبیل کی بھی دِکھائی نہیں دیتی تھی کہ اُس نے گھوڑا محض گھڑسواری سے لطف اندوزی کے لیے رکھا ہو۔ اُسے اچنبھا ہوا، اور پھر باڑے میں بگھی کی موجودگی۔ وہ کوئی نادر شے بھی نہیں تھی لیکن اُس کے پاس موجود تھا۔

وہ کچھ دیر سے ایک خاص آواز سُن رہا تھا۔ راستہ اُوپر پہاڑی پر جا رہا تھا اور پہاڑی پر سے کلپ کلاپ، کلپ کلاپ کی آواز آ رہی تھی۔ کلپ کلاپ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی چھن چھن یا سیٹی کی سی آواز بھی تھی۔

تبھی پہاڑی سے پہیوں پر دھرا ایک صندوق آیا جسے دو نہایت چھوٹے چھوٹے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ وہ کھیت والے گھوڑے سے جسامت میں کم لیکن اُن میں سرگرمی انتہا کی تھی۔ صندوق میں لگ بھگ آدھ درجن پست قامت مرد بیٹھے تھے۔ تمام کے تمام سیاہ ملبوس میں اور سروں پر سیاہ ہَیٹ لیے ہوئے تھے۔

آواز اُنھی کی جانب سے آ رہی تھی۔ گیت کی آواز۔ ایک دُوسرے سے غیر ہم آہنگ تیکھی آوازیں جو نہایت سُریلی تھیں۔ قریب سے گُزرتے ہوئے اُنھوں نے اُس پر نظر تک نہیں ڈالی۔

اِس چیز نے اُس پر کپکپی طاری کر دی۔ باڑے میں موجود بگھی اور کھیت میں گھوڑا تو اِس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے۔

وہ وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اُس کی پکار سُنی۔ ''کام ختم ہو گیا۔'' وہ گھر کے ساتھ کھڑی تھی۔

''ہم یہاں سے آتے جاتے ہیں۔'' اُس نے عقبی دروازے کے بارے میں کہا۔ ''سامنے والا دروازہ پچھلے سرما سے پھنسا ہوا اُور کھلنے سے انکاری ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ اب تک منجمد ہے۔''

وہ ناہموار فرش پر لگے تختوں پر سے تا نگی کھڑکی کی وجہ سے اندھیرے میں چلنے لگے۔ وہاں اُتنی ہی ٹھنڈ تھی جتنی اُس مورچے میں ہوتی تھی جہاں وہ سویا کرتا تھا۔ اُس کی آنکھ بار بار کھلتی اور وہ وہاں ایسی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا جہاں گرم رہ سکے۔ عورت وہاں کپکپا نہیں رہی تھی۔ اُس سے گائے کی جلد جیسی صحت مندانہ مشقت کی بُو آ رہی تھی۔

اُس نے تازہ دُودھ ایک تسلے میں اُنڈیلا اور قریب رکھے جالی دار کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ پھر اُسے گھر کے مرکزی حصے میں لے گئی۔ وہاں موجود کھڑکیوں پر پردے نہیں تھے جس کی وجہ سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ایک دستی نل کے ساتھ بٹھل، ایک میز جس پر چکنائی سے محفوظ رکھنے والا جگہ جگہ سے چھید پڑا کپڑا، مسہری پر ایک پُرانا ابلق لحاف دھرا تھا اور ایک سرہانہ بھی جس کی کچھ چھال جھڑ چکی تھی۔

اگرچہ سب کچھ پُرانا اور خراب حالت میں تھا تاہم مَیلا کچیلا نہیں تھا۔ جس شے پر بھی نظر پڑتی زیرِ استعمال دِکھائی دیتی تھی۔ لیکن نگاہیں اُوپر اُٹھانے پر کارنس پر اخبار، رسائل اور کاغذ چھت تک ڈھیروں ڈھیر پڑے نظر آتے تھے۔

اُس نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا اُسے آگ لگنے کا ڈر نہیں؟ جب کہ وہاں لکڑی کا چولہا بھی ہے۔

''اوہ، میں ہر وقت یہیں رہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں یہیں سوتی اور سب کچھ یہیں ہوتا ہے۔ یہاں اَور کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہَوا کی آمد و رفت ہو۔ میں محتاط رہتی ہوں۔ میں نے آگ کے لیے چمنی تک نہیں رہنے دی۔ کئی بار وہ اِتنی گرم ہو گئی تھی مجھے اُس پر میٹھا سوڈا چھڑکنا پڑا۔ اِس کی ضرورت بھی نہیں۔

''میری والدہ بھی یہیں رہتی تھی۔'' وہ بولی۔ ''اُسے کسی اَور جگہ چین ہی نہیں آتا تھا۔ میں اُس کی چارپائی یہیں ڈالتی تھی۔ میں ہر شے پر نظر رکھتی تھی۔ میں نے تمام کاغذات کو سامنے والے کمرے میں منتقل کرنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن وہاں اِس قدر سِیلن ہے کہ وہ برباد ہو جاتے۔ اُنھوں نے مئی میں وفات پائی ہے۔ ٹھیک اُس وقت جب موسم اچھا ہوا تھا۔ وہ بس ریڈیو پر جنگ کے خاتمے کا اعلان سننے کے لیے زندہ تھیں۔ وہ درست طور پر سمجھتی تھیں۔ وہ بہت عرصہ پہلے اپنی گویائی کھو چکی تھیں۔ میں اُن کی خاموشی کی اِتنی عادی ہو گئی تھی کہ اب بھی بعض اوقات مجھے گمان گزرتا ہے کہ وہ یہاں موجود ہیں لیکن وہ نہیں ہیں۔''

جیکسن نے محسوس کیا کہ اُس کا اظہارِ افسوس کرنا ضروری ہے۔

''اوہ، ٹھیک ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ یہ سرما میں نہیں ہوا۔''

اُس نے اُسے جئی کا دَلیا اور چائے دی۔

''زیادہ کڑک تو نہیں؟ چائے؟''

مُنہ بھرا ہونے کی وجہ سے اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں پتی کے سلسلے میں کفایت سے کام نہیں لیتی۔ اگر یہی کرنا ہو تو گرم پانی ہی کیوں نہ پی لیا جائے؟ جب پچھلے سرما میں موسم بہت خراب ہوا تو ہم برباد ہو گئے۔ پانی ختم ہو گیا، ریڈیو جواب دے گیا اور سمندر جم گیا۔ مجھے دُودھ دوہنے کے لیے باہر جاتے ہوئے عقبی دروازے سے رَسّی باندھنا پڑتی تھی۔ میں مارگریٹ روز کو عقبی باورچی خانے میں لے جا رہی تھی کہ مجھے اندازہ ہوا کہ طوفان نے اُسے اِتنا بیمار کر دیا ہے کہ میں اُسے بچا نہیں پاؤں گی۔ خیر وہ بچ گئی۔ ہم سب بچ گئے۔''

گفتگو میں موقع پاتے ہی اُس نے پُوچھا کہ کیا قرب وجوار میں کہیں ہُو نے بھی رہتے ہیں۔

''نہیں، میں نے تو نہیں دیکھے۔''

''ایک چھکڑے میں؟''

''اوہ، کیا وہ بیٹھے ہوئے تھے؟ وہ تمھیں مینونائٹ لڑکے ہوں گے۔ وہ اپنے چھکڑے پر گرجا گھر جاتے ہیں اور راستے بھر گاتے رہتے ہیں۔ لڑکیاں بگھی میں جاتی ہیں لیکن لڑکوں کو چھکڑے میں بھیجا جاتا ہے۔''

''اُنھوں نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔''

''وہ دیکھتے بھی نہیں۔ میں ماں سے کہا کرتی تھی کہ ہم بالکل صحیح سڑک پر رہ رہے ہیں کیوں کہ ہم بھی بالکل مینونائٹس کے مانند ہیں۔ گھوڑا اور بگھی اور ہم اپنی کچا دُودھ پیتے ہیں لیکن ہم میں صرف ایک قدر مشترک نہیں، ہم میں سے کوئی بھی اُن کی طرح گاتا نہیں۔

''جب ماں فوت ہوئی تو وہ اس قدر کھانا لائے کہ میں ہفتوں کھاتی رہی۔ اُنھوں نے سوچا ہو گا کہ تدفین کے بعد تعزیت والوں کا ہجوم یا ایسا ہی کچھ اور ہو گا۔ میں خُوش قسمت ہوں کہ وہ یہاں رہتے ہیں۔

''وہ بھی خُوش قسمت ہیں کہ خیرات اُن پر فرض ہے اور میں حقیقتاً یہاں اُن کے دَر پر موجود ہوں، اور اگر تمھیں معلوم ہو تو اُن کی خیرات کی حق دار۔''

ناشتہ ختم کرنے کے بعد اُس نے اُسے ادائیگی کی لیکن اُس نے اُس کے پیسے ہاتھ مار کر واپس ہٹا دیے۔

البتہ ایک کام اُس نے کہا کہ اگر وہ کر سکتا ہے تو جانے سے قبل وہ گھوڑے کی کُھرلی ٹھیک کر دے۔

یہ کام درحقیقت نئی گھرلی بنانے کے مترادف ثابت ہوا۔ اِس کام کے لیے وہ اِدھر اُدھر سامان اور اَوزار کی تلاش میں چکراتا پھرا۔ اِس میں اُس کا تمام دِن لگ گیا۔ اُس نے اُسے کھانے میں میٹھی روٹی اور مینونائٹ میپل کا شربت دیا۔ اُس نے اُسے بتایا کہ اگر وہ صرف ایک ہفتے بعد آتا تو وہ اُسے تازہ جام کھلاتی۔ اُس نے ریل کی پٹڑی کے ساتھ اُگی ہوئی جنگلی رَس بھریاں جمع کر رکھی تھیں۔

وہ عقبی دروازے کے باہر باورچی خانے کی کرسیوں پر سُورج غروب ہونے تک بیٹھے رہے۔ وہ اُسے بتا رہی تھی کہ وہ وہاں کیسے آئی اور وہ بے دھیانی سے سنتا رہا کیوں کہ وہ اِردگرد دیکھتے ہوئے سوچ میں گُم تھا کہ گو وہ جگہ نہایت دُوردراز واقع تھی لیکن اگر کوئی شخص وہاں رہنا چاہے تو اِتنی بُری بھی نہیں تھی۔ ایک خاص تعداد میں رقم اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ وہ ایک للک بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے طور پر معذوری کا اظہار بھی کر سکتا تھا کہ وہ سفر میں ہے۔

اُس نے بتایا کہ اُس کے والد نے — جسے وہ ڈیڈی کہتی تھی — وہ جگہ صرف گرما کے موسم گزارنے کے لیے خریدی تھی اور پھر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ سارا سال وہیں رہا کریں گے۔ وہ کہیں بھی رہ کر اپنا کام کر سکتا تھا کیوں کہ وہ ٹورنٹو کے اخبار ''ٹیلی گرام'' میں کالم لکھ کر اپنی روزی کماتا تھا۔ (جیکسن کو بدحواسی کے عالم میں ایک لمحے کے لیے بچشمِ تصور دیکھا کہ ایک حقیقی کالم نے عمارت کو قائم رکھا ہوا ہے یا قائم رکھنے میں مددگار ہے)۔ لکھے ہوئے کالم ڈاکیا وصولتا اور ٹرین کے ذریعے بھجوا دیا جاتا۔ وہ ہر مَوضوع پر لکھتا، جن کا تذکرہ وہ کبھی کبھار بیلے کی ماں سے بھی کرتا، جسے وہ کسی کتاب سے لیے گئے نام شہزادی کیسامیسما کہہ کر بلاتا تھا۔ شاید اُس کی ماں ہی اُس کے وہاں قیام کا سبب تھی۔ اُسے (ماں کو) ۱۹۱۸ء کا خطرناک نزلہ ہو گیا جس کی وجہ سے بے شمار لوگ موت کا شکار ہوئے تھے، اور جب وہ ٹھیک ہوئی تو اُس کی گویائی جا چکی تھی۔ مکمل طور پر نہیں کیوں کہ وہ تمام آوازیں ٹھیک ادا کر سکتی تھی لیکن لگتا تھا جیسے وہ الفاظ کھو بیٹھی ہے یا پھر الفاظ نے اُسے گُم کر دیا ہو۔ اُسے کھانا کھانے اور غسل خانے میں جانے کے لیے سب کچھ دوبارہ سیکھنا پڑا لیکن وہ یہ کبھی نہیں سیکھ پائی کہ گرم موسم میں بھی کپڑے پہنے رکھنا ہوتے ہیں۔ اِس لیے وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسی مضحکہ خیز حالت میں اِدھر اُدھر، شہر کی سڑکوں پر گھومتی پھرے۔ سرمائی موسموں میں بیلے سکول چلی جاتی تھی۔ جیکسن کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش آئی کہ جسے وہ بشپ سٹران کہہ رہی ہے وہ دراصل ایک سکول ہے جو ٹورنٹو میں ہے اور وہ متحیر تھی اُس نے اُس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ وہ امیر کبیر لڑکیوں سے بھرا ہوتا تھا لیکن اُس میں اُس جیسی لڑکیاں بھی تھیں جنھیں وہاں داخلے کے لیے عزیز و اقارب سے خاص رقم یا وصیّت ملتی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُسے وہاں احساسِ برتری پڑھایا گیا لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے کیا کرے۔

لیکن اِس سب کو ایک حادثے نے سمیٹ دیا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ چہل قدمی کرتے

ہوئے، جسے وہ گرمیوں کی شام کو پسند کرتا تھا، اُس کا والد ٹرین کی زد میں آگیا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو وہ اور اُس کی والدہ دونوں اپنے اپنے بستر میں جا چکی تھیں۔ بیلے کا خیال تھا کہ فارم کا کوئی کھلا رہ جانے والا جانور پٹڑی پر پہنچ گیا ہو گا لیکن اُس کی ماں بری طرح بَین کر رہی تھی اور لگتا تھا جیسے وہ اصل واقعہ جان گئی ہو۔

سکول کے دِنوں میں اُس کی ایک سہیلی ہوا کرتی تھی، جسے اُس نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ وہ کیا کرے لیکن وہ دونوں ہی اِس معاملے میں کوری تھیں۔ اُس کے پاس کرنے کو بس دُودھ دوہنا، ماں کی دیکھ بھال کرنا اور مُرغیاں پالنا ہی بچا تھا۔ اُس نے آلوؤں کو اِس طرح کاٹا کہ ہر ٹکڑے میں ایک آنکھ ہو اور اُنھیں بو کر اُگلے گرما میں کھود کے نکالنا سیکھا۔ البتہ اُس نے کار چلانا نہیں سیکھی اور جب جنگ لگی تو اُس نے اپنے ڈیڈی کی کار بیچ ڈالی۔ مینونائٹس نے اُسے ایک گھوڑا دیا جو کھیتوں میں کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور اُن میں سے ایک نے اُسے سدھایا اور اُس پر سواری کی تربیت بھی دی۔

اُس کی ایک پُرانی سہیلی اُس کے ہاں آئی تو اُس کا خیال تھا کہ وہ جس طرح کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ محض ایک امرِ مجبوری ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ واپس ٹورنٹو چلے جائے لیکن اُس کی ماں کا کیا ہوتا؟ اُس کی ماں کی چُپ اب بہت بڑھ چکی تھی اور وہ اپنے کپڑے بھی پہنے رکھنے لگی تھی۔ اب وہ ہر ہفتے کی سہ پہر کو ریڈیو سے موسیقی سننا بھی پسند کرتی تھی۔ بلا شبہ وہ یہ سب کچھ ٹورنٹو میں رہ کر بھی کر سکتی تھی لیکن بیلے نے اُسے ہجرت پر مجبور کرنا مناسب نہیں جانا۔ یا پھر شاید وہ اپنے آپ کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ خُود ہجرت سے خوف زدہ تھی۔

جیکسن نے سرما آنے تک سب سے پہلا کام کچھ کمروں کو ٹھیک کرنے کا کیا کہ باورچی خانے کے بجائے وہاں سویا جا سکے۔ اُس نے کچھ چوہوں اور چوہیوں سے بھی نجات حاصل کی جو ٹھنڈے پڑتے موسم میں گھر کے اندر آنے لگے تھے۔ اُس نے اُس سے پُوچھا کہ اُس نے بلی کیوں نہیں پالی تو اُسے ایک عجیب منطق سننے کو ملی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہر وقت جانور مارتی اور اُنھیں گھسیٹ کر اُسے دِکھانے لاتی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ شکنجوں کے کھٹکوں پر کان رکھتا اور اُسے یہ معلوم ہونے سے قبل ہی کہ کیا ہوا ہے، اُن سے جان چھڑا لیتا۔ پھر اُس نے باورچی خانے میں بھرے کاغذوں کے آگ پکڑنے کے خدشے پر لیکچر جھاڑا اور وہ اُنھیں وہاں سے سامنے والے کمرے میں سیلن سے پاک کر کے منتقل کرنے پر رضامند ہو گئی۔ وہی اُس کے لیے بڑا کام ثابت ہوا۔ اُس نے وہاں ایک انگیٹھی نصب کی اور دِیواروں کی مرمت کی۔ اُس نے اُسے بتایا کہ وہ مہینے بھر کا زیادہ وقت اُوپر چڑھ چڑھ کر کاغذ اُتارنے، اُنھیں دوبارہ پڑھنے، ترتیب دینے اور اُس کے بنائے ہوئے کارنسوں پر منتقل کرنے میں صرف کرے۔

تب اُس نے اُسے بتایا کہ کاغذ اُس کے والد کی کتاب پر مشتمل ہیں، جسے وہ کبھی کبھار ناول

کہتی۔ اُسے کبھی اُس کے بارے میں تفصیل جاننے کا خیال نہیں آیا لیکن ایک روز اُس نے خود ہی اُسے بتایا کہ وہ میٹِلڈا اور سٹیفن نامی دو افراد کے بارے میں ایک ناول ہے۔

''تمھیں اپنی تاریخ کے بارے میں علم ہے؟'' اُس نے ہائی سکول کی تعلیم کے پانچ سال نمایاں نمبروں سے مکمل کیے تھے۔ وہ علمِ مثلث اور جغرافیے میں تو بہت اچھا رہا تھا لیکن اُسے تاریخ کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا۔ پھر اپنے آخری سال میں اُسے محاذِ جنگ پر جانا پڑ گیا تھا۔

اُس نے کہا۔ ''زیادہ نہیں۔''

''اگر تم بشپ سٹران گئے ہوتے تو تمھیں کافی معلوم ہوتا۔ یہ تمھارے حلق تک ٹھنسی ہوتی، کم از کم انگریزی تاریخ۔''

اُس نے بتایا کہ سٹیفن ایک ہیرو تھا۔ اپنے زمانے کا معزز اور نہایت اچھا انسان۔ وہ اُن نایاب لوگوں میں سے تھا جو صرف اپنے لیے نہیں جیتے اور وقت پڑنے پر اپنے عہد سے نہیں پھرتے۔ نتیجتاً وہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اور میٹِلڈا۔ وہ ولیم کی بیٹی تھی، جو ایک فاتح اور بے حد ظالم شخص تھا۔ چوں کہ وہ ایک عورت تھی، اِس لیے بہت سے احمق لوگ اُس کا دفاع کرتے تھے۔

''اگر وہ اسے ختم کر لیتے تو یہ بہت اچھا ناول ثابت ہو سکتا تھا۔''

بلا شبہ جیکسن احمق نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کتابوں کا وجود اسی لیے ہے کہ لوگ جم کر بیٹھ کے انھیں لکھتے ہیں۔ وہ غیب سے وجود میں نہیں آتیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیوں۔ پہلے ہی کتابوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ اُس نے سکول میں دو کتابیں پڑھی تھیں: دو شہروں کا قصہ اور ہَکل بیری فِن۔ دونوں کی زبان ایسی کہ آپ کو دہلا دے لیکن مختلف طرح سے۔ اور یہی بات قابلِ فہم تھی۔ وہ ماضی میں لکھی گئی تھیں۔ جو بات اُسے حیران و پریشان کرتی تھی، اگر چہ وہ اس پر سوچنا نہیں چاہتا تھا، یہ تھی کہ اب، عہدِ موجود میں کوئی کیوں چاہے گا کہ وہ بیٹھے اور ایک اَور کتاب لکھے۔

''ایک المیہ۔'' بَیلے پھرتی سے بولی اور جیکسن سمجھ نہیں پایا کہ وہ اپنے والد کے بارے میں کہہ رہی تھی یا نامکمل کتاب کے دونوں افراد کے بارے میں۔ بہر حال اب کمرہ رہنے کے قابل ہو گیا تھا اور اُس کا دھیان چھت کی طرف تھا۔ کمرے کو ٹھیک کرنے کا کیا فائدہ اگر چھت کو چھوڑ دیا جائے جو اُسے سال دو سال میں دوبارہ ناقابلِ رہائش بنا دے۔ اُس نے چھت کی مرمت کی کہ وہ مزید چند سردیاں نکال جائے لیکن اِس سے زیادہ کی وہ ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔ اُس کا اب تک یہی قصد تھا کہ وہ کرسمس سے پہلے اپنی راہ پکڑ لے۔

ساتھ والے کھیتوں کا مینونائٹس خاندان بڑی عمر کی لڑکیوں اور چھوٹی عمر کے لڑکوں پر مشتمل

تھا جنھیں وہ دیکھ چکا تھا اور وہ ابھی زیادہ مشقت کے کام کرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ جیکسن نے اُن کی ساونی فصل کاٹنے کا کام پکڑ لیا۔ اُسے بھی دُوسروں کے ساتھ کھانے کے لیے اندر بلایا جاتا اور اُسے کھانا دیتے ہوئے لڑکیوں کا وارفتہ روّیہ اُس کے لیے باعثِ تحیّر تھا۔ اُس کی توقع کے برعکس وہ سب کی سب خاموش طبع بھی نہیں تھیں۔ مائیں اُن پر آنکھ رکھتیں اور باپ اُس پر۔ یُوں سب محفوظ رہتے۔

بلا شبہ اُس نے اِس بارے میں بَیلے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ۔ اُسے یہ معلوم ہو گیا تھا۔ اُس سے سولہ برس بڑی تھی۔ لیکن اِس کا تذکرہ، حتّٰی کہ اِس بارے میں مذاق بھی، ہر شے برباد کر سکتا تھا۔ وہ ایک خاص نوع کی عورت تھی اور وہ ایک خاص نوع کا مرد۔

بہ وقتِ ضرورت وہ جس قصبے سے خریداری کرتے تھے، وہ اَوریول کہلاتا اور اُس کی پرورش والے قصبے سے متضاد سمت میں واقع تھا۔ اُس نے وہاں گھوڑے کو یونا ئیٹڈ چرچ کے اصطبل میں باندھا کیوں کہ مرکزی سڑک پر گھوڑے باندھنے والے ستون اب باقی نہیں بچے تھے۔ پہلے پہل وہ اَوزاروں اور حجام کی دُکانوں سے مجتنب تھا۔ لیکن جلد ہی اُسے چھوٹے گاؤوں والی اُس چیز کا ادراک ہو گیا جس کا اپنی زندگی میں اُسے اپنے گاؤں میں ہوا کرتا تھا۔ اُن کا آپس میں کوئی تعلّق نہیں تھا تا آں کہ وہ بال پارک میں کھیلوں کے انعقاد کے سلسلے یا ہاکی کے میدان میں نہ کھولی جاتیں جہاں ہر کام نہایت جوش و وَلولے سے جلد بازی میں کیا جاتا تھا۔ جب لوگوں کو کسی ایسی شے کی خریداری کی ضرورت پڑتی جو اُن کے اپنے قصبے میں دستیاب نہ ہوتی تو وہ شہر کا رُخ کرتے۔ اُسے کوئی شناسا دِکھائی دیا نہ کسی نے اُس میں دلچسپی ظاہر کی تاہم لوگوں نے ایک آدھ بار اُس کے گھوڑے پر ضرور نظر ڈالی۔ سرمائی مہینوں میں لوگ دُودھ دہی اور کریانے کی دُکانوں پر دُودھ اور انڈے پہنچانے کے لیے اپنے گھوڑے استعمال کرتے تھے کیوں کہ عقبی سڑکیں ناہموار تھیں۔

اگرچہ اُس کا ارادہ کبھی فلم دیکھنے کا نہ ہوتا لیکن بَیلے ہمیشہ ٹھیر کر دیکھتی کہ کون سی فلم چل رہی ہے۔ اُس کی فلموں اور فلمی ستاروں کے بارے میں گو چند برس پُرانی لیکن وسیع معلومات تھیں۔ مثال کے طور پر وہ بتا سکتی تھی کہ ہَیٹ بٹلر بننے سے پہلے کلارک گیبل نے اپنی حقیقی زندگی میں کس سے شادی کی تھی۔

جلد ہی جیکسن اپنے بال کٹوانے یا ختم ہونے پر تمبا کو لانے کے لیے جانے لگا۔ اب وہ ایک کسان ہی کی طرح تمبا کو نوشی کرنے لگا تھا کہ خود تہہ لگاتا اور کبھی گھر کے اندر نہ سلگاتا۔

کچھ عرصہ پہلے تک استعمال شدہ کاریں دستیاب نہیں تھیں لیکن جب اُن کی فراہمی ہوئی تو نئے نئے ماڈل نظر آنے لگے اور جن کاشت کاروں کے پاس رقم تھی وہ پُرانی کاریں بدلنے لگے۔ اُس نے بھی بَیلے سے بات کی۔ خُدا ہی جانتا ہے کہ سفید چندیا والا گھوڑا کتنا بُوڑھا اور پہاڑی پر چڑھنے میں

ہَٹ دھرم کیوں تھا۔

اُسے پتا چلا کہ اگر چہ کاروں کے بیوپاری کو اُن کی آمد کا گمان تک نہیں تھا لیکن وہ اُس کی نظروں میں تھے۔

''میرا ہمیشہ خیال رہا ہے کہ آپ اور آپ کی بہن مینونائٹس ہیں لیکن وہ مختلف لباس پہنتے ہیں۔'' بیوپاری نے کہا۔

اِس بات نے جیکسن نے کو ذرا سا جھٹکا لگایا لیکن یہ میاں بیوی ہونے سے بہتر تھا۔ اِس چیز نے اُسے یہ احساس بھی دِلا دیا کہ وہ کتنی عمر کا ہے اور گزشتہ برسوں میں کتنا تبدیل ہوگیا ہے اور کس طرح وہ شخص، جس نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی، وہ شکستہ اعصاب فوجی اب موجودہ رُوپ میں ناقابلِ شناخت ہے۔ جب کہ بَیلے، جہاں تک اُس کا اندازہ تھا، اپنی زندگی کے اُس مقام پر ٹھہر گئی تھی جہاں وہ ایک بڑی عمر کا بچہ دِکھائی دیتی تھی۔ اُس کی آگے پیچھے پھلانگتی اور ماضی میں جاتی اور پھر ماضی سے نکلتی گفتگو بھی اِس تأثر کو مضبوط کرتی تھی کہ وہ اُن کے قصبے کے آخری چکر، اپنے ماں باپ کے ہمراہ دیکھی ہوئی اپنی آخری فلم یا اُس پُرلطف موقع میں — جب مارگریٹ روز نے — جواَب مر چکی تھی — اپنے ہینگ پریشان حال جیکسن پر تانے تھے، فرق قائم نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اُن کی دُوسری کار تھی جس میں وہ ۱۹۶۲ء کے گرما میں ٹورنٹو گئے۔ وہ ایک ایسا دورہ تھا جس کا اُسے گمان تک نہیں تھا اور وہ جیکسن کے لیے انتہائی بے وقت آیا تھا۔ اوّلاً اِس بنا پر کہ وہ مینونائٹس کے لیے، جو اپنی فصلوں میں مصروف تھے، ایک اصطبل تعمیر کر رہا تھا اور ثانیاً اِس لیے کہ اُسے اپنی کاشت کی ہوئی سبزیاں برداشت کرنا تھیں جنھیں اُس نے اَوریول میں سبزی والے کو فروخت کرنے کی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ لیکن بَیلے کو رسولی ہوگئی تھی جس پر اُسے بالآخر توجہ دینا پڑ ہی گئی تھی اور اب اُسے ٹورنٹو سے جراحی کروانا پڑ رہی تھی۔

بَیلے کہتی رہی کہ کتنی تبدیلی آ گئی ہے۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ ہم کینیڈا ہی میں ہیں؟

یہ بات کِچنر کے پاس سے گزرنے سے پہلے کی تھی۔ جب وہ نئے ہائی وے پر چڑھے تو وہ حقیقتاً چوکنا ہوگئی اور اُسے کہنے لگی کہ وہ کوئی اَور سڑک تلاش کرے یا پھر واپس گھر چلے۔ اُس نے اپنے آپ کو اُس سے تیز لہجے میں بات کرتے پایا — ٹریفک نے اُسے بھی حیرت سے دوچار کر رکھا تھا۔ اُس کے بعد وہ تمام راستے خاموش رہی اور اُسے نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں یا اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا یا دُعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس نے اُسے کبھی دُعائیں مانگتے نہیں دیکھا تھا۔

حتّٰی کہ اُس صبح بھی اُس نے، جانے کے بارے میں اُس کا ذہن بدلنے کی کوشش کی تھی۔ اُس

نے کہا کہ رسولی چھوٹی پڑ رہی ہے بڑھ نہیں رہی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ چوں کہ ہر شخص کی ہیلتھ انشورنس ہو چکی ہے لہٰذا کسی کے پاس بھی ڈاکٹروں کی طرف دوڑنے اور اپنی زندگی کو ہسپتالوں اور جراحیوں کا ایک طویل دورانیے کا ڈراما بنانے کے سوا چارہ نہیں بچا، جو زندگی کے آخری حصے میں تکلیف کے دورانیے کو طویل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔

جب وہ ہائی وے سے چھوٹی سڑک پر مُڑ کر واقعی شہر میں داخل ہو گئے تو اُس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ وہ ایونیو روڈ پر نکلے تو باوجود ہر چیز کی تبدیلی کے نعروں کے، اُس نے ہر بلاک میں اپنی جان پہچان کی کوئی نہ کوئی شے پہچان لی۔ وہاں اپارٹمنٹوں والی عمارت تھی جس میں بشپ سٹران کے ایک استاذ رہا کرتے تھے (اُس نے کچھ دیر قبل بتایا تھا کہ سٹران محض تلفظ ہے، اِس نام کے اصل ہجے سٹراچن (Strachan) ہیں)۔ زیرِ زمین ایک دُکان تھی جہاں سے دُودھ، سگریٹ اور اخبار خریدا جا سکتا تھا۔ اُس نے کہا کہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہوگی اگر اب بھی وہاں سے ٹیلی گرام مل جائے جس میں اُس کے والد کا نام اور ایک دُھندلی تصویر ہو جو اُس زمانے میں کھینچی گئی تھی جب اُن کے سارے بال قائم تھے۔

چھوٹی سی چیخ۔ ایک سڑک کے ساتھ اُس نے وہی گرجا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ حلف اُٹھا سکتی تھی کہ وہ بالکل وہی گرجا گھر ہے۔ جس میں اُس کے والدین کی شادی ہوئی تھی۔ وہ اُسے وہ دِکھانے لے گئے تھے، گو وہ اُس گرجا گھر کے رُکن بھی نہیں تھے۔ وہ اُس گرجا گھر کے علاوہ کسی اَور میں جاتے بھی نہیں تھے۔ اُس کے والد کا کہنا تھا کہ اُن کی شادی تہہ خانے میں ہوئی تھی لیکن اُس کی والدہ کہتی تھی کہ ویسٹری[۲] میں۔

تب اُس کی ماں بولنے کے قابل تھی، جب وہ بولنے کی اہل تھی۔ شاید اُس زمانے کا قانون تھا کہ یا تو شادی گرجا گھر میں کریں ورنہ وہ غیر قانونی ہوگی۔

ایگلنٹن پر اُس نے زیرِ زمین ریلوے کی علامت دیکھی۔

''ذرا سوچو، میں کبھی زیرِ زمین ٹرین پر سوار نہیں ہوئی۔'' اُس نے یہ بات دُکھ اور تفاخر کے ملے جلے احساس کے ساتھ کہی۔ ''تصور کرو کہ باقی ہر شے کو کتنا نظر انداز کیا۔''

ہسپتال میں لوگ اِس کام کے لیے تیار تھے۔ اُس نے اپنی خوش مزاجی کا مظاہرہ اپنی گفتگو سے جاری رکھا۔ اُنھیں ٹریفک کے بارے میں اپنے خوف اور تبدیلیوں کی باتیں بتاتی رہی اور اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا اب بھی کرسمس پر ایٹن سٹور پر نمائش ہوتی ہے اور کیا لوگوں کو اب بھی ٹیلی گرام یاد ہے؟

''تمھیں چائنا ٹاؤن کے بیچ سے آنا چاہیے تھا۔'' ایک نرس بولی۔ ''اب وہ خاصے کی چیز

ہے۔''

''میں گھر لوٹتے ہوئے اُسے دیکھتی جاؤں گی۔'' اُس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں گھر لوٹ سکی تو۔''

''اب احمقانہ باتیں مت کرو۔''

ایک اَور نرس، جیکسن سے کارکھڑی کرنے کے بارے میں باتیں کر رہی تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ وہ اُسے کہاں لے جائے کہ اُسے ٹکٹ نہ لینا پڑے۔ وہ یہ بھی جان لینا چاہتی تھی کہ کیا وہ وہاں اپنے ایسے عزیزوں سے آگاہ ہے، جن کے ہاں رہائش اُسے ہوٹل سے بہت ارزاں پڑے۔

اُنھوں نے بتایا کہ بیلے اب بستر پر پہنچا دی گئی ہوگی۔ ایک ڈاکٹر اُسے دیکھنے آئے گا اور جیکسن بعد میں اُسے شب بخیر کہنے آ سکتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ اُس وقت اُسے قدرے غنودگی میں پا سکتا ہے۔

وہ بے دھیانی سے باتیں سُنتی اور کہتی رہی کہ وہ تمام وقت غنودگی میں رہی ہے اور اُسے ہر طرف سے ہنسی کی آواز آتی رہی ہے تو وہ مُتحیر نہ ہوا۔

اُس کے روانہ ہونے پہلے نرس اُسے دستخط لینے کے لیے لے گئی۔ جس خانے میں رشتے کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا اُسے پُر کرتے ہوئے وہ ہچکچا گیا۔ پھر اُس نے لکھا۔ ''دوست۔''

جب وہ شام کو واپس آیا تو اُسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بیلے غنودہ نہیں تھی۔ اُنھوں نے اُسے سبز کپڑے کے ایک غلاف میں یُوں لپیٹ رکھا تھا کہ اُس کی گردن اور بازو عریاں تھے۔ اُس نے اُسے اِس قدر عریاں کم ہی دیکھا یا اُس کی ہنسلی سے ٹھوڑی تک پھیلی نیلی نسوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

وہ غصّے میں تھی کہ اُس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''وہ مجھے کچھ بھی نہ دیں لیکن پانی کے دو گھونٹ تو دے دیں۔''

وہ چاہتی تھی وہ جا کر اُس کے لیے کوک لے آئے، جسے اُس نے اپنی یادداشت کے مطابق کبھی نہیں پیا تھا۔

''نیچے ہال میں مشین نصب ہے — وہاں نصب ہونا چاہیے۔ میں نے لوگوں کو وہاں سے ہاتھوں میں کوک پکڑے جاتے دیکھا ہے اور اِس چیز نے میری پیاس بڑھا دی ہے۔''

اُس نے اُسے کہا کہ وہ احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور اُس نے ناراضگی سے رُخ موڑ لیا۔

''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''جلد ہی چلی جاؤ گی۔''

''تم میرے کپڑے ڈھونڈنے میں میری مدد کر سکتے ہو؟''

''نہیں، میں نہیں کر سکتا۔''

''اگر تم نہیں کرو گے تو میں خود تلاش کر لوں گی۔ میں خود ہی ریلوے سٹیشن بھی چلی جاؤں گی۔''

''یہاں سے ہمارے گھر کو کوئی سواریوں والی ٹرین نہیں جاتی۔''

پھر اچانک ہی وہ اپنے فرار کے منصوبے سے دستبردار ہوتی دکھائی دی۔

چند ہی لمحوں بعد اُس نے گھر اور گھر میں لائی ہوئی اُن کی بہتری۔ خاص طور پر اُس کی لائی ہوئی بہتری۔ کو یاد کرنے لگی: بیرونی دیوار پر سفید رنگ کی دمک اور خوشی کہ سیاہ پڑے باورچی خانے میں کی گئی سفیدی اور فرش پر جڑے گئے لکڑی کے تختے، دوبارہ ڈالی گئی چوبی کھپرے کی چھت اور کھڑکیوں کو دیا گیا پُرانا رُوپ اور تمام کارناموں سے نمایاں پانی کے پائپوں کی تنصیب، جس نے موسمِ سرما میں بہت لطف دیا تھا۔

''اگر تم نہ آتے تو میں بہت جلد بیزاری کا شکار ہو جاتی۔''

اُس نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی اس کا شکار ہو چکی ہے۔

''جب میں یہاں سے نکلوں گی تو ایک وصیت لکھوں گی۔'' وہ بولی۔ ''سب کچھ تمھارا۔ تمھاری محنت ضائع نہیں جائے گی۔''

بلا شبہ اُس نے بھی اِس بارے میں سوچا تھا اور متوقع طور پر ملکیت کے امکانات اُس کے لیے باعثِ اطمینان ہوتے گو اُسے سچی اور مخلصانہ توقع یہی تھی کہ ایسا کچھ جلد نہیں ہوگا۔ لیکن نہیں۔ اِس سے اُسے کم ہی فائدہ ہوتا کہ وہ جائیداد بہت دُور دراز واقع تھی۔

اُس کا جنون عود کر آیا۔

''آہ، کاش میں یہاں نہیں۔ وہاں ہوتی۔''

''جراحی کے بعد ہوش میں آنے پر تم خود کو بہت بہتر محسوس کرو گی۔''

وہ شام سے ہی اِس سفید جھوٹ کو سُن رہا تھا۔ وہ اچانک بہت تھکن محسوس کرنے لگا۔

اُس نے اپنے اندازے کی نسبت زیادہ سچ بات کہی تھی۔ دو روز بعد جب نیلے رسولی نکال دیے جانے کے بعد ایک دُوسرے کمرے میں بیٹھی اُس سے ملنے کی منتظر اور پردے کے عقب میں قریبی بستر سے عورت کے بَین کی آوازوں سے زچ نہیں تھی، جو کم و بیش ویسی ہی تھیں جیسی وہ۔ نیلے۔ خود گزشتہ روز نکال رہی تھی جب اُس نے نہ تو آنکھیں کھولی تھیں اور نہ ہی وہ اُس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''اُس کی طرف دھیان مت دو۔'' بیلے نے کہا۔ ''وہ اِس سے بے نیاز ہے۔ غالباً اُسے کسی شے کا احساس تک نہیں ہے۔ وہ کل تک مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گی۔ یا پھر شاید نہ ہو۔''

کسی حد تک اطمینان بخش، ایک خاص تحکمانہ اور جنگی فوجی کی سی بے رحمی نمایاں تھی۔ وہ بستر پر بیٹھی مناسب حد تک خم دار بالی سے مالٹے کا کسی قسم کا جوس پی رہی تھی۔ وہ قلیل وقت قبل لائی جانے والی عورت سے بہت کم عمر لگ رہی تھی۔

وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا وہ ٹھیک طور پر نیند لے رہا ہے، اُسے کوئی ایسی جگہ مل گئی ہے جہاں کا کھانا اُسے پسند آ گیا ہے، موسم چہل قدمی کے لیے زیادہ گرم تو نہیں ہوا اور کیا اُسے رائل اونٹاریو میوزیم کی سیر کے لیے وقت ملا جس کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ اُس نے ہدایت کی تھی۔

لیکن وہ اُس کے جوابات پر توجہ قائم نہیں رکھ سکی۔ وہ تحیّر کا شکار تھی۔ قابو پائی ہوئی حیرت۔

''اوہ، مجھے تمھیں بتانا ہے کہ۔'' وہ اُس کی وضاحت کہ وہ عجائب گھر کیوں نہیں جا سکا، میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''اوہ، اتنا چونک کر مت دیکھو۔ ایسا مُنہ بنا کر تو تم مجھے ہنسا دو گے اور اس سے میرے ٹانکوں میں تکلیف ہوگی۔ آخر مجھے ہنسنے کا خیال ہی کیوں آ رہا ہے؟ درحقیقت یہ خطرناک حد تک افسردہ کر ڈالنے والا کام ہے۔ یہ ایک المیہ ہے۔ تمھیں میرے والد کے بارے میں تو علم ہے، میں نے تمھیں اُن کے بارے میں بتایا تھا۔''

اُس نے نوٹ کیا کہ اُس نے ڈیڈی کے بجائے والد کہا تھا۔

''میرے والد اور والدہ۔''

لگتا تھا جیسے وہ یادیں کھنگال رہی ہو اور پھر وہ دوبارہ شروع ہوئی۔

''جب تم نے پہلی بار دیکھا تو گھر اُس سے کہیں بہتر حالت میں تھا۔ اُس سے بہتر ہی ہوگا۔ ہم چھت پر بنے کمرے کو غسل خانے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ بے شک ہمیں پانی ڈھونا پڑتا تھا۔ لیکن بعد میں، جب تم آئے تو میں نیچے والا استعمال کرتی تھی۔ تمھیں پتا ہے کہ اُس میں کارنسیں لگی الماری تھی؟''

اُسے یہ یاد کیوں نہیں تھا کہ وہی تو تھا جس نے کارنسیں نکال کر غسل خانے میں نصب کی تھیں؟ اُس نے ہی تو یہ کام کیا تھا۔

''اوہ، خوب، اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ اپنے خیالوں کا تعاقب کرتی ہوئی بولی۔ ''تو میں نے پانی گرم کیا اور اسفنجی غسل لینے کے لیے اُسے اُوپر چھت پر لے گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اُتارے۔ خوب، میں نے یہی کیا تھا۔ سنک کے اُوپر ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ وہاں اصل غسل خانوں والا ایسا سنک لگا تھا جس کی کل نکال کر پانی کو واپس بالٹی میں ڈالا جا سکتا ہے۔ طہارت

خانہ دُوسری جگہ پر تھا۔تم تصویر دیکھ لینا۔ میں غسل لینا شروع کیا تو فطری طور پر میں الف ننگی تھی۔رات کے تقریباً نو بجے کا وقت ہوگا لہٰذا وہاں خُوب روشنی تھی۔کیا میں نے بتایا ہے کہ وہ گرمی کا موسم تھا؟ وہ چھوٹا سا کمرہ مغرب کے رُخ پر تھا۔

''تبھی میں نے قدموں کی چاپ سُنی اور بلا شبہ وہ ڈیڈی تھے۔میرے والد۔وہ والدہ کو بستر پر پہنچانے کا کام مکمل کر چکے ہوں گے۔میں نے چھت پر آتے قدموں کی دھمک جیسی بھاری آواز سُنی۔ قدرے غیر معمولی۔نہایت نپی تُلی۔یا شاید یہ بعد میں میرے ذہن سے چپک جانے والا گمان ہے۔بعد میں چیزیں ڈرامائی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔چاپ غسل خانے کے دروازے کے عین سامنے ٹھیر گئی اور میں نے کچھ سوچا، میں نے سوچا کہ وہ نہایت تھک گئے ہوں گے۔میں نے دروازے کی کنڈی نہیں چڑھائی تھی کیوں کہ وہاں کنڈی تھی ہی نہیں۔اگر دروازہ بند ہوتا تو یہی فرض کیا جاتا کہ اندر کوئی ہے۔

''تو وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے، میں سوچنے سے بھی قاصر ہو چکی تھی اور پھر اُنھوں نے دروازہ کھولا اور کھڑے کھڑے مجھے دیکھا۔میں بتانا چاہتی ہوں کہ میری مراد کیا ہے۔اُنھوں نے صرف میرے چہرے نہیں ہر حصّے کو دیکھا۔میرا چہرہ آئینے میں نظر آ رہا تھا اور وہ مجھے اور جو کچھ میرے عقب میں تھا آئینے میں دیکھ رہے تھے اور میں بھی دیکھ سکتی تھی۔اُن کی نظریں کسی بھی طرح معمول کی نہیں تھیں۔

''میں تمھیں بتاتی ہوں کہ مجھے کیا خیال آیا تھا۔مجھے خیال آیا تھا کہ وہ نیند میں چل رہے تھے۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کروں کیوں کہ نیند میں چلنے والے کو چونکانا نہیں چاہیے۔

''لیکن تب وہ بولے''معاف کرنا''اور مجھے پتا چل گیا کہ وہ نیند میں نہیں تھے۔لیکن وہ ایک پُرمزاح قسم کی آواز میں بولے تھے۔میرا مطلب ہے کہ وہ ایک عجیب وغریب آواز تھی۔انتہائی عجیب جیسے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہوں یا مجھے دیکھ کر پاگل ہو گئے ہوں، میں جان نہیں پائی۔پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ اُنھی قدموں بڑے کمرے میں لوٹ گئے۔اگلی صبح جب میں اُٹھی تو وہاں وہی پانی موجود تھا جس سے میں نے غسل لیا تھا اور میں اُس کے قریب بھی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن میں گئی۔

''لیکن ہر شے معمول کے مطابق تھی اور وہ ناشتہ کر رہے تھے۔اُنھوں نے مجھے صبح بخیر کہا اور مجھ سے کچھ الفاظ کے ہجّے پُوچھے۔اُسی انداز میں جس میں وہ اکثر دریافت کیا کرتے تھے کیوں کہ میں ہجّوں میں کافی بہتر تھی۔میں نے اُنھیں ہجّے بتائے اور کہا کہ اگر وہ خُود کو لکھاری قرار دیتے ہیں تو اپنے ہجّے ٹھیک کریں۔وہ اِس معاملے میں بے بس تھے۔لیکن کچھ دیر بعد دِن چڑھے جب میں کچھ رکابیاں دھو رہی تھی تو وہ عین میری پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے اور مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔وہ صرف اِتنا بولے۔''بیٹی، مجھے افسوس ہے۔''اور میں نے سوچا، آہ کاش، وہ یہ بات نہ کہتے۔مجھے اِس بات نے خوف زدہ کر دیا۔مجھے معلوم تھا کہ یہ سچ ہے کہ اُنھیں افسوس ہوا ہے لیکن اُنھوں نے معاملہ کچھ یُوں کھول کر رکھ دیا

تھا کہ میں اُس سے نظریں نہیں چُرا سکتی تھی۔ میں نے محض اتنا کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' لیکن میں یہ بآسانی نہیں کہہ پائی یا یُوں کہ یہ واقعی ٹھیک تھا۔

''میں نہیں کہہ پائی۔ میں اُن کے علم میں لانا چاہتی تھی کہ اُنھوں نے ہمیں تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا اور دُھلی ہوئی رکابیوں کا پانی چھینکنے چلی گئی اور پھر اپنے دُوسرے کام کاج کرنے لگی۔ بعد میں مَیں نے والدہ کو کھانے کے لیے جگایا، کھانا لگایا اور اُنھیں پُکارا لیکن وہ نہیں آئے۔ میں نے والدہ سے کہا کہ وہ چہل قدمی کے لیے چلے گئے ہوں گے۔ وہ لکھتے لکھتے تھک جاتے تو اکثر یہی کیا کرتے تھے۔ میں نے والدہ کو کھانا کھانے میں مدد دی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔ اگرچہ یہ والد کا کام تھا لیکن میں نے والدہ کا بستر تیار کیا۔ پھر میں نے ریل گاڑی کے آنے کی آواز سُنی اور اچانک ہی بلند شور اور ٹرین کی بریکوں کی چیخ۔ شاید مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کیا ہوا ہے گو جب مجھے پتا چلا تو میں نہیں جانتی تھی کہ دراصل کیا ہوا ہے۔

''میں تمھیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ ٹرین کی زد میں آ گئے تھے۔

''لیکن میں تمھیں یہ نہیں بتا رہی ہوں۔ میں تمھیں محض سَراوَن پھرنے کے بارے میں نہیں بتا رہی ہوں۔ شروع میں مَیں اِس کا ادراک نہیں کر پائی اور میں حقیقتاً عرصۂ دراز کے بعد یہ سوچنے کے قابل ہوئی کہ وہ اپنے کام کے خیالوں میں گُم پٹری کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے اور اُنھیں گاڑی کی آواز سُنائی نہیں دی۔ یہی کہانی درست تھی۔ مجھے قطعاً خیال نہیں آیا کہ اِس کی وجہ میں تھی یا بنیادی وجہ میں تھی۔ جنسیت۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں نے اُس واقعے کو اصل میں سمجھا ہی اب ہے کہ اُس میں کسی کی خطا نہیں تھی۔ وہ المیائی صورتِ حال انسانی جنسیت کے دخل کی بنا پر تھی۔ میں جوان ہو رہی تھی اور ماں کی جو حالت تھی اور والد فطری طور پر اُسی حالت میں تھے جس میں ہونا چاہیے تھا۔ میرا قصور تھا نہ اُن کا۔

''یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ، میری بس یہ مراد ہے، لوگ ایسی صورتِ حال میں ہوں تو اُنھیں ایسے مقامات پر جانا چاہیے اور اِس پر شرمندہ اور اپنے آپ کو خطاوار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم سوچ رہے ہو کہ میری مراد قحبہ خانوں سے ہے تو تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ اگر تم طوائفوں کے بارے میں سوچ رہے ہو تو بھی تم ٹھیک ہو۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟''

جیکسن نے اُس کے سر کے اُوپر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ ہاں۔

''میں ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ یہ نہیں کہ المیہ مجھ پر اثر نہیں کرتا لیکن میرا مطلب ہے کہ اِس طرح میں المیے سے نکل آتی ہوں۔ اگر تم میرا مطلب سمجھ سکو تو یہ محض انسانی خطائیں ہی ہیں جو المیے کو جنم دیتی ہیں۔ اگر میں مُسکرا رہی ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ میں احساسات سے عاری ہوں۔ میں نہایت حساس

ہوں۔ لیکن مجھے کہنا ہے کہ میں ہلکی ہو گئی ہوں۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ میں قدرے خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تمام باتیں تمھیں دِق تو نہیں کر رہیں؟''

''نہیں۔''

''تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں تھوڑی سی خراب ذہنی حالت میں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں ہوں۔ اِس خراب ذہنی حالت میں شفافیت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہر چیز کے بارے میں۔ ہر شے نہایت صاف ہے۔ میں اِس کی انتہائی ممنون ہوں۔''

اِس تمام گفتگو کے دوران میں دُوسرے بستر سے عورت کی رحم بھری آہ وزاری جاری رہی۔ جیکسن کو محسوس ہوا جیسے اُس کی ٹیپ کے مصرعے جیسی آہ وزاری اُس کے دماغ میں پیوست ہو گئی ہو۔

اُس نے ہال سے نرسوں کے نرم قدموں کی چاپ سُنی اور تمنا کی کہ وہ اُس کمرے میں آجائیں۔ وہ آ گئیں۔

نرس نے کہا کہ اُس نے آرام کے لیے بیلے کو خواب آور گولی دینا ہے۔ اُسے ڈر لگنے لگا کہ وہ اُس سے شب بخیری بوسے کے لیے نہ کہہ دے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ اُس ہسپتال میں بہت زیادہ بوسے لیے دیے جا رہے تھے۔ اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا لیکن بوسے کا تذکرہ تک نہیں ہوا۔

''کل ملیں گے۔''

وہ علی الصبح اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے ناشتے سے قبل سیر کا قصد کیا۔ وہ اچھی نیند سویا تھا لیکن اُس نے اپنے آپ کو باور کروایا کہ اُسے کچھ دیر کے لیے ہسپتال کی فضا سے باہر نکلنا چاہیے۔ اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بیلے میں تبدیلی کی بنا پر بہت پریشان تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ممکن ہے یا اغلب طور پر وہ اپنی عام ذہنی حالت کی طرف آج ہی یا چند ایک روز میں پلٹ آئے گی۔ تب شاید اُسے اپنی سُنائی ہوئی کہانی یاد بھی نہ رہے جو ایک نعمتِ خداوندی ہوگی۔

سال کے اُس حصے میں، توقع کے عین مطابق سُورج خاصا اُوپر آ چکا تھا۔ لاریاں اور اندرونِ شہر چلنے والی دُوسری گاڑیاں سواریوں سے بھری پڑی تھیں۔ وہ کچھ دیر جنوب میں چلا اور پھر ڈُنڈاس سٹریٹ پر مُڑ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اُس نے اپنے آپ کو چائنا ٹاؤن میں پایا جس کے بارے میں وہ سُن چکا تھا۔ کچھ جانی پہچانی اور بہت سی انجانی سبزیوں کے ڈھیر دُکانوں میں دھکیلے جا رہے تھے اور کھالوں سمیت بظاہر کھانے والے چھوٹے چھوٹے جانور فروخت کے لیے لٹکے ہوئے تھے۔ سڑکیں غیر قانونی طور پر کھڑے ٹرکوں اور شور مچاتے اور چلاتی ہوئی آوازوں والے چینیوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ تمام چلاتی ہوئی آوازوں سے جنگ کا سماں لگتا تھا لیکن اُن کے لیے غالباً یہ معمول کی بات تھی۔ اُس نے وہاں سے نکلنا چاہا اور ایک ریستوران میں چلا گیا جسے چلاتے تو چینی تھے لیکن اُس پر انڈوں اور سؤر کی پُٹھ

کے گوشت کے عام ناشتے کا اشتہار لگا تھا۔ جب وہ وہاں سے باہر نکلا تو اُس کا ارادہ پلٹ کر ہسپتال جانے کا تھا۔

لیکن اِس کے بجائے اُس نے ایک بار پھر اپنا رُخ جنوب کی سمت پایا۔ وہ ایک رہائشی گلی میں داخل ہوگیا جس کے اطراف اینٹوں کے بلند وبالا اور نہایت تنگ مکان تھے۔ وہ اُس زمانے میں تعمیر ہوئے ہوں گے جب اُس علاقے کے لوگوں کو روِشوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی یا ممکنہ طور پر جب اُن کے پاس کاریں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ چلتا گیا یہاں تک کہ اُس نے کوئین سٹریٹ کی تختی دیکھی، جس کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا۔ وہ دوبارہ غربی سمت مُڑ گیا اور چند چوکوں کے بعد اُس کے سامنے ایک رُکاوٹ آ گئی۔ اُس نے کیکوں کی ایک دُکان کے سامنے لوگوں کے ایک چھوٹے سے ہجوم کو دیکھا۔ وہ ایک ایمبولینس کے قریب کنارے کے راستے کی طرف اپنی پشتیں کیے یوں کھڑے تھے کہ گزرنے کے لیے بھی راہ نہیں بچی تھی۔ کچھ لوگ اطمینان سے کھڑے دیکھتے ہوئے ایک دُوسرے سے استفسار کررہے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ بتایا جارہا تھا کہ موت ہوگئی ہے۔ کچھ تماشائی مختلف اُمیدواروں (یعنی جن کی موت کا امکان ہوسکتا تھا۔ مترجم) کا ذکر کررہے تھے اور دُوسرے اِس امر کو گاڑی کے وہاں ٹھیرنے کا قانونی جواز قرار دے رہے تھے۔

بالآخر جس شخص کو سٹریچر پر باندھ کر باہر لایا گیا وہ یقیناً مردہ نہیں تھا یا پھر اُس کا چہرہ نہیں ڈھانپا گیا تھا۔ اُسے کیکوں کی دُکان سے نہیں۔ جس کی کسی نے تمسخرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ جو کیکوں کے معیار پر کسی قسم کا طنز تھا۔ بلکہ عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر لایا جارہا تھا۔ وہ عمدہ اینٹوں والی اپارٹمنٹوں کی پانچ منزلہ عمارت تھی جس کی مرکزی ارضی منزل پر مشینوں پر گاہکوں کے خود کپڑے دھونے اور سکھانے والی دُکان کے ساتھ کیکوں کی دُکان بھی تھی۔ عمارت کے مرکزی دروازے پر لکھا نام تکبر کے ساتھ ساتھ اُس کے ماضی کی قدرے حماقت کا مظہر تھا: بونی ڈُنڈی۔

سب سے آخر میں ایک شخص باہر نکلا جس نے ایمبولینس والوں کی وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ وہ وہاں کھڑا ہوکر پریشانی سے منتشر ہوتے ہجوم کو دیکھنے لگا۔ اب صرف ایمبولینس کی چنگھاڑ کا انتظار تھا جو راستہ پاتے ہی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

جیکسن اُن لوگوں میں شامل تھا، جنھوں نے اب بھی وہاں سے ہلنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اُس واقعے کے بارے میں متجسس تھا بلکہ اِس سے زیادہ، اُسے اُس موڑ کا انتظار تھا جہاں سے مُڑ کر وہ وہاں لوٹ سکتا جہاں سے آیا تھا۔ باہر آنے والا شخص اُس کی سمت آیا اور اُس سے پُوچھنے لگا کہ اُسے جلدی تو نہیں۔

نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔

وہ عمارت کا مالک تھا۔ ایمبولینس میں لیے جانے والا عمارت کا نگران اور سپر نٹنڈنٹ تھا۔

''مجھے ہسپتال پہنچ کر دیکھنا ہے کہ اُس پر کیا افتاد پڑی ہے۔ بالکل کل ہونے والی بارش کی طرح۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ جہاں تک میرا خیال ہے قریب کوئی ایسا فرد بھی موجود نہیں جسے میں بلا سکوں۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مجھے چابیاں بھی نہیں ملیں۔ نہ اُس کے پاس اور نہ اُس جگہ جہاں وہ عام طور پر رکھتا ہے۔ اِس لیے مجھے گھر جا کر اضافی چابیاں لینا ہیں اور میں پریشان ہوں، کیا تم اِس دوران میں دھیان رکھ سکتے ہو؟ مجھے گھر بھی جانا ہے اور ہسپتال بھی۔ میں کسی کرایے دار سے بھی کہہ سکتا ہوں لیکن میں نہیں کہنا چاہتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ فطری اشتیاق یا کچھ بھی کہہ لو۔''

اُس نے جیکسن سے دوبارہ دریافت کیا کہ وہ محسوس تو نہیں کرے گا اور جیکسن نے کہا کہ نہیں، ٹھیک ہے۔

''بس ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنا۔ اُنھیں اپنی چابیاں دِکھانے کے لیے کہنا۔ اُنھیں بتانا کہ ایمرجنسی ہے، زیادہ لمبی بات مت کرنا۔''

وہ جاتے جاتے مُڑ آیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

وہاں کُرسی پڑی تھی جسے جیکسن نے نہیں دیکھا تھا۔ تہہ کر کے راستے سے ہٹا کر رکھی ہوئی کہ ایمبولینس کھڑی ہو سکے۔ وہ کینوس کی ایک کُرسی تھی لیکن آرام دہ اور خاصی وزنی۔ جیکسن شکریہ ادا کر کے اُسے ایسی جگہ ڈال کے بیٹھ گیا جہاں سے وہ راہ گیروں یا اپارٹمنٹوں کے رہائشیوں کے راستے میں رُکاوٹ نہ بنے۔ اُس کی بات سُنی ہی نہیں گئی۔ وہ ہسپتال کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اِس حقیقت کے بارے میں بھی کہ اُسے بھی جلد وہاں واپس جانا ہے لیکن وہ شخص جلدی میں تھا اور اُس کے دماغ میں پہلے ہی بہت کچھ تھا اور اُس نے خُود بھی یہ بات پہلے ہی کہہ دی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہوا وہ لوٹ آئے گا۔

جیسے ہی جیکسن بیٹھا اُسے ادراک ہوا کہ وہ بہت دیر اِدھر اُدھر مٹر گشت کرتا رہا ہے۔

اُس شخص نے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو کیکوں کی دُکان سے کافی یا کھانے کی کوئی بھی چیز لے سکتا ہے۔

''بس اُن سے میرا نام لے دینا۔''

لیکن جیکسن اُس کا نام قطعاً نہیں جانتا تھا۔

لوٹنے پر مالک نے دیر سے آنے پر معذرت کی۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ ایمبولینس میں لے جائے جانے والا شخص مرگیا تھا۔ تدفین کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ چابیوں کا نیا گُچھا ضروری ہوگیا تھا، جو بن گیا تھا۔ عرصہ دراز سے عمارت میں رہنے والوں کی تدفین میں شرکت ہونا تھی۔ اخبار میں اشتہار پر کچھ اور

لوگ بھی آ سکتے تھے۔ لکھنے تک اُس کے بچے مشکل امر تھا۔

جیکسن چاہتا تو عارضی طور پر مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ بس یہ وقتی ہوتا۔

جیکسن نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اُسے کوئی مسئلہ نہیں۔

اگر وہ کچھ وقت لینا چاہتا ہے تو اُسے دیا جا سکتا تھا۔ جنازے اور کچھ اور کاموں کو نپٹانے کے فوراً بعد اپنے معاملات سمیٹنے اور باقاعدہ معمولات شروع کرنے کے لیے اُسے چند روز مل سکتے تھے۔

جیکسن نے کہا کہ اِس کی بھی ضرورت نہیں۔ اُس کے معاملات سمٹے ہوئے اور اُس کا سامان اُس کی پشت پر تھا۔

فطری طور پر اِس چیز نے تھوڑا سا شک پیدا کیا۔ جیکسن کو حیرانی نہیں ہوئی جب دو چار روز بعد اُسے یہ پتا چلا کہ اُس کا نیا آجر پولیس کے پاس گیا تھا۔ لیکن بظاہر سب ٹھیک تھا۔ وہ ایک ایسے تنہا شخص کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا تھا جو کسی نوع کی مصیبت میں تو پھنسا ہوتا ہے لیکن قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا۔

دِکھائی یہی دیتا تھا کہ اُس کی تلاش میں چھاپے نہیں پڑ رہے۔

اُصولی طور پر جیکسن کو عمارت میں بوڑھوں یا تنہا لوگوں کا رہنا پسند تھا نہ کہ بے حس اور مفاد پرستوں کا۔ صلاحیت، ایسی صلاحیت کہ جو ایک بار سامنے آجاتی اور ایک بار ظہور پذیر ہو جاتی خواہ پھر وہ زندگی بھر برقرار نہ رہتی جیسے ریڈیو کے ایک اناؤنسر کی آواز کی جنگ کے دِنوں میں تو ہر سمت گونج سنائی دیتی تھی لیکن بعد میں اُسی آواز کا جوش و ولولہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ اکثر لوگ سمجھتے کہ وہ مر چکا ہے لیکن وہ وہاں ایک مجرد کمرے میں خبریں پڑھنے اور گلوب اینڈ میل میں لکھنے کا کام کرتا ہوا موجود تھا کہ اگر اُس میں جیکسن کی دلچسپی کی کوئی چیز ہوتی تو وہ اُسے دے دیتا۔

ایک بار اُس کی دلچسپی کی چیز موجود تھی۔

طویل عرصے تک ٹورنٹو ٹیلی گرام کے کالم نگار رہنے والے وِلارڈ ٹریسے اور ہیلینا کی دختر مارجوری ایزابیلا ٹریسے کینسر کے ساتھ بہادری سے لڑنے کے بعد وفات پا گئی تھی۔ اَوریول، جولائی ۱۸، ۱۹۶۵ء۔

کوئی تذکرہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ غالباً ٹورنٹو میں۔ وہ اُس کی توقع سے زیادہ وقت زندہ رہی تھی۔ اُس نے اُس کے گھر کے کیے ہوئے کاموں کے تصور میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ نہ ہی اُسے کرنا تھا۔ ایسی چیزیں صرف خوابوں میں یاد کی جا سکتی ہیں۔ اُس وقت اُس کے احساسات خواہش سے زیادہ جوش سے بھرے تھے جیسے ابھی اُسے اپنا نامختتم کام مکمل کرنا ہو۔

بوٹی ڈُنڈی کی اُس عمارت میں انسانوں کا خیال رکھنے کی خاطر وہ اُن کے ماحول میں بہتری

لایا کہ عورتیں اُسے اپنا آشیانہ کہہ سکیں۔ (عام طور پر مرد کسی بھی بہتری یعنی کرایے میں اضافے پر برافروختگی کا اظہار کرتے تھے)۔ اُس نے عمدہ اخلاق آداب اور اعلیٰ مالیاتی ذہانت سے اُن کے ساتھ مذاکرات کر کے اُنھیں رضامند کیا اور وہ رہائش گاہ ایسا مقام بن گیا جہاں انتظار کرنے والوں کی ایک فہرست تھی۔ ''ہم اِس تمام عمارت کو بلا کسی ایک بھی جنونی کے بھر سکتے ہیں۔'' مالک نے کہا۔ لیکن جیکسن نے نشاندہی کی کہ جنھیں وہ جنونی کہتا ہے وہ عام طور پر اوسط درجے کے لوگوں کی نسبت اُکتائے ہوئے ہوتے ہیں اور اِس کے ساتھ ہی اقلیت میں بھی۔ وہاں ایک ایسی عورت بھی تھی کسی زمانے میں ٹورنٹو سمفنی میں گایا کرتی تھی اور ایک موجد بھی، جس کی قسمت نے اُس کی ایک ایجاد پر، اُس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور اَسّی برس کی عمر کو پہنچنے پر بھی اُس نے اپنا کام ترک نہیں کیا تھا۔ اور ایک ہنگری پناہ گزین اداکار جس کا لہجہ اب مروّج نہیں رہا تھا لیکن اب بھی دُنیا کے کسی کونے میں اُس کا ایک اشتہار چل رہا تھا۔ وہ سب کے سب خُوش اخلاق تھے، حتٰی کہ وہ بھی جو ہر روز دوپہر کو ''اپنی کیور بار'' جاتے اور بند ہونے تک وہیں رہتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ حقیقتاً معروف لوگ اُن کے دوست تھے جو شاذونادر ہی اُن سے ملنے آتے تھے۔ نہ ہی یہ گمان کرنا چاہیے کہ بونی ڈُنڈی میں کسی گرجا گھر کا کوئی کٹر و رعقیدے والا مبلّغ تھا البتہ بلاوے پر مبلّغ کام کے لیے آجاتا تھا۔

لوگ تب تک لازمی ٹھہرتے جب تک اُس کی موجودگی ضروری ہوتی۔

وہاں کینڈ یسے اور قونسی نامی ایک نوجوان جوڑے کو استثنا حاصل تھا۔ جس نے کبھی اپنا کرایہ ادا نہیں کیا اور آدھی رات کو کھسک جاتا تھا۔ جب وہ کمرے کی تلاش میں آئے تھے تو مالک خُود ہی انچارج کا کام کیا کرتا تھا اور وہ اپنے بُرے انتخاب کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتا کہ وہاں کے لیے ایک تر وتازہ چہرے کی ضرورت تھی۔ کینڈیسے کے چہرے کی نہ کہ اُس کے یار کے چہرے کی۔ یار نہایت احمق قسم کا تھا۔

گرما کے ایک دِن ایک میز کو پالش کرتے ہوئے جیکسن نے عقبی دوہرا دروازہ، جس سے سازوسامان کی ترسیل ہوتی تھی، ہَوا کی تھوڑی بہت آمدورفت کے لیے کھولا۔ وہ ایک خُوب صُورت میز تھی جو اُسے مفت میں مل گئی تھی کیوں کہ اُس کی تمام پالش اُڑ چکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ داخلی دروازے پر ڈاک رکھنے کے لیے وہ اچھی لگے گی۔

وہ دفتر سے نکلنے کے قابل اِس لیے ہوسکا تھا کہ وہاں موجود مالک کچھ کرایوں کی پڑتال کررہا تھا۔

سامنے والے دروازے کی گھنٹی ہلکی سی بجی۔ جیکسن برش صاف کرتے ہوئے جانے کے لیے تیار ہی تھا کیوں کہ اُس کے خیال میں ہندسوں کے گورکھ دھندے میں اُلجھا ہوا مالک شاید ہی تکلیف

کرنے کی زحمت کرے۔ لیکن سب ٹھیک تھا کہ اُس نے دروازہ کھلنے اور ایک عورت کی آواز سُنی۔ ایک ایسی آواز جو بُوھاپے کی قربت کے باوجود اب بھی قدرے دِلکشی رکھتی تھی، جس میں اب بھی وہ تیقّن موجود تھا کہ جو بھی سماعت کی زد میں آتا پسپا ہو جاتا۔

یہ سوچنے سے قبل اُسے خیال آیا کہ غالباً یہ خُوبی اُسے اپنے مبلّغ باپ سے ملی تھی۔

اُس نے بتایا کہ اُس کی بیٹی کے لیے یہ آخری جگہ بچی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی تلاش میں تھی۔ کینڈیسے اُس کی بیٹی تھی۔ وہ برٹش کولمبیا سے وہاں آئی تھی۔ کیلونا سے جہاں وہ اور لڑکی کا باپ رہتے تھے۔

الیانے۔ وہ عورت الیانے تھی۔

اُس نے دریافت کرتے سُنا کہ کیا وہ بیٹھ سکتی ہے۔ تب مالک نے اپنی — جیکسن کی — کرسی کھینچی۔

ٹورنٹو اُس کی توقع سے زیادہ گرم تھا اگرچہ وہ اونٹاریو سے آشنا تھی کہ وہ وہاں پلی بڑھی تھی۔

اُس نے درخواست کی کہ کیا اُسے پانی کا ایک گلاس مل سکتا تھا۔

اُس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں دے لیا تھا کہ اُس کی آواز نا قابلِ سماعت حد تک دھیمی پڑ گئی تھی۔ مالک ہال میں آیا اور اُس نے سیون اَپ نکالنے کے لیے مشین میں کچھ ریزگاری ڈالی۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ وہ کوک کی نسبت زیادہ زنانہ ہے۔

اُس نے کونے سے جیکسن کو گفتگو سُنتے دیکھا تو اُس نے اشارہ کیا کہ وہ، جیکسن معاملات کو سنبھالے کہ شاید وہی پریشان حال کرایہ داروں کو سنبھالنے کا ماہر تھا۔ لیکن جیکسن نے اپنا سر سختی سے نفی میں ہلا دیا۔ نہیں۔

وہ زیادہ دیر پریشان نہیں رہی۔

اُس نے مالک سے معذرت چاہی اور کہا کہ آج کی گرمی ایسے کرتب دِکھا سکتی ہے۔

اب کینڈیسے کے بارے میں۔ وہ ایک ماہ کے بیچ چھوڑ گئے تھے، شاید تین ہفتے قبل۔ آگے کا کوئی پتا نہیں تھا۔

''ایسے معاملات میں عام طور پر نہیں —''

''اوہ، بے شک میں سمجھ سکتی ہوں —''

جب یہ سب ہوا تو کچھ بُڑبُڑاہٹیں اور دبے قدموں چہل قدمی کی آوازیں آئیں۔ پھر ''میرا نہیں خیال کہ آپ مجھے وہ کمرہ دیکھنے سے روکیں گے جہاں وہ رہتے رہے ہیں —''

''اِس وقت کرایے دار موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ ہوتا تو بھی میرا خیال ہے کہ وہ رضامند نہ

ہوتا۔''

''بے شک۔ یہ مطالبہ ہی احمقانہ ہے۔''

''کیا کوئی ایسی چیز ہے جس میں آپ کی خصوصی دلچسپی ہو؟''

''اوہ نہیں ۔نہیں۔ آپ نے بہت مہربانی کی۔ میں نے آپ کا وقت لیا۔''

اب وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وہ چلنے لگے۔ دفتر سے باہر، سامنے والے دروازے کی طرف چند قدم۔ پھر دروازہ کھلا اور سڑک کا شور آنے لگا جس نے اُس کے، اگر اُس نے کہیں ہوں گے، الوداعی کلمات نگل لیے۔

تاہم وہ شکست کھا گئی تھی لیکن وہ وہاں سے باہر باوقار انداز میں نکلی ہوگی۔

جیسے ہی مالک واپس آیا جیکسن بھی اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔

''حیرت انگیز۔'' مالک نے یہی کہا تھا۔ ''ہمیں ہمارے پیسے مل گئے۔''

وہ بنیادی طور پر ایک، خصوصاً کسی کے ذاتی معاملات کے بارے میں، غیر متجسس نوع کا آدمی تھا۔ اُس کی اس خوبی کو جیکسن سراہتا تھا۔

بلا شبہ وہ اُسے دیکھنا پسند کرتا۔ اُس کے ذہن میں بیٹی کا زیادہ تصور نہیں تھا۔ اُس کے بال سنہرے لیکن رنگے ہوئے لگتے تھے۔ اگر چہ آج کل یہ بتانا مشکل ہوتا ہے، تاہم وہ بیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ مرد دوست کے نہایت زیر اثر۔ گھر سے بھاگی ہوئی، اپنی ادائیگیوں سے بھاگی ہوئی، ایک گھٹیا سی شے، اپنے مرد دوست کی خاطر اپنے والدین کا دل توڑنے والی۔

کیلونا کہاں تھا؟ مغرب میں کہیں۔ برٹش کولمبیا۔ تلاش کا ایک طویل سفر۔ بلا شبہ وہ ایک پُرعزم خاتون تھی۔

خوش گمان۔ غالباً یہ بات اب تک اُس کے لیے سچ تھی۔ اُس نے شادی کر لی تھی۔ لڑکی اُسی بیاہ کا نتیجہ تھا اور اِس بات نے جیکسن کو اُلٹا صدمہ پہنچایا تھا۔ اُس کے لیے اگلی بار یہ یقینی ہوگا کہ وہ ایسے کا شکار ہوگی نہ ہی لڑکی۔ وہ جب کافی کچھ حاصل کر لے گی تو گھر لوٹ جائے گی۔ شاید اُس کی گود میں ایک بچہ بھی ہو لیکن یہ سب بھی آج کل رواج بن چکا ہے۔

سن ۱۹۴۰ء کے کرسمس سے قبل ہائی سکول میں بغاوت ہو گئی۔ حتّٰی کہ وہ تیسری منزل تک پہنچ گئی جہاں ٹائپ رائٹروں اور جمع کرنے والی مشینوں کی کھٹا کھٹ عام طور پر نچلی منزل کے شور شرابا کو دبا کر رکھتی تھی۔ سکول کی بڑی عمر کی لڑکیاں وہاں ہوتی تھیں — وہ لڑکیاں جو پچھلے برس لاطینی، بیالوجی اور یورپی تاریخ پڑھ رہی تھیں، اب ٹائپ کرنا سیکھ رہی تھیں۔

اُن ہی میں سے ایک اِلیانے بشپ تھی جو ایک پادری کی بیٹی تھی۔ اُس کے والد کے یونائیٹڈ

چرچ میں کوئی بشپ نہیں تھا۔ جب اِلیانے نویں جماعت میں تھی تو وہ وہاں اپنے خاندان کے ہمراہ آئی تھی اور پانچ برسوں تک وہ، نشستوں کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہونے کی بنا پر، جیکسن ایڈمز کے پشت پر بیٹھتی رہی تھی۔ اُس وقت تک جیکسن کے غیر معمولی شرمیلے پن اور کم گوئی کو جماعت کا ہر فرد تسلیم کر چکا تھا لیکن اُس کے لیے یہ نئی چیز تھی اور اگلے پانچ برسوں میں اُس نے اُنھیں تسلیم نہ کرتے ہوئے پگھلا کر رکھ دیا۔ اُس نے اُس سے ربڑ، قلم کی نبیں اور جیومیٹری کے آلات اُدھار لیے، برف توڑنے کے لیے نہیں بل کہ فطرتاً وہ لاپرواہ تھی۔ اُنھوں نے مسائل کے جوابات کا تبادلہ کیا اور ایک دُوسرے کے پرچوں کی پڑتال کی۔ جب وہ سرِ راہ ملتے تو ایک دُوسرے کو خیر مقدمی کلمات کہتے جو حقیقتاً محض خیر مقدمی کلمات ہی نہ ہوتے ــ وہ ذومعنویت اور اثر انگیزی رکھتے تھے۔ اِس کے علاوہ وہ آپس میں کچھ مذاق بھی کرتے لیکن اُس کا کوئی زیادہ مطلب نہ ہوتا۔ اِلیانے شرمیلی لڑکی نہیں تھی لیکن وہ چالاک اور تنہا تھی اور زیادہ معروف بھی نہیں تھی اور یہی چیز جیکسن کے لیے مناسب تھی۔

بالائی منزل سے جب اِلیانے دُوسری لڑکیوں کے ہمراہ ہنگامہ دیکھنے آئی تو وہ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی کہ اُس کا سبب دو لڑکے تھے جن میں ایک جیکسن اور دُوسرا بِلی واٹس تھا۔ دونوں لڑکے جو محض ایک سال پہلے تک کُب نکالے اپنی کتابوں پر جھکے اور سعادت مندی سے ایک کمرۂ جماعت سے دُوسرے کی طرف جاتے تھے، اب فوجی وردی میں اپنی اصل جسامت سے دوگنے لگ رہے تھے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرنے پر، اُن کے مضبوط بُوٹ سفّاک شور برپا کر رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ اُس روز کی جماعتیں منسوخ ہو گئی ہیں کیوں کہ ہر شخص کو فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ وہ سب کو سگریٹیں بانٹ رہے تھے، حتّیٰ کہ فرش پر بھی پھینک رہے تھے، جہاں سے وہ لڑکے اُٹھا سکتے تھے جو شیو بھی نہیں بناتے تھے۔

لاپرواہ جنگجو، ہاؤ ہُو کرنے والے حملہ آور۔ حلق تک پیے ہوے۔

"میں بُزدل کھلاڑی نہیں ہوں۔" وہ چلّا رہے تھے۔

پرنسپل اُنھیں قابُو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یُوں کہ ابھی جنگ کا آغاز اور بھرتی ہو جانے والے لڑکوں کا کچھ خوف تھا تو کچھ اُن کا اجلال و اکرام کہ وہ کفن پوش ہو کر ایسا کہہ رہے تھے اور وہ ایک سال بعد جنتی، سنگ دِلی اب دِکھانے کا اہل نہیں تھا۔

"اب، اب۔" وہ بولا۔

"میں بُزدل کھلاڑی نہیں ہوں۔" بِلی واٹس نے اُسے کہا۔

غالباً جیکسن نے بھی یہی دُہرانے کے لیے اپنا مُنھ کھولا ہی تھا کہ اُسی لمحے اُس کی نظریں اِلیانے بشپ کی نظروں سے دوچار ہوئیں اور اُن کی نگاہوں میں ایک خاص آشنائی کا تبادلہ ہوا۔

لگتا تھا جیسے اِلیانے بشپ سمجھ گئی ہو کہ جیکسن واقعی نشے میں ہے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اُسی

نشے نے اُسے زیادہ نشے میں ہونے کی اداکاری کرنے کے قابل کر رکھا تھا۔لہٰذا نشے کا وہ مظاہرہ قابو کیا جا سکتا تھا۔(بِلی واٹس نشے میں مکمل طور پر دھت تھا)۔اِس ادراک کے ساتھ ہی اِلیانے مُسکراتی ہوئی سیڑھیوں سے اُتری اور اُس نے ایک سگریٹ قبول کر کے اپنی اُنگلیوں میں تھام لی۔اُس نے دونوں ہیروؤں کے بازوؤں میں اپنے بازو ڈالے اور اُنھیں مارچ کرواتی سکول سے باہر لے گئی۔

باہر نکلتے ہی اُنھوں نے اپنی اپنی سگریٹیں سلگالیں۔

بعد میں اِلیانے کے والد کے مذہبی اجتماع میں اِس بات پر اختلاف سامنے آیا۔کچھ کا خیال تھا کہ درحقیقت اِلیانے نے اپنی سگریٹ نہیں پی بلکہ محض لڑکوں کو مطمئن کیا تھا جب دُوسروں کا کہنا تھا کہ اُس نے یقیناً کش لیے ہیں۔

بِلی نے اِلیانے کے گرد اپنے بانہیں حمائل کر کے اُس کے ساتھ بوس و کنار کی کوشش کی لیکن وہ لڑکھڑا کر سکول کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور مُرغے کی طرح بانگیں دینے لگا۔دو سال کے اندر وہ مر گیا۔

اُس دوران میں اُسے گھر جانا تھا اور جیکسن نے اُسے تھاما تاکہ وہ اُس کے بازو اپنے کندھوں پر رکھ کر اُسے، اُس کے گھر لے جا سکیں۔خُوش قسمتی سے اُس کا گھر سکول سے زیادہ دُور نہیں تھا۔اُنھوں نے اُسے وہاں چھوڑا، سیڑھیوں سے اُترے اور باتیں کرنے لگے۔

جیکسن گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔کیوں؟''کیوں کہ اُس کی سوتیلی ماں وہاں موجود ہے۔''اُس نے بتایا۔وہ اپنی سوتیلی ماں سے نفرت کرتا تھا۔کیوں؟ بلا سبب۔

اِلیانے جانتی تھی کہ اُس کی ماں اُس وقت کار کے ایک حادثے میں چل بسی تھی جب وہ بہت چھوٹا تھا۔اُس کے شرمیلے پن کی کچھ وجہ یہ بھی تھی۔اُس نے سوچا کہ شاید شراب نوشی کی وجہ سے وہ مبالغے سے کام لے رہا ہے لیکن اُس نے اُسے اُس پر مزید بات کے لیے کہنے کی کوشش نہیں کی۔

''ٹھیک ہے۔''وہ بولی۔''تم میرے گھر ٹھیر سکتے ہو۔''

اتفاق سے اِلیانے کی ماں گھر پر موجود نہیں تھی۔وہ اُس کی بیمار نانی کی تیمارداری کے لیے گئی ہوئی تھی۔اِلیانے اپنے والد اور دو چھوٹے بھائیوں کی خاطر گھر کی دیکھ بھال الل ٹپو انداز میں کر رہی تھی۔یہ خُوش قسمتی کی بات تھی۔اُس کی ماں موجود ہوتی تو بھی بُڑبُڑ نہ کرتی البتہ وہ آنے جانے والوں کے بارے میں جاننا چاہتی اور دریافت کرتی کہ یہ لڑکا کون ہے؟ پھر یہ کہ وہ معمول کے مطابق اِلیانے کو سکول بھی بھیجتی۔

ایک فوجی اور ایک لڑکی اچانک ہی بہت قریب آ گئے تھے گو اِس تمام عرصے میں لوگر تھم اور گرامر کے سوا کچھ نہیں ہوا تھا۔

اِلیانے کے والد نے اُن پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔اُسے ایک پادری کی حیثیت سے مذہبی

خیالات میں زیادہ دلچسپی ہونا چاہیے تھی لیکن اُس کی زیادہ دلچسپی جنگ میں تھی اور اِس امر نے احساسِ تفاخر بخشا تھا کہ اُس کے گھر میں ایک فوجی آیا ہے۔ وہ اِس پر بھی خوش تھا کہ اپنی پادری والی تنخواہ میں وہ اپنی بیٹی کو سکول بھیجنے کے قابل نہیں تھا کیوں کہ اُسے اپنے بھائیوں کو بھجوانے کے لیے بھی کچھ رقم پس انداز کرنا پڑتی تھی۔ اِس چیز نے بھی اُسے نرم خُو کر دیا تھا۔

جیکسن اور الیا نے فلم دیکھنے جاتے نہ ہی رقص گاہ۔ وہ ہر طرح کے موسم میں اندھیرا پھیلنے کے بعد سیر کے لیے جاتے۔ کبھی کبھار وہ کافی پینے کسی ریستوران میں چلے جاتے لیکن کسی بھی شخص سے آشنائی نہ بڑھاتے۔ اُن کے ساتھ مسئلہ کیا تھا؟ کیا وہ ایک دُوسرے کی محبت میں گرفتار ہو رہے تھے؟

اِلیا نے خُود جیکسن کے گھر اُس کا بیگ لینے گئی۔ اُس کی سوتیلی ماں نے تیوریاں چڑھا کر اپنے مصنوعی دانت نکالے اور اُس کی طرف یُوں دیکھا جیسے وہ کوئی شرارت کرنے لگی ہو۔

اُس نے پُوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

''تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ اِس سامان کو دیکھو'' وہ بلند آہنگ قہقہے کے ساتھ بولی۔ اُس کی شہرت بڑبولی کی تھی لیکن لوگ کہتے تھے کہ اُس کا مقصد کسی کا دِل دُکھانا نہیں ہوتا۔ اِلیا نے خصوصاً نسوانی تھی اور اُس نے اُسے کم ہی اشتعال دِلایا۔

اُس نے جیکسن کو بتایا کہ اُس نے کیا اور کیسے مزاحیہ انداز میں کہا تھا لیکن وہ ہنسا نہیں۔

اُس نے معذرت کی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اپنے گھر میں بند رہ کر لوگوں کو حقیر جاننے کے عادی ہو۔'' اُس نے کہا۔

جیکسن نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔

اِس بار گھر سے نکلنا جیکسن کے لیے آخری بار ثابت ہوا۔ وہ ایک دُوسرے کو خط لکھتے رہے۔ اِلیا نے نے اُسے اپنی ٹائپنگ اور مختصر نویسی مکمل کرنے اور ٹاؤن کلرک کے دفتر میں ملازمت مل جانے کے بارے لکھا۔ اُس نے حقیر جاننے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کے باوجود وہ سکول کی نسبت اب ہر شے کا زیادہ مذاق اُڑانے لگی تھی۔ شاید اُس کا خیال تھا کہ محاذِ جنگ پر موجود شخص کو لطائف کی ضرورت ہوتی ہے۔

کلرک کے دفتر میں جلد بازی میں کی جانے والی شادیوں کو وہ ''دوشیزہ دُلھا'' کہہ کر پُکارتی۔ اور جب کبھی کوئی ہٹا کٹا پادری اُن کے گھر آتا اور اُسے علیحدہ کمرے میں سلایا جاتا تو وہ حیرت کا اظہار کرتی کہ اُس بستر پر شرارتی خواب تو آتے ہوں گے۔

جیکسن نے اِلیے ڈی فرانس پر لوگوں کے اژدحام اور یُو کی شکل والی کشتیوں سے گریزپا ہوتے ہوئے غوطہ خوری کے بارے میں لکھا۔ جب وہ انگلستان پہنچا تو اُس نے ایک بائیسیکل خریدی

اور اُس نے اُسے بتایا کہ وہ اُس پر، یہ جانچنے کے لیے کہ اُن پر پابندیاں تو نہیں، کن کن مقامات پر گیا۔

پھر اُسے ایک نقشہ دیا گیا جس کا مطلب تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر کن خطوط پر کام کرے گا (بلا شبہ اُس کی مراد ڈی۔ڈے (D-Day) کے بعد سے تھی)۔

یہ خطوط اِلیانے کے خطوط سے زیادہ غیر دلچسپ ہوتے تھے، جن پر وہ ہمیشہ دستخط کرتے ہوئے محبت کے ساتھ لکھتی تھی۔ جب ڈی۔ڈے آ پہنچا تو اِلیانے کے بقول وہ تکلیف دہ خاموشی والا دِن تھا لیکن وہ اِس کی وجہ سمجھ گئی تھی اور جب جیکسن نے دوبارہ لکھا کہ اگر چہ تفصیلات کا ذکر نا ممکن ہے تاہم سب ٹھیک ہے۔

اُس خط میں جیکسن نے یُوں بات کی جیسے وہ شادی کرنے جا رہی ہو۔

اور بالآخر وی ای ڈے (V-E Day) آیا اور گھر کی طرف گامزن ہوا۔اُس نے ذکر کیا کہ سر پر موسمِ گرما کے ستاروں کا جھرمٹ ہے۔

اِلیانے نے سِلائی سیکھ لی تھی۔ وہ اُس کی گھر آمد کی خُوشی میں نیا لباس تیار کر رہی تھی، لیموں رنگ والے مصنوعی ریشم کا ٹوپی شکل والے بازوؤں کا مکمل سکرٹ، جس پر نقلی سونے کے چمڑے کا تنگ بیلٹ بنایا گیا تھا۔اُس کا ارادہ اپنے موسمِ گرما والے ہیٹ کے گرد اسی سبز کپڑے کی پٹی چڑھانے کا بھی تھا۔

"تمھیں یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تم مجھے اچھی طرح دیکھو اور پہچان سکو اور ٹرین سٹیشن پر کسی اَور خُوب صُورت عورت کے ساتھ بھاگ نہ جاؤ۔"

جیکسن نے اُسے اپنا خط ہیلی فیکس کے ذریعے بھجوایا۔اُس نے بتایا کہ وہ ہفتے کی شام والی گاڑی سے آ رہا ہے۔اُس نے کہا کہ وہ اُسے خُوب یاد ہے اور اگر اُس شام ٹرین سٹیشن خُوب صُورت عورتوں سے بھرا ہوا تو بھی دھوکے سے کسی دُوسری عورت کو اُسے سمجھ لینے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

آخری شام وہ گھر کے باورچی خانے میں دیر تک بیٹھے رہے جہاں بادشاہ جارج ششم کی وہ تصویر لگی تھی جو اُس زمانے میں جگہ جگہ لگی ہوتی تھی اور جس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوتے تھے:

سال کے دروازے پر کھڑے شخص سے میں نے کہا۔" مجھے روشنی دے دو کہ میں انجانی دُنیا میں بہ حفاظت سفر کر سکوں۔"

اور اُس نے جواب دیا۔"اندھیرے میں جاؤ اور اپنا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں دے دو۔ روشنی کے بجائے یہ تمھارے لیے بہتر اور ایک جانے پہچانے راستے پر سفر کی نسبت زیادہ محفوظ ہوگا۔"

پھر وہ نہایت خاموشی سے بالائی منزل پر گئے اور وہ علاحدہ کمرے میں اپنے بستر پر چلا گیا۔ اِلیانے کی آمد، اُن کے مابین طے تھی لہٰذا وہ حیران نہیں ہوا۔

وہ ایک سانحہ تھا لیکن اُس نے ایسا روّیہ اختیار کیا جس سے لگتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتی ۔ اُس کے تکلیف دہ جذبات کے اظہار سے اَور بڑا سانحہ اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ جیکسن کے لیے اُسے کوشش سے روکنے یا وضاحت کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ کوئی لڑکی اتنا کم جانتی ہو؟ جب سب کچھ بخوبی ہو چکا تو بالآخر وہ علاحدہ ہو گئے۔ اگلی صبح اُس نے، اُس کے والد اور بھائیوں کی موجودگی میں اُسے خدا حافظ کہا۔ جلد ہی محبت بھرے خطوط کا آغاز ہو گیا۔ ساؤتھمپٹن میں اُس نے شراب پی اور ایک بار پھر کوشش کی۔ لیکن عورت بولی۔ ''مجھے میاں، بس کرو تم ہار گئے۔''

اُسے عورتوں کے پہناوے پسند نہیں تھے۔ دستانے، ہَیٹ سرسراتے سکرٹ، جو تمام کے تمام کچھ تقاضا اور دِق کرنے والے ہوتے تھے۔ لیکن وہ اِس بارے میں کیسے جان سکتی تھی؟ لیموں رنگ، جیکسن کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس رنگ کے بارے میں جانتا ہے۔ اُس کا نام تیزاب جیسا تھا۔

پھر اُسے بہ آسانی ادراک ہوا کہ کوئی شخص وہاں نہیں ہو سکتا۔

کیا وہ اپنے آپ یا کسی اَور کو بتائے گی کہ اُسے تاریخ میں غلطی لگی ہے؟ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ جھوٹ سے کام لے گی ۔ آخر وہ حربہ ساز تھی۔

اب جب کہ وہ جا چکی تھی جیکسن کے دِل میں اُسے دیکھنے کی خواہش جاگی۔ پریشانی کے عالم میں بھی اُس کی آواز معجزانہ طور پر تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اپنی تمام تر اہمیت کو اُجاگر کرتی اور موسیقائی اثرات رکھتی ہوئی۔ وہ مالک سے کبھی دریافت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کیسی لگ رہی تھی، کیا اب بھی اُس کے بال گھنے سیاہ تھے یا سفید پڑ گئے تھے، اور اُسے جھرّیاں پڑ گئی تھیں یا وہ فربہ ہو گئی تھی۔ اُس نے لڑکی پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی سوائے اِس کے کہ اُسے، اُس کا آشنانا پسند تھا۔

اُس نے شادی کر لی تھی۔ تب تک اُس نے بچّی کو خود پالا تھا اور یہ عام بات نہیں تھی۔ اُس کا خاوند خُوش حال ہو گا اور اُس کے اَور بھی بچے ہوں گے لیکن وہ اُس کی چہیتی ہو گی۔

اِس قسم کی لڑکیاں لوٹ آتی ہیں۔ گھر سے باہر رہ کر وہ اپنے آپ کو تباہ کر لے گی۔ وہ جب ضروری سمجھے گی لوٹ آئے گی۔ حتّٰی کہ ماں — اِلیانے — کیا اُس نے اِس طرح اُس کا ماحول خراب نہیں کیا کہ وہ کسی نہ کسی طور دُنیا کو سنبھال لیتی اور جس چیز کو مناسب خیال کرتی اپنا لیتی جیسے کہ زیادہ عرصے تک کوئی شے اُسے ناکامی سے دوچار نہیں کر سکتی؟

اگلے روز اُسے یہ اطمینان حاصل تھا کہ کبھی اُس کی زندگی میں آنے والی عورت جا چکی ہے۔ وہ یہ جگہ جانتی تھی اور واپس آ سکتی تھی۔ وہ وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کر سکتی تھی۔ سڑکوں پر آتے جاتے یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ راستہ کہاں گم ہے۔ اپنے شکستہ، چاپلوسانہ لہجے اور منکسرانہ انداز میں، جو حقیقتاً منکسرانہ نہ ہوتا، لوگوں سے پُوچھ کچھ کرتی۔ اِس کا امکان تھا کہ اُس کا آمنا سامنا ٹھیک دروازے پر ہی

ہو جاتا۔

معاملات پر قفل ڈالا جا سکتا تھا جس کے لیے بس ارادے کی کچھ پختگی درکار تھی۔ جب وہ اِتنا کم عمر تھا کہ بمشکل چھے یا سات برس کا ہو اُس نے اپنی سوتیلی ماں کی حماقت کو تالے میں بند کر دیا تھا جسے وہ اُسے نہلاتے ہوئے اپنی بے وقوفی یا پریشانی کہتی تھی۔ وہ اندھیری گلی میں بھاگ نکلا اور وہ اُسے اندر لائی لیکن وہ جان گئی کہ اگر وہ اُسے نہ روکتی تو وہ واقعی بھاگ نکلتا۔ اِسی لیے اُس نے اُسے روک لیا تھا۔ اُس نے اُسے کہا کہ یہ مذاق نہیں ہے کیوں کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کوئی اُس سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ جانتی تھی وہ اُس سے نفرت کرتا ہے گو اُسے، اُس کی پرواہ نہیں تھی اور اُس نے اُسے روک لیا تھا۔

اُس نے بونی ڈُنڈی نامی عمارت میں تین راتیں اور گزاریں۔ اُس نے مالک کے لیے ہر اپارٹمنٹ کا حساب کتاب لکھا کہ کس کے ذمے کیا اور کب واجب الادا ہے۔ یہ اشارہ دیے بغیر کہ کیوں اور کہاں اُس نے بتایا کہ اُسے بلایا گیا ہے۔ اُس نے اپنا بینک کا کھاتہ خالی کیا اور اپنی چند ایک چیزیں باندھ لیں۔ شام کو، دیر سے، اُس نے ٹرین پکڑی۔ وہ سو گیا اور رات کو، خواب کے اُن ٹکڑوں کے دوران میں، اُس نے مینونائٹس لڑکوں کو اپنے چھکڑے پر جاتے دیکھا۔ اُس نے اُنھیں میٹھی بچگانہ آواز میں گاتے سُنا۔

یہ پہلے بھی اُسے خوابوں میں دِکھائی دیا تھا۔

اگلی صبح وہ کیپوسکاسنگ (Kapuskasking) میں اُتر گیا۔ اُسے کارخانوں کی بو آئی اور ٹھنڈی ہَوا نے فرحت بخشی۔

vvvv

۱؎ Jersy: ایک چھوٹی قامت کی گائے جو ہلکے بھورے رنگ کی ہوتی ہے لیکن بہت گاڑھا دودھ دیتی ہے جس سے خاصی بالائی حاصل ہوتی ہے۔

۲؎ Vestry: گرجا گھر کا وہ کمرہ جسے پادری دفتر یا ادائیگیِ رسوم والا مخصوص لباس زیب تن کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سویتلانا الیگزائی وِچ

(SVETLANA ALEXIEVICH)

نوبیل انعام برائے ادب ۔۲۰۱۵ء سے بیلارس (رُوس) کی صحافی خاتون سویتلانا الیگزائی وِچ کو سرفراز کیا گیا ہے کہ ''اُن کی تحریریں ہمارے عہد کی گوناں گوں صوتوں کی حامل یادگار تحریریں ہے۔'' انعام کا اعلان کرتے ہوے نوبیل پرائز کمیٹی نے الیگزائی وِچ کی ان الفاظ میں تحسین کی: ''اُن کا اُسلُوب غیر معمولی ہے-- انسانی آوازوں کا احتیاط سے ترتیب ہوا کولاژ-- جو ایک پُورے عہد کے ہمارے فہم کو گہرا کرتا ہے۔'' الیگزائی وِچ ادب کا نوبیل پانے والی چودھویں اور رُوس کی پہلی لکھاری خاتون ہیں ۔ اِس سے قبل رُوس کے کسی لکھاری یا ادیب کو اِس اعزاز سے نہیں نوازا گیا ۔ الیگزائی وِچ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ دُنیا بھر کے مرد و زن صحافیوں نوبیل انعام پانے والی پہلی صحافی ہیں۔

سویتلانا کا پُورا نام سویتلانا الیگزینڈر روفنا الیگزائی وِچ ہے ۔ وہ ۳۱ - مئی ۱۹۴۸ء کو مغربی یوکرین کے شہر سٹانسلاوِف (جس کا نام ۱۹۶۲ء میں تبدیل کر کے ایوانوفرانک فسک رکھ دیا گیا تھا) میں پیدا ہوئیں ۔ اُن کے والد کا تعلق بیلارس سے تھا جب کہ ماں یوکرینی تھیں ۔ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، بیلارسٹین سٹیٹ یونیورسٹی سے گریجوایشن کرنے اور منسک کے ادبی جریدے ''نیمان'' (Neman) کی نامہ نگار بننے سے قبل، اُنھوں نے بہت سے مقامی اخبارات کے نمائندے کی حیثیت سے کام کیا۔ اُنھوں نے اپنی صحافتی زندگی کے دوران رُوس کے بہت سے ڈرامائی واقعات کے، مثلاً دُوسری جنگِ عظیم، رُوس افغانستان جنگ اور سانحۂ چرنوبل، عینی شاہدین کے انٹرویو قلم بند کیے۔ لُوکاشینکو انتظامیہ کے سیاسی جبر و استحصال کے بعد سال ۲۰۰۰ء میں اُنھوں نے بیلارس کو داغِ مفارقت دے دیا۔ اُنھیں پناہ گزینوں کے عالمی شہروں نے پناہ کی پیشکش کی اور اُنھوں نے ۲۰۱۱ء تک کا عرصہ پیرس، گوتھن برگ اور برلن میں بسر کیا۔ ۲۰۱۱ء میں وہ منسک لوٹ آئیں۔

الیگزائی وِچ اپنے وطن بیلارس سے زیادہ دُنیا بھر میں معروف ہیں ۔ اُن کی کتب کو سوویت اور سوویت ٹُوٹنے کے بعد کی جذباتی تاریخ گردانا جاتا ہے جسے محتاط طریقے سے انٹرویوز کے کولاژ میں بیان کیا گیا ہے ۔ رُوسی مصنف اور نقاد دِمتری بائیکوف کے مطابق اُن کی کتابوں میں بہت سے خیالات و نظریات بیلارس کے لکھاری ایلس ایڈمووِچ سے مستعار لیے گئے ہیں جن کا خیال تھا کہ بیسویں صدی کی ہولناکیوں کو بیان

کرنے کے لیے افسانوی تخلیقات سے زیادہ بہترین راستہ گواہوں کے بیانات کی قلم بندی ہے۔ بیلارس کے شاعر اُلادزمیر نیاکلیایوف نے ایدموویچ کو 'الیگزائی ویچ کا جدِ امجد' قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے ایدموویچ کے دستاویزی ناول 'میں جلے ہوے گاؤں سے آیا ہوں' کا حوالہ دیا ہے جس میں نازی فوجی دستوں نے بیلارس پر قبضے کے دوران اُلادزمیر کالیس بنک اور جانکابرل نامی گاؤوں کو آگ لگا دی تھی کہ یہ واحد کتاب ہے جس نے ادب کی سمت الیگزائی ویچ کے رویے پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ الیگزائی ویچ نے خود بھی ایدموویچ کے اثر کو تسلیم کرتے ہوے اضافہ کیا کہ وہ بیلارس کے ایک اور لکھاری واسل بائی کاؤ سے بھی متاثر ہیں۔

الیگزائی ویچ کی انگریزی میں صرف تین کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں: Zinky Boys: Soviet Voices from Afghanistan War (یہی کتاب Zinky Boys: Soviet Voices from Forgotten War کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے)، War's Unwomanly Face، اور بے حد پذیرائی حاصل کرنے والی کتاب Voices from Chernobyl۔ اپنی تخلیقات کے بارے میں الیگزائی ویچ کہتی ہیں:

''اگر ہماری تمام تاریخ پر نظر ڈالی جائے، سوویت اور مابعد سوویت دونوں پر تو وہ ایک وسیع و عریض اجتماعی قبر اور خون میں نہائی ہوئی تاریخ ہے، جو ظالموں اور مظلوموں کا دائمی نوحہ ہے۔ ستم رسیدہ روسی سوال کرتے ہیں کہ کیا کیا جائے اور کس پر الزام دھرا جائے: انقلاب پر، جبری مشقت کے کیمپوں پر (gulag: ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران سوویت یونین میں جبری مشقت کے کیمپ بنائے گئے تھے جن میں بے شمار لوگ مر گئے تھے۔ مترجم)، جنگِ عظیم دوم پر، عوام سے خفیہ رکھی جانے والی سوویت افغان جنگ پر، عظیم سلطنت کے انہدام پر، عظیم اشتراکی ملک کے زوال پر، مثالی سرزمین پر اور اب آفاقی مسئلے چرنوبل پر۔ ایسا مسئلہ جو روے ارض کے تمام جان داروں کا مسئلہ ہے۔ یہ ہماری تاریخ ہے۔ یہی میری تخلیقات ہیں اور یہی میرا راستہ ہے۔''

الیگزائی ویچ کی پہلی کتاب ''War's Unwomanly Face'' ۱۹۸۵ء میں منصۂ شہود پر آئی جو اُن لاکھوں خواتین کا تذکرہ کرتی ہے جنھوں نے ریڈ آرمی میں شمولیت اختیار کر کے فوج کے شانہ بہ شانہ جنگ لڑی لیکن اُن کا کبھی نام تک نہیں لیا گیا۔ یہ کتاب ناول کی صورت میں ہے جس میں عورتوں کو خود کلامی کے ذریعے جنگِ عظیم دوم کے اُن پہلوؤں کے بارے میں باتیں کرتے دکھایا گیا ہے جن کا پہلے کبھی تذکرہ نہیں ہوا۔ اِس کے متعدد ایڈیشن بہت سے ناشروں نے شائع کیے اور یہ کتاب لاکھوں کی تعداد فروخت ہوئی۔ الیگزائی ویچ نے ۲۰۰۲ء میں اِس پر دوبارہ کام شروع کیا اور سینسر کی زد میں آنے والے حصوں کو دوبارہ شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن چیزوں کو بھی شامل کیا جنھیں شامل کرنے کا وہ پہلے حوصلہ نہیں کر سکی تھیں۔ دُوسری کتاب ''The Last Witness: The Book of Childlike Stories'' زمانۂ جنگ کے بارے میں بچوں کی ذاتی یادوں کا احاطہ کرتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کی آنکھوں کے ذریعے جنگ کو دیکھنے کے عمل نے احساسات و

جذبات کے نئے دَر وَا کیے ہیں۔"Zinky Boys: Soviet Voices from Forgotten War" ۱۹۹۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی جو افغانستان کے میدانِ جنگ سے جستی تابوتوں میں آنے والے فوجی جوانوں کے بارے میں ہے۔ ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والی کتاب "Enchanted With Death" سوویت یونین کے انہدام پر خودکشی کرنے والوں کے متعلق ہے۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو اشتراکیت سے جُدا کر سکے نہ ہی نئے نظامِ حیات کو قبول کر پائے۔ ۱۹۹۳ء کے بعد بیلارس کے سرکاری نشر و اشاعت کے اداروں نے اُن کی کتب چھاپنا بند کر دیں۔ تاہم نجی اداروں نے اُن کی دو اَور کتب "Voices From Chernobyl" ۱۹۹۹ء میں اور "Second Hand Time" ۲۰۱۳ء میں شائع کیں۔

ناقدین کا خیال ہے کہ "وہ ایک صحافی ہے جج نہیں۔ وہ کہانیاں سنا کر فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتی ہیں۔" نوبیل انعام کے اعلان کے بعد الیگزائی وچ نے اُنھیں ملنے والے نوبیل انعام کے متنازعہ ہونے اور سیاسی عمل دخل کا کرشمہ قرار دینے والی خبروں پر سوالات کے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ اُن سے فون پر بیلارس کے صدر الیگزینڈر رُلو کاشینکو یا حکام میں سے کسی نے فون تک نہیں کیا اور وہ یُوں ظاہر کر رہے ہیں جیسے "وہ عدم وجود ہے" اور "بیلارس یورپ کی آخری آمریت ہے۔" تاہم نوبیل انعام ۲۰۱۵ء متنازعہ ہے کیوں کہ غیر افسانوی نثر نگار کو نوبیل انعام برائے ادب دیے جانے کا یہ پہلا موقع ہے۔

زیرِ نظر تحریروں کا انتخاب سویتلانا کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "Voices From Chernobyl" سے کیا گیا ہے۔ یہ تحریریں دراصل ۱۹۸۶ء میں چرنوبل کے ایٹمی گھر میں آگ لگنے اور ایٹمی دھماکوں کے نتیجے میں تابکاری سے متاثرین کے ۱۹۹۶ء میں لیے گئے انٹرویو ہیں جنھیں سویتلانا خود کو پس منظر میں رکھتے ہوئے، تاہم کہیں کہیں اپنی جھلک بھی دکھاتے ہوئے، افسانوی انداز میں ضبطِ تحریر میں لائی ہیں۔ ستم رسیدگی کی یہ داستانیں درحقیقت انسان کی سائنس کی ترقی کے نام پر اپنے ہی ہاتھوں زمین پر زندگی کی تباہ و بربادی اور قلع قمع کی داستانیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ نوبیل انعام برائے ادب کی حق دار قرار پائی ہیں۔

سویتلانا الیگزائی وچ کو آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اُن ہی آوازوں کو اپنی لکھتوں میں بیان کیا ہے۔ نوبیل انعام کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اُن آوازوں اور اپنے فن و فکر کا ذکر اپنے نوبیل خطبے "ہاری ہوئی جنگ" میں یُوں کیا۔

"اِس چبوترے پر میں تنہا نہیں کھڑی ہوں...... میرے چاروں طرف آوازیں ہیں، سینکڑوں آوازیں جو بچپن ہی سے میرے ساتھ رہی ہیں۔ میں دیہی علاقے میں پلی بڑھی۔...... اپنے گھروں کے آس پاس بنچوں پر جمع ہو جانے والی عورتوں کی آوازیں۔ اُن کے خاوند تھے نہ باپ اور بھائی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد ہمارے گاؤں میں ایک بھی مرد تھا۔...... مجھے بس اِتنا یاد ہے کہ وہ عورتیں محبت کی باتیں کرتی تھیں۔ اپنی محبوب ہستیوں کے جنگ پر روانگی سے ایک روز قبل خُدا حافظ کہنے کے قصّے سُنایا کرتیں اور اُن

کے انتظار کی باتیں کرتی تھیں — سال ہا سال بیت گئے لیکن وہ اُن کی منتظر ہیں۔ ..... فلابرٹ خُود کو انسانی قلم کہا کرتا تھا، میں کہتی ہوں کہ میں انسانی سماعت ہوں۔ جب میں سڑک سے گُزرتی ہوں تو میری سماعت الفاظ، جملے اور آہ و بکا سُنتی ہے۔ میں ہمیشہ سوچتی ہوں — کتنے ہی ناول گُم ہو گئے! اندھیروں میں کھو گئے۔ ہم نے ادب میں گفتگو کے پہلو کے کو پکڑا ہی نہیں۔ ہم اِس رُخ کو پسند ہی نہیں کرتے، اِس پر متحیر ہوتے ہیں نہ حظ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اِس پہلو نے مجھے تو مسحور کر رکھا ہے بل کہ اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ ..... میں نے پانچ کتابیں لکھیں ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ پانچوں دراصل ایک ہی کتاب ہے۔ مثالی دُنیا کے بارے میں ایک کتاب۔ ..... میں روزمرہ احساسات، خیالات، الفاظ اور اپنے عہد کی زندگی کو جمع کرتی ہوں۔ مجھے رُوح کی تاریخ سے دلچسپی ہے۔ رُوح کی روزمرہ زندگی، وہ چیزیں یا حسرتیں جن سے تاریخ کی دیوہیکل تصویر صرفِ نظر کرتی ہے۔ میں تاریخ کے پوشیدہ پہلوؤں پر کام کرتی ہوں۔ مجھے اب بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ میں جو کچھ لکھتی ہوں وہ ادب نہیں ہے، دستاویز ہے۔ آج ادب کیا ہے؟ اِس سوال کا جواب کون دے گا؟ اب ہم پہلے سے زیادہ برق رفتار زندگی بسر کر رہے ہیں ..... ہر شے اپنی حد سے تجاوز کر گئی ہے، موسیقی اور مصوری بھی — یہاں تک کہ دستاویزی الفاظ بھی دستاویز کی حدود و قیود سے نکل گئے ہیں۔ حقیقت اور افسانے میں کوئی سرحد نہیں رہی۔ دونوں ایک دُوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ ..... کہانی لکھنے میں مجسمہ ساز کی سی کشتی لڑنا پڑتی ہے۔ ..... مجھے چھوٹے لوگوں میں دلچسپی ہے۔ چھوٹے لیکن جنھیں میں عظیم لوگ کہوں گی کیوں کہ لاچاری وسعتِ قلبی دیتی ہے۔ میری کتابوں میں یہ لوگ اپنی باتیں کرتے ہیں، چھوٹی سے چھوٹی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ بڑی تاریخ بھی چلتی ہے۔ ہمارے پاس اِتنا وقت نہ تھا اور نہ ہے کہ سمجھ پاتے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے ..... یہ کم و بیش میری وہ گفتگوئیں ہیں جو میری اپنے مرکزی کرداروں سے کسی نہ کسی طرح ہوئیں۔ بلاشبہ، لوگ اپنے فارغ وقت میں باتیں کرتے تھے۔ اُن کے پاس باتوں کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ تاہم انسانی رُوح تک رسائی مشکل ہے کیوں کہ ٹیلی ویژن اور اخبار سدِ راہ ہیں اور یہی اِس صدی کے توہمات، بغض اور گُمراہیاں ہیں۔ ..... لوگ تو اپنے کرتوتوں بھگت رہے ہیں لیکن جانور، پرندے، مچھلیاں — انھوں نے کیا کِیا ہے؟ ..... میں نے خُود دیکھا ہے کہ ہتھیار خُوب صُورت ہیں: مشین گنیں، سُرنگیں، ٹینک۔ انسان نے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے خُوب غور و خوض سے کام لیا ہے۔ یہی سچائی اور خُوب صُورتی کے درمیان نزاع ہے۔ ..... میں افغانستان کے ایک ہسپتال میں زخمی بچّوں کو تحائف دینے گئی۔ ..... میرے پاس پانچ کھلونا ریچھ بھی تھے۔ ..... ایک نوجوان عورت اپنے بازوؤں میں ایک بچّہ اُٹھائے میری طرف بڑھی۔ وہ پچھلے دس برسوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں نے ایک کھلونا بچّے کو دیا جسے اُس نے اپنے مُنھ سے پکڑا۔ ..... بچّے کے دونوں بازو نہیں تھے۔ مجھ سے دریافت کیا جاتا ہے: ہم ہمیشہ المیہ ہی کیوں لکھتے ہیں؟ کیوں کہ ہم ایسی ہی زندگی جیتے ہیں۔"

VVVV

تنہا انسانی پُکار
(A Solitary Human Voice)

مجھے نہیں پتا کہ میں کس کے بارے میں بات کروں ۔۔۔ موت کے متعلق یا محبت کے بارے میں؟ یا یہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں؟ میں دونوں میں سے کس کے بارے میں بات کروں؟

ہمارا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ ہم اب تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے تھے، چاہے ہم صرف دُکان تک ہی جا رہے ہوتے۔ میں اُس سے کہتی: ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' لیکن اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ کتنی۔ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا......

ہم فائر سٹیشن کی، جہاں وہ کام کرتا تھا، اقامت گاہ میں دُوسری منزل پر رہتے تھے۔ وہاں تین اُور نوجوان جوڑے بھی رہ رہے تھے۔ ہم سب ایک ہی باورچی خانہ استعمال کرتے تھے۔ پہلی منزل پر وہ ٹرک کھڑے کرتے تھے۔ آگ بجھانے والے دوسُرخ رنگ کے ٹرک۔ یہی اُس کا کام تھا۔ مجھے ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے ــ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟

ایک رات میں نے شور سُنا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ ''کھڑکی بند کرلو اور جا کر دوبارہ سوجاؤ۔ ایٹمی گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

میں نے خُود دھماکہ نہیں دیکھا تھا۔ صرف شعلے اُٹھتے دیکھے تھے۔ ہر شے روشن اور چمک دار ہو رہی تھی ــ سارا آسمان بھی۔ فلک بوس شعلہ اور دھواں ــ حدت ناقابلِ برداشت تھی۔ اور وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔

جلتی ہوئی رَال سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جس نے چھت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے بعد میں بتایا کہ یُوں لگ رہا تھا جیسے دھواں کولتار پر چل رہا ہو۔ اُنھوں نے آگ بجھانے کی بہت کوشش کی۔ اُنھوں نے جلتی ہوئی رَال پر اپنے پیر مارے...... وہ اپنے کرمچ کے پہیوں والے جوتے پہنے ہوئے نہیں تھے۔ وہ جس حالت میں تھے اُسی میں چلے گئے تھے، اپنی بے آستینوں قمیصوں ہی میں۔ کسی نے اُنھیں بتایا ہی نہیں تھا۔ اُنھیں تو محض آگ بجھانے کے لیے بُلایا گیا تھا، بس۔

چار بج گئے۔ پانچ اور پھر چھے۔ چھے بجے ہمیں اُس کے والدین کے ہاں جانا تھا۔ آلو بیجنے کے لیے۔ پرپیات سے سپیری زہیے تک چالیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا، جہاں اُس کے والدین رہتے

تھے۔کھیتی باڑی۔اُسے بہت پسند تھی۔اُس کی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کیوں نہیں چاہتے تھے کہ وہ شہر جاتے۔یہاں تک کہ اُنھوں نے اُس کے لیے ایک نیا گھر بھی تعمیر کیا تھا۔اُس کا نام فوج میں درج کرلیا گیا تھا۔اُس نے ماسکو کی فائر بریگیڈ میں خدمات سرانجام دی تھیں اور جب لوٹا تو بھی وہ فائر مین ہی بننا چاہتا تھا۔[خاموشی۔]

بعض اوقات مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اُس کی پُکار سُنائی دے رہی ہو۔جیتی جاگتی پُکار۔حدیہ کہ اُس کی تصویر بھی مجھے پر اُتنا اثر نہیں کرتی جتنی وہ پُکار۔لیکن وہ مجھے کبھی نہیں پُکارتا......میرے خوابوں تک میں نہیں۔بس میں ہی اُسے پُکارتی پھرتی ہوں۔

سات بجے۔مجھے سات بجے بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔میں اُدھر دوڑی لیکن پولیس نے پہلے ہی سے ہسپتال کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ کسی کو اندر جانے نہیں دے رہے تھے۔صرف ایمبولینسیں جا سکتی تھی۔پولیس والے چلّا رہے تھے:ایمبولینسوں پر تابکاری کے اثرات ہیں،دُور رہو! وہاں میں تنہا نہیں تھی۔وہ تمام بیویاں پہنچ چکی تھیں جن کے شوہر اُس رات ایٹمی گھر میں تھے۔میں ایک دوست کو تلاش کرنے لگی جو اُس ہسپتال میں ڈاکٹر تھی۔جب وہ ایک ایمبولینس سے باہر نکلی تو میں نے اُس کا سفید کوٹ پکڑ کر کھینچا۔"مجھے اندر جانے دو!""میں یہ نہیں کر سکتی۔اُس کی حالت بُری ہے۔اُن سب ہی کی حالت خراب ہے۔"میں مصر رہی۔"بس اُسے دیکھ لینے دو!""ٹھیک ہے۔"وہ بولی۔"میرے ساتھ آؤ۔صرف پندرہ یا بیس منٹ کے لیے۔"

میں نے اُسے دیکھا۔وہ سارے کا سارا سُوجا اور پھُولا ہوا تھا۔صرف اُس کی آنکھیں دِکھائی دے رہی تھیں۔

"اُسے دُودھ کی ضرورت ہے۔بہت سارے دُودھ کی۔"میری دوست نے کہا۔"اُن میں سے ہر ایک کو کم از کم تین لیٹر دُودھ پلانا چاہیے۔""لیکن وہ تو دُودھ پسند نہیں کرتا۔""اب وہ پیے گا۔" اُس ہسپتال کے بہت سے ڈاکٹر اور نرسیں،اور خاص طور پر وہاں کی چھوٹی نرسیں،بیمار پڑ جائیں گی اور اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔لیکن اُس وقت ہم یہ بات نہیں جانتے تھے۔

صبح دس بجے کیمرا مین شِشنے نوک چل بسا۔وہ پہلے دِن کی پہلی موت تھی۔ہمیں پتا چلا دُوسری موت ملبے تلے رہ جانے والے۔والیرا خود یے چک۔کی تھی۔وہ اُس تک کبھی نہیں پہنچ پائے۔اُنھوں نے اُسے کنکریٹ تلے ہی دفنا دیا تھا۔تب ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف وہی پہلی اموات ہیں۔

میں نے پُوچھا۔"واسیا،میں کیا کروں؟""یہاں سے نکل جاؤ!جاؤ!تمھارے پاس ہمارا بچّہ ہے۔"لیکن میں اُسے کیسے چھوڑ دیتی؟وہ مجھ سے کہہ رہا تھا:"جاؤ!چلی جاؤ!بچّے کو بچاؤ۔""پہلے

میں تمھارے لیے کچھ دُودھ لاتی ہوں، پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔''میری دوست تانیا کپے نوک دوڑتی ہوئی اندر آتی ہے۔ اُس کا خاوند بھی اُسی کمرے میں ہے۔ اُس کا باپ بھی ہم راہ ہے جس کے پاس اپنی کار ہے۔ ہم کار میں سوار ہو کر دُودھ لینے نزدیکی گاؤں چلے جاتے ہیں جو قصبے سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم تین تین لیٹر والی بوتلوں کے چھے خوشے خریدتے ہیں تا کہ سب کے لیے کافی ہو۔ لیکن وہ دُودھ سے اُلٹیاں کرنے لگتے ہیں۔ وہ پاس سے گُزرتے رہے، اُنھوں نے ٹی وی چلا لیے۔ ڈاکٹر یہ بتانے میں لگے رہے کہ وہ زہریلی گیس سے متاثر ہوئے ہیں۔ تابکاری کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔ اور آناً فاناً قصبہ فوجی گاڑیوں سے بھر جاتا ہے۔ اُنھوں نے تمام راستے بند کر دیے۔ ٹرالیاں اور ٹرینیں تک چلنا بند ہو گئیں۔ وہ سڑکوں کو کسی سفید پاؤڈر سے دھو رہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ اگلے روز کے لیے مزید تازہ دُودھ خریدنے گاؤں کیسے جاؤں گی۔ کسی نے بھی تابکاری کے بارے میں بات تک نہیں کی۔ صرف فوجی جراحی والے نقاب اُڑسے ہوئے تھے۔ قصبے کے لوگ دُکانوں سے روٹیاں لے جا رہے تھے، کھلی ہوئی بوریوں میں جن میں صرف روٹیاں ٹھونسی ہوئی تھیں۔ لوگ طشتریوں میں کپ کیک کھا رہے تھے۔

اُس شام میں ہسپتال میں داخل نہیں ہو پائی۔ وہاں لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں اُس کی کھڑکی کے نیچے کھڑی تھی کہ وہ آیا اور اُس نے پکار کر مجھ سے کچھ کہا۔ نہایت مایوس کُن بات تھی۔ ہجوم میں سے کسی نے اُس کی بات سُن لی تھی۔ اُسی رات اُنھیں ماسکو لے جایا جا رہا تھا۔ ہمیں ہمارے شوہروں کے ساتھ جانے دیا جائے! تمھیں اِس کی اجازت نہیں! ہم نے گھونسے چلائے اور نوچا۔ فوجیوں نے۔ فوجی وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ اُنھوں نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ پھر ڈاکٹر باہر آیا اور بولا: ٹھیک ہے۔ وہ ماسکو جہاز کے ذریعے جا رہے تھے لیکن ہمیں اُن کے کپڑے لانے تھے۔ وہ جو کپڑے نیوکلیائی مرکز میں پہن کر گئے تھے وہ جل چکے تھے۔ بسیں پہلے ہی چلنا بند تھیں اور ہم شہر میں دوڑیں لگا رہی تھیں۔ ہم اُن کے بیگ لیے بھاگتی ہوئی واپس آئیں تو جہاز جا چکا تھا۔ اُنھوں نے ہمارے ساتھ چھل کھیلا تھا تا کہ ہم چیخنا چلّانا اور رَونا دھونا نہ کریں۔

رات کا وقت ہے۔ سڑک کے ایک جانب بسیں ہیں، سینکڑوں بسیں۔ وہ قصبہ خالی کرنے کے لیے تیار کھڑی ہیں اور دُوسری جانب آگ بجھانے والے سینکڑوں ٹرک۔ وہ ہر شہر سے آئے ہیں۔ اور پُوری سڑک سفید جھاگ سے بھری پڑی ہے۔ ہم بس بددُعائیں دیتے اور رَوتے پیٹتے جھاگ پر چل رہے ہیں۔ ریڈیو پر وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ تین سے پانچ روز تک کے لیے شہر خالی کروا سکتے ہیں، اپنے گرم کپڑے ساتھ لے لیں، تمھیں ایک جنگل میں رہنا پڑے گا، تنبوؤں میں۔ اِس پر بھی لوگ خُوش

ہیں — کیمپوں والا ایک تفریحی دورہ! ہم مے ڈے اس طرح منائیں گے۔ روزمرّہ کی زندگی سے ایک وقفہ۔ لوگ تکّے کباب تیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے گٹار ہم راہ لے لیتے ہیں، اپنے ریڈیو بھی۔ صرف وہ عورتیں رو پیٹ رہی تھیں، جن کے خاوند ایٹمی گھر میں تھے۔

مجھے اپنے والدین کے گاؤں سے باہر کوئی سفر یاد نہیں۔ یوں لگتا ہے گویا میں نے نیند سے اُٹھ کر اپنی ماں کو دیکھا۔ ''امّی، واسیا ماسکو میں ہے۔ وہ اُسے خاص جہاز پر لے کر گئے ہیں!'' لیکن ہم نے باغ میں پودے لگانے کا کام ختم کیا۔ [ایک ہفتے بعد گاؤں خالی کروا لیا گیا تھا۔] کون جانتا تھا؟ اُس وقت کسے پتا تھا؟ دِن ڈھلے میں قے کرنے لگی۔ میں چھے ماہ کی حاملہ تھی۔ میں خوف زدہ ہو گئی۔ اُس رات میں نے اُسے خواب میں خود کو پکارتے سُنا۔ ''لیوسیا! لیوسینکا!'' لیکن مرنے کے بعد اُس نے مجھے کبھی خوابوں میں بھی نہیں پکارا۔ ایک بار بھی نہیں۔ [وہ رونے لگتی ہے۔]

اگلی صبح میں یہ سوچتے ہوئے اُٹھی کہ مجھے ماسکو جانا چاہیے۔ تنہا مجھے۔ میری ماں رونے لگی۔ ''تم کہاں جا رہی ہو، اِس حالت میں؟'' پس میں نے اپنے والد کو ہم راہ لیا۔ وہ بینک گیا اور اُن کے پاس جتنی رقم تھی نکلوا لایا۔

مجھے سفر یاد نہیں۔ بس سفر میری یاد سے محو ہے۔ ماسکو میں ہمیں جو پہلا پولیس افسر نظر آیا ہم نے اُس سے پُوچھا کہ چرنوبل کے فائرمینوں کو کہاں رکھا گیا ہے اور اُس نے ہمیں بتا دیا۔ ہم بھی حیرت زدہ رہ گئے، ہر شخص خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیوں کہ یہ انتہائی خفیہ معاملہ تھا۔ ''ہسپتال نمبر ۶۔ شچوکن سکایا سٹاپ پر۔''

وہ ایک خاص ہسپتال تھا، تابکاری کے علاج کا، جس میں بغیر پاس کے داخل ہونے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑی عورت کے حوالے کچھ پیسے کیے تو وہ بولی۔ ''آگے چلی جاؤ۔'' پھر میں نے کسی سے پُوچھا تو کسی کی منت سماجت کی۔ بالآخر ہیڈ ریڈیالوجسٹ، انجلینا واسلیفنا گسکوفا کے دفتر میں جا بیٹھی۔ لیکن تب تک مجھے اُس کا نام پتا نہیں تھا، مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ مجھے اُس سے ملنا ہے۔ ٹھیک اُسی لمحے وہ دریافت کرتی ہے: ''کیا تمھارے بچّے ہیں؟

''میں اُسے کیا بتاؤں؟ میں پہلے سمجھ گئی تھی کہ مجھے یہ بات چھپانا ہو گی کہ میں حمل سے ہوں۔ وہ مجھے اُس سے ملنے نہیں دیں گے! یہ اچھی بات ہے کہ میں دبلی پتلی ہوں کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔

''ہاں۔'' میں جواب دیتی ہوں۔

''کتنے؟''

میں سوچ رہی ہوں۔ مجھے اُسے بتانا چاہیے: دو۔ اگر صرف ایک بتایا تو وہ مجھے اندر نہیں

جانے دے گی۔

''ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔''

''گویا تمھیں مزید بچّوں کی ضرورت نہیں ہے۔ٹھیک ہے۔سنو: اُس کا مرکزی اعصابی نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے،اُس کا ذہن مکمل طور پر بے کار ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچ رہی ہوں ،تو وہ تھوڑا سا بے حس ہو گا۔''

''اور سنو: اگر تم روئی پیٹیں تو میں تمھیں فوراً باہر پھنکوا دوں گی۔بوس و کنار بالکل نہیں۔اُس کے قریب بھی مت پھٹکنا۔تمھارے پاس آدھ گھنٹا ہے۔''

لیکن میرا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔اگر میں گئی تو یہی کچھ اُس کے ساتھ ہو گا۔ میں اپنے آپ سے عہد کرتی ہوں۔ میں اندر داخل ہوتی ہوں۔ وہ بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔تاش کھیل رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔

''واسیا!'' وہ پکار اُٹھتے ہیں۔

وہ مڑتا ہے۔

''اوہ، خُوب،اب کھیل ختم۔اُس نے مجھے یہاں بھی ڈھونڈ لیا!''

وہ نہایت خُوش گوار طبیعت میں لگ رہا ہے۔اُس نے ۴۸ نمبر کا پاجاما پہن رکھا ہے جب کہ اُس کا حجم ۵۲ نمبر کا تھا۔آستینیں بہت چھوٹی ہیں۔ پینٹ بھی نہایت چھوٹی ہے۔لیکن اب اُس کا چہرہ سُوجا ہوا نہیں ہے۔اُنھیں کسی قسم کی سیال شے دی جاتی ہے۔

میں کہتی ہوں۔''تم کہاں تک بھاگو گے؟''

وہ مجھے گلے لگانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر لگانے نہیں دیتی۔''بیٹھو،بیٹھو۔'' وہ کہتی ہے۔''یہاں معانقہ نہیں ہو گا۔''

ہم اِس بات کو کسی نہ کسی طور مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔اور پھر دُوسرے کمروں سے ہر شخص آنے لگتا ہے، پرِپیات کا ہر شخص۔ جہاز پر اٹھائیس لوگ سوار ہوئے تھے۔کیا ہو رہا ہے؟ قصبے کے معاملات کیسے جا رہے ہیں؟ میں اُنھیں بتاتی ہوں کہ اُنھوں نے ہر کسی کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا ہے،پُورا شہر تین سے پانچ روز کے لیے مکمل طور پر خالی کروایا جا رہا ہے۔اُن میں سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اور اُن میں سے ایک عورت ،وہاں دو عورتیں تھیں جو حادثے کے روز اپنے کام پر تھیں،رونے لگتی ہے۔

''او خدایا! میرے بچّے وہاں ہیں۔اُن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

میں اُس کے ساتھ تنہائی چاہتی ہوں،چاہے ایک منٹ ہی کی ملے۔وہ لوگ یہ بات محسوس کر

لیتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی حیلہ سازی کرتا ہے اور وہ تمام باہر چلے جاتے ہیں۔ پھر میں اُسے پیچھے ڈال لیتی ہوں اور چومتی ہوں۔ وہ پرے ہٹ جاتا ہے۔

''میرے نزدیک مت بیٹھو۔ کُرسی لے لو۔''

''یہ احمقانہ بات ہے۔'' میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتی ہوں۔ ''کیا تم نے دھماکہ دیکھا تھا؟ تم نے دیکھا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ تم وہاں پہنچنے والوں میں سب سے پہلے شخص تھے۔''

''وہ غالباً تخریب کاری تھی۔ کسی نے اُس کا منصوبہ بنایا تھا۔ سب کا یہی خیال ہے۔''

اُس وقت لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ یہی سوچ رہے تھے۔

اگلے روز وہ سب اپنے اپنے کمروں میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُن پر ہال وے میں جانے اور ایک دُوسرے سے بات چیت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ وہ اپنے ٹھولوں سے دیواریں بجاتے تھے۔ ڈیش ڈیش نقطہ، ڈیش نقطہ۔ ڈاکٹروں نے وضاحت کی کہ تابکار شعاعوں پر ہر شخص کا جسم مختلف ردِعمل دیتا ہے اور جو چیز ایک شخص کر سکتا ہے وہی دُوسرا نہیں کر سکتا۔ حد یہ کہ اُنھوں نے اُنھیں جہاں رکھا تھا وہ اُس جگہ کی دیواروں کی تابکار شعاعوں کو بھی ماپ سکتے تھے۔ دائیں، بائیں اور قدموں تلے فرش کی بھی۔ اُنھوں نے نچلی اور بالائی منزلوں کے تمام مریضوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ اُس جگہ کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

تین روز تک میں ماسکو میں اپنی دوستوں کے ہم راہ رہی۔ وہ کہتی رہیں: برتن لے لو، رکابی لے لو، تمھیں جس چیز کی ضرورت ہے لے لو۔ میں نے چھے لوگوں کے لیے ٹرکی کی یخنی بنائی۔ ہمارے چھے فائرمینوں کے لیے، اُسی شفٹ کے چھوؤں کے لیے۔ اُس رات وہ سارے ڈیوٹی پر تھے: باشک، کِبے نوک، تِتے نوک، پراوِک، لِس چُورا۔ میں دُکان پر گئی اور اُن کے لیے ٹُوتھ پیسٹ، ٹُوتھ برش اور صابن خریدے۔ ہسپتال میں اُن کے پاس، اِن میں سے ایک بھی چیز نہیں تھی۔ میں نے اُن کے لیے چھوٹے تولیے بھی خریدے۔ اب ماضی کی طرف دیکھتی ہوں تو میں اپنی دوستوں پر متحیر رہ جاتی ہوں: وہ سراسیمہ تھیں۔ بے شک، کیوں نہ ہوتیں۔ ہر طرف افواہیں گرم تھیں لیکن وہ پھر بھی یہی کہتی رہیں: تمھیں جس چیز کی ضرورت ہے، لے لو! یہ لے لو! وہ کیسا ہے؟ وہ سب کیسے ہیں؟ کیا وہ بچ جائیں گے؟ زندہ۔ [وہ خاموش ہو جاتی ہے۔] اُس وقت میں بہت سے اچھے لوگوں سے ملی، مجھے وہ سب تو یاد نہیں البتہ ایک بُوڑھی نگران عورت یاد ہے جس نے مجھے بتایا: ''ایسی بیماریاں بھی ہیں جو لاعلاج ہیں۔ تمھیں صرف بیٹھنا اور محض اُنھیں دیکھنا ہوتا ہے۔''

صبح سویرے میں مارکیٹ جاتی ہوں، پھر اپنی دوستوں کے گھر میں یخنی تیار کرتی ہوں۔ مجھے ہر چیز کُوٹنا اور پیسنا ہوتی ہے۔ کسی نے کہا۔ ''مجھے سیب کا جُوس لا دو۔'' تو جُوس کے چھے ڈبے لے کر جاتی

ہوں، ہمیشہ چھوؤں کے لیے! ہسپتال کو دوڑتی ہوں اور پھر شام تک وہیں رہتی ہوں۔ شام کو میں پھر شہر لوٹ جاتی ہوں۔ میں کتنا عرصہ یہ مسلسل بھاگ دوڑ کر سکتی تھی؟ تین روز بعد وہ مجھے بتاتے ہیں کہ میں طبّی کارکنوں کی اقامت گاہ میں قیام کر سکتی ہوں جو ہسپتال کی زمینی منزل پر ہے۔ میرے خدا، یہ کس قدر حیران کُن واقعہ تھا!

''لیکن وہاں کوئی باورچی خانہ نہیں ہے۔ میں پکاؤں کیسے؟''

''تمھیں پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خوراک ہضم نہیں کر سکتے۔''

وہ بدلنے لگا۔ میں روزانہ ایک نئے آدمی سے ملی۔ چھالے نمودار ہونے لگے۔ اُس کے مُنھ میں، زبان پر، چہرے پر — شروع میں وہ چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے اور پھر بڑے ہو جاتے۔ وہ تہہ در تہہ نمودار ہوتے — سفید تھِلّی کے مانند — اُس کے بدن کا رنگ نیلا...... سُرخ...... خاکستری سُرمئی۔ اور یہ سب میرا انتہائی ذاتی ہے! اِسے بیان کرنا بھی ممکن نہیں! اِسے لکھنا بھی ممکن نہیں! حد یہ کہ اِسے بُھلانا بھی ممکن نہیں ہے! میں اسی لیے محفوظ رہی کہ یہ سب نہایت سُرعت سے وقوع پذیر ہوا: سوچنے تک کے لیے ایک لمحہ نہیں تھا۔ رونے تک کے لیے بھی ایک لمحہ تک نہیں تھا۔

مجھے اُس سے محبت تھی! مجھے نہیں معلوم کتنی! حال ہی میں تو ہماری شادی ہوئی تھی۔ ہم سڑک پر چل رہے ہوتے — وہ میرا ہاتھ تھامتا اور مجھے گھمانے لگ جاتا۔ مجھے چُومنے لگتا، مجھے چُومنے لگتا۔ پاس سے گُزرتے لوگ مُسکرانے لگتے۔

وہ تابکار شعاعوں سے بدن میں زہر پھیلنے والے نازک حالت کے مریضوں کا ہسپتال تھا۔ چودہ دِن۔ ہر چودہ دِن بعد ایک شخص مر جاتا ہے۔

پہلے ہی روز، اُنھوں نے اقامت گاہ میں ڈوسی میٹر[1] سے میری جانچ پڑتال کی۔ میرے کپڑے، بیگ، پرس، جُوتے — ہر شے ''گرم'' تھی۔ اور اُنھوں نے فوراً وہ چیزیں مجھ سے وہیں لے لیں۔ حتّٰی کہ میرے زیر جامے بھی۔ اُنھوں نے صرف میرے پیسے چھوڑے۔ بدلے میں اُنھوں نے مجھے ہسپتال کا لباس دیا — ۵۶ کے ناپ کا — اور تقریباً ۴۳ کے ناپ کی چپلیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ شاید وہ کپڑے لوٹا دیں اور شاید نہ لوٹائیں کیوں کہ وہ اُنھیں وہاں اپنے لیے ''مسئلہ'' نہیں بنائیں گے۔ پس جب میں اُس سے ملنے گئی تو ایسے حلیے میں تھی۔ میں نے اُسے ڈرا دیا تھا۔ ''محترمہ، تمھارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' لیکن میں اب بھی اُسے یخنی بنا کر دے سکتی تھی۔ میں نے شیشے کے ایک مرتبان میں پانی اُبالا اور اُس میں مرغی کے قتلے ڈالے — چھوٹے چھوٹے قتلے۔ پھر کسی عورت نے مجھے اپنا برتن دیا، شاید وہ صفائی کرنے والی عورت تھی یا خاتون سنتری۔ کسی نے مجھے اجموِد کاٹنے کے لیے کٹائی والا تختہ دیا۔ میں

اپنے ہسپتال والے لباس میں مارکیٹ نہیں جا سکتی تھی، لوگ مجھے سبزی لا دیتے۔ لیکن یہ فضول تھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں پی سکتا تھا۔ وہ کچا انڈہ تک نہیں نگل سکتا تھا۔ لیکن میں کوئی مزیدار شے بنانا چاہتی تھی! گویا زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہو۔ میں ڈاک خانے کو دوڑی۔ ''لڑ کیو'' میں نے اُنھیں بتایا۔ ''میں فوراً اپنے والدین کو اِیوانو فرانکوفسک بُلانا چاہتی ہوں! میرا خاوند مر رہا ہے!'' وہ یکا یک چلّا اُٹھیں کہ میں کہاں سے آئی ہوں اور میرا خاوند کون ہے اور اُنھوں نے میرا رابطہ کروا دیا۔ اُسی روز میرے والد، بہن اور بھائی پرواز سے ماسکو آ گئے۔ وہ میری چیزیں لائے تھے؛ اور پیسے بھی۔ وہ مئی کی نو تاریخ تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے کہا کرتا تھا: ''تمھیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ ماسکو کتنا خوب صورت ہے! خاص طور پر V-Day کو، جب آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔ میں تمھیں وہ دِکھانا چاہتا ہوں۔''

میں اُس کے پاس کمرے میں بیٹھی ہوں۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ ''دِن ہے یا رات؟''

''رات کے نو بجے ہیں۔''

''کھڑکی کھول دو! وہ آتش بازی چھوڑنے والے ہیں۔''

میں نے کھڑکی کھول دی۔ ہم آٹھویں منزل پر ہیں اور سارا شہر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے! آتش بازی کا ایک گُل دستہ فضا میں چُھوٹا۔

''وہ دیکھو!'' میں نے کہا۔

''میں نے تمھیں کہا تھا نا کہ میں تمھیں ماسکو دِکھاؤں گا؛ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ عام تعطیل کے دِنوں میں تمھیں سدا پھول دیا کروں گا.....''

میں اُس کی جانب دیکھتی ہوں تو وہ اپنے تکیے کے نیچے سے تین گُل ناریاں نکال رہا ہوتا ہے۔ اُس نے نرس کو پیسے دیے تھے اور وہ لے کر آئی تھی۔

میں دوڑ کر اُس کی طرف جاتی ہوں اور اُسے چُومنے لگتی ہوں۔

''میرے عشق! میرے واحد عشق!''

وہ دبکنے لگتا ہے۔ ''ڈاکٹروں نے تمھیں کیا بتایا ہے؟ مجھ سے لپٹنا نہیں اور مجھے چُومنا نہیں!''

وہ مجھے اُس سے لپٹنے نہیں دیتے لیکن میں ..... میں نے اُسے اُٹھا کر اُس کی ٹیک لگوائی۔ اُس کا بستر ٹھیک کیا۔ میں نے حرارت پیما لگایا۔ میں نے گندوالی قاب اُٹھائی اور واپس لا کر رکھی۔ میں ساری رات اُس کے ساتھ رہی۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ جب میرا سر چکرایا تو میں کمرے کے بجائے ہال میں تھی۔ میں نے کھڑکی کی دہلیز تھام لی۔ ایک ڈاکٹر وہاں سے گزر رہا تھا، اُس نے مجھے بازو سے پکڑا۔ اور پھر اچانک بولا۔ ''تم حمل

سے ہو؟''

''نہیں، نہیں!'' میں خوف زدہ ہوگئی کہ کہیں کوئی سُن ہی نہ لے۔

''جھوٹ مت بولو۔'' اُس نے آہ بھری۔

اگلے روز مجھے ڈاکٹروں کی سربراہ کے دفتر میں طلب کیا جاتا ہے۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' وہ دریافت کرتی ہے۔

''کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر میں تمھیں بتا دیتی تو تم مجھے گھر بھیج دیتیں۔ وہ مبنی بر مصلحت جھوٹ تھا!''

''تم نے کیا کیا ہے؟''

''لیکن میں اُس کے ساتھ تھی......''

میں زندگی بھر انجلینا واسلیفنا گسکوا کی ممنون رہوں گی۔ زندگی بھر! دُوسرے لوگوں کی بیویاں بھی آتی تھیں لیکن اُنھیں داخل ہونے ہی کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اُن کی مائیں میرے ہم راہ تھیں۔ والودیا پراوِک کی ماں خدا سے مسلسل دُعا مانگتی رہتی۔ ''اِس کے بجائے مجھے اُٹھا لے۔'' ایک امریکی پروفیسر ڈاکٹر گیل نے۔ جس نے ہڈیوں کے گودے کی جراحی کی تھی۔ مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ اُمید کی نہایت ننھی سی کرن ہے، وہ بولا، لیکن زیادہ نہیں، البتہ ذرا سی۔ جتنا مضبوط شخص اُتنا ہی طاقت وَر نامیاتی جسم! اُنھوں نے اُس کے تمام عزیز و اقارب کو بُلا لیا۔ اُس کی دو بہنیں بیلارس سے آئی تھیں، اُس کا بھائی لینن گراڈ سے۔ وہ وہاں فوج میں تھا۔ سب سے چھوٹی نتاشا چودہ برس کی تھی۔ وہ نہایت دہشت زدہ تھی اور بہت روتی تھی لیکن اُس کی ہڈیوں کا گودا موزوں بیٹھا۔ [خاموشی۔]۔ اب میں اِس پر بات کر سکتی ہوں۔ پہلے میں نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے دس برس تک اِس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ [خاموشی۔]۔

جب اُسے پتا چلا کہ وہ اُس کی چھوٹی بہن کی ہڈیوں کا گودا لے رہے ہیں تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ ''اِس کے بجائے میں مرنا پسند کروں گا۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ اُسے ہاتھ بھی مت لگانا۔'' اُس کی بڑی بہن لی یُودا اٹھائیس برس کی تھی جو خُود ایک نرس تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے (چھوٹی بہن کے) ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ ''جتنی دیر وہ زندہ رہتا ہے۔'' اُس نے بتایا۔ ''میں جراحی دیکھتی رہی۔ وہ ایک دُوسرے کے ساتھ ساتھ میزوں پر پڑے تھے۔ جراحی کے کمرے میں ایک بڑی کھڑکی تھی۔ اُس میں دو گھنٹے لگے۔ جب اُنھوں نے اپنا کام ختم کیا تو لی یُودا کی حالت اُس سے (بھائی سے) زیادہ خراب تھی۔ اُسے (چھوٹی بہن کو) سینے میں اٹھارہ چھید آئے تھے۔ اُس کا بے ہوشی سے ہوش میں آنا نہایت

مشکل تھا۔ اب وہ بیمار ہے۔ لاچار ہے۔ وہ ایک توانا اور حسین لڑکی تھی۔ وہ کبھی شادی نہیں کر پائی۔ میں اِس دوران میں ایک کمرے سے دُوسرے کی جانب بھاگتی پھرتی رہی۔ کبھی اِس کمرے میں تو کبھی اُن کے کمرے میں۔ اب وہ عام کمرے میں نہیں رہا تھا۔ وہ مخصوص کمرے میں، ایک مہین پردے کے عقب میں تھا۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اُن کے پاس آلات تھے کہ وہ پردہ ہٹائے بغیر اُسے ٹیکے لگا سکتے تھے۔ قناطیر رکھ سکتے تھے۔ پردے نلیوں سے جوڑ کر رکھے جاتے تھے۔ میں نے اُن آلات کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ لیکن میں پردہ ہٹاتی اور اُس کے پاس اندر چلی جاتی۔ اُس کے بستر کے قریب ایک چھوٹی کُرسی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی حالت اِتنی خراب ہوگئی تھی کہ اب میں اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ مجھے مسلسل پُکارتا رہتا تھا۔ ''لیوسیا، کہاں ہو تم؟ لیوسیا!'' وہ پُکارتا ہی چلا جاتا۔ دُوسرے مخصوص کمرے، جہاں ہمارے نوجوان تھے، فوجیوں نے سنبھال رکھے تھے کیوں کہ عملے کی چھوٹی نرسوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ حفاظتی لباسوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فوجی غلاظت سے بھری نلیاں لے جاتے۔ وہ فرش کو پونچا لگاتے، بستروں کی چادریں بدلتے۔ وہ ہر کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے وہ فوجی کہاں سے لیے تھے؟ ہم نے نہیں پُوچھا۔ لیکن وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ہر روز میں سُنتی: مرگیا، مرگیا۔ تیتے نوک مرگیا۔ مرگیا۔ یہ میرے دماغ پر ہتھوڑے برسنے والی بات تھی۔

وہ دِن میں ۲۵ سے ۳۰ بار تک پاخانہ کر رہا تھا۔ خُون اور بلغم ملا پاخانہ۔ اُس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی جِلد پھٹنا شروع ہوگئی تھی۔ اُس کا بدن دُنبلوں سے بھر گیا تھا۔ جب وہ سر پھیرتا تو بالوں کا ایک گُچھا تکیے پر رہ جاتا۔ میں مذاق کرنے کی کوشش کرتی۔ ''یہ مناسب ہے، تمھیں کنگھے کی ضرورت نہیں۔'' جلد ہی اُنھوں نے اُن کے سارے بال کٹوا ڈالے۔ میں نے اُس کے بال خُود کاٹے۔ میں اُس کا ہر کام خُود کرنا چاہتی تھی۔ اگر جسمانی لحاظ سے ممکن ہوتا تو میں پُورے چوبیس گھنٹے اُس کے پاس ہی ٹھیرتی۔ ایک منٹ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتی۔ [طویل خاموشی۔] میرا بھائی آیا اور سہم گیا۔ ''میں تمھیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔'' لیکن میرے والد نے اُسے کہا۔ ''تمھارا کیا خیال ہے کہ تم اُسے روک لو گے؟ وہ کھڑکی کے راستے چلی جائے گی! وہ آگ سے بچنے کے لیے نکلنے والے راستے سے چلی جائے گی!''

میں ہسپتال واپس جاتی ہوں تو بستر کے ایک طرف ایک سنگترہ دیکھتی ہوں۔ ایک بڑا سا اور گلابی سنگترہ۔ وہ مُسکرا رہا ہے۔ ''مجھے تحفے میں ملا ہے۔ تم لے لو۔'' اُسی وقت مہین پردے میں سے نرس اشارہ کرتی ہے کہ میں اِسے نہیں کھا سکتی۔ یہ کچھ دیر اُس کے پاس پڑا رہا ہے، پس تم اِسے نہیں کھا سکتیں

ٹل کہ اِسے چُھونا بھی مت۔" "آؤ، کھالو اسے۔" وہ کہتا ہے۔ "تمھیں سنگترے پسند ہیں نا!" میں سنگترہ ہاتھ میں پکڑ لیتی ہوں۔ اِسی دوران میں وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سو جاتا ہے۔ وہ اُسے سلانے کے لیے ہمیشہ ٹیکے لگاتے رہتے تھے۔ نرس میری جانب دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اور میں؟ میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے موت کا خیال تک اُس کے پاس سے نہ گُزرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موت ہول ناک ہے اور میں اُس سے خوف زدہ ہوں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہاں کچھ گفتگو کے ٹکڑے تھے۔ کوئی کہہ رہا ہے: "تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اب تمھارا شوہر نہیں ہے۔ محبوب نہیں ہے۔ ٹل کہ ایک تابکاری زدہ چیز ہے جس کی منزل زہر بھری ہے۔ تمھیں خودکشی نہیں کرنا، اپنے آپ کو سنبھالو۔" اور میں اُس شخص جیسی ہوں جو دماغ چل جانے کے سبب دِیوانہ ہو گیا ہو۔ "لیکن میں اُس سے محبت کرتی ہوں! مجھے اُس سے محبت ہے!" وہ سو رہا ہے اور میں سرگوشی کر رہی ہوں۔ "مجھے تم سے محبت ہے!" ہسپتال کے صحن میں چلتے پھرتے: "مجھے تم سے محبت ہے!" اُس کی غلاظت کی قاب لے جاتے ہوئے: "مجھے تم سے محبت ہے!" مجھے یاد ہے کہ ہم گھر میں کس طرح رہا کرتے تھے۔ اُسے رات کو صرف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لینے کے بعد ہی نیند آتی تھی۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ سوتے ہوئے شب بھر میرا ہاتھ پکڑے رکھنا۔ پس میں ہسپتال میں اُس کا ہاتھ تھام لیتی ہوں اور چھوڑتی نہیں۔

ایک رات ہر شے پر سکوت طاری تھا۔ ہم تنہا تھے۔ اُس نے بہت غور سے مجھے دیکھا اور اچانک پُوچھا۔

"میں اپنے بچّے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسا ہے؟"

"ہم اُس کا نام کیا رکھیں گے؟"

"یہ فیصلہ تم کرو گی۔"

"جب وہ ہم دونوں کا ہے تو میں ہی کیوں؟

"اِس صُورت میں، اگر لڑکا ہوا تو اُس کا نام واسیا ہو گا اور اگر لڑکی ہوئی تو نتاشا۔"

مجھے اُس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتی ہوں! وہ...... بس وہ۔ میں ایک اندھے کے مانند تھی۔ گو میں چھے ماہ کی حاملہ تھی لیکن حد یہ کہ مجھے اپنے دِل کے نیچے چھوٹی موٹی اُچھل کود بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرا ننّھا میرے وجود کے اندر ہے اور وہ محفوظ ہے۔

ڈاکٹروں میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ میں رات کو اُس کے مخصوص کمرے میں ٹھیرتی ہوں۔ نرسیں مجھے اندر جانے دے دیتیں۔ شروع شروع میں اُنھوں نے بھی مجھ سے بحث کی تھی: "تم نوجوان

ہو۔تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ وہ اب ایک شخص نہیں رہا بل کہ ایک نیوکلیائی مرکز ہے۔تم بھی اُس کے ساتھ جل مروگی۔'' میں اُن کے پیچھے دُم ہلاتے ہوئے کُتّے کے مانند پھرتی تھی۔ میں گھنٹوں اُن کے دروازے پر کھڑی منّتیں اور بحث کرتی رہتی۔ اور پھر وہ کہتیں: ''ٹھیک ہے، جہنم میں جاؤ! تم صحیح الدماغ نہیں ہو۔'' صبح کے وقت، بس آٹھ بجنے سے کچھ پہلے، جب ڈاکٹر دورے کرنا شروع کرتے تھے تو وہ پردے کی دُوسری طرف آ کھڑی ہوتیں: ''نکلو!'' سو، میں ایک گھنٹے کے لیے اپنی قیام گاہ پر چلی جاتی۔ پھر صبح نو بجے سے رات نو بجے تک کا پاس میرے پاس ہے۔ گھٹنوں سے نیچے میری ٹانگیں نیلی پڑ گئی تھیں، نیلی اور سُوجی ہوئیں۔ میں اِتنا تھک چکی تھی۔

جب میں اُس کے پاس ہوتی تو کبھی نہ کرتے لیکن جب میں چلی جاتی تو — وہ اُس کی تصویریں کھینچتے۔ بے لباسی کی حالت میں، عریاں۔ اُس کے اُوپر ایک چھوٹی سی پتلی چادر ہوتی تھی۔ میں روزانہ اُس پتلی چادر کو تبدیل کرتی اور روزانہ شام کو وہ خُون سے لت پت ہو جاتی۔ میں اُسے اُٹھاتی تو اُس کی جلد کی پپڑیاں میرے ہاتھ میں آ جاتیں اور میرے ہاتھوں سے چمٹ جاتیں۔ میں اُسے کہتی۔ ''عشق! میری مدد کرو۔ اپنے بازوؤں اور کہنیوں کے بل جتنا اُوپر اُٹھ سکتے ہو اُٹھو تا کہ میں تمھارا بستر ٹھیک کر سکوں، سلوٹیں اور تہیں دُور کر سکوں۔'' چھوٹی سے چھوٹی تہ بھی اُس کے بدن پر زخم ڈال دیتی۔ میں خُون نکلنے کی حد تک اپنے ناخن اِتنی گہرائی میں کاٹتی کہ اُن سے اتفاقاً بھی اُسے زخم نہ آئے۔ کوئی بھی نرس اُس کے قریب نہیں پھٹکتی تھی۔ اگر اُنھیں کوئی شے درکار ہوتی تو وہ مجھے پُکارتیں۔

اُنھوں نے اُس کی تصویریں کھینچیں۔ سائنس کے لیے، اُنھوں نے بتایا۔ اگر میں اُنھیں وہاں سے باہر نکالنے کی اہل ہوتی تو اُنھیں دھکّے دے کر وہاں سے نکال باہر کرتی۔ میں اُنھیں للکارتی! اُن پر گھونسے برساتی! اُنھوں نے جرأت کیسے کی؟ وہ سارے کا سارا میرا ہے — وہ میرا عشق ہے —

میں کمرے سے نکل کر ہال وے میں جا رہی ہوں۔ میں سوفے کی سمت جا رہی ہوں کیوں کہ وہ مجھے دِکھائی نہیں دیتی ہیں۔ میں ڈیوٹی پر موجود نرس کو بتاتی ہوں۔ ''وہ مر رہا ہے۔'' اور وہ مجھے کہتی ہے۔ ''تم کیا توقع کر رہی تھیں؟ وہ ۱۶۰۰ رونٹجن (roentgen) لے چکا ہے۔ ۴۰۰ کی مقدار بھی مہلک ہوتی ہے۔ تم ایک نیوکلیائی مرکز کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔'' وہ سارا میرا ہے...... میری محبت ہے۔ جب وہ سب مر گئے تو اُنھوں نے ہسپتال اُدھیڑ ڈالا۔ اُنھوں نے دیواریں تک کھرچ ڈالیں اور فرش کھود ڈالا۔

اور پھر — ایک آخری چیز۔ یہ مجھے ٹکڑوں میں یاد ہے۔ تمام منتشر ہو چکی ہے۔

رات کے وقت میں اُس کے پاس چھوٹی کُرسی پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ آٹھ بجے میں کہتی ہوں۔ ''واسینکا، میں ذرا سی ہَوا خوری کے لیے جا رہی ہوں۔'' وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور پھر بند کر لیتا ہے۔ وہ

مجھے جانے دیتا ہے۔ میں اپنی قیام گاہ میں اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔فرش پر لیٹ جاتی ہوں۔ میں بستر پر لیٹ نہیں سکتی تھی۔ اَنگ اَنگ دُکھ رہا ہوتا ہے کہ تبھی صفائی والی دروازہ پیٹتی ہے۔''جاؤ! اُس کے پاس دوڑ کر جاؤ! وہ جنونیوں کی طرح تمھیں پُکار رہا ہے۔'' اُسی صبح تانیا کیے نوک نے مجھے کہا تھا۔ ''میرے ساتھ قبرستان تک چلو۔ میں وہاں اکیلی نہیں جا سکتی۔'' وہ ویتا کیے نوک اور والو دِیا پراوِک کی تدفین کر رہے تھے۔ وہ دونوں میرے واسیا کے دوست تھے۔ ہمارے خاندان آپس میں دوست تھے۔ دھما کے سے ایک روز پہلے کا ہم سب کا عمارت میں اکٹھے فوٹو ہے۔ ہمارے شوہر کتنے وجیہ ہیں! وہ اُس کی زندگی کا آخری دِن تھا۔ہم سب بہت خوش تھے!

میں قبرستان سے واپس آئی تو سیدھی نرس کی طرف گئی۔''وہ کیسا ہے؟'' ''وہ پندرہ منٹ قبل مر گیا۔'' ''کیا؟'' میں وہاں ساری رات رہی تھی۔ تین گھنٹوں ہی کے لیے گئی تھی! میں کھڑکی کے پاس گئی اور چلّانے لگی۔''کیوں؟ کیوں؟'' میں اُوپر آسمان کی طرف دیکھنا اور بَین کرنے لگی۔عمارت کے سب لوگ سُن رہے تھے لیکن مجھ سے دُور رہے۔ پھر میں گئی: میں اُسے ایک بار اَور دیکھوں گی! ایک مرتبہ اَور! میں سیڑھیوں کی جانب دوڑی۔ وہ ابھی تک اپنے مخصوص کمرے میں تھا۔ اُنھوں نے ابھی اُسے وہاں سے ہٹایا نہیں تھا۔اُس کے آخری الفاظ تھے: ''لیوسیا! لیوسینکا!'' ''وہ تھوڑی دیر کے لیے ابھی گئی ہے۔ جلد لوٹ آئے گی۔'' نرس نے اُسے بتایا۔اُس نے ہوک بھری اور خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد میں نے اُسے نہیں چھوڑا۔ میں نے قبر تک تمام راستے اُسے اپنے حصار میں لیے رکھا۔اگر چہ مجھے یاد ہے کہ وہ چیز قبر نہیں ہے، پلاسٹک کا ایک تھیلا ہے۔تھیلا۔

مُردہ خانے میں اُنھوں نے پُوچھا تھا۔''تم دیکھنا چاہو گی کہ ہم نے اُسے کیسا لباس پہنایا ہے؟'' میں دیکھتی ہوں! اُنھوں نے اُسے عام سا لباس پہنا رکھا تھا، اُس کی سروس کیپ سمیت۔ وہ اُسے جُوتے نہیں پہنا سکے تھے کیوں کہ اُس کے پیر سُوجے ہوئے تھے۔اُنھوں نے اُس عام لباس کو بھی کاٹ رکھا تھا کیوں کہ اُس کے بغیر وہ اُسے پہنا ہی نہیں سکتے تھے۔لباس پہننے کے لیے اُس کا پُورا جسم تھا ہی نہیں۔ وہاں تو بس— زخم ہی زخم تھے۔ہسپتال کے آخری دو دِنوں کے دوران میں— میں اُس کا بازو تھامتی تو ہڈّی ہلنے لگتی،اِس طرح حرکت کرنے لگتی گویا گوشت نے اُسے چھوڑ دیا ہو۔اُس کے پھیپھڑوں اور جگر کے ٹکڑے اُس کے مُنھ کے راستے نکل رہے تھے۔اُس کے اندرونی اعضا حلق میں رُکاٹ پیدا کر رہے تھے۔ میں اپنے ہاتھ پر پٹی لپیٹتی اور اُس کے مُنھ میں ڈال کر تمام مواد باہر نکال لیتی۔ اِس کے بارے میں بات کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔اِس کے بارے میں لکھنا بھی ناممکن ہے۔حتّٰی کہ اِس کے بارے میں سوچتے ہوئے جینا بھی ممکن نہیں۔ وہ سارے کا سارا میرا ہے۔میرا عشق۔اُنھیں تو اُس کے ماپ کا

جُوتوں کا ایک جوڑا تک نہیں ملا۔ اُنھوں نے اُسے ننگے پاؤں ہی دفنا دیا۔

وہ منظر اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے – عام لباس پہنے ہوئے – اُنھوں نے اُسے اُٹھایا اور مومی تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا مُنہ باندھ دیا۔ پھر اُس تھیلے کو چوبی تابوت میں رکھا۔ اور پھر اُس تابوت پر بھی ایک مومی تھیلا چڑھا کر اُسے باندھ دیا۔ اگر چہ پلاسٹک شفاف لیکن ٹیوب کے ربڑ کے مانند موٹا ہے۔ پھر اُنھوں نے وہ سب جستی تابوت میں ڈال دیا۔ اُسے اُس میں کَس ڈالا۔ صرف ٹوپی پُوری نہیں آئی۔

سب ہی آ گئے۔ اُس کے ماں باپ، میرے ماں باپ۔ اُنھوں نے ماسکو سے سیاہ رُومال خریدے۔ دی ایکسٹرا آرڈینری کمیشن نے ہم سے ملاقات کی۔ اُنھوں نے سب سے ایک ہی بات کہی: ہمارے لیے آپ کے شوہروں، آپ کے بیٹوں کی نعشیں دینا ممکن نہیں ہے۔ وہ انتہائی تابکاری رکھتے ہیں اور اُنھیں ایک خاص طریقے سے ماسکو ہی کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ مہر بند جستی تابوت سیمنٹ سے بنی اینٹوں تلے دفن کیے جائیں گے۔ آپ کو اِس دستاویز پر دستخط کرنا ہوں گے۔

اگر کچھ لوگ برہم ہوئے اور اُنھوں نے اصرار کیا کہ وہ تابوت گھر ہی لے جانا چاہتے ہیں تو اُنھیں بتایا گیا کہ تمھیں پتا ہے کہ مرجانے والے اب ہیرو ہیں اور اب اُن کا اپنے خاندانوں سے کوئی تعلّق نہیں رہا۔ وہ وطن کے ہیرو تھے۔ اُن کا وطن سے رشتہ تھا۔

ہم جنازہ گاڑی میں بیٹھ گئے، عزیز و اقارب اور کچھ طرح کے فوجی۔ ایک کرنل اور اُس کا دستہ۔ وہ دستے کو بتاتے ہیں: ''احکامات کا انتظار کرو!'' ہم ماسکو میں دو تین گھنٹے سفر کرتے رہے، پَنچی والے راستے پر۔ ہم دوبارہ ماسکو جارہے ہیں۔ وہ دستے کو بتاتے ہیں: ''ہمیں قبرستان میں نہ جانے دینے کا حکم ہے۔ قبرستان پر غیر ملکی صحافیوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ تھوڑی دیر مزید انتظار کرو۔'' والدین کچھ نہیں بولتے۔ میری ماں کے ہاتھ میں سیاہ رُومال ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ ''یہ لوگ میرے شوہر کو کیوں چھپا رہے ہیں؟ وہ تھا – کیا؟ قاتل؟ مجرم؟ ہم کسے دفنانے جارہے ہیں؟'' میری ماں: ''چُپ، بیٹی چُپ۔'' وہ سر سہلا رہی ہے۔ کرنل پکارتا ہے: ''قبرستان چلو۔ اِس کی بیوی جنونی ہو رہی ہے۔'' قبرستان میں ہمیں فوجیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ ہمارا پُورا بدرقہ تھا۔ اُنھوں نے تابوت اُٹھایا ہوا تھا۔ کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ہمیں اجازت ملی تھی۔ اُنھوں نے محض ایک مِنٹ میں زمین میں دفنا دیا۔ ''جلدی کرو! جلدی کرو!'' آفیسر پُکار رہا تھا۔ اُنھوں نے مجھے تابوت سے بھی لپٹنے نہیں دیا۔ اور – لاری پر –، ہر چیز راز میں تھی۔

وہ آناً فاناً ہمارے لیے گھر واپسی کے لیے جہاز کے ٹکٹ خرید لائے۔ اگلے روز کی پرواز کے۔

تمام وقت سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک فوجی نشانوں والا ہمارے سر پر سوار رہا۔ اُس نے ہمیں سفر کے لیے خوراک خریدنے کے لیے بھی قیام گاہ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ ہمیں کسی سے بات کرنے سے خدا بھی منع کرتا ہے — خاص طور پر مجھے۔ جیسے میں اُس وقت بات کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں تو رونے سے بھی لاچار ہوگئی تھی۔ جب ہم روانہ ہو رہے تھے تو ڈیوٹی پر موجود عورت نے تمام تولیے اور چادریں شمار کیں۔ اُس نے اُنھیں فوراً تہہ کیا اور مومی تھیلے میں لپیٹ دیا۔ اُنھوں نے غالباً اُنھیں جلا دیا ہوگا۔ ہم نے اقامت گاہ کی ادائیگی خود کی۔ وہ نیوکلیائی شعاعوں کے زہر سے علاج والا ہسپتال تھا۔ محض چودہ راتوں تک علاج والا۔ ایک شخص کے مرنے میں بس اتنا ہی وقت لگتا ہے۔

گھر پہنچ کر میں سوگئی۔ بس میں گھر میں داخل ہوئی اور سیدھی بستر پر جا گری۔ میں تین روز تک سوتی رہی۔ ایک ایمبولینس آئی۔ ''نہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''یہ اُٹھ جائے گی۔ یہ محض ہولناک نیند ہے۔''

میں تیئیس برس کی تھی۔

میں نے جو خواب دیکھا وہ مجھے یاد ہے۔ میری مرحومہ دادی اُسی لباس میں آتی ہے جس میں ہم نے اُس کی تدفین کی تھی۔ وہ سالِ نو کے درخت کو سنوار رہی ہے۔ ''دادی اماں، ہم سالِ نو کا درخت کیوں سنوار رہے ہیں؟ ابھی تو موسمِ گرما ہے۔'' ''کیوں کہ جلد ہی تمھارا واسینکا مجھ سے آ ملنے والا ہے۔'' اور وہ جنگل سے نمودار ہوا۔ مجھے خواب یاد ہے — واسیا سفید لباس میں آتا ہے اور نتاشا کو پکارتا ہے۔ وہ ہماری بیٹی ہے جسے ابھی میں نے جنم بھی نہیں دیا ہے۔ لیکن وہ بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے چھت کی سمت اُچھالتا ہے اور وہ دونوں ہنسنے لگتے ہیں۔ اور میں اُنھیں دیکھتے ہوئے اُس خوشی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہوں — یہ کس قدر خالص ہے — میں سو رہی ہوں۔ ہم جھیل کے کنارے پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ٹہلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ غالباً اُس نے مجھے کہا کہ میں روؤں مت۔ مجھے اشارہ کیا، وہاں اُوپر سے۔

[وہ ایک طویل وقفے کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔]

دو ماہ بعد میں ماسکو گئی۔ ریلوے سٹیشن سے سیدھی قبرستان پہنچی۔ اُس کے پاس! قبرستان ہی میں مجھے دردِ زہ شروع ہوگیا۔ ٹھیک اُسی وقت جب میں نے اُس سے باتیں کرنا شروع کی ہی تھیں — اُنھوں نے ایمبولینس کو بُلا لیا۔ جب میں ماں بنی تو بھی وہاں وہی انجلینا واسلیفنا گسکووا ہی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا۔ ''تمھیں پیدائش کے وقت یہاں آنا ہوگا۔'' پیدائش میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔

اُنھوں نے اُسے مجھے دکھایا — ایک لڑکی۔ ''نتاشینکا۔'' میں پکار اُٹھی۔ ''تمھارے باپ

نے تمھارا نام نتاشینکا رکھا تھا۔'' وہ صحت مند دِکھائی دے رہی تھی۔ بازو، ٹانگیں، سب کچھ۔ لیکن اُسے جگر کی سوجن، خلیوں کی عدم بڑھوتری، جھلی کی سوجن (Cirrhosis) کا مرض تھا۔ اُس کے جگر میں اٹھارہ مقامات پر ایٹمی شعاعوں کے آئینی بانڈ تھے۔ پیدائشی دِل کی بیماری۔ چار گھنٹے بعد اُنھوں نے مجھے بتایا کہ وہ مرگئی ہے۔ اور دوبارہ: ہم اُسے تمھیں نہیں دیں گے! کیا مطلب ہے تمھارا ہے کہ تم اُسے مجھے نہیں دو گے؟ میں اُسے تمھیں نہیں دوں گی! تم اُسے سائنس کے لیے لینا چاہتے ہو۔ میں تمھاری سائنس سے نفرت کرتی ہوں! مجھے سائنس سے نفرت ہے!

[وہ خاموش ہو جاتی ہے۔]۔

میں تمھیں غلط باتیں بتاتی رہی ہوں۔ غلط باتیں۔ مجھے اپنی چوٹ کے بعد چیخنا چلّانا نہیں چاہیے۔ اور مجھے رونا پیٹنا نہیں چاہیے۔ کیوں کہ تمام الفاظ ہی غلط ہیں۔ لیکن میں اتنا کہوں گی۔ کسی کو یہ نہیں معلوم۔ جب وہ میرے پاس ایک چھوٹا چوبی صندوقچہ لے کر آئے اور بولے۔ ''وہ اِس میں ہے۔'' میں نے دیکھا۔ اُسے جلا ڈالا گیا تھا۔ اُس کی راکھ بنی ہوئی تھی۔ اور میں رونے لگی۔ ''اِسے اُس کے قدموں میں دفن کردو۔'' میں نے استدعا کی۔

وہاں، قبرستان میں، نتاشا اِگنا ٹینکو کا نام نہیں ہے۔ وہاں صرف اُس کا نام ہے۔ اُسے ابھی تک نام نہیں ملا، اُسے کچھ نہیں ملا، بس رُوح ملی تھی۔ جسے میں نے وہاں دفن کر دیا۔ میں ہمیشہ وہاں دو گل دستے لے کر جاتی ہوں: ایک اُس کے لیے اور دُوسرا اُس کے لیے (بیٹی کے لیے) کونے پر رکھ دیتی ہوں۔ میں قبر کے گرد گھٹنوں کے بَل چلتی ہوں۔ ہمیشہ اپنے گھٹنوں کے بَل۔ [وہ ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے۔]۔ میں نے اُس کا خُون کرڈالا۔ میں۔ وہ۔ بچایا۔ میری ننھّی بیٹی نے مجھے بچایا۔ اُس نے تابکاری کے تمام اثرات خُود پر لے لیے۔ اِس بات پر وہ مینارہ نُور ہے۔ وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ وہ نہایت ہی ننھّی سی چیز تھی۔ [اُسے سانس لینے میں دُشواری ہوتی ہے۔]۔ اُس نے بچایا...... لیکن میں اُن دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ کیوں کہ۔ کیوں کہ آپ کسی کا محبت سے خُون نہیں کر سکتے، ٹھیک ہے؟ یہ دونوں چیزیں اکٹھی کیوں ہیں۔ محبت اور موت؟ اکٹھی۔ کون مجھے یہ بات سمجھائے گا؟ میں قبر کے گرد گھٹنوں کے بَل رینگتی ہوں۔ [وہ طویل وقفے کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔]۔

کیف میں اُنھوں نے مجھے ایک اپارٹمنٹ دے دیا۔ وہ ایک بڑی عمارت میں تھا جہاں اُنھوں نے ایٹمی گھر کے ہرفرد کو ڈال دیا گیا۔ وہ دو کمروں والا ایک بڑا اپارٹمنٹ تھا ویسا ہی جس کا واسیا اور میں نے خواب دیکھا تھا۔ اور میں اُس میں پاگل ہوتی جارہی تھی!

بالآخر مجھے ایک خاوند مل گیا۔ میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ تمام تر سچائی۔ کہ میری ایک محبت ہے، زندگی بھر کی محبت۔ میں نے اُس ایک ایک بات بتا دی۔ہم ملتے لیکن میں اُسے کبھی اپنے گھر نہیں بُلاتی تھی کیوں کہ وہاں واسیا تھا۔

میں مٹھائیوں کی ایک دُکان میں کام کرتی تھی۔ میں کیک بناتی اور میرے آنسو بہت رہتے۔ میں رو نہیں رہی، میرے آنسو خود بخود بہہ رہے ہیں۔

میں نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔اینڈری۔اینڈریکا۔میری دوستوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ ''تم بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔'' اور ڈاکٹروں نے مجھے ڈرایا: ''تمھارا جسم اِسے سنبھال نہیں پائے گا۔'' پھر، بعد میں اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُس کا ایک بازو نہیں ہے۔ دایاں بازو۔ آلات نے یہی دِکھایا تھا۔ ''ٹھیک ہے، پھر کیا ہوا؟'' میں نے سوچا۔ میں اُسے بائیں ہاتھ سے کام کرنا سکھادوں گی۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو بالکل ٹھیک تھا۔ ایک خُوب صُورت لڑکا۔ اب وہ سکول میں ہے۔ اچھے درجے حاصل کرتا ہے۔ اب میرے پاس کوئی ہے۔ میں زندہ رہ سکتی ہوں اور اُس کی مہک محسوس کر سکتی ہوں۔ وہ میری زندگی میں روشنی ہے۔ وہ ہر بات کو پُوری طرح سمجھتا ہے۔ ''امّی، اگر میں دو روز کے لیے نانی اماں کے ہاں چلا جاؤں تو کیا آپ سانس لے پائیں گے؟'' میں نہیں لے پاؤں گی۔ میں اُس دِن سے ڈرتی ہوں جب وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایک روز ہم سڑک پر جا رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں گرنے لگی ہوں۔ تب مجھے پہلی بار چوٹ لگی تھی۔ سیدھی سڑک پر آ رہی۔ ''امّی، تمھیں پانی چاہیے؟'' ''نہیں، بس یہاں میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔'' اور میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے نہیں پتا پھر کیا ہوا۔ میں ہسپتال پہنچ گئی۔ لیکن میں نے اُس کا بازو اِتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ ڈاکٹروں نے بمشکل میری اُنگلیاں کھولیں۔ اُس کا بازو بہت دیر تک نیلا پڑا رہا۔ اب جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔ ''امّی، بس میرا بازو مت پکڑنا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' وہ بھی بیمار رہتا ہے۔ دو ہفتے سکول تو دو ہفتے ڈاکٹر کے ساتھ گھر۔ ہم یہ زندگی جی رہے ہیں۔

[وہ اُٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔]

یہاں ہم بہت سے لوگ ہیں۔ پُوری گلی۔ جس کا نام ہے۔ چرنوبل سکایا۔ اِن لوگوں نے زندگی بھر ایٹمی گھر میں کام کیا ہے۔ اِن میں سے بہت سے اب بھی وہاں عارضی بنیادوں پر کام کرنے جاتے ہیں۔ وہ اِس طرح وہاں کام کرتے ہیں۔ کوئی بھی وہاں زیادہ عرصے نہیں رہتا۔ اُنھیں بیماریاں لگی ہوئی ہیں، یہ بیمار ہیں لیکن اپنی نوکریاں نہیں چھوڑتے۔ یہ تو ایٹمی گھر کے بند ہونے کے بارے میں سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ کس کو اب اِن کی ضرورت ہے؟ اکثر مر جاتے ہیں۔ ایک لمحے میں۔

بس نیچے گر تے ہیں— کوئی کہیں جا رہا ہوگا تو وہ گرتا ہے، سوجاتا ہے اور کبھی نہیں اُٹھتا۔ وہ اپنی نرس کے لیے پھول لے کر جا رہا تھا کہ اُس کے دِل نے کام کرنا بند کر دیا۔ یہ مرجاتے ہیں لیکن درحقیقت ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں تو کسی نے یہ تک نہیں پوچھا کہ ہم کیا بیتی ہے؟ ہم نے کیا دیکھا ہے؟ کوئی بھی موت کی باتیں نہیں سُننا چاہتا۔ جس سے وہ دہشت زدہ ہیں۔

لیکن میں تو تمھیں محبت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اپنی محبت کے بارے میں......

(مرحوم فائر مین واسلی اِگناٹینکو کی بیوہ لی یُد مِلّا اِگناٹو۔)

VVVV

---

۱ ڈوسی میٹر (dosimeter): وہ آلہ جس سے بدن میں جذب شدہ ایٹمی شعاعوں کی مقدار ناپی جاتی ہے۔

۲ اجمود (parsley): سلاد جیسے پتوں والی ایک خوش بُودار سبزی جو سالن کے اُوپر سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اُسے علیحدہ سے کچا بھی کھایا جا سکتا ہے۔

وہ جو لوٹ آئے

(By Those Who Returned)

گومل اَو بلاسٹ کے علاقے نارووِل یانسک کا اِیلی ایرَیگ نامی گاؤں۔

شریکِ گفتگو: اینا پافلوفنا آرٹی یُوشینکو، اِیوااَیڈموفنایُوشینکو، واسلی نکولائی وِچ آرٹی شینکو، سَوجیانکولائی فناموروز، نادے زِہدہ بوری سوفنانِکولائیِنکو، الیکسندرفیوروس وِچ نِکو لائینکو، میخائل مارٹنووِچ لِس۔

''اور ہم اِس طرح کے حالات میں جیتے رہے، ہر طرح کے حالات میں زندہ رہے.....''

''او ہ میں اِسے بالکل بھی یاد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ نہایت دہشت ناک ہے۔ اُنھوں نے ہمیں دھکے دے دے کر باہر نکالا، فوجیوں نے دھکے دے کر باہر نکالا۔ بڑی بڑی مشینیں گھومتی پھر رہی تھیں۔ ہمہ قسم کی زمین پر کام کرنے والی مشینیں۔ ایک بوڑھا شخص۔ وہ پہلے ہی زمین پر گرا پڑا تھا۔ مر رہا تھا۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ 'تم، بس اُٹھ جاؤ' وہ چِلّا رہا تھا۔ 'اور قبرستان چلو۔ میں خود یہ کروں گا۔' اُنھوں نے ہمارے گھروں کے بدلے میں ہمیں کیا دیا؟ کیا؟ دیکھو، یہ کتنی خوب صُورت جگہ ہے! اِس خوب صُورتی کی قیمت ہمیں کون ادا کرے گا؟ یہ تفریحی مقام ہوا کرتا تھا!''

''ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر ــ بہت زیادہ شور۔ ٹرالیوں والے ٹرک۔ فوجی ٹرک۔ خوب، میں سمجھا جنگ لگ گئی ہے۔ چینیوں یا امریکیوں کے ساتھ۔''

''میرا شوہر کلخوز کے اجلاس سے گھر آیا۔ وہ کہتا ہے: 'کل ہمارا انخلا ہوگا۔' اور میں پُوچھتی ہوں: 'آلوؤں کا کیا بنے گا؟ ہم نے ابھی تک اُنھیں نہیں نکالا۔ ہمیں وقت ہی نہیں ملا۔' ہمارا پڑوسی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور شروب پینے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم شروب پی لیتے ہیں تو کلخوز کے چیئرمین کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ 'اب ہم یہاں سے نہیں جا رہے۔ ہم جنگ میں یہاں رہے تو اب شعاعوں میں بھی رہ لیں گے۔ اگر ہمیں خود کو یہاں دفن بھی کرنا پڑا تو بھی ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے!''

''پہلے پہل ہمارا خیال تھا کہ ہم سب دو تین ماہ کے اندر مر جائیں گے۔ اُنھوں نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ اُنھوں نے ہم پر افواہ سازی سے کام لیا تھا۔ ہمیں دہشت زدہ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے ــ ہم زندہ ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے! خدا کا شکر ہے!''

''کسی کو نہیں پتا تھا کہ دُوسری دُنیا میں کیا ہے۔ یہ جگہ بہتر ہے۔ سُنا سا تو ہے۔''

''ہم چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میں نے اپنی ماں کی قبر سے تھوڑی سی مٹی لی، اُسے ایک چھوٹی سے تھیلی میں ڈالا۔ گھٹنوں پر جھکی: 'ہمیں معاف کر دینا تمھیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔' میں وہاں رات کے وقت گئی تھی اور خوف زدہ نہیں تھی۔ لوگ گھروں پر اپنے اپنے نام لکھ رہے تھے۔ درختوں پر، باڑوں پر اور کولتار پر۔''

''فوجیوں نے کتّوں کو مار ڈالا تھا۔ بس اُنھیں گولیاں مار ڈالی تھیں۔ ٹھائیں، ٹھائیں، ٹھائیں! اُس کے بعد میں نے کسی جان دار کے زندہ ہونے اور چیخنے کی آواز نہیں سُنی۔''

''میں کولخوز میں بریگیڈ کا قائد تھا۔ پینتالیس سالہ۔ مجھے لوگوں کے حالت پر دُکھ ہو رہا تھا۔ ہم اپنے ہرن ایک نمائش پر ماسکو لے کر گئے تھے، کولخوز نے ہمیں بھیجا تھا۔ ہم گلابی اور کالے رنگ کی ایک سند جیت کر لائے تھے۔ لوگ مجھ سے احترام سے بات کرتے تھے۔ 'واسلی نکولائی وچ، نکولائی وچ' اور یہاں میں کون ہوں؟ ایک چھوٹے سے گھر میں ایک ضعیف شخص! میں یہیں مر جاؤں گا، عورتیں میرے لیے پانی لائیں گی اور وہ گھر کو گرم کریں گے۔ مجھے لوگوں کا دُکھ ہے۔ میں نے شب کے گیت پر عورتوں کو کھیتوں سے جاتے دیکھا تو میں جانتا تھا کہ اُنھیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے ادائیگی والے دِن چند چھڑیوں کے۔ لیکن وہ گا رہی ہیں.....''

''اگر یہ شعاعوں سے بھی زہریلا ہے تو بھی میرا اپنا گھر تو ہے۔ ہمیں دُنیا کے کسی مقام پر کوئی جگہ نہیں چاہیے۔ پنچھی بھی اپنے گھونسلے سے پیار کرتا ہے.....''

''میں اضافہ کروں گا: میں اپنے بیٹے کے ہاں ساتویں منزل پر رہتا ہوں۔ میں کھڑکی کے پاس جاتا، نیچے دیکھتا اور سینے پر ہاتھ باندھتا ہوں۔ مجھے خیال گزرتا ہے جیسے میں نے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنی ہے۔ پالتو گھوڑے کی۔ میں ڈر جاتا ہوں۔ بعض اوقات میں اپنے باڑے کا خواب دیکھتا ہوں: میں اپنی گائے کو باندھتا ہوں اور دُودھ دھونے لگتا ہوں تو دھوتا ہی چلا جاتا ہوں، دھوتا ہی چلا جاتا ہوں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں جاگنا نہیں چاہتا۔ میں اب بھی وہیں ہوں۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔''

''دِن ہم نئے مقام پر گزارتے اور راتیں اپنے گھروں میں۔ اپنے خوابوں میں۔''

''سرما میں ہماری راتیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ہم بیٹھ جاتے اور شمار کرنے لگتے ہیں: کون کون چل بسا؟''

''میرا خاوند دو ماہ سے چارپائی سے لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولتا تھا اور کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ پاگل تھا۔ میں صحن میں ٹہلتی، واپس آتی: ''بڈّھے، کیسے ہو؟'' میری آواز پر وہ نظریں اُٹھا کر دیکھتا اور پہلے سے بہتر ہو جاتا۔ جب تک وہ گھر میں رہا، کوئی مر جاتا تو رو نہیں سکتے تھے۔ اِس مداخلت

سے اُس کی موت واقع ہو جاتی، اُسے زندہ رہنے کے لیے جنگ لڑنا پڑتی۔ میں الماری سے ایک موم بتی لیتی اور اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ وہ اُسے پکڑ لیتا اور سانس لینے لگتا۔ میں دیکھتی ہوں کہ اُس کی آنکھیں بجھ گئی ہیں۔ میں روئی نہیں۔ میں نے صرف ایک بات کہی: 'ہماری بیٹی اور میری پیاری ماں کو ہیلو تو کہہ دو۔' میں دُعا کیا کرتی تھی کہ ہم دونوں اکٹھے جائیں۔ دیوتا یہ کام کر جاتے لیکن اُس نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میں زندہ ہوں......''

''لڑکیو، روؤ مت۔ ہم پہلے ہی ہدف پر تھے۔ ہم شاخانو وانگیس تھے۔ ہم سٹالن کے زمانے میں رہے، جنگ میں رہے۔ اگر میں ہلسی خوشی نہ رہتا اور اپنے آپ کو مطمئن نہ رکھتا تو اِتنے طویل عرصے تک جی نہ پاتا۔''

''ایک بار میری ماں نے مجھے سکھایا۔ ایک شبیہ لو اور اُسے گھما کر اُلٹا کر دو تو سمجھ لو اُن تین دِنوں کے دوران ایسے ہی حالات تھے۔ تم چاہے جہاں بھی ہوتے ہمیشہ گھر لوٹ آتے۔ میرے پاس دو گائیں اور دو بچھڑے تھے، پانچ سؤر، قازیں، مرغیاں۔ ایک کتّا۔ میں اپنا سر تھام کر بس باڑے کے چکر کھائے چلا جاتا۔ اور سیب، بہت سارے سیب! ہر چیز چھن گئی، ہر ایک شے اسی طرح چلی گئی!''

''میں نے گھر دھویا، چولہا صاف کیا۔ میز پر روٹیاں اور نمک ہونا چاہیے، ایک چھوٹی طشتری اور تین چمچ بھی۔ اِتنے چمچ جتنے گھر میں جی ہوں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم لوٹ سکتے تھے۔''

''شعاعوں کی وجہ سے مرغیوں کی کلغیاں سُرخ سے سیاہ پڑ گئی تھیں۔ پنیر بنایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہم ایک ماہ تک پنیر اور گھر کی بنی پنیر کے بغیر رہے۔ البتہ دُودھ خراب نہیں ہوتا تھا۔ اُس میں پاؤڈر ملایا جاتا تھا۔ شعاعوں کی وجہ سے سفید پاؤڈر۔''

''مجھے وہ شعاع اپنے باغ میں ملی تھی۔ سارا باغ سفید ہو گیا تھا، اِتنا سفید جتنا سفید ہو سکتا تھا جیسے اُسے کسی چیز سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ کسی چیز کے تختوں سے۔ مجھے خیال آیا شاید وہ چیز کوئی جنگل سے لایا ہو۔''

''ہم جانا نہیں چاہتے تھے۔ تمام مرد نشے میں مدہوش تھے۔ وہ اپنے آپ کو کاروں کے نیچے گھسیڑ رہے تھے۔ بڑی جماعت کے سرکردہ تمام گھروں میں جا جا کر لوگوں منّتیں کر رہے تھے کہ وہ چلے جائیں۔ احکامات تھے: 'اپنی کوئی بھی چیز مت چھوڑنا!'''

''مویشیوں کو اُن تین دِنوں کے دوران پانی تک نہیں ملا۔ نہ چارہ۔ یہ قصہ تھا! ایک اخباری نمائندہ آیا۔ نشے میں دُھت دُودھ والیوں نے اُسے قریب قریب مار ہی ڈالا۔''

''سردار ایک فوجی کے ساتھ میرے گھر کے گرد گھوم رہا ہے۔ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے: 'باہر آ جاؤ ورنہ ہم گھر کو آگ لگا دیں گے! لڑکو، مجھے تیل والا ڈبا دو۔' میں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی — کمبل اکٹھے کر رہی تھی، تکیے جمع کر رہی تھی۔''

''جنگ کے دوران تمام رات بندوقوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ہم نے جنگل میں ایک گڑھا کھودا۔ اُن کے پاس بم ہی بم تھے۔ ہر شے جلا ڈالی۔ صرف گھر ہی نہیں بل کہ باغات، چیری کے درخت بھی، ہر چیز۔ جب تک جنگ جاری رہی۔ میں اسی چیز سے خوف زدہ ہوں۔''

''انھوں امریکی نمائندۂ نشریات سے دریافت کیا: 'شاید اس میں چرنوبل کے اسباب ہوں!' 'یقیناً لیکن تمھیں اس بنیادی نکتے کو بہت گہرائی میں دفن کرنا پڑے گا۔'''

''انھوں نے ہمیں نیا مکان دیا۔ پتھروں سے بنا ہوا۔ لیکن، تمھیں پتا ہے، ہم نے سات برسوں میں اُس میں ایک کیل تک نہیں ٹھونکی۔ یہ ہمارا تھا ہی نہیں۔ یہ اجنبی تھا۔ میرا خاوند تو بس روتا ہی رہتا تھا۔ پورے ہفتے وہ کولخوز میں ٹریکٹر پر کام کرتا ہے، اتوار کا انتظار کرتا ہے، پھر اتوار کو دیوار کے ساتھ لیٹ جاتا ہے اور بَین کرنے لگتا ہے......''

''کوئی بھی اب ہمیں زیادہ عرصے تک بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ہم کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ یہاں نہ دُکان ہے، نہ ہسپتال اور نہ ہی بجلی۔ ہم مٹی کے تیل کی لالٹین کے پاس بیٹھے ہیں یا پھر چاندنی میں۔ اور ہمیں یہ پسند ہے! کیوں کہ ہم اپنے گھر میں ہیں۔''

''شہر میں میری بہو میرے پیچھے اپارٹمنٹ میں چلی آئی اور اُس نے دروازے کی ہتھی اور کرسی پونچھی۔ یہ سب میری رقم سے خرید کیا ہوا تھا، سارا فرنیچر اور ریفریجریٹر بھی۔ اُس رقم سے جو حکومت نے مجھے گھر اور گائے کے لیے دی تھی۔ جوں ہی رقم ختم ہوئی ماں کی ضرورت بھی نہ رہی۔''

''ہمارے بچوں نے رقم لے لی۔ باقی افراطِ زر نے لے لی۔ انھوں نے ہمیں گھروں کے لیے جتنی رقم دی تھی اُس سے صرف ایک کلو اچھی مٹھائی خریدی جا سکتی تھی، شاید وہ اب اس کے لیے بھی ناکافی ہو۔''

''میں دو ہفتے تک چلتا رہا۔ میری گائے میرے ہم راہ تھی۔ وہ مجھے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں جنگل میں سویا۔''

''وہ ہم سے خوف کھائے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم معتدی ہیں۔ خدا نے ہمیں ہی کیوں سزا دی؟ کیا وہ دیوانہ ہے؟ ہم اب انسانوں کی طرح نہیں رہتے، ہم اب خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان انسان کا قتل کر رہا ہے۔''

''میرے بھتیجے موسمِ گرما میں آیا کرتے تھے۔ اُس پہلی گرمیوں میں وہ نہیں آئے، وہ خوف زدہ تھے۔ لیکن اب وہ آتے ہیں۔ وہ کھانا بھی کھاتے ہیں، اُنھیں کھانے کو جو بھی دیا جائے۔ 'بڑی اماں۔' وہ کہتے ہیں۔ 'کیا تم نے رابنسن کراوزو کے بارے میں کتاب پڑھی ہے؟ وہ بھی تمھاری طرح تنہا رہتا تھا۔ ایک کلہاڑے اور ایک پھاوڑے کے ساتھ۔ اور اب میرے پاس شمع الخزیر ہے، انڈے ہیں اور دُودھ ہے۔ یہ سب میرا ہے۔ صرف شکر نہیں ہے۔ اِسے کاشت نہیں کر سکتے لیکن ہمارے پاس اتنی

زمین ہے جتنی ہم چاہیں! چاہیں تو ۱۰۰۱ ایکڑوں پر ہل چلا لیں۔ لیکن حکومت ہے نہ کوئی آقا۔ ہمارے معاملات میں دخل دینے والا کوئی نہیں ہے۔"

"بلّیاں بھی ہمارے ساتھ لوٹ آئیں اور کتے بھی۔ ہم سب اکٹھے واپس آئے ہیں۔ فوجی ہمیں داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ باغی لشکر۔ لہٰذا ہم رات کے وقت۔ جنگل کے راستے۔ کٹروں کی طرح داخل ہوئے۔"

"ہمیں حکومت سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس ہمیں اکیلا چھوڑ دے، ہم صرف اتنا چاہتے ہیں۔ ہمیں دُکان کی ضرورت ہے نہ لاری کی۔ ہم اپنے لیے ڈبل روٹی لینے پیدل جاتے ہیں۔ بیس کلومیٹر دُور۔ بس ہمیں تنہا چھوڑ دے۔ ہم اپنے آپ ہی ٹھیک ہیں۔"

"ہم سب اکٹھے واپس آئے، تین خاندان۔ یہاں کی چیز لُوٹی جا چکی تھی۔ چولہے توڑے ہوئے تھے، کھڑکیاں اور دروازے اُکھاڑ کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ لیمپ، بجلی کے بٹن، ٹونٹیاں — وہ ہر چیز لے گئے تھے۔ کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے ہر چیز دوبارہ اپنے ان ہاتھوں سے لگائی۔ کسی بھی طرح!"

"جب قاز چیختے ہیں تو اِس کا مطلب ہے کہ موسمِ بہار آ گیا۔ کھیتوں کو بیجنے کا وقت آ گیا۔ اور ہم یہاں خالی گھروں میں بیٹھے ہیں۔ کم از کم چھتیں تو سالم ہیں۔"

"پولیس چلا چلا کر پکار رہی تھی۔ وہ کار میں آئے تھے اور ہم جنگل میں بھاگ گئے تھے۔ جس طرح ہم جرمنوں سے بھاگے تھے۔ ایک مرتبہ وہ سرکاری وکیل کے ہمراہ آئے تھے۔ وہ خفا ہوا اور پھنکارا۔ وہ ہم پر شق ۱۰ لگانے جا رہے تھے۔ میں نے کہا: 'انھیں مجھے ایک سال کے لیے جیل بھجوانے دو۔ میں جیل کاٹوں گا اور لوٹ کر یہیں آؤں گا۔' اُن کا کام ہی چلّانا ہے اور ہمارا یہاں چُپ چاپ قیام کرنا۔ میرے پاس تمغہ ہے۔ میں کولخوز کا بہترین کاشت کار تھا۔ اور وہ مجھے شق سے ڈرا رہا تھا۔"

"روزانہ میں اپنے گھر کا خواب دیکھتی تھی۔ میں یہاں واپس آ گئی ہوں: باغ میں کھدائی کر رہی ہوں یا اپنا بستر ٹھیک کر رہی ہوں۔ اور ہر بار مجھے کوئی نہ کوئی چیز ملتی: کبھی جُوتا تو کبھی ننھا سا موزہ۔ اور ہر چیز بہتری کے لیے تھی جو مجھے خوش کر دیتی تھی۔ میں جلد ہی اپنے گھر ہوں گی......"

"راتوں کو ہم خدا کی منّت کرتے ہیں اور دن میں پولیس کی۔ اگر تم مجھے پوچھو 'کیوں رو رہی ہو؟' مجھے نہیں پتا کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں اپنے گھر میں رہ رہی ہوں۔"

"ہم نے ہر طرح کے حالات جھیلے اور اُن میں زندہ رہے......"

"میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئی۔ 'پیاری' میں کہتی ہوں۔ 'میری ٹانگیں حرکت نہیں کرتیں۔ جوڑوں میں درد رہتا ہے۔' 'تمھیں اپنی گائے ترک کر دینا چاہیے، بڑی ماں۔ اُس کا دُودھ زہریلا ہے۔' 'اوہ، نہیں' میں کہتی ہوں۔ 'میری ٹانگیں دُکھتی ہیں، گھٹنوں میں درد رہتا ہے لیکن میں گائے نہیں چھوڑ

سکتی۔وہ مجھے خوراک دیتی ہے۔''

''میرے سات بچے ہیں۔وہ سب شہروں میں رہتے ہیں۔میں اکیلی یہاں ہوں۔میں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔میں اُن کی تصویروں کے سامنے بیٹھ جاتی ہوں۔تھوڑی دیر بیٹھی رہتی ہوں۔اکیلی۔مکمل طور پر تنہا۔میں نے گھر کو نئو در نگ کیا ہے۔اس میں رنگ کے چھے ڈبے لگے۔اور اس طرح میں جی رہی ہوں۔میں نے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کو پالا پوسا۔میرا خاوند جوانی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔اب میں تنہا ہوں۔''

''ایک بار ایک بھیڑیے سے میرا سامنا ہو گیا۔میں وہاں کھڑا تھا۔ہم ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔وہ سڑک کی ایک طرف چلا گیا اور میں نے دوڑ لگا دی۔میرا ہَیٹ اُڑ گیا۔میں بہت دہشت زدہ ہو گیا تھا۔''

''ہر جانور انسان سے خوف زدہ ہے۔اگر تم اُسے چھیڑو نہ تو وہ تمھارے گرد چکر لگائے گا۔تم اِس کے عادی ہو جاؤ گے کہ تم جنگل میں ہو اور تمھیں کوئی انسانی آوازیں سُنائی دیں تو تم اُن کی سمت دوڑ پڑتے ہو۔لیکن اب لوگ ایک دُوسرے سے چھپتے پھرتے ہیں۔خدا مجھے جنگل میں کسی بھی آدمی سے ملنے سے محفوظ رکھے!''

''انجیل میں لکھی ہر بات پُوری ہوتی جا رہی ہے۔اُس میں ہمارے کولخوز کے بارے میں لکھا ہے اور ہمارے گورباچوف کے بارے میں۔یہ کہ ایک بڑا حکمران ہوگا جس پر پیدائشی نشان ہوگا اور ایک عظیم سلطنت پارہ پارہ ہو جائے گی۔پھر یومِ حساب ہوگا۔شہروں میں رہنے والا ہر شخص موت کا شکار ہو جائے گا اور صرف ایک دیہاتی بچے گا۔وہ ایک انسانی پیروں کے نشان دیکھ کر خوش ہوگا۔خود اُس آدمی کو نہیں صرف اُس کے پیروں کے نشان۔''

''ہمارے پاس روشنی کے لیے ایک لیمپ ہے۔مٹی کے تیل کا ایک لیمپ۔آہا، اِس عورت نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا۔اگر ہم کسی وحشی سؤر کو مار گرائیں تو ہم اُسے تہہ خانے میں لے جاتے ہیں یا خود ہی دفن کر دیتے ہیں۔زمین کے اندر گوشت تین دن تک محفوظ رہتا ہے۔واڈ کا ہم خود بناتے ہیں۔''

''میرے پاس نمک کے دو تھیلے ہیں۔ہم حکومت کے بغیر ٹھیک رہیں گے! بہت ساری گیلیاں— ہمارے اِرد گرد جنگل ہی جنگل ہے۔گھر گرم ہے۔لیمپ روشن ہے۔یہ عمدہ ہے! میرے پاس ایک بکری ہے، ایک مینا، تین سؤر اور چودہ مرغیاں۔زمین— اِتنی جتنی میں چاہوں، گھاس— اِتنی جتنی میں چاہوں۔کنوئیں میں پانی ہے۔اور آزادی! ہم خوش ہیں۔یہ اب کولخوز نہیں رہی، یہ اصل اشتراک ہے۔ہمیں ایک گھوڑا خریدنے کی ضرورت ہے۔پھر ہمیں کسی اَور شے کی ضرورت نہیں رہے گی۔صرف ایک گھوڑا۔

''یہ بات ایک رپورٹر نے کہی تھی کہ ہم اپنے گھر نہیں لوٹے ایک صدی پیچھے چلے گئے ہیں۔

ہم فصل کاٹنے کے لیے ہتھوڑا استعمال کرتے ہیں اور گھاس کاٹنے کے لیے درانتی۔ ہم کولتار پر کنک نکالتے ہیں۔''

''جنگ میں اُنھوں نے ہمیں آگ لگائی تو ہم زیرِ زمین رہے۔ مورچوں میں۔ اُنھوں نے میرے بھائی اور دو بھتیجوں کو قتل کر دیا۔ سب نے بتایا ہے۔ میرے خاندان کے سترہ لوگ گم ہو گئے۔ میری ماں روتی پیٹتی رہی۔ دیہاتوں سے ایک بوڑھی عورت گزر رہی تھی، جاروب کشی کرتی ہوئی۔ 'تم بَین کر رہی ہو؟' اُس نے میری ماں سے پُوچھا۔ 'بَین مت کرو۔ جو دُوسروں کے لیے اپنے جان دیتا ہے، وہ مقدس ہوتا ہے۔' اور میں اپنے وطن کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس میں قتل و غارت نہیں کر سکتا۔ میں ایک اُستاد ہوں اور میں نے اپنے بچّوں کو دُوسروں سے محبت کرنا پڑھایا ہے۔ میں نے اُنھیں یُوں پڑھایا تھا: 'ہمیشہ فاتح خدا ہی ہوگا۔' بچّے چھوٹے ہوتے ہیں، اُن کے من سچے ہوتے ہیں۔''

''چرنوبل تمام جنگوں کی ماں کے مانند ہے۔ اِس سے بچنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ زمین کے نیچے، نہ پانی میں اور نہ ہی فضا میں کوئی جگہ۔''

''ہم نے ریڈیو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ ہمیں کسی خبر کا کچھ پتا نہیں لیکن زندگی پُرسکون ہے۔ ہم پریشان نہیں ہوتے۔ لوگ آتے ہیں، ہمیں کہانیاں سناتے ہیں— ہر طرف جنگ لگی ہے۔ اور اشتراکیت جیسی چیز ختم ہو گئی ہے اور ہم سرمایہ دارانہ نظام کے تحت رہ رہے ہیں۔ اور زار سیاہ پڑتا جا رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''کبھی کوئی جنگلی سؤر باغ میں آ جاتا ہے تو کبھی کبھار کوئی لومڑی۔ لیکن لوگ بہت ہی کم۔ صرف پولیس آتی ہے۔'' ''تم میرا گھر بھی دیکھنے آؤ۔''

''اور میرا بھی۔ بہت عرصہ ہو گیا میرے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا۔ میں اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں: پیارے خدا! دو مرتبہ پولیس آئی اور میرا چُولہا توڑ گئی۔ وہ مجھے ٹریکٹر پر دھکا کر دُور لے گئی اور میں، میں لوٹ آیا۔ وہ لوگوں کو آنے دیں تو— وہ سارے اپنے گھٹنوں کے بَل چلتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔ لیکن زندہ لوگ صرف رات کو جنگل کے راستے آ سکتے ہیں۔''

''ہر شخص زمین کاشت کرنے کے لیے واپس لوٹنا چاہ رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ ہر کوئی اپنی واپسی چاہتا ہے۔ پولیس کے پاس اُن لوگوں کی فہرستیں ہیں جنھیں وہ آنے دے گی لیکن اٹھارہ سال سے کم عمر بچّے نہیں آ سکتے۔ لوگ لوٹ آئیں گے تو اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کر بہت خُوش ہوں گے۔ اپنے صحن میں لگے سیب کے درخت کے پاس کھڑے ہو کر بہت خُوش ہوں گے۔ پہلے وہ قبرستان جا کر گریہ زاری کریں گے، پھر اپنے گھروں کے صحنوں میں چلیں آئیں گے۔ وہ وہاں بھی آہ و زاری اور دُعا کریں گے۔ اُن کے پاس شمعیں ہیں۔ وہ اُنھیں باڑوں پر لٹکا دیں گے۔ جیسے قبرستان کی چھوٹی باڑ پر

لٹکا تے ہیں ۔بعض اوقات وہ گھر پر بھی ہار چھوڑیں گے ۔وہ مرکزی دروازوں پر سفید تولیے رکھیں گے۔ بوڑھی عورت استدعا کرتی ہے: 'بھائیو اور بہنو! صبر سے کام لو۔' ''

''لوگ انڈے اور رَول اور جو بھی اُن کے پاس ہو قبرستان لے کر جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے خاندان کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اُنھیں پُکارتے ہیں: 'بہن، تمھیں ملنے آیا ہوں۔ آؤ کھانا کھائیں۔' یا 'امّی، پیاری امّی ۔ابّو، پیارے ابّو۔' وہ جنت میں گئی رُوحوں کو پُکارتے ہیں۔ جن کے لوگ اِسی برس فوت ہوئے ہیں وہ روتے ہیں اور جن کے پہلے فوت ہوئے تھے وہ نہیں روتے۔ وہ باتیں کرتے ہیں، اُنھیں یاد کرتے ہیں۔ ہر کوئی دُعا مانگتا ہے۔ اور وہ بھی دُعا مانگتے ہیں جنھیں دُعا مانگنا نہیں آتی۔''

''میں صرف رات کو نہیں روتی۔ مرے ہوؤں کو رات کو نہیں رونا چاہیے۔ جب سُورج ڈُوب جاتا ہے تو میں رونا بند کر دیتی ہوں۔ اُنھیں یاد کرتی ہوں، اوہ خدایا! اور اُنھیں اُن کی دُنیا میں چھوڑ دیتی ہوں۔''

''اگر تم چالبازی سے کام نہیں لیتے تو شکست مقدر بنتی ہے۔ مارکیٹ میں ایک یوکرائنی عورت سیب بیچ رہی تھی۔ 'آؤ، سیب لے لو! چرنوبل کے سیب!' کسی نے اُسے کہا یہ بات مت کہو، کوئی نہیں خریدے گا۔ 'فکر مت کریں'، وہ کہتی ہے۔ 'وہ پھر بھی خریدیں گے۔ کسی کو اپنی ساس کے لیے ضرورت ہے تو کسی کو اپنے مالک کے لیے۔' ''

''ایک شخص تھا، وہ یہاں جیل سے واپس آیا تھا۔ معافی لے کر۔ وہ ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کی ماں مر گئی تھی، گھر گرا دیا گیا تھا۔ وہ ہمارے پاس آیا۔ 'خاتون، مجھے کچھ روٹی اور شحم الخنزیر دے دو۔ میں تمھاری لکڑیاں پھاڑ دوں گا۔' اُسے مل جاتا ہے۔''

''ملک میں افراتفری مچی ہے — اور لوگ یہاں لوٹ آتے ہیں۔ وہ دُوسروں سے، قانون سے بھاگ کر آتے ہیں۔ اور وہ تنہا رہتے ہیں۔ حتّٰی کہ اجنبی بھی۔ وہ سخت لوگ ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ذرا میں بھی دوستانہ پن نہیں۔ اگر وہ نشے میں دھت ہو جائیں تو کسی نہ کسی شے کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں۔ رات کو ہم اپنے بستروں کے نیچے کلہاڑے اور دوشاخہ رکھ کر سوتے ہیں۔ باورچی خانے میں دروازے کے ساتھ ہی ہتھوڑا رکھا ہوتا ہے۔''

''موسمِ بہار میں یہاں ایک مجنون لومڑی ہوا کرتی تھی — جب اُس پر جنون کے دورے پڑتے ہیں تو ہم دردہو جاتی ہیں، بچ مچ ہم درد۔ لیکن وہ پانی نہیں دیکھ سکتیں۔ بس اپنے صحن میں پانی کی ایک بالٹی انڈیل دو، پھر سب ٹھیک ہے۔ وہ بھاگ جائے گی۔''

''یہاں کوئی ٹیلی ویژن نہیں ہے۔ نہ سینما گھر۔ یہاں کرنے کو صرف ایک کام ہے — اپنی کھڑکی سے باہر تکتے رہنا۔ خُوب، اور عبادت کرتے رہنا، بے شک۔ کبھی یہاں اشترا کی نظام ہوا کرتا تھا لیکن اب صرف خدا ہے۔ پس ہم عبادت کرتے رہتے ہیں۔''

"ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں خدمات سرانجام دیں۔ میں کٹر اشترا کی ہوں۔ میں ایک سال تک کٹر اشترکیوں کے ساتھ رہا۔ اور جب ہم نے جرمنوں کو مار بھگایا تھا تو میں سب سے آگے تھا۔ میں نے ریکسٹاگ (Reichstag) پر اپنا نام لکھا: آرٹی یوشینکو۔ میں نے اشتراکیت کی تعمیر کے لیے اپنا اُوور کوٹ اُتار پھینکا۔ لیکن کہاں ہے وہ اشتراکیت؟"

"اشتراکیت یہاں ہمارے پاس ہے۔ ہم بھائیوں اور بہنوں کی طرح رہتے ہیں ......"

"جس برس جنگ شروع ہوئی تو گگر مٹنے ہوئے نہ بیر۔ کیا تم اِس بات پر یقین کر سکتی ہو؟ زمین نے خود بھی تاخت وتاراج کو محسوس کر لیا تھا۔ ۱۹۴۱ء۔ اوہ، میں اُسے کتنا یاد کرتا ہوں! میں جنگ کبھی نہیں بھلا پایا۔ خبر پھیلی کہ وہ تمام جنگی قیدیوں کو لائیں گے اور آپ اپنے عزیزوں کو پہچان کر لے جا سکتے ہیں۔ ہماری ساری عورتیں دوڑیں! اُس رات کچھ تو اپنوں کو گھر لائے اور کچھ غیروں کو۔ لیکن ہم میں ایک بدمعاش بھی تھا...... وہ عام لوگوں کی طرح رہتا تھا، شادی شدہ تھا اور اُس کے دو بچے تھے۔ اُس نے کمانڈر کو بتا دیا کہ ہم یوکرائینیوں کو لے گئے ہیں، واسکو، شاسکو۔ اگلے روز جرمن موٹر سائیکلوں پر آئے۔ ہم نے اُن کی منتیں کیں، ہم اُن کے سامنے گھٹنوں کے بَل جھک گئے۔ لیکن وہ لوگ اُنھیں لے گئے اور اپنی خود کار بندوقوں سے اُنھیں مار ڈالا۔ نو افراد۔ وہ نوجوان تھے اور بہت ہی اچھے! واسکو، ساشکو......"

"آقا لوگ آئے، وہ چلاتے رہے لیکن ہم گونگے بولے بن گئے۔ ہم نے ہر طرح کے حالات بھگتے ہیں، ہر طرح کے حالات میں زندہ رہے ہیں......"

"لیکن میں کسی اَور چیز کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ میں اِس پر بہت غور کرتی ہوں۔ قبرستان میں کچھ لوگ بلند آواز میں دُعا مانگتے، باقی خاموشی سے۔ اور کچھ لوگ کہتے: 'کھل جا، زرد ریت۔ کھل جا، سیاہ رات!' جنگل تو کھل سکتا ہے لیکن ریت کبھی نہیں کھلتی۔ میں آہستگی سے پُوچھتی۔ 'اِیوان، میں کیسے جیوں؟' لیکن وہ کبھی مجھے جواب نہیں دیتا، نہ اِس طرح نہ اُس طرح۔"

"میرا اپنا کوئی نہیں ہے جسے میں رووں البتہ میں سب کے لیے روتا ہوں۔ اجنبیوں تک کے لیے۔ میں قبروں پر جاتا ہوں اور اُن سے باتیں کرتا ہوں۔"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مُردوں سے بھی نہیں، جانوروں سے بھی نہیں، کسی سے نہیں۔ میرا بیٹا شہر سے آتا ہے۔ وہ مجھ پر جنونی ہو جاتا ہے۔ 'تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اگر کسی لٹیرے نے تمھیں قتل کر ڈالا تو کیا ہوگا؟' لیکن وہ مجھ سے کیا لے گا؟ صرف چند تکیے ہی تو ہیں۔ ایک سادہ سے گھر میں چند تکیے ہی سب سے اہم فرنیچر ہیں۔ اگر کوئی چور گھسنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو جیسے ہی وہ کھڑکی میں اپنا سر اُٹھائے گا میں کلہاڑے سے اُس کا سر تن سے جُدا کر دوں گا۔ ہم اِس طرح یہاں رہتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ شاید وہاں کوئی اَور ہے لیکن وہاں اُوپر کوئی ہے ضرور۔ اور میں زندہ ہوں۔"

''چرنوبل میں تباہی مچی، کیوں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے اپنے سائنس دانوں کا قصور تھا۔ اُنھوں نے خدا کی داڑھی نوچی تھی اور اب وہ کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ لیکن ہم تو وہ لوگ ہیں جو عبادت کرتے ہیں۔''

''ہم نے کبھی اچھی زندگی نہیں گزاری۔ نہ سکون سے گزاری۔ ہم ہمیشہ خوف زدہ ہی رہے۔ جنگ سے فوراً پہلے وہ لوگوں کو گھسیٹتے۔ وہ کالی کاروں میں آئے تھے اور کھیتوں سے ہمارے لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ آج تک واپس نہیں آئے۔ ہم نے ہمیشہ خوف زدگی ہی میں زندگی بسر کی ہے۔''

''لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ فصل اچھی ہوتی ہے۔ ہم نوابوں کی طرح رہتے ہیں۔''

''میرے پاس صرف ایک چیز ہے، میری گائے۔ اگر وہ ایک اور جنگ نہ لگائیں تو میں اُسے اُنھیں دے دوں گا۔ دیکھو، مجھے جنگ سے کتنی نفرت ہے!''

''ہمارے پاس یہاں جنگوں کی ماں ہے — چرنوبل۔''

''اور کوئل کُوکُو کر رہی ہے، میگ پائی چہچہا رہے ہیں، چکارے دوڑ رہے ہیں۔ کیا وہ انھیں دوبارہ پیدا کر لیں گے — کسے پتا ہے؟ ایک صبح میں نے باہر باغ میں دیکھا، سؤر زمین کھود رہے تھے۔ وہ جنگلی تھے۔ تم لوگوں کو نئی جگہ بسا لو گے لیکن گوزا اور سؤروں کو نہیں بسا سکتے۔ پانی سرحدوں کو نہیں مانتا، یہ زمین پر بھی چلتا ہے اور زمین کے اندر بھی۔''

''لڑکیو، اِس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اِس سے دُکھ ہوتا ہے۔ آؤ خاموش ہو جائیں۔ وہ خاموشی سے تمھارے تابوت لاتے ہیں محتاط ہو کر۔ وہ نہیں چاہتے کہ تابوت دروازے یا پلنگ سے ٹکرا کر آواز پیدا کرے، نہیں چاہتے کہ کسی چیز کو چُھوئیں یا دستک دیں۔ ورنہ اگلے مرنے والے شخص کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اُنھیں زندگیاں برباد کرنا آتی ہیں۔ اے میرے خدا۔ اُن کی بادشاہی ہو۔ آؤ، اُن کے لیے دُعا کریں جو معلوم نہیں کہاں دفن ہیں۔ ہمارے پاس یہاں سب کچھ ہے — قبریں۔ ہر طرف قبریں ہی قبریں۔ کوڑا اُٹھانے والے ٹرک اور بلڈوزر کام کر رہے ہیں۔ گھر ڈھے رہے ہیں۔ گورکن مشقت کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے سکول دفنا دیے، ہیڈ کوارٹرز اور غسل خانے بھی۔ یہ وہی دُنیا ہے لیکن لوگ مختلف ہیں۔ ایک بات کا مجھے علم نہیں ہے: کیا لوگوں کی رُوحیں ہوتی ہیں؟ کس قسم کی ہوتی ہیں؟ اور وہ خود کو کس طرح اگلی دُنیا میں تطبیق کرتے ہیں؟ میرے دادا کو مرنے میں تین دن لگے۔ میں چُولہے کے پیچھے چھپی رہی اور انتظار کرتی رہی: وہ اپنے جسم کا کس طرح تطابق کر پائے گا؟ میں گائے دوہنے گئی — واپس آتی ہوں، اُسے پکارتی ہوں، وہ کھلی آنکھیں لیے پڑا ہے۔ اُس کی رُوح پرواز کر گئی تھی۔ یا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر ہم کیسے ملیں گے؟''

''ایک بُڑھیا، وہ اعلان کرتی ہے کہ ہم لافانی ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں: اے خدا، ہمیں اپنی زندگی کی مصیبتوں میں زندہ رہنے کی ہمّت عطا فرما۔''

اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات

(پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی دستیاب کتب)

نام کتاب	مصنف	قیمت: مجلد	قیمت: غیر مجلد
حکیم محمد سعید: شخصیت اور فن	صادق حسین طارق		40روپے
امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن	ڈاکٹر گوہر نوشاہی		40روپے
حفیظ جالندھری: شخصیت اور فن	عزیز ملک		40روپے
باقی صدیقی: شخصیت اور فن	پروفیسر نجمی صدیقی		40روپے
شاہ مراد خانپوری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر نثار ترابی	130روپے	110روپے
محمد خالد اختر: شخصیت اور فن	اشفاق احمد ورک	150روپے	145روپے
میر گل خان نصیر: شخصیت اور فن	واحد بخش بزدار	150روپے	140روپے
ابوالفضل صدیقی: شخصیت اور فن	نذر الحسن صدیقی	100روپے	90روپے
مرزا قلیچ بیگ: شخصیت اور فن	نصیر مرزا	115روپے	110روپے
سوبھوگیان چندانی: شخصیت اور فن	سید مظہر جمیل	200روپے	190روپے
جمال ابڑو: شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	120روپے	110روپے
عبداللہ جان جمالدینی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	110روپے	100روپے
شوکت صدیقی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انوار احمد	100روپے	90روپے
سید ہاشمی: شخصیت اور فن	پروفیسر صبا دشتیاری	100روپے	90روپے
شاہد احمد دہلوی: شخصیت اور فن	تاج بیگم فرخی	180روپے	175روپے
محمد حسن عسکری: شخصیت اور فن	عزیز ابن الحسن	155روپے	140روپے
رحمان بابا: شخصیت اور فن	ڈاکٹر پرویز مہجور خویشگی	185روپے	175روپے
عطا شاد: شخصیت اور فن	افضل مراد	165روپے	155روپے
قلندر مومند: شخصیت اور فن	پروفیسر محمد زبیر حسرت	175روپے	165روپے
ڈاکٹر تنویر عباسی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ادل سومرو	176روپے	166روپے

مست توکلی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	170روپے	160روپے
مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	200روپے	190روپے
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: شخصیت اور فن	محمد راشد شیخ	165روپے	155روپے
شفیق الرحمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	160روپے	155روپے
ضیاء جالندھری: شخصیت اور فن	علی محمد فرشی	200روپے	190روپے
ممتاز شیریں: شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنظیم الفاروق	215روپے	210روپے
پروفیسر فتح محمد ملک: شخصیت اور فن	محمد حمید شاہد	195روپے	185روپے
سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن	مبین مرزا	220روپے	210روپے
پروفیسر احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر محمد کامران	190روپے	180روپے
کرنل محمد خان: شخصیت اور فن	ایم اسماعیل صدیقی	190روپے	180روپے
عابد علی عابد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلیم اختر	225روپے	215روپے
سائیں احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	170روپے	160روپے
فارغ بخاری: شخصیت اور فن	طارق ہاشمی	210روپے	200روپے
دوست محمد کامل مومند: شخصیت اور فن	مصطفیٰ کمال	160روپے	150روپے
مسعود مفتی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مقصودہ حسین	280روپے	270روپے
مجید امجد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	170روپے	160روپے
رضا ہمدانی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار	240روپے	230روپے
ڈاکٹر فقیر محمد فقیر: شخصیت اور فن	محمد جنید اکرم	210روپے	200روپے
جمیل الدین عالی: شخصیت اور فن	بیگم رعنا اقبال	210روپے	200روپے
زیتون بانو: شخصیت اور فن	اباسین یوسفزئی	230روپے	220روپے
کشور ناہید: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	150روپے	140روپے
عبداللہ حسین: شخصیت اور فن	محمد عاصم بٹ	160روپے	140روپے
احمد شمیم: شخصیت اور فن	منیرہ شمیم	220روپے	210روپے
احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناہید قاسمی	390روپے	380روپے
حبیب جالب: شخصیت اور فن	سعید پرویز	280روپے	270روپے
افتخار عارف: شخصیت اور فن	عبدالعزیز ساحر	275روپے	250روپے
محمد عثمان ڈیپلائی: شخصیت اور فن	آفاق صدیقی	160روپے	150روپے

فخر زمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	180روپے	170روپے
علامہ نیاز فتح پوری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	220روپے	210روپے
استاد دامن: شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	190روپے	180روپے
اقبال ساجد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر جواز جعفری	240روپے	235روپے
خیر النساء جعفری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنویر جونیجو	230روپے	220روپے
عطاء الحق قاسمی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	320روپے	310روپے
سید آل رضا: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی	290روپے	280روپے
عرش صدیقی: شخصیت اور فن	بیگم نظیر افتخار	220روپے	210روپے
حجاب امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	240روپے	230روپے
خدیجہ مستور: شخصیت اور فن	تاج بیگم فرخی	210روپے	200روپے
ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن	محمد افتخار شفیع	210روپے	200روپے
حبیب جالب: شخصیت اور فن	سعید پرویز	280روپے	270روپے
ڈاکٹر انور سدید: شخصیت اور فن	پروفیسر سجاد نقوی	400روپے	390روپے
صہبا اختر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	250روپے	240روپے
غلام ثقلین نقوی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	310روپے	300روپے
مولوی غلام رسول عالپوری: شخصیت اور فن	صاحبزادہ مسعود احمد	450روپے	400روپے
سوبھو گیان چندانی: شخصیت اور فن	سید مظہر جمیل	200روپے	190روپے
سلیم احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مختار احمد عزمی	225روپے	200روپے
علامہ اقبال: شخصیت اور فن پشتو	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مترجم: م ر شفق	450روپے	400روپے
منشا یاد: شخصیت اور فن	اسلم سراج الدین	350روپے	340روپے
ڈاکٹر رشید امجد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شفیق انجم	210روپے	200روپے
پروفیسر غلام جیلانی اصغر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	260روپے	250روپے
افضل پرویز: شخصیت اور فن	راجہ شکیل انجم	180روپے	170روپے
مجنوں گورکھپوری: شخصیت اور فن	جمال نقوی	190روپے	180روپے
علامہ اقبال: شخصیت اور فن (سندھی)	منظور علی ویسریو	450روپے	430روپے
شیخ سر عبدالقادر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	260روپے	250روپے
شہزاد احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	270روپے	260روپے

نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں (۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء)

فرخندہ لودھی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	310روپے	300روپے
صوفی شاہ عنایت شہید: شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	210روپے	200روپے
بلھے شاہ: شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	260روپے	250روپے
ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	370روپے	350روپے
عزیز احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اعجاز حنیف	240روپے	220روپے
مولانا الطاف حسین حالی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی	330روپے	320روپے
عبداللہ حسین: شخصیت اور فن	محمد عاصم بٹ	280روپے	250روپے
احمد فراز: شخصیت اور فن	محبوب ظفر	580روپے	560روپے
احمد بشیر: شخصیت اور فن	محمد ظہیر بدر	430روپے	400روپے
سید نصیر شاہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اسد مصطفیٰ	370روپے	350روپے

☆☆☆☆

کتب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

میر نواز سولنگی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سیلز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ)

اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد۔

فون: 051-9269711



SELECTED SHORT STORIES OF NOBEL LAUREATES

(2001-2015)

SELECTED & TRANSLATED BY
NAJAM UD DIN AHMED

ISBN: 969-472-298-6



PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk